مُطالعۂ ادبیاتِ ایران

(حصّہ نظم و نثر)

(مُؤلفین)

رودکی سے غالب تک • دَورِ سامانیہ سے دورِ قاچاریہ تک

اشرف لطیفی
ایم۔اے (فارسی)، ایم۔اے (اُردو)

سیّد خورشید حسین بخاری
فاضلِ فارسی ایم۔اے۔ایم۔او۔ایل

—— بنظرِ ثانی ——

ڈاکٹر رانا محمد بہاء الحق اشک

ایم۔اے (عربی)۔ایم اے (فارسی)۔ایم۔اے (علوم اسلامیہ)
پی۔ایچ۔ڈی۔ایم۔او ایل (عربی)، ایم۔او۔ایل (فارسی)
مولوی فاضل، منشی فاضل، ادیب فاضل، پنجابی فاضل
اُستاذ دانشکدۂ دولتی لاہور

ناشِر
ملک نذیر احمد پروپرائٹر تاج بکڈپو اُردو بازار لاہور

مکمل ہر دو حصّہ نیوز پرنٹ . . . . دس ۱۰/- روپے

مکمل ہر دو حصّہ سفید کاغذ . . . . بارہ ۱۲/- روپے

مطالعۂ ادبیاتِ ایران

(رودکی سے غالب تک)

مؤلفہ

اشرف لطیفی ایم اے (اردو، فارسی)

ناشِر

ملک نذیر احمد پروپرائٹر تاج بکڈپو اردو بازار لاہور

طبع اوّل .... سنہ ۱۹۶۶ء
تعداد .... ایک ہزار
مطبع .... ویسٹرن پریس لاہور
ناشر ملک نذیر احمد

قیمت

حصّہ نثر	(۱) نیوز پرنٹ	پانچ روپے
	(۲) سفید کاغذ	چھ روپے
حصّہ نظم	(۱) نیوز پرنٹ	پانچ روپے
	(۲) سفید کاغذ	چھ روپے
حصّہ نثر و نظم (مکمل)	(۱) نیوز پرنٹ	دس روپے
	(۲) سفید کاغذ	بارہ روپے

فهرست

فہرست مضامین

پیش لفظ

زیر نظر کتاب فارسی کے بلند پایہ نقادوں مثلاً رضا زادہ شفق، ذبیح اللہ صفا، شبلی نعمانی اور مقبول بیگ بدخشانی کی قیمتی آرا کا مجموعہ ہے ان میں اول الذکر دونوں اصحاب سرزمین ایران کے صاحبان علم وادب کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں جن کی تنقیدی نگارشات کی اہمیت محتاج بیان نہیں ثانی الذکر دونوں حضرات برصغیر پاک وہند کے نامور نقاد ہیں اور فارسی زبان و ادب پر پوری مہارت رکھتے ہیں ان سب کی تنقیدی آرا الگ الگ کتابی صورتوں میں تو چھپ چکی ہیں مگر ان کا دستیاب ہونا بجائے خود ایک مسئلہ ہے مزید برآں ان نایاب اور گراں قیمت کتابوں کے خریدنے کی ہر کوئی استطاعت نہیں رکھتا لائبریریوں میں اگر ان کی ایک آدھ جلد موجود ہو تو لائبریری سے استفادہ بھی ہر ایک کے بس کا روگ نہیں اس کتاب کو انہی مجبوریوں کے پیش نظر ترتیب دیا گیا ہے اس میں رودکی سے غالب تک فارسی زبان وادب کے نمائندہ شعرا پہ مذکورہ اصحاب کے تبصرے ملیں گے جس سے مذکورہ کتابوں کے حصول کی چنداں ضرورت نہیں رہے گی کیونکہ ہر نقاد کے اہم بیانات کو شامل کتاب کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے

اس ضمن میں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آقائے ذبیح اللہ صفا نے ابھی "تاریخ ادبیات در ایران" کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچایا ہے

اس کی تین جلدیں شائع ہوئی ہیں مگر شعرا پر تنقیدی اظہار خیال صرف جلد اول اور دوم میں ہی ملتا ہے تیسرا حصہ اس قسم کی آرا سے معرا ہے اس لئے اس کتاب میں شیخ فریدالدین عطار کے بعد ذبیح اللہ صفا صاحب کا تبصرہ نہیں ملے گا۔

کتاب کی افادیت کا فیصلہ قارئین پر چھوڑتا ہوں مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب فارسی کے جملہ امتحانوں کے لئے یکساں مفید ہے بالخصوص ایم اے فارسی کے زبان وادب کے پرچے کی تیاری کے لئے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

کتاب کی ترتیب کے دوران جن اصحاب کا تعاون شامل حال رہا ان کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں ان میں جناب اکرم جلیلی صاحب ایم اے خاص طور پر شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے ہر مشکل مقام پر میری رہنمائی کی اور ہر لحظہ میری حوصلہ افزائی کرتے رہے اگر کتاب کو انہی کی کوششوں کا نتیجہ قرار دوں تو بے جا نہ ہوگا۔

جناب صادق بھٹی لائبریرین اورنٹیل سیکشن پنجاب پبلک لائبریری کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے کتابوں کی فراہمی میں ہمیشہ وسیع القلبی کا ثبوت دیا۔

میں ان تمام مصنفین کا تہہ دل سے ممنون ہوں جن کی قیمتی آرا اس کتاب کی زینت ہیں اور ساتھ ہی ان کے تبصروں کو الگ ترتیب دینے کی جسارت پر معذرت خواہ ہوں ۔

اشرف لطیف ایم اے

ایرانی ادبیات کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت

اگر ایرانی ادبیات کی تاریخ ہخامنشی دور سے شمار کی جائے تو کوئی ڈھائی ہزار سال سے یہ وطن نظم و نثر میں ادبی آثار کا حامل نظر آتا ہے۔ ذیل میں ہم اس دور کی اہمیت اور قدر و قیمت کا خلاصہ اس طرح پیش کر سکتے ہیں۔

۱۔ کیا عبارت کے لحاظ سے اور کیا معانی کے لحاظ سے ہر تمدن میں آریائی ادبیات کا پایہ بہت بلند ہے ایران کے عالم اور ایران کے شاعر حکمت، فلسفہ اور اجتماعی داخلاقی مسائل کو قدیم ترین زمانے سے بہترین فارسی سبک میں پیش کرتے آئے ہیں حد یہ کہ بڑے بڑے قصیدے جو امیروں کی خوشامد اور وزیروں سے انعام حاصل کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ ان میں بھی لطیف معانی اور دلکش مضامین درج کئے ہیں کہ اس صنعت شعر کو ایرانی قوم کی استعداد فکر اور وسعت خیال کے ایک نمونے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

۲ — اس میں شک نہیں کہ بہت سے فارسی قصیدوں میں طول کلام، عبارت پردازی، قافیہ پیمائی اور اخلاقی برائیاں موجود ہیں لیکن اس کے باوجود قصیدے میں بہت سی بنیادی خوبیاں بھی پائی جاتی ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں۔

(۱) قصیدہ گو شاعروں نے اونچے درجے حاصل کرنے، سلاطین سے انعام پانے اور لوگوں سے داد حاصل کرنے کے لئے بڑی محنت سے کام لیا ہے اور فارسی میں بہترین ترکیبیں ایجاد اور موزوں ترین الفاظ استعمال کئے اور انہیں زندہ کیا ہے۔ اسی طرح انہوں نے اپنی زبان کی بقا کے لئے بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔

۲۔ تملق گوئی کو مذموم جانتے ہوئے بھی انھوں نے نہایت اچھوتے مضامین نازک تشبیہیں ماہرانہ اور اُستادانہ تخیلات مدحیہ قصیدوں میں پیش کئے ہیں یہ چیزیں ایرانی قوم کی تیز فکر، بلند تخیل اور لطیف قریحہ گوئی پر دلالت کرتی ہیں اور ہر قوم ایسے لطیف معانی پیش نہیں کر سکتی۔

۳۔ فارسی قصیدوں میں نہایت بلند پایہ مضامین درج کئے گئے ہیں۔

۴۔ قصیدوں میں ضمنی طور پہ بہت سے تاریخی مطالب، عادات اور حکائیں آئی ہیں ان سے پچھلے زمانے کی تاریخ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

۵۔ ایرانی امثال اور حکیمانہ اقوال ان میں جمع ہوکر محفوظ ہو گئے ہیں

۶۔ قصیدوں کی ابتدا میں وہ بے نظیر تغزل درج ہے جو ایرانی استادوں کے لطیف احساسات اور قدرتِ بیان کلام کا بین ثبوت ہے۔

۷۔ بادشاہوں کی مدح وستائش کے ضمن میں جو پند ونصیحت کی گئی ہے وہ بڑے دلکش اور شیریں انداز میں کی گئی ہے۔اس پُراثر کلام نے سخت اور ظالم مغول جیسے بادشاہوں کے اخلاق کی سختی کو یکسر بدل دیا اس لحاظ سے یہ قصیدے بہت زیادہ قابلِ قدر اور قابل تعریف ہیں۔

۸۔ ایسے قصیدے جو بالکل دینی اور اخلاقی ہیں وہ چاپلوسی اور خوشامد سے یکسر خالی ہیں۔ان میں علمی، حکیمانہ مطالب یا شاعر نے خود اپنے حالات یا اپنے افکار درج کئے ہیں ایسے قصیدوں کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا

۲ —— ایرانی ادبیات نے قصیدہ، قطعہ، نثر، اشعار، امثال، حکیمانہ اور اخلاقی داستانوں کے ذریعہ عوام کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے یہ چیزیں قدیم زمانے ہی سے نہایت دلنواز اور فصیح فارسی میں لکھی جاتی رہی ہیں ان چیزوں نے لوگوں کے اخلاق کو سدھارنے میں زبردست حصہ لیا ہے اگر بعض شاعروں

نے کبھی بُرزراہ تفنن اخلاق اور آداب کے خلاف اشعار بھی لکھے ہیں تو ان کا یہ کلام بہترین اشعار کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔

۳۔ ایرانی ادبیات کی تاریخی قدروقیمت بھی ہے۔ کیونکہ یہ ایران کے بے شمار عاقل ترین افراد کے اخلاق، افکار، آداب، احساسات، نصائح اور پند کا مجموعہ ہے جو صدیوں سے محفوظ چلا آرہا ہے اور ہم جو ان کے اخلاف ہیں۔ اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔

۴۔ فارسی میں مدحیہ اور تعریفی قصیدوں کی زیادتی کی وجہ سے دوسرے اقسام نظم و نثر سے کہیں صرف نظر نہ کر لینا چاہیئے ایسے بہت سے شاعر ہیں جو ایک مستقل مسلک اور ایک مقصد اپنے پیش نظر رکھتے تھے اور اپنے عالی مقاصد کے لئے شاعری کرتے تھے۔ جیسے مذہبی عقائد میں ناصر خسرو، صوفیانہ اور عرفانی مطالب میں شیخ عطار، شیخ شبستری۔ مولانا جلال الدین رومی حافظ وغیرہ آپ بیتی اور روحانی تاثرات کے بیان میں مسعود سعد سلمان۔ خاقانی۔ فلسفیانہ نقطہ نظر سے زندگی کی شرح میں عمر خیام اور پند گوئی میں سعدی وغیرہ ایسے بہت سے بزرگوں نے ایسی گراں بہا یادگاریں چھوڑی ہیں کہ قیامت تک ان پر زوال آنا ممکن نہیں۔

۵۔ مخصوص ادبی آثار کے سوا بھی قدیم زمانے سے ہمارے زمانے تک دری زبان میں بہت سی علمی، فنی اور دینی کتابیں لکھی گئی ہیں اور ان میں سے ہر کتاب اپنے زمانے کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے

۶۔ ایرانی ادبیات ہماری قومی زبان فارسی کی سب سے بڑی سند اور اس کی بہترین ضامن ہیں یہ ہمارے ملک اور ہر زمانے کے بڑے بڑے شاعروں کی طرز کی میزان ہے آج بھی یہ گراں بہا آثار اور تصانیف ایک طرف ہماری زبان

کے محافظ اور دوسری طرف ہمارے نئے مصنفوں کے لئے نمونہ ہیں۔ ہمارے
بڑے بڑے شاعروں اور مصنفوں کی وجہ سے نہ صرف ہماری زبان تباہی و بربادی
سے بچ گئی بلکہ بہت سے فارسی الفاظ بھی اس وسیلہ سے محفوظ رہ گئے ہیں اگر
شاہنامہ یا شاعروں کے قصیدے یا غزلیں اور دوسری بہت سی نثری تصنیفیں
اگر عالم وجود میں نہ آئی ہوتیں تو بہت سے فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبیں ناپید
ہو جاتیں اور ایک عامیانہ زبان کے سوا اور کچھ باقی نہ رہتا۔

۷۔ بداعت اور اچھوتے پن کے لحاظ سے بھی ادبیات ایران کی اہمیت بہت
زیادہ ہے۔ یعنی ایران کے بزرگوں نے لطیف علمی اور اجتماعی معانی کو نہایت
دلکش، زیبا اور خوش آیند عبارت میں ادا کیا ہے۔ جس طرح استخر فارس کی عمارتوں
اور اصفہان کی مسجد شاہ میں ایرانی بداعت، ذوق صنعت کاری اور حسن پرستی
کی روح کا اظہار تناسب اور عظمت کی شکل میں اور اصفہان مشہد اور اردبیل
کی کاشی کاری میں رنگ آمیزی اور گلکاری اور ہم آہنگی کی صورت میں ہوا ہے
اسی طرح دلکش فارسی اشعار میں یہی روح دلربا طرز سخن پیوند نظم اور رعایت
وزن و تناسب کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی ہے۔ یہی چیز بے شائبہ تعلی ایرانی شاعروں
اور ادیبوں کی سحر بیانی کی سب سے بڑی دلیل اور شاہد عادل ہے

(تاریخ ادبیات ایران رضا زادہ شفق)

سامانی دور ۲۶۱ - ۳۸۹ھ اور فارسی ادبیات کا عروج

سامانی خاندان ایرانی علم وادب کو زندہ کرنے والا خاندان تھا اس خاندان کے جد کا نام سامان تھا اور یہ اشراف بلخ سے تھا نوح، احمد، یحییٰ اور الیاس اس کے چار بیٹے تھے اور چاروں کے چاروں خلیفہ مامون کی خدمت میں منسلک تھے خلیفہ کی ان پر نظر عنایت تھی اور یہ روز بروز ترقی کرتے گئے ان چاروں کو مختلف علاقوں کی حکومت ملی۔ نوح کو سمرقند احمد کو فرغانہ یحییٰ کو چاچ اور الیاس کو ہرات کی حکومت عطا ہوئی ان بھائیوں میں احمد سب سے زیادہ ہوشیار اور لائق تھا نوح کے مرنے کے بعد اس نے سمرقند اور کاشغر کو اپنے علاقہ میں شامل کر لیا اس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹوں میں نصر اور خاص کر اسماعیل نے سامانی سلطنت کو کافی ترقی دی۔

سامانی دور حکومت کو فارسی زبان اور فارسی ادبیات کی ترقی کا دور شمار کرنا چاہیئے کیونکہ اس دور میں ایران میں شاعروں کی کثرت ہوئی صاحب تذکرہ لباب الالباب نے ایسے ۲۷ شاعروں کے نام لئے ہیں جو اس دور میں گذرے ہیں سامانیوں کا پائے تخت بخارا بڑے بڑے فقیہوں، ادیبوں اور مصنفوں کا مرکز تھا اسی طرح سامانیوں کے دور میں سمرقند کو بھی علم وادب کے لئے خاص شہرت حاصل ہوئی کہنا چاہیئے کہ بعد اسلام فارسی نظم ونثر کی بنیاد اسی دور میں رکھی گئی اس دور کی شاعری کا بہترین نمونہ رودکی کے اشعار اور اس دور کی نثر کا سب سے اچھا نمونہ تاریخ بلعمی ہے یہ دونوں نمونے نہایت جاندار سہل اور سادہ ہیں .....

اس دور کے شاعروں میں ایک شاعر ابوشکور بلخی کا نام لکھا ہے یہ شاعر سامانی دور کے وسط میں گزرا ہے اور نوح بن نصر کے دربار سے تعلق رکھتا تھا..

ابوشکور بلخی پہلا مثنوی گو شاعر ہے جو اشعار اس سے منسوب ہیں ان میں ایک شعر ہے جس کے مضمون کو یونانی حکیموں نے بھی بیان کیا ہے اور یونان کے نامی حکیم نے بھی اس کا ذکر کیا ہے

ے تا بدآنجا رسید دانش من • کہ بدانم ہمی کہ نادانم

اس پر معنی اور مترنم شعر میں خرد مند شاعر نے انسانی فکر کی کوتاہی اور دانش و حکمت کی بے کرانی اور خود شناسی کے لازمات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس دور کا ایک شاعر ابوالمؤید بلخی ہے اس کے اشعار لباب الالباب میں درج ہیں۔

ابوالمؤید کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے فردوسی سے پہلے شاہنامہ لکھنے کی کوشش کی ہے قابوس نامہ جیسی قدیم کتابوں میں اس کا ذکر آیا ہے اور لکھا ہے کہ مؤید کا شاہنامہ نثر میں تھا اس کے سوا ابوالمؤید نے یوسف زلیخا کے قصہ کو فارسی میں نظم کیا تھا۔

سامانی دور کا ایک اور شاعر ابوالحسن شہید بلخی ہے یہ اپنے ہم عصر شاعروں میں سب سے زیادہ مشہور ہے اور اکثر تذکروں میں اس کا نام آتا ہے یہ شخص اپنے زمانے کے عالموں میں شمار ہوتا تھا اور اس نے شاعری کی تمام اصناف میں شعر کہے ہیں فارسی اور عربی دونوں زبانوں پر اسے یکساں قدرت حاصل تھی اس کی عربی منظومات میں سے ایک نظم کا نام لباب الالباب میں نقل ہوا ہے شاعری کے سوا شہید کو فلسفہ میں بھی مہارت حاصل تھی کہتے ہیں کہ اس نے محمد زکریا رازی سے مباحثے کئے تھے اس شاعر کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دانشمندوں کی تعداد و ثروت کے کم ہونے اور بے عقلوں کے نصیب میں ناز و نعمت لکھے جانے پر رنجیدہ ہوتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ شاعر بلند ہمت تھا۔ علم و دانش

کی اس بے قدری پر تاسف کے باوجود علم و دانش کو مال و دولت پر ترجیح دیتا ہے۔ شہید کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی حساس طبیعت رکھتا تھا سے دنیا کی برائیوں سے اور دانش و بینش کی فراوانی سے بڑا دکھ ہوتا تھا اس لئے اس نے دنیا کو غم کا شانہ دیکھا ہے کہتا ہے:-

اگر غم را چو آتش دود بودی — جہاں تاریک بودی جاودانہ

دریں گیتی سراسر گر بگردی — خردمندی نیابی شادمانہ

بعض بڑے بڑے شاعروں نے شہید کی بڑائی اور اس کے فضل کو تسلیم کیا ہے رودکی نے اس کی وفات پر جو کہتے ہیں ۳۲۵ھ میں واقع ہوئی۔ حسب ذیل پراثر قطعہ لکھا ہے۔

کاروان شہید رفت از پیش — واں ما رفتہ گیر و می اندیش

از شمار دو چشم یک تن کم — وز شمار خرد ہزاراں بیش

سامانی عہد کے دوسرے مشہور شاعروں میں ایک عمارہ مروزی ہے اس شاعر کا زمانہ سامانی دور کا آخری زمانہ ہے کیونکہ اس نے آخری سامانی شاہزادے ابو ابراہیم منتصر کا مرثیہ لکھا ہے اور اس نے سلطان محمود کی مدح کی ہے۔

اس خوش کلام شاعر کے جو تھوڑے بہت اشعار اب باقی رہ گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حسن کا متوالا تھا اور زمین کے رنگ برنگے نقوش سیمیں برف شاخ بید اور برگ لالہ سے بڑا لطف اندوز ہوتا تھا۔

ابوالحسن مجدالدین اسحاق کسائی مروزی چوتھی صدی کے آخر کا مشہور شاعر ہے اور اپنے زمانے کے دانشمندوں اور شاعروں میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ کسائی مروزی ۳۴۱ھ میں پیدا ہوا اور تذکروں اور خود اس کے اشعار کی رو سے اس نے بڑی لمبی عمر پائی جس کا شمار سو سال تک ہوتا ہے یہ شاعر

شیعہ تھا اور اس نے حضرت علی کی مدح میں اشعار لکھے ہیں۔

کسائیؒ پہلا فارسی شاعر ہے جس نے دینی قصائد اور حکیمانہ اشعار لکھے اور اخلاقی پند و نصائح کو نظم کا جامہ پہنایا اس لحاظ سے اس کی شاعری نے ناصر خسرو کے لئے نمونہ اور سانچے کا کام دیا چنانچہ ناصر خسرو نے اس سبک میں یعنی مذہبی شاعری علم و دانش کی ترغیب اور حصول تقویٰ میں طویل طویل قصیدے لکھے ہیں۔ ناصر خسرو نے ان قصائد میں کسائیؒ کا نام بھی لیا ہے۔

کسائیؒ نے اخلاقی اور معنوی مطالب کی طرف توجہ کرنے کے باوجود عالم حسن کو بالکل فراموش نہیں کیا فطری مناظر نے ہمیشہ اس کے دل پر اثر کیا۔

رودکی سمرقندی

ابوعبداللہ جعفر بن محمد رودکی سمرقند کے قریب قصبہ رودک میں پیدا ہوا۔
رودکی کو ایران کا سب سے پہلا بڑا شاعر مانا جاتا ہے کیونکہ اس شاعر کے نہ صرف اپنے اشعار جو اس کی فضیلت اور اس کی بلند خیالی کو ثابت کرتے ہیں گذشتہ اور اس کے معصر شاعروں سے زیادہ باقی ہیں بلکہ تمام تذکرہ نویسوں نے اس کا اسی طرح ذکر کیا ہے ان کے سوا بہت سے شاعروں نے اور خاص کر اس کے ہمعصر شعراء جیسے شہید بلخی اور معروف بلخی وغیرہ نے اس کی بڑی تعریف کی ہے اور ان لوگوں نے جو اپنے آپ کو بہت بڑا شاعر گردانتے تھے رودکی کے ساتھ رقابت کا اظہار کیا ہے چنانچہ منوچہری گرگانی جو اپنے آپ کو بہت بڑا اور کامل شاعر سمجھتا تھا اور اس کے اشعار سے بھی اس کی قوت سخن آزادگی اور بے نیازی آشکارا ہے رودکی کے ساتھ اپنا مقابلہ کرتا ہے اور کہتا ہے :-

اگر بدولت با رودکی نہ ہمسانم عجیب مکن سخن از رودکی نہ کم دانم

عنصری جو قصیدہ کا استاد تھا غزل میں رودکی کی ہنرمندی اور استادی کی تصدیق کرتا ہے اور اس طرح اس کی تعریف کرتا ہے :-

غزل رودکی وار نیکو بود غزلہائے من رودکی وار نیست
اگرچہ بکوشم ببار یک وہم بدیں پردہ اندر مرا بار نیست

کسائی مروزی اس کے بارے میں لکھتا ہے :-

؎ رودکی استاد شاعران جہاں بود صد یک از او توئی کسائی پرگست

مسعود سعد فخریہ کہتا ہے :-

؎ سجود آرد بہ پیش خاطر من روان رودکی دا بن ہانی

خاقانی اپنے شعر کی تعریف میں کہتا ہے :-

ے رودکی آنکہ در ہمی سفتی — مدح سامانیاں ہمی گفتی

عالموں اور فاضلوں نے بھی رودکی کی تعریف کی ہے اسماعیل بن احمد سامانی کے مشہور وزیر ابوالفضل بلعمی کا قول ہے کہ عرب اور عجم میں رودکی کا جواب نہیں بلعمی نے رودکی کی نہ صرف تعریف کی ہے بلکہ اس کی قدردانی کی ہے اور اسے صلہ اور انعام دیا ہے چنانچہ چھٹی صدی کے شاعر سوزنی نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

ے صد یک از آنچہ تو بکمین شاعری وہی — از بلعمی بعمری نگرفت رودکی!

رودکی کا سبک اور شاعری

رودکی کو قصیدہ رباعی مثنوی قطعہ غزل غرض تمام فنون سخن اور انواع شعر میں مہارت حاصل تھی اور ہر طرز میں کامیاب رہا ہے خاص کر قصیدہ سرائی میں وہ سب کا پیش رو ہے اس لحاظ سے کہنا چاہیئے کہ رودکی بعد اسلام ایران کا پہلا بڑا شاعر ہے جس نے نہایت بلند پایہ اور محکم قصیدے لکھے ہیں ۔

رودکی نہ صرف سخن پردازی اور الفاظ کے تناسب کا استاد تھا بلکہ اس نے نہایت دقیق معانی سے بھی کام لیا ہے اور عبرت آموز قطعات اور حکیمانہ اشعار اپنی یادگار چھوڑے ہیں مثلاً اس کے پند آمیز قطعات میں سے ایک قطعہ ہے :ے

زمانہ پندی آزادوار داد مرا — زمانہ را چو نکو بنگری ہمہ پند است
بروز نیک کساں گفت غم مخور زنہار — بسا کہ بروز تو آرزومند است

اس موضوع پر اس نے بہت سے شعر کہے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر دنیا کے غم و اندوہ کے مقابلہ میں قوی دل اور توانا فکر تھا اور ہر موقع پر بردباری کی دعوت دیتا تھا کیونکہ اس کے نزدیک مرد وہی ہے جو پہاڑ کی طرح اپنی جگہ سے نہ ہلے حوادث کی بڑی سے بڑی موجیں اس کو ڈرا نہ سکیں اس مضمون کو رودکی نے ایک قصیدہ میں خوب

بیان کیاہے یہ قصیدہ مشاہیر میں سے کسی کی وفات پر لکھا گیا ہے اور اس کے آخر میں آسیب روزگار اور تشویش افکار کا ذکر کرکے دلداری کی کوشش کی ہے اس قصیدہ کے چند شعر ہیں :-

ای آنکہ غم گنی و سزاداری — وندر نہاں سرشک ہمی باری
رفت آنکہ رفت و آمد آنکہ آمد — بود آنکہ بود خیرہ چہ غم داری
ہموار کرد خواہی گیتی را — گیتی است کی پزیرد ہمواری

اس شاعر نے بڑی طویل عمر پائی اور اس نے جو فرحت بخش اشعار لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ خود بھی اپنے اقوال پر کاربند تھا اس نے تندرست اور شادماں زندگی لبسر کی تھی اور اگر اس کے اندھے ہونے کی روایت صحیح ہے۔ تو اس کی بردباری اور سبک روحی کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح اس کی اندرونی روشنی نے بیرونی تاریکی پر غلبہ حاصل کر لیا تھا ایسی توانائی اور ایسی سعادت حاصل کرنے کے لئے شاعر نے چار وسائل دریافت کئے ہیں سچ تو یہ ہے کہ ان چار وسائل کو زندگی کے چار رُکن کہنا چاہیئے یہ چار رکن کیا ہیں، خرد، تندرستی، نیک خوئی اور نیک نامی چنانچہ کہتا ہے۔

چہار چیز مر آزادہ را ز غم بخرد — تن درست و خوی نیک و نام نیک خرد
ہر آنکہ ایزدش این ہر چہار روزی کرد — سزد کہ شاید زیاد جاوداں و غم نخورد

باوجود اس کے کہ رودکی ہمیں زندہ دلی، شادمانی اور اس دنیا کی نعمتوں سے استفادے کی دعوت دیتا ہے دوسری طرف وہ یہ بھی کہتا ہے کہ شان و شوکت اور اس کے جلوہ کے فریب میں نہ آنا چاہیئے اور نعمت و جاہ پر مغرور نہ ہونا چاہیئے۔

مہتراں جہاں ہمہ مردند — مرگرا سر خود ہمی کردند
زیر خاک اندروں شدند آناں — کہ ہمہ کوشکہا بر آوردند

از ہزاراں ہزار نعمت جاہ — نہ بآخر بجستر کفن بردند

رودکی قصیدہ کا استاد تھا اور ایک خاص سبک میں جسے اب خراسانی سبک یا ترکستانی سبک کہا جاتا ہے شعر کہتا تھا اس سبک کی ایک خصوصیت سادگی اور ہر حال میں متانت و سنجیدگی ہے رودکی کے جو قصائد باقی رہ گئے ہیں ان میں سے ایک قصیدہ وہ ہے جو حسب ذیل مطلع سے شروع ہوتا ہے ؎

مادر می را بکرد باید قربان — بچۂ او را گرفت و کرد بزندان

رودکی نے یہ قصیدہ امیر ابوجعفر احمد صفاری کی مدح میں لکھا ہے۔ یہ قصیدہ خراسانی سبک کی طرح سادہ اور محکم ہے اور ایسی پر تکلف مدح سرائی جو رودکی کے بعد کی صدی میں رائج ہوگئی تھی اس قصیدہ میں ناپید ہے۔

رودکی کے قصیدوں میں ایک اور قصیدہ ہے جو اس نے اپنے بڑھاپے کے زمانے میں اپنی حالت پر لکھا ہے اس قصیدے میں اس نے جوانی کے دنوں کے مزوں اور بڑھاپے کے دنوں کے ضعف کا نقشہ کھینچا ہے۔ اسی قصیدہ کے سلسلہ میں اس نے اپنی شاعری کی شہرت اور اس کے اثر و نفوذ کا بھی ذکر کیا ہے اس قصیدے کے چند شعر ہیں :-

مرا بسود و فرو ریخت ہر چہ دنداں بود — نبود دنداں لا بل چراغ تاباں بود
سپید سیم رده بود و در و مرجاں بود — ستارۂ سحری بود و قطرۂ باراں بود
دلم خزانۂ پر گنج بود گنج سخن! — نشان نامہ ما مہر و شعر عنواں بود

رودکی کے اور کمالات میں سے ایک جس کا تمام تذکرہ نویسوں نے ذکر کیا ہے موسیقی اس کی مہارت اور نغمہ سرائی کا کمال ہے چنانچہ خود کہتا ہے

رودکی چنگ بر گرفت و نواخت — بادہ انداز کو سرود انداخت

سامانی بادشاہوں کی خدمت میں رودکی اپنے شعر گا کر سناتا تھا اور اس کے ساتھ چنگ بجاتا تھا اس کی خوش نوائی کا اندازہ کرنے کے لئے یہ واقعہ کافی ہے

کہ نصر بن احمد سامانی اپنے ایک سفر میں بخارا کو بالکل بھلا بیٹھا تھا درباریوں کو
اپنے وطن اور اپنے گھروں کی یاد ستا رہی تھی لیکن اتنی جرأت ان میں نہ تھی کہ خود
نصر بن احمد سامانی سے وطن واپس چلنے کے لئے کہتے ان درباریوں نے رودکی
کا وسیلہ ڈھونڈا اور اس سے درخواست کی کہ وہ کسی طرح امیر کو بخارا واپس چلنے
پر آمادہ کرے رودکی نے کچھ شعر کہے صبح امیر کی خدمت میں حاضر ہُوا اور چنگ
اٹھا کر وہ مشہور قصیدہ گانا شروع کر دیا جس کا مطلع یہاں نقل کیا جاتا ہے :-

بوئے جوئے مولیاں آید ہمی یاد یار مہرباں آید ہمی

رودکی نے یہ قصیدہ کچھ اس طرح گایا کہ امیر کے دل میں اتر گیا اور اسے کچھ
ایسا مست و بے خود کیا کہ وہ موزے تک پہنے بغیر بخارا کی طرف چل پڑا۔

رودکی کی ایک اہم تصنیف منظوم کلیلہ و دمنہ تھی اس کی اصل کو ایک
ایرانی عالم ابن مقفع نے پہلوی سے عربی میں منتقل کیا تھا رودکی کی یہ منظوم تصنیف
اب ناپید ہو گئی ہے ۔

کیا الفاظ کے لحاظ سے اور کیا معنی کے لحاظ سے رودکی کے کلام میں بڑی
تازگی پائی جاتی ہے اس کے اکثر شعر عربی زبان کے اثر سے آزاد نظر آتے ہیں رودکی
کے اشعار کی تعداد میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے صاحب لباب الالباب کہتا
ہے کہ اس کے اشعار کے سو دفتر ہیں اور اسی سلسلہ میں رشیدی سمرقندی کا شعر پیش
کیا ہے۔

ے شعر اورا بر شمردم سیزدہ صد ہزار ہم فزوں آید اگر چونانکہ باید بشمری

رودکی نے ۳۲۹ھ ہجری میں وفات پائی یعنی وہ اپنے ممدوح اور سرپرست
نصر بن احمد سامان سے دو سال پہلے فوت ہو گیا

؎ (تاریخ ادبیات ایران رضا زادہ شفق)

سامانیوں کے دور میں سینکڑوں شعرا تھے لیکن آج تک سامانیوں کا نام جس کی بدولت زندہ ہے وہ رودکی ہے شریف گرگانی نے سچ کہا ہے۔

از اں چندیں نعیم جاودانی | کہ ماند در آل ساساں وآل سامان
ثنائے رودکی ماندست و مدحش | نوائے باربد ماندست و دستاں

یورپ اور ایشیا کا یہ عجیب اتفاقی توافق ہے کہ رودکی بھی ہومر کی طرح مادر زاد اندھا تھا آٹھ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا پھر علم قرأت کی تکمیل کی اسی سن میں شعر کہنا شروع کردیا شاعری کے شغلہ کے ساتھ تمام متداول علوم و فنون حاصل کئے خوش قسمتی سے نہایت خوش آواز اور طبیعت بذلہ سنج واقع ہوئی تھی۔ سلاطین و امراء کے دربار میں ایک بڑی خدمت ندیمی کی تھی تقرب و اثر کے لحاظ سے ندیم کا رتبہ وزرا سے بھی بالاتر ہوتا تھا اس عہدہ کے لئے بذلہ سنجی، لطیفہ طبعی، حاضر جوابی، ظرافت وسعت معلومات ضروری شرطیں تھیں رودکی یہ سب شرطیں جمع تھیں۔

رودکی کی شاعری کا عام انداز واقعہ گوئی، پند و موعظت اور حسن تاثیر ہے۔ عرب جاہلیت کی شاعری کا اصلی جوہر یہی تھا کہ اس سے بڑے بڑے قومی اور ملکی انقلابات پیدا کر دیتے تھے فارسی شاعری تفریح طبع کے سوا اور کسی کام کی نہ تھی یعنی اس سے کبھی کوئی تاریخی واقعہ وجود میں نہیں آیا لیکن رودکی اس عام اعتراض سے مستثنیٰ ہے

اقسام سخن میں رودکی کے ہاں قصیدہ، رباعی، قطعہ، غزل، مرثیہ سب کچھ موجود ہے مضامین کے لحاظ سے بھی اس کی شاعری کا دائرہ نہایت وسیع ہے یعنی واقعہ نگاری، خیال بندی، موعظت و نصیحت، عشق و محبت، مدح و ثنا، صنائع و بدائع سب چیزیں پائی جاتی ہیں اور درجہ کمال پہ پائی جاتی ہیں۔ قصیدہ کا

جو طریقہ رودکی نے قائم کیا آج تک قائم ہے یعنی ابتدا میں تشبیب یا بہاریہ وغیرہ پھر بادشاہ کی مدح کی طرف گریز، جود و سخا عدل وانصاف، شجاعت و دلیری کا ذکر، پھر دعائیہ ، صنائع شاعری میں ایک صنعت ہے جس کو ترصیع کہتے ہیں یعنی دونوں مصرعوں میں ہم وزن الفاظ لاتے ہیں یہ صنعت رودکی کے تمام قصیدوں میں پائی جاتی ہے اور چھٹی صدی تک تمام شعرا کا یہ عام انداز رہا۔ قصیدہ میں اگرچہ مداحی ہی مداحی ہوتی ہے لیکن رودکی نے جابجا نیچرل سین بھی دکھلائے ہیں۔ بعض بعض قصیدوں میں ایسی باتوں کا التزام کیا ہے جس کی تقلید کسی نے نہیں کی مثلاً ایک قصیدہ ، تیئس شعروں کا کہا ہے جس میں صرف مطلع ہی ہیں پہلا مطلع یہ ہے ؎

ندانی درد ہجر اے بت مرو زاں زار گردانی   وگر زارم نگردانی بہ داغ ہجر گردانی

ہجو فارسی شاعری کے چہرہ کا نہایت بدنما داغ ہے لیکن رودکی کی ہجو میں بھی متانت اور واقعیت پائی جاتی ہے ؎

زہے سوار وجوان، توانگر از رہ دور   بخدمت آید نیکو سگال نیک اندیش!
لیت رآید مر خواجہ را پس از دہ سال   کہ باز گردد پیر و پیادہ و دل ریش

عام قاعدہ یہ ہے کہ ابتدائے شاعری میں مضمون بندی بالکل نہیں ہوتی لیکن یہ حیرت انگیز بات ہے کہ رودکی نے کثرت سے نئے نئے مضامین پیدا کئے ہیں ؎

تیر او مانندۂ روزی کہ رسے مردم رسد   تیر دشمن باز گردد سوئے دشمن چوں صدا

(ماخوذ از شعر العجم شبلی نعمانی)

رودکی مسلمہ طور پر ایران کے شاعران عظیم میں سے ایک ہے اس کی تعریف میں سمعانی لکھتا ہے کہ " وکان ابوالفضل البلعمی وزیر اسماعیل بن احمد

والی خراساں سیقولے لیس للرودکی فی العرب والعظم نظیرہ" ایران کے بڑے بڑے شاعروں نے رودکی کے کلام پر خصوصی توجہ دی اکثر نے اس کے اشعار پر تضمینیں لکھیں اور شاعری میں اس کے مرتبے اور عظمت کا ذکر کرتے وقت کلی طور پر سمعانی کے ہم خیال ہوئے

ابوالحسن شہید بلخی جو کہ رودکی کا معاصر تھا اس کے بارے میں یوں رقمطراز ہے

سے بسخن ماند شعر شعرا　　　رودکی را نکو بتی است
شاعر آنرا واحسنت مدیح　　　رودکی را خرد احسنت محی است

کسائی مروزی بھی اس کو شاعروں کا استاد قرار دیتے ہیں مگر دقیقی اس دکسائی مروزی کے قول اور شہید بلخی کے مندرجہ بالا دو شعروں کے علاوہ مندرجہ ذیل اشعار میں اس کی عظمت کا اقرار کرتے ہوئے اور اپنے پر اس کو ترجیح دیتے ہوئے کہتے ہیں

سے کرا رودکی گفتہ باشد مدیح　　　امام فنون سخن بود ور
دقیقی مدیح آورد پیش رد　　　چو خرما بود بردہ سوئے ہجر

نظامی عروضی سمرقندی صاحب چہار مقالہ اس کو "صاحبقراں شاعری" شمار کرتے ہیں :سے

اے آنکہ طعن کردی در شعر رودکی　　　ایں طعن کردن تو ز جہل و کودکی است
کانکس کہ شعر داند و داند کہ در جہاں　　　صاحبقران شاعری استاد رودکی است

اور عنصری اپنی تمام استادانہ شان و عظمت کے باوجود غزلسرائی میں اپنے آپ کو کمتر تصور کرتا ہے اور رودکی کی بزرگی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

غزل رودکی وار نیکو بود　　　غزلہائے من رودکی وار نیست
اگرچہ بپیچم بسیار یک وہم　　　بدیں پردہ اندر مرا بار نیست

استاذ علی بن جو لوغ فرخی سیستانی رودکی کے ایک شعر پر بصورت ذیل

تضمین لکھتا ہے ؎

یک بیت شعر باز کنم ز آنکہ رودکی　　گرچہ ترا نگفت سزاوار آں توہی
جز برتری نجوئی گوئی کہ آتشی　　جز راستی نخواہی مانا ترازوی

اور سوزنی اس کے قصیدہ میں سے جو اس نے ابوالفضل بلعمی کی تعریف میں لکھا گیا تھا ایک شعر کو اپنے قصیدوں میں ایک میں اس طرح لاتا ہے ؎

در مدح تو بصورت تضمین ادا کنم　　ایک بیت رودکی را در حق بلعمی
صدر جہاں جہاں ہمہ تاریک شب شبہ است　　از بہر ما سپیدۂ صادق ہمی دمی

اس کے علاوہ بلخی کی مشہور تضمین رودکی کے اس قصیدہ سے جو صورت پذیر ہوئی جس میں ایک ذیل کا ایک شعر اسماعیلی مذہب سے رودکی کے تعلق پر دلالت کرتا ہے ؎

از رودکی شنیدم سلطان شاعراں　　کاندر جہاں بکس مگرد جز بفاطمی

رودکی کے اشعار، قطعات، قصائد اور غزلوں میں سے معدودے چند جو باقی رہ گئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مختلف فنون شعر پر اُستادانہ مہارت رکھتا تھا۔ اس کا کلام قوت تشبیہ میں لاثانی اور نزدیکی معانی میں بے نظیر ہے اس کے اشعار میں لطافت و متانت خصوصاً مشاہدہ کی جا سکتی ہے اس کے علاوہ اس کا کلام تاثیر کی دولت سے مالا مال ہے اس کے غالب اشعار سے مسرت وانبساط کی بو آتی ہے اور رنج والم سے بے توجہی کا سراغ ملتا ہے

رودکی کے اشعار کی کثرت پر بحث نہیں پھر بھی اس کے اشعار کا اندازہ سو ہزار شعر ہے مگر برخی نے اس کو دس لاکھ تیس ہزار کہا ہے اختلاف کی یہ گنجائش آل افراسیاب کے معاصرین میں سید الشعرا رشیدی سمرقندی کے ان دو شعروں سے پیدا ہوئی جو کہ عوفی نے رودکی کے حالات کے ضمن میں نقل کئے ہیں۔

گر سری یابد لعالم کس بے نکو شاعری | رودکی را بر سر آں شاعراں زیبد سری
شعر او را بر شمردم سیزدہ دہ صد ہزار | ہم فزوں آید وگر چونانکہ باید بشمری

لیکن ان تمام اشعار میں سے سوائے ان چند قطعات اور قصائد کے جو قدیم کتابوں میں نقل ہیں سوائے ان بعض بچے بکھرائے اشعار کے جو لغت اور تذکرہ کی کتابوں میں درج ہیں کچھ دستیاب نہیں ہوتا۔

رودکی کا بڑا شاہکار جس میں سے اب سوائے چند اشعار کے کچھ باقی نہیں رہا ہے کلیلہ ودمنہ کا منظوم ترجمہ ہے۔ عربی کی کتاب کا یہ ترجمہ امیر نصر بن احمد کے زمانے میں ابوالفضل محمد بلعمی کے حکم سے صورت پذیر ہوا

رودکی نے کلیلہ ودمنہ کے اس منظوم ترجمہ کے علاوہ دوسری مثنویاں بھی لکھیں ان میں سے ایک مثنوی بحر متقارب (فعولن فعولن فعول)، ایک بحر خفیف (فاعلاتن مفاعلن فعلن)، ایک بحر ھزج مسدس (مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل)، ایک اور بحر سریع (مفتعلن مفتعلن فاعلات)، لکھیں جن کے اکا دکا شعر بکھری حالت میں مل جاتے ہیں۔

ان مثنویوں کے علاوہ رودکی نے باقی اصناف شاعری مثلاً قصیدہ، قطعہ غزل اور رباعی مختلف موضوعات (مدح، غنائی، ہجو، وعظ، ہزل وغیرہ) پر بھی طبع آزمائی کی ہے جیساکہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہیں کہیں ان کے اکا دکا شعر دستیاب ہوتے ہیں

زمانہ پندی آزادوار داد مرا! | زمانہ را چو نکو بنگری ہمہ پنداست
بروز نیک کساں گفت تا تو غم نخوری | بسا کسا کہ بروز تو آرزومنداست

---

۵ شاد زی با سیاہ چشماں شاد | کہ جہاں نیست جز فسانہ و باد
نیک بخت آں کسی کہ داد بخورد | شوربخت آنکہ او نخورد و نداد

بادوابراست ایں جہاں فسوس — بادہ پیش آر ہرچہ بادا باد

(ترجمہ از "تاریخ ادبیات در ایران" ذبیح اللہ صفا)

سامانی دور کا مشہور ترین شاعر رودکی ہے۔ رودکی کی تاریخ ولادت کسی تذکرے میں نہیں ملتی ہاں البتہ اس کا سال وفات تذکرہ نویسوں نے ۳۲۹ ہجری لکھا ہے رودکی نے اشعار میں اپنے بڑھاپے کا ذکر کیا ہے مثلاً

من موی خویش را نہ ازاں می کنم سیاہ — تا باز نوجواں شوم و نو کنم گناہ

چوں جامہا بوقت مصیبت سیہ کنند — من موی از مصیبت پیری کنم سیاہ

ایسے اشعار کے پیش نظر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ رودکی تیسری صدی ہجری کے وسط میں پیدا ہوا اگر اس نے ستر بہتر عمر پائی ہو تو ۲۵۰ ہجری سے لے کر ۲۶۰ ہجری تک کسی ایک سال میں اس کی ولادت ہوئی ہو گی۔ محمد عوفی لکھتا ہے کہ رودکی اس قدر ذکی اور تیز فہم تھا کہ اس نے آٹھ سال کی عمر میں کلام مجید حفظ کیا اور قرأت کا فن بھی سیکھا شعر گوئی شروع کی تو اس میں کمال حاصل کیا۔ آواز بڑی دلکش پائی تھی اس لئے شاعری کے ساتھ ساتھ موسیقی کی طرف بھی رجوع کیا بربط خوب بجاتا تھا۔ اس لئے موسیقی کی وجہ سے اس کی شہرت دور دور پہنچی امیر نصر بن احمد سامانی نے اسے قرب خاص بخشا تھا۔

رودکی بصارت سے محروم تھا محمد عوفی کا بیان ہے کہ رودکی مادر زاد اندھا تھا لیکن ایک جدید ایرانی تذکرہ نویس بدیع الزماں لکھتے ہیں کہ رودکی آخر عمر میں بصارت سے محروم ہوا یہی بات معلوم ہوتی ہے کیونکہ رودکی کے اشعار میں بعض تشبیہات ایسی بھی ہیں جنہیں وہی شخص لکھ سکتا ہے جو بصارت کی دولت سے بہرہ ور ہو چکا ہو۔ مثال کے طور پہ یہ شعر:۔

ے لالہ میاں کشت بخندو ہمی زودُ چوں پنجۂ عروس بحناشدہ خضیب

ایک اندھا شخص گل لالہ کو دلہن کے حنائی ہاتھ سے کیسے تشبیہ دے سکتا ہے

رودکی اپنے قصائد کی وجہ سے مشہور ہوُا اس کے قصیدوں میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ پہلے مطلع آتا ہے اس کے ساتھ ہی تشبیب شروع ہوجاتی ہے تشبیب میں شاعر عموماً اپنے محبوب کے حسن جمال کا ذکر کرتا ہے اس لئے اسے غزل بھی کہا جاتا ہے۔ تشبیب کے بعد ممدوح کی تعریف کی طرف گریز ہوتا ہے اور اس کے عدل و انصاف جود وسخا دلیری اور شجاعت کا ذکر آتا ہے پھر ممدوح کے حق میں دعا ہوتی ہے آخر میں شاعر ممدوح کو اپنی ضرورتوں کا احساس دلاتا ہے جسے "طلب" یا حسن طلب، کہتے ہیں جس شعر میں شاعر اپنا تخلص لاتا ہے اسے مقطع کہتے ہیں۔

رودکی نے قصیدہ لکھنے کا جو انداز اختیار کیا تھا وہ آج بھی جوں کا توں ہے رودکی کا دل بہت حساس ہے اس لئے اور حالات دنیا سے اس کا دل متاثر ہے کسی کے حالات ہمیشہ سازگار نہیں رہتے اس لئے رودکی دنیا کو ہیچ سمجھتا ہے چنانچہ کہتا ہے:۔ ے

این جہان پاک خواب کردار است آں شناسد کہ دلش بیدار است

رودکی کے مطالب میں گہرائی ہوتی ہے اس کے اکثر قطعات عبرت آموز اور حکیمانہ ہیں۔ رودکی افکار دنیا کے ہوتے ہوئے قوی اور توانا دل رکھتا ہے اور دوسروں کو بھی صبر و تحمل کی تلقین کرتا ہے ابوالفضل بلعمی کے بیٹے کی وفات پر مرثیہ لکھا ہے جس میں اسے صبر و تحمل کی تلقین کرتا ہے۔

ے ای آنکہ غمگینی و سزاواری واند نہاں سرشک می باری!

رفت آنکہ رفت و آمد آنکہ آمد بود آنکہ بود خیرہ چہ غم داری

جب سے شعر وجود میں آیا ہے غالباً اسی وقت سے خمریات کا موضوع شعر کی زینت بنا ہوا ہے شروع شروع میں یونانیوں اور عربوں نے خمریات کو موضوع سخن بنایا ان کے بعد اہل ایران نے اس موضوع کو اپنایا رودکی کے کلام میں نشہ شراب صاف جھلکتا ہے ؎

بیار آں می کہ پنداری رواں استی   دیا چوں برکشیدہ تیغ پیش آفتابش

فلسفہ نشاط کی انتہا خیام کی رباعیوں میں ہمیں نظر آتی ہے لیکن اس کے ابتدائی نقوش رودکی کے کلام میں ملتے ہیں ؎

شاد زی با سیاہ چشماں   کہ جہاں نیست جز فسانہ و باد

رودکی کو تصویر کشی میں خاص ملکہ ہے انہوں نے اس قصیدے میں جس کی قافیہ و ردیف قطران بود، نقصان بود، سخنداں بود ہے جوانی اور بڑھاپے کا ذکر اس خوبی سے کیا ہے کہ دونوں تصویریں ہو بہو نظر آتی ہیں۔

غزل کا جداگانہ وجود تو سعدی اور ان کے معاصروں کے زمانے میں قائم ہوا البتہ قصیدے کی ابتدا میں چند اشعار لکھے جاتے تھے جن میں محبوب کے حسن و زیبائی اور شاعر کی اپنی کیفیات قلب کا بیان ہوتا تھا اس حسن و عشق کے بیان کو تشبیب یا غزل کہتے تھے اس قسم کی غزل سرائی میں رودکی کو اولیت کا درجہ حاصل ہے چند شعر ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں:-

؎ عشق را گر پیغمبری لیکن   حسن را آفریدگار توئی!

؎ دشوار نمائی سخ و دشوار دہی بوس   آساں بربائی دل آساں ببری جان

کسی شاعر کی خوبی کا اندازہ ان تشبیہات سے ہوتا ہے جو وہ اپنے اشعار میں لاتا ہے تشبیہ کے بغیر شعر اس حسن کی مانند ہے جو آراستہ نہ کیا گیا ہو تشبیہ شعر کے لئے ایسی ہی ضروری ہے جیسا کہ حسن کے لئے آرائش اور زیور ضروری ہے تشبیہ

میں درج ذیل خوبیاں ہونی چاہئیں۔

۱۔ تشبیہ میں ہمہ گیری ہو

۲۔ تشبیہ کا تعلق کچھ اس طرح قائم کیا جائے کہ مشبہ بہ اپنے مشبہ سے زیادہ حسین اور جامع ہو۔

۳۔ تشبیہ فطری اور روزمرہ کے موافق ہو اور ذہن فوراً اس تشبیہ کی طرف منتقل ہو سکے

رودکی کی اکثر تشبیہات ان تمام خوبیوں کی حامل ہیں۔

رودکی کا دیوان قصائد، رباعیوں، مثنویوں اور قطعات پر مشتمل ہے رباعی پہلی مرتبہ رودکی کے کلام میں ہی نظر آتی ہے اس لئے رباعی لکھنے میں رودکی کو اولیت حاصل ہے

رودکی شعر گوئی میں سبک خراسانی کا پیرو کار ہے

(ماخوذ از ادب نامہ ایران، مقبول بیگ بدخشانی)

غزنوی دور

غزنویوں کے عہد میں علم و ادب کا عام رواج ہوا اور امیروں اور وزیروں نے عالموں کی سرپرستی شروع کی ان میں بعض جیسے قابوس وشمگیر اور صاحب بن عباد خود بھی عالموں اور دانش مندوں میں شمار ہوتے ہیں ان کے دربار اور ان کے پائے تخت جیسے بخارا، سمرقند، طبرستان، رے، اصفہان وغیرہ علم و ادب کے مرکز اور عالموں اور ادیبوں کے مستقر بنے ہوئے تھے اسی عہد میں سلطان محمود کی کوششوں سے غزنویوں کا خاندان اوج کمال کو پہنچا اور شہر غزنہ علوم و ادبیات کا ایک نیا مرکز بن گیا دور دور سے شاعر کھنچ کھنچ کر یہاں چلے آنے لگے۔

دوسرے غزنوی بادشاہوں کی طرح محمود نے بھی فارسی زبان اور ادبیات کی بڑی خدمت کی ہے اس نے اپنے دربار میں شاعروں اور ادیبوں کی عزت بڑھائی یہی وجہ ہے کہ عنصری، فرخی اور فردوسی جیسے بڑے بڑے شاعروں نے اس کی مدح کی ہے کہتے ہیں اس کے دربار میں چار سو سے زیادہ شاعر جمع ہو گئے تھے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ محمود نے خود بھی فارسی میں شعر کہے ہیں اور وہ فارسی نثر پر بھی بڑا عبور رکھتا تھا۔ سلطان محمود کے جانشینوں میں سے بعض جیسے سلطان محمود، ابراہیم اور بہرام شاہ نے بھی شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کی ہے لیکن اس خصوص میں ان کا پایہ سلطان محمود کے پائے کو نہیں پہنچتا خاص طور پر اس لئے بھی کہ محمود کے بعد غزنویوں کی سلجوقیوں سے کش مکش شروع ہو گئی تھی اور اس کشمکش کی وجہ سے وہ علم و ادب کی ترویج میں کچھ زیادہ کوشش نہ کر سکے۔

<u>عنصری</u> ۱۔ ابوالقاسم حسن بن احمد عنصری ۳۵۰ھ ہجری میں پیدا ہوا بلخ اس کا

وطن تھا کہتے ہیں کہ اس کا باپ تجارت کا پیشہ کرتا تھا اس نے بھی باپ کا
بھی پیشہ اختیار کیا لیکن ایک سفر میں چوروں نے اس کا سارا سرمایہ لوٹ لیا
اس واقعہ کے بعد اس نے علم وادب سیکھنا شروع کیا اور اس میں شہرت
پائی پھر سلطان محمود کے چھوٹے بھائی اور اپنے ممدوح امیر نصر کے توسط سے سلطان
محمود کے دربار میں رسائی حاصل کی۔

سلطان محمود کے دربار میں پیش ہونے کے بعد روز بروز عنصری کو سلطان
کا زیادہ سے زیادہ تقرب حاصل ہوتا گیا یہاں تک کہ ملک الشعرائی کا لقب
پایا اور سلطان نے لطف وکرم کے ساتھ اسے خوب نوازا دربار کے تمام شاعر
اس کا احترام اپنے اوپر لازم سمجھتے تھے دربار میں اس کا مرتبہ روز بروز بڑھتا
گیا اور رودکی کی طرح وہ بڑے جاہ وجلال کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا

عنصری کے اشعار کا بہترین حصہ اس کے قصائد ہیں یہ قصیدے زیادہ
تر سلطان محمود غزنوی اس کے بھائی امیر نصر سلطان کے بیٹے سلطان مسعود اور
اس کے بھائی امیر یوسف کی مدح میں لکھے ہیں اور ان میں اپنے ممدوحوں
کے اوصاف، ان کی فتوحات اور ان کے کارناموں کو نہایت تفصیل کے ساتھ
بیان کیا ہے سچ تو یہ ہے کہ اکثر قصیدوں میں عنصری نے دادِ سخن دی ہے اور
نہایت دقیق معانی کو بہترین، رواں، مترنم اور محکم بندش میں ادا کیا ہے اس
کی طرزِ ادا نہایت دلکش ہے اور قطعی طور پر وہ چوٹی کے قصیدہ گو شاعروں
میں شمار کیا جا سکتا ہے اس کے ہم عصر ایک شاعر منوچہری نے جو خود بھی استادان
میں شمار ہوتا تھا اس کی مدح کی ہے اور "خطاب بہ شمع" میں کہا ہے۔

تو ہمی تابی و من بر تو ہمی خوانم بہر	هر شبی تا روز دیوان ابوالقاسم حسن
اوستاد اوستادان زمانہ عنصری!	عنصرش بی عیب دل بی غش و دینش بی فتن

عنصری سے پہلے قصیدہ گو شاعروں میں رودکی کے سوا اس کی ٹکر کا کوئی مشہور شاعر پیدا ہی نہیں ہوا تھا اور اس کے نقش اور اس کی برتری کا خود عنصری نے اعتراف کیا ہے۔

عنصری کا سبک عنصری اپنے اکثر قصیدے غزل یا تشبیب سے شروع کرتا ہے اور اس کے بعد ممدوح کی مدح شروع کرتا ہے عنصری کی اس طرز کی اس کے بعض ہم عصروں نے بھی پیروی کی ہے عنصری نے غزلیں بھی لکھی ہیں لیکن اس فن میں اس نے رودکی کی برتری تسلیم کی ہے چنانچہ کہتا ہے۔

غزل رودکی وار نیکو بود　　　غزلہائے من رودکی وار نیست

عنصری کے قصائد کا دیوان باقی ہے اور اس میں دو ہزار کے قریب اشعار ہیں اصل میں اس کے دیوان میں تیس ہزار شعر تھے۔

عنصری کا اصل کمال اس کی قصیدہ گوئی اور اس کے بہترین قصائد کا بڑا حصہ سلطان محمود کی مدح اس کی جنگوں اور اس کی شجاعت کے ذکر سے بھرا ہوا ہے سلطان محمود کے سفروں میں یہ شاعر بھی لازمی طور پر اس کے ہم رکاب رہتا تھا۔ واقعات کا خود مشاہدہ کرتا تھا پھر اپنے ممدوح کے عالی صفات اور اس کی عظمت و بزرگی کو اپنے دلکش انداز میں پیش کرتا تھا۔

اس شاعر نے قصیدے کے سوا دوسرے اصناف سخن میں کوئی خاص کمال پیدا نہیں کیا لیکن حق یہ ہے کہ اس فن کا وہ بہت بڑا ماہر تھا اس نے نہایت اچھی بندش کے ساتھ موزوں الفاظ کا انتخاب کیا ہے اور ان کو بڑی مہارت اور بڑی خوبی کے ساتھ نظم میں مربوط کیا ہے اس نے اپنے کلام میں نازک اور دقیق مضامین پیدا کئے ہیں اس کے اشعار نہ تو فرخی کی طرح سادہ ہیں اور نہ منوچہری کے بعض اشعار کی طرح مشکل الفاظ سے بھرے ہوئے ہیں بلکہ نہایت استوار و

دقیق ہیں اور اس حالت میں بھی بہتے پانی کی طرح نہایت صاف اور رواں ہیں مثلاً اس کا یہ قصیدہ :۔

ع چہ چیز است رخسارہ و زلف دلبر

اور دوسرے قصیدے ہمارے اس دعویٰ کا بین ثبوت ہیں۔

قصیدہ غزل اور رباعی کے سوا عنصری مثنوی کہنے میں بھی مہارت رکھتا تھا کہتے ہیں اس نے پہلی بار وامق و عذرا کے قصے کو نظم کا جامہ پہنایا تھا اسی طرح بعض اور مثنویاں یعنی "سرخ بت، خنگ بت شادبہر اور عین الحیوٰۃ بھی اسی سے منسوب کی گئی ہیں۔ (عنصری نے ۴۳۱ ہجری میں انتقال کیا)

(ماخوذ از تاریخ ادبیات ایران رضازادہ شفق)

عنصری کے زمانہ تک شاعری کا ایک بڑا لازمہ بدیہی یعنی فن مجلس تھا جو شاعر جس قدر زیادہ اس فن میں کمال رکھتا تھا اس قدر زیادہ کامیاب ہوتا تھا اس کے لئے سب سے مقدم چیز بدیہہ گوئی تھی عنصری اس وصف میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا وہ نہایت پرگو تھا اور برجستہ کہتا تھا آتشکدہ میں لکھا ہے کہ ایک موقعہ پر رات بھر میں ہزار شعر کہہ ڈالے اس کی بدیہہ گوئی کے واقعات تذکروں میں کثرت سے ملتے ہیں۔

ایک دن بزم عیش میں بادہ و جام کا دور تھا محمود خلافِ عادت معمول سے زیادہ پیکر بدمست ہوگیا اسی حالت میں ایاز پہ نظر پڑی اس کی شکن در شکن زلفیں چہرہ پر بکھری ہوئی تھیں محمود نے بے اختیار اس کے گلے میں ہاتھ ڈال دیئے۔ لیکن فوراً سنبھل گیا اور جوش تقویٰ میں آکر ایاز کو حکم دیا کہ زلفیں کاٹ کر رکھ دے ایاز نے فوراً حکم کی تعمیل کی صبح کو جب محمود سو کر اٹھا تو ایاز کی صورت دیکھ کر سخت مکدر ہوا بار بار اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا ندما و مقربین دم بخود تھے آخر

باعلی قریب نے جو حاجب خاص تھا عنصری کو بلا کر صورت واقعہ بیان کی عنصری نے محمود کے سامنے جا کر یہ رباعی پڑھی ۔

کی عیب سر زلف بت از کاستن است | نہ جائے بہ غم نشستن و برخاستن است
وقت طرب و نشاط و مے خواستن است | کآراستن سرو ز پیراستن است

عنصری کی شاعری کی خصوصیات

(۱) قصیدہ میں تخلص اور گریز سب سے زیادہ مہتم بالشان چیز سمجھی جاتی ہے یعنی غزلیہ مضامین کہتے کہتے بادشاہ کی مدح کی طرف کیونکر رجوع کریں متاخرین کو ناز ہے کہ یہ نکتہ آفرینیاں انہیں کے ساتھ مخصوص ہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ عنصری کے تخلص بھی متاخرین سے کم نہیں ایک قصیدہ میں ابتدا سے انتہا تک دو دو چیزوں کا مقابلہ کیا ہے اس میں لکھتا ہے ۔

۵ مرا بہرہ دو چیز آمد ز گیتی | دل پاک و زبان مدح گستر
یکی بر مہر جاناں وقف کردم | یکی بر مدح شاہنشاہ کشور

(۲) قصیدہ اگرچہ مداحی اور ہجو کے لئے مخصوص ہو گیا تھا لیکن عنصری نے اکثر قصائد سے واقعہ نگاری کا کام لیا ہے اس نے اکثر قصیدوں میں محمودی کی اور فتوحات نظم کی ہیں ۔

(۳) مناظر قدرت اور خاص خاص چیزوں کے اوصاف بھی اس نے [illegible] خوبی سے لکھے ہیں

(۴) صنائع بدائع کی بدعت عنصری سے پہلے شروع ہو چکی تھی لیکن خال خال تھی اور اس قدر نمایاں نہ تھی کہ لوگوں کا خیال اس طرف رجوع ہوتا عنصری نے اکثر صنعتیں مثلاً لف و نشر، توشیح، تقسیم، سوال و جواب، کثرت سے برتیں اور چونکہ بعض صنعتیں نہایت خوبی سے استعمال کیں اوروں نے بھی تقلید کی اور ایک عام شاہراہ پیدا ہو گئی

۵۔ مبالغہ میں بھی عنصری نے کمی نہیں کی لیکن متاخرین کے مقابلہ میں اس کا رنگ پھیکا معلوم ہوتا ہے مثلاً ؎

؎ بہ نورد ظلمت ماند زمین وابر ہمی | بہ درد مینا ماند سرشک ابر و گیا
فریفتہ است زمین ابر تیرہ را کہ ازو | ہمی ستاند در و ہمی دہد مینا

(ماخوذ از شعر العجم شبلی نعمانی)

ابوالقاسم حسن بن احمد عنصری بلخی محمود اور مسعود کے درباروں میں ملک الشعرا اور رودکی کے بعد مدح، غزل اور قصیدہ میں استاد مطلق تھا عوفی اس کو مُقدم شعرا اور عہد و پیشوائی فضلاء زماں کہتا ہے اور حقیقتاً وہ اس مرتبہ کا حقدار بھی ہے اس کے نام، نسب اور تخلص کے بارے میں منوچہری اس قصیدہ کے ان دو شعروں میں جو عنصری کی مدح میں لکھا گیا تھا کہتا ہے:۔

تو بھی تابی و من بر تو ہمی خوانم بمہر | ہر شبی تا روز دیوان ابوالقاسم حسن
اوستاد اوستادانِ زمانہ عنصری | عنصرش بی عیب و دل بی غش و دینش بی فتن

عنصری امیر نصر بن ناصر الدین کی وساطت سے سلطان محمود کی خدمت میں پہنچا اس کی تصدیق اس کے بعض شعروں سے بھی ہو جاتی ہے مثلاً عنصری اپنے ان قصائد میں سے (جو امیر نصر کی مدح میں لکھے گئے) ایک میں کہتا ہے:۔

نہ بودم من اندر جہاں پیش ازیں | کہ را بود در گیتی از من خبر
ز جاہ تو معروف گشتم چنیں | من اندر حضر نام من اندر سفر

عنصری کو محمود کے دربار میں داخلے کا اتفاق اس کی سلطنت کے اولین ایام میں ہو گیا تھا چنانچہ اس پہل کے سبب، سلطان کے بھائی کی دوستی کے باعث اور علم و ادب و شعر میں مہارت کی وجہ سے بادشاہ کی قربت حاصل ہو گئی اور بادشاہ کے خاص ندیموں میں اس کا شمار ہونے لگا۔

عنصری سلطان محمود کے اکثر جنگی معرکوں میں اس کے ہمراہ ہوتا تھا چنانچہ اس کے قصائد انہیں جنگی سفروں کی تعریف میں لکھے ہیں۔

سلطان مسعود کے عہد حکومت میں بھی عنصری نے اپنے مقام اور مرتبے کی حفاظت کی اور وہ "مقدم شعرا" شمار ہوتا رہا۔ عنصری سبکتگین کے تمام افراد خاندان میں سے امیر نصر برادر سلطان محمود کے ساتھ زیادہ قلبی تعلق رکھتا تھا بڑے بڑے قصیدوں میں اس کی مدح کی گئی ہے

عنصری جیسا کہ اس کے اشعار سے ظاہر ہے ایک بلند ہمت اور بزرگ منش انسان تھا اس نے اپنے تمام قصائد میں اخلاقی مضامین کے بیان کو خاص طور پر مدح کے ساتھ شامل کیا ہے یہ اشعار اس کی بلند ہمتی اور علو طبعی کی نمائندگی کرتے ہیں اس کی غزلوں میں وقار اور متانت پورے طور پر آشکارا ہوتی ہے۔ اس کی وفات ۴۳۱ھ ہجری میں بتائی جاتی ہے۔

دولت شاہ سمرقندی اس کے دیوان کو تقریباً تین ہزار اشعار کا لکھتے ہیں لیکن اب اس کے تمام اشعار جو دیوان یا دیگر ادبی کتابوں مثلاً "ترجمان البلاغت، حدائق السحر، "لغت فرس اسدی" "المعجم فی معائیر اشعار العجم وغیرہ میں ہیں دو ہزار سے تھوڑا سا تجاوز کرتے ہیں یہ تمام اشعار قصائد، غزلیات، رباعیات اور مثنویوں میں بکھرے پڑے ہیں۔

عنصری اپنے دیوان کے علاوہ بھی منظومات کا ایک ذخیرہ رکھتا تھا۔ عوفی کے قول کے مطابق وہ منظومات "شاد بہر و عین الحیٰوۃ"، "وامق و عذرا" اور "خنک بت و سرخ بت" میں سے ہیں۔

عنصری ایک ہنرمند شاعر ہے۔ خیالات باریک اور معانی دقیق کے ادا کرنے میں اس کو پوری قدرت حاصل ہے اس کے بہت کم ایسے اشعار ہیں جو

تخلیقی ذوق کے پیدا کردہ تازہ مضامین سے عاری ہوں انہوں نے عربی ادب کے شعراء عظیم کے مضامین کو بھی اپنایا ہے مگر ان مضامین کو اس طرح تازہ رنگ دیا ہے اور ایسی جدید ہیئت میں لکھا ہے کہ ان کی پہلی صورت کا پتہ نہیں چل سکتا۔

عنصری کو علوم عقلی پر پورا عبور حاصل ہے وہ علمی اصطلاحات و افکار سے اپنے اشعار کو مزین کرتا ہے کبھی وہ ان علمی اصطلاحات و افکار کے ساتھ شاعرانہ تخیلات کی آمیزش کرتا ہے اور کبھی سادگی سے ان کو بیان کر دیتا ہے اس طرح وہ ہر طریقہ سے ان اصطلاحات کو اپنے شعری مقاصد کے لئے استعمال کرتا ہے ؎

گرچہ سامان جہاں اندر خرد باشد خرد   تا از و سامان نگیرد سخت بی سامان بود
تا با اصل اندرواں را با خرد خویشی بود   تا بطبع اندر زمستان صد تابستان بود

دقت خیال، باریکیٔ فہم اور نئے نئے مضامین لانے کی کوشش نے عنصری کے اشعار کو کسی حد تک مشکل بنا دیا ہے جس کے سبب اس کے "نسخ دیوان" میں ایسی غلطیاں راہ پا گئی ہیں جو دقتِ نظر سے تصحیح کی محتاج ہیں۔

(ترجمہ از تاریخ ادبیات در ایران ذبیح اللہ صفا)

عنصری شعر گوئی میں سبک خراسانی کا پیرو ہے قصائد کا آغاز بالعموم قدرتی مظاہر مثلاً رات بادل، خزاں اور بہار کے ذکر سے کرتا ہے پھر معنی خیز گریز سے اصل مدح کی طرف رجوع کرتا ہے

عنصری اکثر سلطان محمود کی مہموں میں اس کا ہم رکاب رہتا اور جنگ کے حالات و واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا اس لئے اس کے اشعار ـ بار زار کی حقیقی تصویر معلوم ہوتے ہیں

عنصری کو اگرچہ قصائد ہی کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی لیکن قصائد میں بعض ایسے اخلاقی مسائل بھی بیان کرتا ہے جن میں قارئین کے لئے علو ہمت، بلند نظری اور وسیع ظرفی کا سبق ہوتا ہے۔ عنصری اگرچہ قصیدہ گو شاعر ہے لیکن اس نے کبھی کسی کی بے جا تعریف نہیں کی تملق اور خوشامد سے اس کا دامن داغ دار نہیں ہنر نمائی کی خاطر مبالغہ کرتے ہوئے وہ حد سے بھی نہیں گزرتا بلکہ حسب موقع بادشاہ کی مدح کرتے ہوئے اسے عفو، رحم، سخاوت اور وفا کی تلقین کرتا ہے ؎

چہار و قلتش ہیشہ چہار کار بود   کسی نہ دید و نہ بیندش ازیں چہار جدا
بوقت قدرت عفو و بوقت ذلت رحم   بوقت تنگی رادی بوقت عہد وفا

عنصری کے بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ شعر و شاعری کے علاوہ مختلف علوم میں بھی مہارت رکھتا تھا ذیل کا شعر اس کے علم و آگہی کا پتہ دیتا ہے ؎

وگر فرو شود آہن بآب طبع ایں است   چرا بر آید جوشی ہمی بروی غدیر

عنصری کے قصائد کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے الفاظ و کلمات بہت زور دار اور پرشکوہ ہوتے ہیں عنصری کے بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عرب شعراء سے متاثر تھا

قصائد و قطعات کے علاوہ چند رباعیاں بھی عنصری کی یادگار ہیں جن میں سے دو حسب ذیل ہیں:-

در عشق تو کس پاکی ندارد جز من   در شورہ کسی تخم نہ کارد جز من
با دشمن و با دوست بدت می گویم   تا ہیچ کست دوست ندارد جز من

ای شب نکنی آں ہمہ پرخاش کہ دوش   راز دل من مکن فاش کہ دوش
دیدی کہ چہ دراز بود در شبیہ شیم!   ہاں اے شب وصل آنچناں باش کہ دوش

عنصری کا دیوان قصائد، قطعات، رباعیات اور مثنویوں کے بعض اشعار پر مشتمل ہے۔ مجمع الفصحا کے بیان کے مطابق اس کے دیوان کے اشعار کی تعداد تین ہزار ہے لیکن آج کل جو دیوان ملتا ہے اس میں اشعار کی تعداد دو ہزار سے کچھ زائد ہی ہوگی۔

دیوان کے علاوہ عنصری نے بعض مثنویاں بھی لکھیں جن کے نام یہ ہیں۔ عین الحیٰوۃ، شادبہر، وامق وعذرا، سرخ بت اور خنگ بت لیکن مقام افسوس ہے یہ سب مثنویاں اب ناپید ہیں ان کے صرف نام ہی تذکروں میں باقی رہ گئے ہیں
(ماخوذ از ادب نامہ ایران مقبول بیگ بدخشانی)

فرخی

محمود کے دربار کے بڑے شاعروں میں ایک ابوالحسن علی بن جولوغ متخلص بہ فرخی بھی ہے یہ سیستان کا رہنے والا تھا چنانچہ اس شعر میں اس نے اپنے وطن کی طرف اشارہ کیا ہے :؎

من قیاس از سیستاں دارم کہ آں شہر من است   وز پیٔ خویشاں ز شہر خویشتن دارم خبر

فرخی کے باپ جولوغ نے صاحب سیستان امیر خلف بانو کی خدمت میں بسر کی. فرخی کو قدرت نے ذوقِ لطیف، فطری صلاحیت اور دلکش آواز سے خوب نوازا تھا یہ چنگ بھی خوب بجاتا تھا اور شعر اور خاص کر قصیدہ خوب کہتا تھا اور اس فن میں اس نے ایک خاص طرز ایجاد کی ہے۔

محمود کے دربار میں حاضر ہونے سے پہلے فرخی سیستان میں کھیتی باڑی کیا کرتا تھا پھر ابوالمظفر احمد بن محمد امیر چغانیاں کے انعام واکرام کی شہرت سنی تو اس کے دربار کے ارادے سے ایک کارواں کے ساتھ ہو گیا امیر کی مدح میں اس نے ایک قصیدہ لکھا اس قصیدے کے چند شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

با کارواں حلہ برفتم از سیستاں   با حلہ تنیدہ ز دل بافتہ ز جاں
با حلہ فریشم ترکیب او سخن!   با حلہ نگارہ اگر نقش او زباں
ہر تار او برنج برآوردہ از ضمیر   ہر پود او بجہد جدا کردہ از رواں

چغانیاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ امیر اپنے گھوڑوں کو داغ دینے کے لئے داغ گاہ گیا ہوا ہے۔ فرخی نے اپنے قصیدے کو امیر ابوالمظفر کے پیش کار خواجہ عمید اسعد کے سامنے پیش کیا خواجہ عمید اسعد اسے اپنے ساتھ داغ گاہ پہنچانے

کا وعدہ کیا اور ضمناً اس سے خواہش کی کہ وہ داغ گاہ کی تعریف میں کچھ شعر کہے فرخی نے اسی رات داغ گاہ کا وہ مشہور قصیدہ لکھا جو ذیل کے مطلع سے شروع ہوتا ہے ؎

تا پرند نیلگوں برروی پوشد مرغزار — پرنیاں ہفت رنگ اندر سر آرد کوہسار

دوسرے روز اس نے امیر کے سامنے قصیدہ پڑھا امیر شعر شناس تھا اس قصیدے پر اسے بڑی حیرت ہوئی اس نے شاعر کو نوازا اور کافی صلہ و انعام سے سرفراز کیا۔

اس کے بعد فرخی غزنوی دربار پہنچا اور یہاں بھی سلطان محمود نے اس کی بڑی عزت افزائی کی سلطان محمود کے دربار میں اسے بہت جلد اونچا مقام مل گیا اور اس نے بہت مال و دولت حاصل کر لی . . . .

فرخی نے اپنے قصائد کا بڑا حصہ دربار غزنہ کی مدح میں لکھا ہے اس نے سلطان محمود اور اس کے بیٹے ابو احمد محمد اور مسعود، اس کے بھائی امیر یوسف اور ان کے وزیروں اور ندیموں کی مدح کی ہے۔

فرخی کے دیوان میں نو ہزار سے زیادہ شعر ہیں اور اس میں قصائد کے سوا غزلیں، قطعے، ترجیع بند اور رباعیاں بھی ہیں۔ فرخی کے ہم عصروں اور اس کے بعد کے شاعروں نے جیسے عنصری اور رشید وطواط وغیرہ نے اس کی مدح کی ہے شاعری کے سوا فرخی عروض اور تنقید شعر میں بھی استاد تھا چنانچہ اس فن پر اس نے "ترجمان البلاغت" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے یہ کتاب اب امتداد زمانہ سے ناپید ہو گئی ہے لیکن رشید الدین وطواط نے یہ کتاب دیکھی ہے اور اپنی تالیف حدائق السحر میں اس سے استفادہ بھی کیا۔

فرخی کا سبک عنصری کی طرح فرخی نے بھی زیادہ تر قصیدے کہے ہیں۔

اور ان کو اس نے قدرتی مناظر سے شروع کیا ہے اسے تغزل میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی الفاظ اور مطالعہ پر اس کی قدرت مسلم ہے لطیف اور فطری تشبیہیں اس کے پاس بہت ملتی ہیں اس کے پاس تعقید اور تکلف نہیں اس کے بیشتر اشعار سادہ اور شیریں ہیں مثال کے طور پر اس قصیدے کو پیش کیا جا سکتا ہے جس میں اس نے ابر کی تعریف کی ہے اس قصیدے سے شاعر کی قادر الکلامی نکتہ آفرینی، خیال کی نزاکت اور تشبیہوں کی قدرت ظاہر ہے اس قصیدے کا مطلع ہے سے

برآمد نیلگوں ابری زاوی نیلگوں دریا   چورائی عاشقاں گرداں چو طبع بے دلاں شیدا

فرخی نے اپنے زمانے کے سیاب مدح میں اپنے ممدوح کو بلند اوصاف اور پاکیزہ اخلاق بخشے اس کا ممدوح سخن فہم، سخنور اور انسانیت نواز ہے اس کا مذہب جود و سخا ہے . . . . وہ اپنے وعدے کو پورا کرتا ہے وہ حق پرست، دیندار اور سچ بولنے والا ہے۔

یہی مضامین اکثر فرخی کے قصیدوں میں آئے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے دلکش اور بلند اشعار میں نیک صفات حاصل کرنے کی کتنی تبلیغ کی ہے اگر لوگوں میں یہ صفات موجود نہ ہوں تو ان اشعار کے سننے سے ان کے حصول کا ان میں شوق پیدا کیا ہے جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے فرخی کی ایک خصوصیت تغزل ہے وہ قصیدوں کی ابتدا شور انگیز اشعار سے کرتا ہے اور فطری مناظر اور بہار کی زیبائی نوروز کی طراوت اور مے اور معشوق کی تعریف سے ان اشعار میں جان ڈال دیتا ہے ایسے ہی تغزل کا نمونہ سلطان محمود کی مدح میں اس کا وہ مشہور قصیدہ ہے جس کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اس قصیدے کی ابتدا میں اس نے ابر کی بڑی دلکش تصویر کھینچی ہے اور اس میں بڑی لطیف تشبیہوں سے کام لیا ہے۔ فرخی نے تغزل میں عجیب رنگا رنگ پھول کھلائے ہیں۔ ان میں نادر رنگ آمیزی کی ہے اور فطرت کی مستی کو

اپنے کلام میں سمو دیا ہے

فرخی خوشی اور غم، شوق وصال اور درد جدائی اور دوسرے انسانی جذبات کی مصوری میں بڑی مہارت رکھتا ہے اس کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صاحب دل تھا دنیا کے انداز اور لوگوں کی حالت اس کے دل کے آئینہ میں نقش ہو کر اس کو متاثر کر دیتی ہے اس کا ایک قصیدہ سلطان محمود غزنوی کی مدح میں ہے اور اس مطلع سے شروع ہوتا ہے ؎

شہر غزنیں نہ ہمانست کہ من دیدم پار ‌‌ ‌‌ ‌‌ چہ فتادہ است کہ امسال دگرگوں شدہ کار

اس قصیدے میں اس ایسے ہی جذبات کی عکاسی کی ہے۔

فرخی کے بعض اشعار میں تاریخی واقعات کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ سلطان محمود کا ندیم تھا اور ہندوستان کے کئی سفروں میں اس کے ساتھ رہا تھا سلطان کے معاریوں اور فتوحات کے بعد اس نے جو قصیدے لکھے ہیں ان میں ایسے واقعات کا تفصیلی ذکر کیا ہے اس لئے یہ قصائد تاریخی واقعات، تاریخی ناموں اور تاریخی مقامات کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور تاریخ نگاری میں ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے ان تاریخی قصیدوں میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں اس زمانے کے رسوم و آئین کا نقشہ کھینچا گیا ہے مثلاً ان میں سلطان کی مجلسوں کا ذکر ہے نوروز اور مہرگان کے جشنوں کا حال ہے یا ابو المظفر چغانی کی داغ گاہ کی تفصیل موجود ہے۔

مختصر یہ کہ فرخی ایران کے قصیدہ گو شاعروں میں درجہ اول کا شاعر ہے اس کا کلام پختہ اس کی طبیعت رواں، اس کے قصیدے سادہ اور سلیس ہیں اس کے کلام میں الجھاؤ، دقیق فلسفیانہ مضامین اور علمی مطالب نہیں پائے جاتے اس کے اشعار ذوق صحیح اور نادرت سخن پر دال ہیں اس کے کلام میں حسن وزن،

ترنم، ہم آہنگی اور بندش کی چستی خوب ہے اس کے اشعار ہر قسم کی تعقید اور برائی سے پاک ہیں۔

فرخی نے ۴۲۹ھ میں وفات پائی

(ماخوذ از تاریخ ادبیات ایران رضا زادہ شفق)

فرخی کے کلام کا عام جوہر زبان کی صفائی اور سلاست و روانی ہے حیرت ہوتی ہے کہ اس ابتدائی زمانہ میں اس نے بیان کو اس قدر صاف کر دیا کہ ہزار برس گزر چکے لیکن آج کی زبان معلوم ہوتی ہے یہ بھی فرخی کی خصوصیات میں ہے کہ جب کسی چیز کی تعریف یا کسی واقعہ کی حالت اور کیفیت بیان کرتا ہے تو اس کا اصل سماں آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا ہے۔

فرخی نے واقعہ نگاری کو بہت ترقی دی اس سے پہلے بھی یہ صنعت موجود تھی لیکن سینکڑوں گوناگوں واقعات کو نہایت بے تکلفی اور برجستگی سے ادا کرکے اس نے واقعہ نگاری کی ایک شاہراہ قائم کر دی اور آئندہ نسلوں کے لئے راستہ صاف کر دیا اکثر قصیدوں میں فتوحات کے حالات لکھتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ایک مؤرخ بے کم و کاست ٹھیک ٹھیک حالات لکھتا جاتا ہے سومنات کی فتح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس میں ایک ایک مقام کا نام اور اس کا حال بیان کیا ہے۔ واقعہ نگاری کا انداز فرخی پر اس قدر غالب ہے کہ قصائد کی تشبیب میں جو دراصل غزل ہوتی ہے یہ انداز قائم رہتا ہے

فرخی سے پہلے مرثیہ کے اشعار بہت کم پائے جاتے ہیں اور جس قدر ہیں معمولی درجہ کے ہیں لیکن فرخی نے سلطان محمود کا جو مرثیہ لکھا وہ نہ صرف پر درد اور پر تاثیر ہے بلکہ اس فن کے تمام اصول اور آئین اس سے

قائم ہو سکتے ہیں۔

مرثیہ گوئی کے بڑے اصول تین ہیں۔

۱۔ ممدوح کی عظمت و شان کا ذکر کیا جائے تاکہ اس سے عبرت کا سبق حاصل ہو کہ اس پایہ کا شخص اٹھ گیا۔

۲۔ اس کے مرنے سے ملک میں جو رنج و ماتم برپا ہے اس کا ذکر کیا جائے۔

۳۔ اس کو مخاطب کر کے ایسے خیالات ظاہر کئے جائیں جس سے یہ ثابت ہو کہ انتہائے وارفتگی اور مدہوشی کی وجہ سے مرثیہ کہنے والے کو اس کے مرنے کی خبر نہیں اور اب تک اس کو اسی طرح مخاطب کر کے باتیں کرتا ہے جس طرح زندگی میں کرتا ہے۔

فرخی کے مرثیہ میں یہ تمام باتیں پائی جاتی ہیں اس کے ساتھ الفاظ کی بندش اور طرز ادا اس قدر موثر ہے کہ پتھر کا دل بھی پانی ہو جاتا ہے۔ قصیدے کا مطلع ہے

شہر غزنیں نہ ہماں ست کہ من دیدم پار ؎ چہ فتادست کہ امسال دگرگوں شد کار

صنائع شاعری میں ایک چیز تلمیح یعنی کسی قصہ طلب واقعہ سے مضمون پیدا کرنا ایک لطیف صفت ہے فرخی اس صفت کا استعمال خوبی سے کرتا ہے۔

مشہور ہے کہ حضرت آدمؑ نے جب بہشت میں گیہوں کھا لیا تو اُن کے بدن کے کپڑے خود بخود اُتر گئے فرخی نے اس واقعہ سے خزاں کی تعریف میں مضمون پیدا کیا ؎

مگر درخت شگوفہ گناہ آدم کرد ؎ کہ از لباس چو آدم ہمی شود عُریاں

صنائع بدائع عارض سخن کے داغ ہیں تاہم چونکہ اس زمانہ میں اس کا رواج عام ہو چکا تھا فرخی کے کلام میں بھی یہ داغ پائے جاتے ہیں لیکن چنداں بدنما معلوم نہیں ہوتے۔ —— لف و نشر اور صنعت تقسیم کو ایک قصیدہ میں جمع کیا ہے

۵

در رگ اندر تن و اندر دل نه اندر دو چشم — خواب و صبر و روح و خون رائے بہ افتاد انقلاب
رنج دارد جائے و درد جائے روح — عشق دارد جائے و آبدار و صبر و خواب!

(ماخوذ از شعر العجم شبلی نعمانی)

فرخی ایران کے بہترین قصیدہ گو شاعروں میں سے ایک ہے اس کا کلام سادگی، روانی اور متانت کی وجہ سے دیگر شاعروں سے ممتاز ہے وہ اپنے احساسات اور افکار کو سادہ اور رواں زبان میں جس مہارت سے ادا کرتا ہے وہ سعدی کو اس کے دو سو پچاس سال بعد حاصل ہوئی یعنی جس سادگی، روانی لطف بیان، دقت احساسات اور شیرینیٔ ادا کو سعدی غزلوں میں پیش کرتا ہے فرخی اسے قصیدوں میں بیان کرتا ہے کہا جاتا ہے کہ سہل ممتنع کی جو خوبی عربی میں ابو الفراس الحمدانی کے کلام میں پائی جاتی ہے وہ فارسی زبان میں فرخی کے کلام میں ملتی ہے۔

فرخی کا تغزل بدائع معانی کی حیثیت سے اور عشق کے جذبات کو شاعرانہ انداز سے بیان کرنے کی وجہ سے مشہور ہے اس نے اپنی غزلوں میں عاشق پر گزرنے والی مختلف واردات اور اس کے دل میں پیدا ہونے والے مختلف انواع کے احساسات کو بیان کیا ہے وہ مدح کرتے وقت اپنی تمام تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لاتا ہے اس کے اشعار میں شوخی اور گستاخی کی جھلک ملتی ہے جو اس کے کلام کو خاص رونق بخشتی ہے۔

فرخی کی غزلیں معاصرین کی غزلوں کے مقابلہ میں لطافت سے خالی نہیں ہیں اس کا دیوان نو ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔

(ترجمہ از تاریخ ادبیات در ایران ذبیح اللہ صفا)

سلطان محمود کے مشہور شعراء میں فرخی کا بھی شمار ہوتا ہے اس کا نام ابوالحسن علی بن جوبوغ اور وطن سیستان ہے۔ دولت شاہ سمرقندی لکھتا ہے کہ فرخی ترمذ کا رہنے والا تھا لیکن فرخی کے ذیل کے شعر سے واضح ہوتا ہے کہ فرخی سیستان ہی کا رہنے والا تھا ؎

من قیاس از سیستان دارم کہ آں شہر من است

وز پئے خویشتاں ز شہر خویشتن دارم خبر

فرخی چنگ بجاتا تھا اور شعر گاتا تھا اس کے نزدیک زندگی وہی زندگی ہے جو عشرت میں بسر ہو چنانچہ اس کے اشعار عیش ونشاط اور مادی لذتوں کے ذکر سے بھرپور ہیں وہ ہر وقت حلاوت نو کا طلبگار نظر آتا ہے ؎

فسانہ گشت و کہن شد حدیث سکندر سخن نو آر کہ نو را حلاوت دگر است

فرخی کو تشبیب یا غزل کہنے میں کمال حاصل ہے غزل کے اشعار رواں، سادہ اور قدرتی احساسات کے حامل ہیں خیالات وسیع تو ہیں لیکن ان میں گہرائی نہیں، عنصری اور فرخی کے قصائد کا موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عنصری کے قصائد میں گہرائی اور متانت ہے اور فرخی کے اشعار میں سادگی اور روانی ہے

فرخی اپنے اشعار چنگ ورباب کے ساتھ گایا کرتا تھا اس لئے اس کی موسیقی کا اثر اس کے اشعار میں جھلکتا نظر آتا ہے وہی روح نشاط، وہی خوش آہنگی جو چنگ و رباب کے تاروں میں ہے وہی اس کے اشعار میں بھی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نغموں کی صدائیں اشعار کے قالب میں ڈھل گئی ہیں

فرخی خوش بیان اور ظریف طبع شخص تھا اس لئے موزوں اور متناسب الفاظ لانے میں اُسے خاص ملکہ حاصل ہے اس کے شعر سادہ اور الجھنوں سے پاک ہیں بعض اشعار ایسے رواں ہیں کہ اپنی تمام شاعرانہ لطافتوں کے باوجود نثر معلوم ہوتے ہیں۔

فرخی بھی عنصری کی طرح سلطان محمود کی اکثر جنگوں میں ہمرکاب رہتا تھا۔ رزم کا موقعہ ہوتا تو اہل رزم کے لئے جوش و خروش کا موجب بنتا بزم کا موقعہ ہوتا تو اہل نشاط کے لئے جان محفل ہوتا اس کی دنیاوی وجاہت کا یہ عالم تھا کہ بیس زریں کمر غلام اس کے جلو میں ہوتے تھے لیکن یہ حالات زیادہ دیر تک قائم نہ رہے ایک مرتبہ اس کو ایاز کی محفل میں بادہ گساری کا موقع ملا تو حاسدوں نے محمود کے کان بھرے محمود سخت غضبناک ہوا اور فرخی کو دربار سے نکال لیا فرخی نے معذرت کی مصاحبوں نے شفاعت الگ کی جب کہیں معافی ہوئی۔

فرخی کو اکثر جنگوں میں شریک ہونے کا موقع ملتا اس لئے جو جو منظر اس کی نظروں سے گذرے انہیں بڑی تفصیل سے قصائد میں پیش کیا ہے اور واقعہ نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ اسی طرح سلطان کے جشنوں کے رسوم، محفلوں کے آداب اور شکار کے مناظر کی پوری پوری عکاسی کی ہے۔

فرخی نے اپنے کلام میں نہایت لطیف اور عمدہ تشبیہوں سے کام لیا ہے

فرخی سے پہلے مرثیے بہت کم شعراء نے لکھے اور جو لکھے گئے ان میں سوز و گداز نام کو نہیں فرخی نے محمود غزنوی کی وفات پر جو مرثیہ لکھا ہے اس میں محب کے سوگوار احساسات کی پوری پوری تصویر موجود ہے اس کے ساتھ طرز ادا اس قدر اثر انگیز ہے کہ پتھر کا دل پسیج جاتا ہے۔

شہر غزنیں نہ ہماں است کہ من دیدم پار	چہ فتاد است کہ امسال دگرگوں شدہ کار
کوی ہا بینم پر شورش و سرتاسر کوی	ہمہ پر جوش و ہمہ جوشش از خیل سوار
مہتراں بینم بر روی زناں ہمچو زناں	چشم ہا کردہ زخونابہ برنگ گلنار
فلک امسال دگر باز نیامد ز غزا	دشمنی روی نہادہ است درین شہر و دیار

سیر مَی خورده مگر دی که بخفته است امروز　　دیر تک خواست مگر رنج رسیدش ز خمار

خیز شاها! که رسولان شهان آمده اند　　هدیه ها دارند آورده فراوان و نثار

که تواند؟ که برانگیزد ازین خواب ترا　　خفتنی خفتنی کز خواب نگردی بیدار

خفتن بسیار ای خواجه خوئی تو نبود　　هیچ کس خفته ندیده است ترا زین کردار

(ماخوذ از ادب نامه ایران مقبول بیگ بدخشانی)

منوچہری

ابوالنجم احمد منوچہری دامغان کا باشندہ تھا اس نے اپنے پہلے ممدوح اور زیاری خاندان کے پانچویں حکمران فلک المعالی منوچہر بن قابوس کے نام پر منوچہری تخلص اختیار کیا تھا بعض تذکرہ نویسوں نے اس کا نام شصت کلہ لکھا ہے لیکن یہ اشتباہ احمد بن منوچہر شصت کلہ کے نام اور اس کے تخلص کو خلط ملط کرنے کی وجہ سے پیدا ہوا احمد بن منوچہر چھٹی صدی ہجری کے ایک شاعر کا نام ہے

اگرچہ منوچہر کی ترقی کی ابتدا سلطان محمود کے زمانے ہی میں ہوئی لیکن اسے مشکل ہی سے سلطان محمود کے شاعروں میں شمار کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کے اشعار میں سلطان محمود کا نام نہیں آتا جو کچھ ہمیں معلوم ہے وہ یہ ہے کہ ۴۲۶ھ میں مسعود گرگان گیا اس سے پہلے منوچہری غزنہ میں موجود تھا اور یہیں وہ سلطان مسعود کے دربار سے وابستہ ہوا بہر حال منوچہری کو مسعود کے دربار کا شاعر سمجھنا چاہیئے کیونکہ اس نے اپنے زیادہ قصیدے اسی بادشاہ اور اس کے وزراء اور امراء کی تعریف میں لکھے ہیں

منوچہری کا سبک منوچہری کے کلام سے واضح ہے کہ اس نے متقدمین کے اشعار اور خاص کر عرب شاعروں کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور ان کے کلام سے اسے بڑا انس ہے چنانچہ خود کہتا ہے کہ :-

ع من بسی دیوان شعر تازیاں دارم زبر

اور یہ محض اتفاقی بات نہیں کہ اس نے اپنے کلام میں ایران اور عرب کے پچھلے اور ہم عصر شاعروں کا ذکر کیا ہے بلکہ اس نے خالص عربی مضامین — جیسے اطلال و دمن، دیار منازل کی یاد، قافلہ اور محبوب کی جدائی سہیل و سماک شادی

کی تصویر وغیرہ وغیرہ بھی اپنے کلام میں پیش کئے ہیں۔

نہ صرف یہ کہ منوچہری کو عربی مضامین اور عربی شاعری سے خاص لگاؤ تھا بلکہ وہ عربی زبان اور عربی لغت پر بھی خوب عادی تھا اس نے اپنے بعض ہمعصر شاعروں کی طرح نہ صرف عربی مضامین اور عربی اسلوب کی تقلید کی ہے۔ بلکہ موٹے عربی الفاظ اور ثقیل عربی ترکیبیں بھی کثرت سے فارسی شاعری میں داخل کر دی ہیں مثلاً "معتبر ذوہب"، "معقد عقایص" "مسلس غدایر" "سجنجل ترائب" وغیرہ اس نے بعض عجیب وغریب نامانوس عربی قافئے بھی استعمال کئے ہیں اس کے بعض قصیدے پڑھنے والے کے ذہن میں فوراً عربی قصائد کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔

لیکن یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ منوچہری کے تمام قصیدے تضمینوں اور عربی الفاظ سے گراں بار ہیں ایسا نہیں ہے بلکہ اول تو شاعر نے عربی زبان پر اپنی قدرت سے کام لے کر عربی ترکیبوں کو فارسی سانچے میں اسی طرح ڈھالا ہے کہ وہ فارسی زبان کا حصہ بن گئی ہیں دوسرے اس کے بیشتر اشعار رواں اور شیریں نثر میں فارسی کا نمونہ ہیں اس کے اکثر قصیدے مدح میں ہیں ان قصیدوں کو وہ وہ نہایت شیریں تغزل کے ساتھ شروع کرتا ہے اور تشبیب کے بعد ممدوح کی مدح پر آتا ہے لیکن شاعر کا سارا شاعرانہ کمال اسی تشبیب کے تغزل میں نمایاں ہے۔

منوچہری کی بہت سی خوبیوں میں ایک خوبی فطری اور دلنشین تشبیہوں کا استعمال ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ خیالی تشبیہوں کا بھی ماہر ہے اگر ایک طرف فطری تشبیہیں ذہن ودماغ سے خراج تحسین وصول کرتی ہیں اور منوچہری کو ان دونوں میں کمال حاصل ہے۔

منوچہری کی اور خوبیوں میں اس کی فطرت پرستی بھی ہے بعض وقت اس

پر فطرت کی دلکشی کا نقش ایسا اثر کرتا ہے کہ اس کے قلم سے فطرت کی عکاسی کے نہایت ہی حسین وجمیل شعر نکل پڑتے ہیں یہ اشعار لکھنے والے کے لطیف احساسات کے آئینہ دار ہیں جس کسی صاحب ذوق نے اس کا یہ قصیدہ ضغ " شبے گیسو فروہشتہ بدامن " پڑھا اور اس میں جو دلفریب مناظر پیش کئے ہیں ان سے لطف اندوز ہوا ہے وہ شاعر کی قدرت سخن کی بے اختیار داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا اس قصیدے میں شاعر نے رنگا رنگی بیدوں پر رات کی تاریجی، ستاروں کی دمک، گنگھور گھٹا کا چھا جانا پانی کا رم جھم برسنا پھر طوفانِ باد وباراں اور پھر آفتاب کا طلوع ہونا مصور کر کے دکھایا ہے یہ سب تصویریں اپنی جگہ اتنی مکمل اور اتنی ماہرانہ ہیں کہ پڑھنے والا بے اختیار منوچہری دامغانی پر آفریں بھیجنے لگتا ہے۔

منوچہری کے قصیدوں میں ایسے بھی اشعار ملتے ہیں جن میں وقتی طور پر حزن وملال کا اثر پایا جاتا ہے اور اس کی مثال قصیدہ "شمع" ہے لیکن اس کے بیشتر اشعار نشاط انگیز اور مسرت خیز ہیں فارسی شاعری میں ایسے شعر بہت کم ملتے ہیں جن میں ایسی زندگی، ایسا رقص، ایسی شادمانی اور ایسی خوشی اور مسرت ٹپکتی پڑتی ہو جیسی کہ استاد منوچہری کے اشعار سے ہویدا ہے

منوچہری نے خاص طور پر مسمط میں اس رنگ کو خوب نبھایا ہے اس کے مسمط بڑے زور دار ہیں اور ان میں مسرت، بہجت اور سرور کی روح سر تا سر سموئی ہوئی ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے منوچہری کو انسانی جذبات غم اور جذبات مسرت کے بیان کرنے پر بڑی قدرت حاصل ہے اس حیثیت سے وہ بہت بڑا شاعر ہے شمع کے ساتھ راز ونیاز کرتے ہوئے ان کا حال بیان کرتا ہے

جو دوسروں کے لئے اپنے جی جان سے گزر جاتے ہیں اور انہیں اس کا بدلہ بدی اور ناسپاسی کے سوا اور کچھ نہیں ملتا اس مضمون کو اس پیارے انداز میں بیان کرتا ہے ؎

تو مرا مانی بعینہ من ترا مانم درست — دشمن خویشیم ہر دو دوستدار انجمن
خویشتن سوزیم ہر دو بر مراد دوستاں — دوستاں در راحت انداز ما و ما اندر حزن
ہر دو گریانیم و ہر دو زرد و ہر دو در گداز — ہر دو سوزانیم ہر دو فرد و ہر دو ممتحن
آنچہ من بر دل نہادم بر سرت بینم ہمی — آنچہ تو بر سر نہادی در دلم دارد وطن
رنگ تو چوں زر کہ بگدازی و بر ریزی بزر — رنگ من چوں ریختہ بر زرد برگ یاسمن
رازدار من توئی ہموارہ یار من توئی — غمگسار من توئی من آں تو تو آن من

منوچہری کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعر و شاعری کے سوا دوسرے علوم میں بھی مہارت رکھتا تھا اور حکمت، طب، نحو، نجوم سے واقف تھا اب اس کا جو دیوان ملتا ہے اس میں تین ہزار سے زیادہ اشعار پائے جاتے ہیں تذکروں میں منوچہری کی وفات کا سن ۴۳۲ھ لکھا ہے

(ماخوذ تاریخ ادبیات ایران رضا زادہ شفق)

منوچہری کے کلام میں اکثر ایسے خصوصیات ہیں جن سے اس کے معاصرین کا کلام بالکل خالی ہے بلکہ مابعد کے شعراء میں بھی ان کے نمونے خال خال پائے جاتے ہیں۔

(۱) سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ شعرائے عرب کی زیادہ تر تقلید کرتا ہے اس نے متعدد قصیدے عربی قصائد کے بحر اور قافیہ میں لکھے ہیں اس کے کلام میں اکثر عربی تلمیحات ہیں یہاں تک کہ محض فارسی داں

اس کے کلام سے پورا لطف نہیں اٹھا سکتے۔

(۲) اس کے کلام کی بڑی خصوصیت برجستگی، روانی اور شستگی ہے یہ جوہر اگرچہ اس کا عام خاصہ ہے لاکن اس کے ساتھ اور مختلف باتیں جمع ہوگئی ہیں جن سے اور زیادہ شیرینی اور دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے وہ اکثر شگفتہ ردیفیں پیدا کرتا ہے کہیں کہیں ممدوح کے نام کو ردیف کرتا ہے اور وہاں گریز کے موقع پر ممدوح کے نام سے خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے بعض جگہ کئی کئی شعر تنسیق الصفات کی صنعت میں لکھا جاتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ریشم پر موتی ڈھلکتے جاتے ہیں مثلاً یہ قصیدہ جس کا پہلا مطلع ہے ؎

دلم اے دوست تو دانی کہ ہوائی تو کند	لب من خدمت خاک کف پائی تو کند

(۳) منوچہری مناظر قدرت کا نقشہ نہایت خوبی سے کھینچتا ہے، صحرا، سبزہ بادل، سیلاب اور ہوا وغیرہ کے اوصاف اکثر قصائد کی تمہید میں لکھے ہیں اور اس خوبی سے لکھے ہیں کہ اگر اس قسم کے اشعار الگ جمع کر دیئے جائیں تو نیچرل شاعری کا ایک مجموعہ تیار ہو جائے گا مثلاً یہ قصیدہ، جس کا مطلع ہے

؎ برآمد بادی از اقصائی بابل	ہیبرلش خارہ زسر بارہ افگن

(۴) حلیہ نگاری یعنی کسی خاص چیز کا سراپا لکھنا اور اس کے تمام اوصاف کا بیان کرنا منوچہری اس کا گویا موجد ہے قصائد میں شعراء بادشاہ کی مدح کے ساتھ تلوار، گھوڑے وغیرہ کی تعریف بھی کرتے تھے۔ عبدالواسع جبلی اور عرفی شیرازی اس میدان میں سب سے آگے ہیں لیکن ان کے ہاں محض خیالی باتیں ہیں، بخلاف اس کے منوچہری نے تصویر کھینچ کر رکھ دی اس کے ساتھ اکثر صنعت تنسیق الصفات کا التزام کیا ہے اور وہاں اس کی قدرتِ زبان کا اندازہ ہوتا ہے کہ بے تکلف موزوں اور متناسب الفاظ کا انبار لگاتا جاتا ہے مثلاً

گھوڑے کا سراپا، ؎

حبذا اسپے محجل مرکبے تازی نژاد	نعل او پروین نشان و سم او خارا شکن
رام زین و کش خرام و خوش عنان و تیز گام	شیخ بورد در راہ جوی و سیل برد کوہکن
پشت روی و دست زری گوش زری گردنش	چوں کمان و چوں رماح و چوں سنان چوں مجن
گاہش اندر شیب تازم گاہ تازم بر فراز	چوں کسی کو گاہ بازی بر نشیند بر رسن

منوچہری نے اگرچہ کوئی مثنوی نہیں لکھی جس سے واقعہ نگاری کی ترقی کا قدم آگے بڑھتا لیکن اکثر قصائد کی تمہید میں وہ واقعہ نگاری کا پیرایہ ڈھونڈھ لیتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مسلسل داستاں لکھ رہا ہے ان موقعوں پر اس کی قوت بیان کا اندازہ ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض مداحی کے لئے قصیدہ نہیں کہتا بلکہ زبان کی ترقی دینے کو پیش نظر رکھتا ہے ایک قصیدہ میں عرب کے انداز پر قافلہ کی روانگی، محبوب کی رخصت اور سفر کے حالات لکھے ہیں جس کا مطلع ہے ۔

؎ الا یا خیمگی خیمہ فرو ہل	کہ پیش آہنگ بیروں شد ز منزل

اقسام سخن میں سے منوچہری کے مسمطات مشہور ہیں وہ درحقیقت اس طرز کا موجد ہے اور خود بھی اس کو اس پر ناز ہے چنانچہ کہتا ہے ۔

طاوس مدیح عنصری خواند	دراج مسمط منوچہری

ان مسمطات میں اکثر جگہ واقعہ نگاری کے نئے نئے اسلوب اختیار کئے ہیں ایک مسمط میں انگوروں کے پھلنے پھولنے اور ان سے شراب کھینچنے کو ایک حکایت کے پیرایہ میں ادا کیا ہے یعنی انگور ایک عورت ہے اس نے لڑکیاں جنی ہیں انگور والا خوش ہے کہ یہ میری لڑکیاں ہیں اتفاق سے اسے باہر جانا پڑا آکر دیکھا تو بچوں کے سرخ سفید چہرے سیاہ ہو گئے اور ان کے پیٹ نکل آئے اس

کو سخت رنج ہوا کہ یہ لڑکیاں بدکار نکلیں اس نے ان کے گلے کاٹ ڈالے اور اس طرح شراب کھینچنے کی اخیر حالت تک حکایت کے پیرائے میں بیان کی ہے ۔

منوچہری کی خصوصیات میں ایک بڑی چیز تشبیہ کی صنعت ہے۔ منوچہری کی اکثر تشبیہیں مرکب ہیں اور ان کے ساتھ خاص جدت ہے

(ماخوذ از شعر العجم شبلی نعمانی)

منوچہری کے بچپن کے حالات کا کچھ پتہ نہیں عوفی نے اس ضمن میں صرف اتنا لکھا ہے کہ " در ایام کودکی چناں ذکی بود کہ ہر نوع کہ اورا در شعر امتحان کردندی بدیہہ بگفتی و خاطر او عواثات آں مسامحہ کردی " اسی جودت طبع اور ذہن کی تیزی نے اس کو عالم شباب میں عربی زبان سیکھنے، عرب کے شاعران عظیم کے اشعار حفظ کرنے، فارسی اور عربی شعراء کے حالات سے بہرہ یاب ہونے کے علاوہ ادبی، دینی اور طبی علوم میں مہارت حاصل کرنے میں مدد دی اور وہ علوم جن میں اسے مہارت حاصل تھی ان کی ذیل کے شعر میں خود وضاحت کرتا ہے ؎

من بدانم علم طب و علم دین و علم نحو   تو ندانی دال و ذال و راء و زاء و سین و شین

وہ اپنے اشعار میں علم نجوم اور طب کی اصطلاحوں سے کافی مدد لیتا ہے عربی شاعروں کے اشعار پر تضمینیں اور ان کے حالات زندگی سے پوری واقفیت اس کی شاعرانہ عظمت اور وسعت معلومات کی دلیل ہیں۔ منوچہری اس شعر میں اکثر عربی اشعار کو ذہن میں محفوظ رکھنے کی طرف اشارہ کرتا ہے ؎

من بسی دیوان شعر تازیاں دارم زبر   تو ندانی خواند الا ھبی بصحنک فاصبحین

منوچہری کا مشہور عربی قصائد کا ذکر کرنا اور ان کی واضح مثالیں دینا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنی علمیت کے اظہار پر اصرار کرتا ہے اس طریقہ

سے وہ چاہتا ہے کہ پیرانہ سال بزرگ شاعروں مثلاً عنصری کو حیران کر دے۔ منوچہری اپنی علمیت کا اظہار عربی کی بڑی بڑی اصطلاحات اور لغت کے ثقیل الفاظ کے استعمال کے ذریعہ کرتا ہے لیکن اس کے باوجود اس استاد شاعر کے شعروں میں موسیقی اور خاص آہنگ کا وصف پایا جاتا ہے۔ منوچہری کی خوش آیند موسیقی، افکار کی سادگی و روانی اور اس کی روح کی جوانی و شادابی نے اس کے شعروں کو از حد طربناک اور دلپذیر بنا دیا ہے۔

منوچہری بعض تراکیب اور کلمات کے استعمال میں لاپرواہ ہے اس کے علاوہ اس کے بعض قصیدوں میں الفاظ معنی پر غالب آ گئے ہیں لیکن اس کے اشعار میں قابل توجہ بات اس کی تشبیہات بدیع ہیں اور شاعر اپنے کلام کو مطالب واضح کرنے کے لئے تشبیہات محسوس کبھی عقلی کبھی خیالی ہر طریقے مزین کرتا ہے

وہ ضرورت سے زیادہ عربی الفاظ کو استعمال کرتا ہے وہ اس سلسلے میں کسی قسم کی حد یا قید کو ملحوظ نہیں رکھتا یہی وجہ ہے کہ اس کے قصیدوں سے عربی الفاظ و کلمات کا زیادہ سراغ ملتا ہے

سہ غزا با مزن بلیشتر زبن لفیقا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کہ مہجور کردی مرا از شیقا!
نعیق تو بسیار د مار اشیقی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ بنا ید بہ یک دوست چندین لفیقا

عربی کے دور از فہم ترکیبات اور نامانوس کلمات کو فارسی میں ڈھالنے میں منوچہری کو ایسی قدرت حاصل تھی کہ ان کے استعمال کا عیب یکسر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور اگر ہم اس طریقۂ نوادرِ کلمات والے کلام کو چھوڑ دیں تو پھر اس کا باقی کلام بڑا رواں اور سادہ ہے۔ منوچہری کو قدرت بیان اور قادر الکلامی کے لحاظ سے غزنوی دور کے ممتاز شاعروں میں شمار کیا جا سکتا ہے اس نے مختلف مناظر

فطرت کو اپنا موضوع سخن بنایا۔

منوچہری عشرت طلب انسان تھا۔ شراب اور عشق سے خاصا لگاؤ تھا۔ اس کی وجہ اس کی جوانی اور کم عمری کو قرار دیا جا سکتا ہے چنانچہ اس نے اپنی تمناؤں، آرزوؤں اور خواہشات کے برملا اظہار سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ اس کا مدحیہ کلام بھی کافی ہے۔ فرخی کی مانند غزنوی دربار کے زیادہ تر امرا کی تعریف و توصیف میں قصیدے لکھے اس کے قصائد کی تشبیبیں لمبی اور متحرک ہوتی ہیں اور ہر حیثیت سے مدح والے حصے پر اس کی تشبیب بھاری ہوتی ہے

منوچہری کے اکثر دیوانوں کے قلمی نسخے عہد قاجاریہ کے ہیں اور قدیم ترین عہد صفویہ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان تمام قلمی نسخوں میں مشکل اور دقیق شعروں میں کاتب نے تصرفات کر دیئے ہیں جس سے دیوان غلطیوں سے بھرے پڑے ہیں اس کے علاوہ ان نسخوں سے طبع ہونے والے دیوانوں میں بھی غلطیاں ہیں۔

منوچہری کے دیوان کے بعض نسخوں میں دوسرے شاعروں کے اشعار بھی درج ہو گئے ہیں مثلاً یہ قصیدہ "جو بر کنم دل از دیدار دلبر۔ نہادم مہر خرسندی بدل بر" نعیبی کا بیان کیا جاتا ہے اسی طرح یہ قصیدہ "السلام علی دار ام الکواعب ——— بتان سیاہ چشم عنبر ذوائب" ہدایت کے بقول "حسن متکلم" کا ہے جو ساتویں صدی کا شاعر تھا اس کے علاوہ یہ قصیدہ

سہ "اے پیکر منور محرور نحوی جیکاں ——— ثعبان آتیش دم درد بینہ انتخواں"

خواجو کرمانی کا ہے

منوچہری کی وفات بقول ہدایت ۴۳۲ھ ہجری ہے۔ اس کے بعض اشعار ۴۳۰ اور ۴۳۱ھ کے حوادث کی نشاندہی کرتے ہیں لہٰذا یہی تاریخ وفات یعنی ۴۳۲ھ درست معلوم ہوتی ہے (ترجمہ از ادبیات در ایران ذبیح اللہ صفا،

ابوالنجم کنیت، احمد نام، منوچہری تخلص اور وطن دامغاں ہے جیسے وہ خود لکھتا ہے۔

سوئے تاج عمرانیاں ہم بدیناں بیاید منوچہری دامغانی

منوچہری شروع شروع میں آل زیار کے عہد حکومت میں فلک المعالی منوچہر بن قابوس وشمگیر کے دربار میں ملازم ہؤا چنانچہ اسی حکمران کی نسبت سے تخلص کیا۔

خصوصیات کلام | غزنوی عہد کے تمام شعراء سبکِ خراسانی کے پیرو ہیں لیکن اس کے برعکس منوچہری نے عرب شعراء یعنی سبک عرب کی پیروی بھی کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عربی زبان سے بہت مانوس تھا اور جیسے کہ وہ خود کہتا ہے کہ شعرائے عرب کے اکثر دیوان اسے ازبر تھے۔ عربی سے استفادہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب وہ غزنوی دربار میں پہنچا تو ابھی تو عمر ہی تھا وہ چاہتا تھا کہ بزرگ شعراء کے مقابلے میں اپنا خاص مقام پیدا کرے چنانچہ اس نے فضیلت و برتری حاصل کرنے کے لئے عربی الفاظ و موضوعات کا سہارا لیا۔

۲۔ اگر منوچہری کے قصائد کے عربی الفاظ و تراکیب کو نظرانداز کر دیا جائے تو کہا جا سکتا ہے ان میں روانی اور سلاست بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس کی شاعری کا یہی وہ وصف ہے جس کی بدولت منوچہری کا شمار شعراء کی اولین صف میں ہوتا ہے۔

۳۔ معلوم ہوتا ہے منوچہری بڑی گہری نظر سے مظاہر فطرت کا مطالعہ کرتا ہے۔ قدرتی مناظر کا مطالعہ اگر گہری نظر سے کیا جائے تو اس کا بیان بھی بہت موثر اور مکمل ہوگا بہار کے نغمے گائے ہوئے شعراء اکثر پھولوں کے رنگ و بو صدائے بلبل اور نوائے عشاق کا ذکر کرتے ہیں یہی منوچہری کے ہاں ہے لیکن اس

نے پتوں، شاخوں، پھولوں، درختوں اور پرندوں کا کچھ ایسے پیرائے میں ذکر کیا ہے گویا ان کی صحبت میں برسوں رہا ہے۔

۴۔ مطالعۂ فطرت کے ساتھ اسے منظر کشی میں بھی بڑی مہارت حاصل ہے معلوم ہوتا ہے ایک ماہر نقاش کے ہاتھ میں دو قلم ہیں اور وہ کسی قدرتی منظر کو رنگوں کے سانچے میں ڈھال رہا ہے منظر کشی میں نہایت عمدہ تشبیہیں لاتا ہے تشبیہوں میں عالم محسوسات سے بھی استفادہ کرتا ہے اور قوتِ خیال سے بھی۔

۵۔ منوچہری ایک عشرت طلب اور خوش باش شاعر ہے اس کے تمام دیوان میں سوائے ایک نظم "شمع" کے اور کہیں غم و اندوہ کا ذکر تک نہیں آیا۔

(ماخوذ از ادب نامہ ایران مقبول بیگ بدخشانی)

فردوسی

ایران کی قومی داستان اور تاریخ کو زندہ کرنے اور فارسی زبان میں ایک نئی جان ڈالنے کے لحاظ سے ابوالقاسم فردوسی ایران کا سب سے بڑا شاعر ہے اس لحاظ سے ایران کے کسی اور شاعر کا مرتبہ اس کے مرتبے کو نہیں پہنچتا۔

افسوس ہے کہ ایسے بڑے اور بلند مقام شخص کی زندگی کے حالات پوری طرح معلوم نہیں جو کچھ ہمیں معلوم ہے وہ بہت کم ہے اس کا شاعرانہ لقب یا تخلص فردوسی تھا اور کنیت ابوالقاسم لیکن اس کے اور اس کے باپ کے نام کے بارے میں روایتیں مختلف ہیں عروضی سمرقندی کی کتاب چہار مقالہ کی رو سے اس کی ولادت صوبہ طوس میں طاہران کے قریب باژ کے گاؤں میں ہوئی اور وہ طاہران میں رہا کتاب چہار مقالہ شاعر کے زمانے سے ایک سو سال بعد تالیف ہوئی اور اب تک یہ کتاب اس کے عہد سے قریب ترین کتاب ہے جس میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

فردوسی کی پیدائش کی کوئی قطعی تاریخ نہ تو روایتوں کے ذریعے اور نہ شاہنامے کے اشعار کے ذریعہ متعین کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ اگرچہ شاہنامہ میں کئی جگہ اس نے اپنے سن کا ذکر کیا ہے لیکن چونکہ اس نے شاہنامہ کی ابتدا کی تاریخ نہیں بتائی ہے اس لئے اس کی پیدائش کی تاریخ کے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جاسکتی بس قیاسات ہی قیاسات سے کام لیا جاسکتا ہے۔

شاہنامہ کے بعض اشعار اور بعض مورخوں کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ فردوسی نے اپنی عمر کا ابتدائی حصہ طوس کے دہقانوں میں گذارا تھا اور اس کی ابتدائی زندگی امن و آسائش میں گزری تھی چنانچہ اس نے بڑھاپے اور ناداری شکایت

کرتے ہوئے اپنی جوانی کی ناز پروردگی، بڑائی اور آرام و آسائش کا ذکر کیا ہے لیکن افسوس ہے کہ یہ فراغت اس بڑے شاعر کو ہمیشہ نصیب نہیں رہی اور عمر کے دوسرے حصے میں ایران کے اس عظیم الشان شاعر پر بڑھاپے کے ساتھ ساتھ افلاس اور ناداری کی مصیبتیں ٹوٹ پڑیں۔

آخر عمر کی پریشانیوں اور تنگدستی سے مجبور ہو کر اس شاعر بزرگ نے صلہ اور انعام کی امید میں شاہنامہ کو محمود کے نام معنون کرنا چاہا لیکن بدخواہوں نے سلطان کے سامنے اس کی برائی کی اور ایسی قدر و قیمت رکھنے والی بے بہا کتاب اور ایسی اہمیت رکھنے والی تصنیف سلطان کی توجہ سے محروم رہ گئی۔ چنانچہ کہتا ہے :-

؎ حسد برد بدگوئی در کار من　　　قبلہ شد بر شاہ بازار من

فردوسی کے دردناک سوانحیات میں سے ایک اہم واقعہ اس کے بیٹے کی وفات ہے اس بیٹے نے عین جوانی یعنی ۳۷ سال کی عمر میں اپنے ۶۵ سالہ بوڑھے باپ کے دل پہ جدائی کا داغ لگایا فردوسی اس بیٹے کے دل سوز مرثیہ میں کہتا ہے

؎ مگر بہرہ گیرم من از پند خویش　　　براندیشم از مرگ فرزند خویش
جواں را چوں شد سال بر سی و ہفت　　　نہ بر آرزو یافت گیتی و رفت

عروضی سمرقندی کا بیان ہے کہ جب سلطان محمود ہندوستان کے سفر سے واپس ہوا تو اس کے وزیر خواجہ احمد حسن میمندی نے فردوسی کا ہر شعر برمحل پڑھا

؎ اگر جز بکام من آید جواب　　　من و گرز و میدان و افراسیاب

اس وقت محمود کو یہ بلند پایہ شاعر یاد آیا اس کے حق میں اس نے جو ناانصافی کی تھی اس پر وہ پشیمان ہوا اور حکم دیا کہ ساٹھ ہزار دینار اس کے پاس بھیجے جائیں اور اس سے پوچھیں کہ اس کی خواہش کیا ہے لیکن جس وقت سلطان کے انعام

سے لدے ہوئے اونٹ شہر طابران میں اودبار کے دروازے سے داخل ہوئے
ہیں لوگ فردوسی کا جنازہ اس شہر کے انزال دروازے سے باہر لے جا رہے تھے
فردوسی کی تاریخ وفات سنہ ۴۱۱ھ یا سنہ ۴۱۶ھ لکھی ہے عروضی سمرقندی کے بیان کے
مطابق اس شاعرِ اعظم نے اپنے پیچھے ایک ہی بیٹی چھوڑی تھی۔

شاہنامہ

قدیم زمانے میں شاہنامہ | شاہ نامہ نویسی یعنی ایران کے بادشاہوں
اور پہلوانوں کی داستان لکھنے کا معمول
ایران میں بہت قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔ پرانے شاہناموں میں سے ایک شاہنامہ
جو ہمارے زمانے تک پہنچا ہے خوتائی نامک یا خدائی نامہ (شاہنامہ پہلوی) ہے
یہ شاہنامہ ساسانیوں کے دورِ حکومت میں لکھا گیا اور ایک ایرانی عالم ابن مقنع
نے پہلوی زبان سے اس کا ترجمہ عربی زبان میں کیا ہے یہ کتاب اور اس کا عربی
ترجمہ دونوں پہلی اسلامی صدیوں میں موجود تھے اور اس کے بعد ناپید ہو گئے
ایسی پہلوی کتابیں جو قدیم شاہناموں کی ردیف میں شمار ہو سکتی تھی اور ہم تک
پہنچی ہیں ان میں سے ایک کارنامک ارتخشیر پاپکاں (یا کارنامہ اردشیر بابکاں)
اور دوسری شاہنامہ گشتاسب ہے

شاہنامہ فردوسی کے ماخذ | شاہنامے کے جملہ ماخذوں میں کتاب اوستا
اور اوستا سے متعلق دوسری کتابیں جیسے بندھش اور دینکرت وغیرہ شامل ہیں
یزدان اور اہرمن کا قصہ زرتشت سے متعلق روایتیں، آفرینش کی داستان،
کیومرث اور کیانی بادشاہوں کی حکایتیں، جم اور فریدوں کی کہانیاں براہِ
راست اوستا سے لی گئی ہیں لیکن ان کے مطالب اور ناموں کے تلفظ میں
تبدیلیاں کی گئی ہیں نہ صرف یہ بلکہ ان داستانوں میں سے بعض داستانیں

جیسے داستانِ جم وکاوہ وکیکاؤس مشترک آریائی، ہند وایرانی ۔ داستانوں میں شامل ہوگئی ہیں ان افسانوں کی اور تحقیق کی جائے تو ان کا رشتہ ہند و ایرانی دور سے اور آگے بڑھ کر مشترک ہند و یورپی افسانوں کے سرچشمہ سے جا ملتا ہے مثلاً شیر حیوان سے زال پرورش پانا یونانی پیریاموس کے بیٹے پاریس کے قصہ سے، اسفندیار کا روئیں تن ہونا یونانی اچیلیش اور جرمن زیگفریڈ کے قصہ اور رستم کے ہفتخواں کی داستان یونانی ہرکلس کے ہفت خوان کی یاد دلاتا ہے۔

ایرانی ماخذوں کے سوا شاہنامے میں بیرونی ماخذوں سے کام لیا گیا ہے ایسے بیرونی ماخذوں میں سے ایک داستان اسکندر ہے۔

شاہنامہ کے فارسی ماخذ

فردوسی نے قدیم داستانوں کو براہِ راست داستا سے یا پہلوی کتابوں سے لیا ہے۔ پہلوی سے عربی اور فارسی میں ترجمہ کو سامانی دور میں ساسانی بادشاہوں کی خاص توجہ کی وجہ سے وسعت ہوئی اور نظم و نثر کے بہت سے دفتر ان زبانوں میں منتقل ہو گئے یہی دفتر ہمارے شاعرِ اعظم کے ماخذ بنے ان میں سے ایک ماخذ مسعود مروزی کا شاہنامہ ہے یہ شاہنامہ چوتھی صدی ہجری کی ابتدا میں نظم کیا گیا تھا ایک اور ماخذ ابو المؤید بلخی کا شاہنامہ ہے یہ بھی اس زمانے میں نثر میں لکھا گیا تھا۔ ایک اور ماخذ ابو علی بلخی کا شاہنامہ ہے لیکن شاہنامہ کا سب سے اہم ماخذ شاہنامہ ابو منصوری ہے۔ یہ شاہنامہ چوتھی صدی کے حاکمِ طوس ابو منصور بن عبدالرزاق طوسی کے حکم پر لکھا گیا تھا اس نے حکم دیا تھا کہ بہت سے عالم ایک جگہ اکٹھے ہو کر قومی داستانوں کو جمع کریں اور ایک شاہنامہ تصنیف کریں ظاہر ہے کہ اس شاہنامہ کے ماخذ بھی وہی اوستائی داستانیں اور پہلوی کتابیں جیسے خوتائی نامک وغیرہ ہی ہیں فردوسی نے اپنے شاہنامے کے بعض اشعار میں ابو منصور کے اس بڑے اقدام کا ذکر کیا ہے۔ فردوسی سے پہلے آخری شاہنامہ گو دقیقی طوسی

تھا اس نے شاہنامہ نظم کرنا شروع کیا لیکن اس کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ اسے مکمل نہ کر سکا۔ دقیقی کے شاہنامے کے صرف ہزار شعر جو ظہور زرتشت اور جنگ گشتاسپ و ارجاسپ سے متعلق ہیں باقی رہ گئے ہیں فردوسی نے دقیقی کے ان اشعار کو اپنے شاہنامہ میں شامل کر لیا ہے اور اسی وجہ سے یہ ہزار شعر زمانہ کی دست برد سے محفوظ رہ گئے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے کئی اسباب کی بنا پر شاہنامہ لکھنے کا ارادہ کیا تھا ایک تو یہ خود اس کی آرزو تھی دوسرے یہ کہ سامانی بادشاہوں نے اس سے پہلے اس کام کا حکم دیا تھا تیسرے یہ کہ ملک کے بزرگوں کی یہی خواہش تھی۔ چنانچہ ابتدا میں فردوسی خوش حال زندگی بسر کرتا تھا اور کسی سے حاجت برآری کا آرزومند نہ تھا وہ اپنے سرمائے سے اس کام پر لگا رہا چنانچہ دقیقی کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ممکن ہے میں بھی دقیقی کی طرح جلد مر جاؤں اس لئے جتنی عمر باقی ہے اور جب تک میرے دم میں دم ہے میں جتنی جلدی ہو سکے اس کتاب کو نظم کر دینا چاہتا ہوں ؎

مگر خود درنگم نباشد بسے　　بباید سپردن بدیگر کسے
و دیگر که گنجم وفادار نیست　　همان رنج را کس خریدار نیست

ادبی محاسن

شاہنامہ کی ادبی خوبیوں میں ادبی زیبائش اور اچھوتی لطافت بھی شامل ہے اس کی بڑی وجہ زبان پر اس کا کامل عبور ہے اس کے کلام کے اور جو نمونے باقی رہ گئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دوسرے شاعروں کی طرح دوسرے اصناف شعر غزل، قصیدہ، رباعی میں بھی طبع آزمائی کی ہے اسے ایران کی قومی داستاں سے خاص لگاؤ تھا اس نے شاہنامہ کے لئے بحر تقارب کا انتخاب کیا یہ وزن رزمیہ شاعری اور حماسہ سرائی کے لئے بہترین وزن ہے فردوسی نے اس

طرز کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ یہ اسی کا حصّہ بن کر رہ گئی فردوسی سے پہلے کا کوئی شاعر اور نہ اس کے بعد کا کوئی شاعر اس کی برابری نہ کر سکا۔ استاد کو خود اپنے کلام کی عظمت کا اندازہ تھا۔ اس لئے کہتا تھا۔

؎ برافگندم از نظم کاخ بلند — کہ از باد و باران نیابد گزند

شاہنامہ کے ساٹھ ہزار اشعار میں سست بھرتی کے شعر یا مہمل اور دوق عبارتیں شاید ہی کہیں ملیں فردوسی نے اپنے کلام میں عربی الفاظ بہت کم استعمال کئے ہیں اور صرف سیدھی سادھی فارسی میں اپنے مطالب ادا کئے ہیں اس پر بھی ان میں بے جان اور بھرتی کے شعر کہیں دکھائی نہیں دیتے۔

شاہنامہ کی ادبی خوبی حکایتوں، ضرب الامثال اور دیگر ۔۔ حسنی باتوں کا بیان کرتا ہے معلوم ہوتا ہے شاعر کا مطالعہ کافی وسیع تھا اس نے اسلامی علوم و معارف اور خاص کر قرآنی نکات سے گہری واقفیت حاصل کی تھی اس کا کلام اس کے دعوی کو یعنی :۔

بسی رنج بردم بسی نامہ خواندم — ز گفتار تازی و از پہلوانی

پوری طرح ثابت کر دکھایا ہے۔

تشبیہ فردوسی کا خاص کمال ہے اس کے لئے بڑی ندرت اور اچھوتے پن کی ضرورت ہے۔ فردوسی نے فطری مناظر میدان جنگ کے نقشے غم و غصہ، شادی و مسرت اور افسوس و محبت جیسے انسانی جذبات کو بڑے ونچ اور روشن انداز میں پیش کیا ہے فردوسی فطرت کے دل فریب مناظر یا انسانی احساسات کی تصویر نہایت دلکش اور دل ربا انداز میں پیش کرتا ہے اس کی یہ خوبی شاہنامہ کے بیشتر اشعار میں پائی جاتی ہے حد یہ کہ بعض سیدھے سادے واقعات پر بھی جیسے روشنابہ اور زلف دوست کی ابتدا میں آئے ہیں بہ لطافت اور بہت تازگی پائی جاتی

ہے اگر ہم شاعر کی داستان سرائی کو لے بیژن اور زال اور رودابہ، بیژن و منیژہ گشتاسپ و کتایون کی دلکش عشقیہ داستانوں کی تفصیل بیان کریں تو یہ بحث بہت طویل ہو جائے گی مختصر یہ کہ جو بھی صاحب ذوق انہیں پڑھے گا وہ فردوسی کی مہارت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ استاد کے قلم سے جو حزنیہ داستانیں نکلی ہیں ان میں سے صرف ایک رستم اور سہراب کی داستان کا نام لینا کافی ہے اس داستان میں انسان کی خونیں قسمت اور اس کے اندوہگین طالع کو بڑے ماہرانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے

فردوسی کی شاعری کی ایک اور خصوصیت اس کے قلم کی تہذیب، کلام کی عفت اور پاک گفتاری ہے پورے شاہنامہ کو کہیں سے اٹھا کر دیکھئے ایک بھی خلاف ادب یا بے شرمی کا لفظ آپ کو دکھائی نہ دے گا۔ یہ ہے کہ جہاں سخت سُست کہنے کی ضرورت پیش آئی ہے وہاں بھی اس نے پردے ہی میں بات کہہ دی ہے کہ اپنے شعر کو رکیک اور ذلیل ہونے نہیں دیا۔

شاہنامے کی اہمیت یہ دل پسند اور رنگین دیوان ایرانیوں کی قومیت کی سند ہے کیونکہ جس زمانہ میں ایرانی زبان اور ایرانی ادبیات عربی ادبیات کے اثر سے پیچھے ڈال دی گئی تھیں اور ایران کی قومی تاریخ اور داستان کئی صدیوں سے متروک اور فراموش ہوتی جا رہی تھی، شاہنامہ نے ان دونوں میں نئے سرے سے جان ڈالی اور انہیں دائمی زندگی بخشی فردوسی کو فارسی زبان کے الفاظ کے استعمال پر بڑی قدرت حاصل تھی اسی نے فارسی زبان کے بہت سے خوبصورت الفاظ کو اپنے رواں اشعار میں استعمال کر کے انہیں دوبارہ رائج کیا اور اس کا کلام آنے والے شاعروں کے لئے نمونہ بن گیا۔

زبان کے سوا شاہنامہ معنی کے لحاظ سے بھی بہت بڑی قدر و قیمت کا مالک

تھا ایران کے پہلوانوں کی شجاعت، عفت، فدا کاری، وفا شعاری اور سربلندی کی داستانیں ہر ایرانی کے لئے درس ہیں اور اسے اسلاف کی یادگار، ایران کی محبت اور اس کی خدمت پر ابھارتی ہیں۔ فلسفیانہ مذہبی، اخلاقی اور اجتماعی مطالب بھی شاہنامہ بزرگ میں کچھ کم نہیں اور مرد بینا ایسے مطالب سے استفادہ کرتے ہیں سبک کی دلکشی، کلام کی ہم آہنگی، پختگی، ربط سخن، ادبی لطافت، شعری دقائق، امثلہ کنایات اور بدیعی محاسن سے پورا شاہنامہ بھرا پڑا ہے۔

(تاریخ ادبیات شاہ ایران۔ رضا زادہ شفق)

عام اتفاق ہے کہ ایران میں اس درجہ کا کوئی شاعر آج تک پیدا نہیں ہوا انوری ان شعراء میں ہے جن کو لوگوں نے فردوسی کا ہمسر قرار دیا ہے چنانچہ مشہور ہے۔

در شعر سہ تن پیغمبر انند   ہر چند کہ لا نبی بعدی

ادبیات و قصیدہ و غزل را   فردوسی، انوری و سعدی

لیکن خود انوری کہتا ہے کہ فردوسی ہمارا خداوند ہے۔ کہ ہم اس کے بندے ہیں۔

آفرین بر روان فردوسی   آں ہمایوں نژاد فرخندہ

آں نہ استاد بود و ما شاگرد   آں خداوند بود و ما بندہ

نظامی کہتے ہیں:۔

سخن گوئے پیشینہ دانائے طوس   کہ آراست زلفِ سخن چوں عروس

علامہ ابن الاثیر نے مثل السائر کے خاتمہ میں لکھا ہے کہ "عربی زبان باوجود اس وسعت وکثرت الفاظ کے شاہنامہ کا جواب پیش نہیں کرسکتی اور درحقیقت یہ کتاب عجم کا قرآن ہے"۔

یورپ کے فضلاء جو زبان فارسی سے واقف ہیں عموماً فردوسی کی کمال شاعری

کے معترف ہیں سر گوردوسلی نے تذکرۃ الشعراء میں فردوسی کو ہومر سے تشبیہ دی ہے اگرچہ ساتھ ہی یہ ناتواں بینی بھی ظاہر کی ہے کہ وہ اگرچہ درحاصل ہومر کا ہمسر نہیں ہوسکتا لیکن ایشیا میں اگر کوئی ہومر ہوسکتا ہے تو وہی ہے ''

لیکن تعجب اور سخت تعجب ہے کہ مسٹر براؤن جو آج کل فارسی دانانِ یورپ میں سب سے ممتاز ہیں فردوسی کے کمال شاعری کے منکر ہیں وہ اپنی کتاب "لٹریری ہسٹری آف پرشیا" میں لکھتے ہیں کہ فردوسی کے بعد جو شاعر پیدا ہوئے وہ شاعرانہ خیالات اور شوکت الفاظ دونوں حیثیت سے فردوسی سے بالاتر ہیں۔ شاہنامہ سبعہ معلقہ کی بھی برابری نہیں کرسکتا صاحب موصوف کو اس پر حیرت ہے کہ شاہنامہ تمام اسلامی دنیا میں اس قدر کیوں مشہور عام ہوگیا پھر خود اس کی وجہ بتائی ہے کہ شاہنامہ میں مسلمانوں کے اسلاف کی فخریہ داستانیں ہیں اس لئے قوم نے اس کا سکہ جما دیا ہم ان سب باتوں کے جواب میں صرف یہ کہتے ہیں ؎

حریف کاوش مژگاں خوں ریزش نہ زاہد ۔۔۔ بدست آور رگ جانی و نشتر را تماشا کن

اب ہم شاہنامہ کے اوصاف کو بیان کرتے ہیں ۔

(۱) اسلام کا خاصہ ہے کہ جہاں جہاں گیا ملک کی زبان سرے سے بدل دی یا اس کو مغلوب کرلیا کہ وہ مستقل اور آزاد زبان نہیں رہی مگر ایران اور ہندوستان سخت جان تھے جہاں ملک کی اصلی زبان قائم رہی لیکن عربی الفاظ اس کثرت سے داخل ہوگئے کہ ان کی آمیزش کے بغیر فارسی یا اُردو لکھنا چاہیں تو لزوم مالایلزم کی محنت اٹھانی پڑتی ہے ۔

ایران میں ابتدا ہی سے عربی نہایت شدت کے ساتھ مخلوط ہوگئی تھی عباس مروزی نے مامون الرشید کی مدح میں جو قصیدہ لکھا اس کے چار شعر آج موجود ہیں جن میں نصف سے زیادہ عربی الفاظ ہیں رودکی اور ابوشکور بلخی وغیرہ کا کلام

الفاظ سے بھرا پڑا ہے اسی زمانہ میں شیخ بو علی سینا نے حکمت علائیہ فارسی زبان میں لکھی اور قصد کیا کہ خالص فارسی میں لکھی جائے لیکن عہدہ برآنہ ہوسکا ۔ فردوسی کی قدرت زبان دیکھو ساٹھ ہزار شعر لکھ کر ڈال دئیے اور عربی الفاظ اس قدر کم ہیں کہ گویا نہیں ہیں۔ اس نے ہر قسم اور ہر طرح کے سینکڑوں گوناگوں مطالب ادا کئے اور زبان کے خالص ہونے میں فرق نہ آنے پایا۔ عربی کے جو الفاظ خال خال آئے ہیں اکثر وہ ہیں جو خاص مصطلح الفاظ ہیں مثلاً دین۔ میمنہ، میسرہ، قلب، سلاح عنان وغیرہ وغیرہ۔ حیرت وہاں ہوتی ہے جہاں فلسفیانہ اصطلاحیں آتی ہیں وہ اس بے تکلفی سے سادی فارسی میں ان کو ادا کرتا جاتا ہے کہ گویا روزمرہ کی باتیں ہیں۔

(۲) ایشیائی تاریخوں کے متعلق عام شکایت ہے کہ ان میں بجز جنگ و خونریزی کے اور کچھ نہیں ہوتا یعنی وہ حالات بالکل نہیں ہوتے جن سے اس زمانہ کے ملکی معاملات اور قوم کی تہذیب و معاشرت کا حال کھل سکے یہ شکایت بہت کچھ صحیح ہے لیکن شاہنامہ اس سے مستثنےٰ ہے شاہنامہ اگرچہ بظاہر صرف رزمیہ نظم معلوم ہوتی ہے لیکن اگر کوئی شخص چاہے تو صرف شاہنامہ کی مدد سے اس زمانہ کی تہذیب و تمدن کا پورا پتہ لگا سکتا ہے مثلاً بادشاہ کیونکر دربار کرتا اور کس ترتیب سے کھڑے ہوتے، آداب دربار انعام و اکرام کا طریقہ، نامہ و پیام کے انداز مجرموں کو سزائیں دینے کا طریقہ، شادیوں کے مراسم، جہیز و عروسی کی رسمیں، دولہا دلہن کا لباس پیش خدمت اور لونڈیوں کے وضع انداز وغیرہ وغیرہ۔

ایشیائی شعراء کا عام قاعدہ ہے کہ کسی داستان کے بیان کرنے میں حسن و عشق کا کہیں اتفاقی موقعہ آجاتا ہے تو اس قدر پھیلتے ہیں کہ تہذیب و متانت کی حد سے کوسوں آگے نکل جاتے ہیں نظامی اور جامی جیسے مقدس لوگ اس حمام میں

آکر ننگے ہوجاتے ہیں لیکن فردوسی ایسے موقعوں پر آنکھ نیچی کئے ہوئے آتا ہے۔ اور صرف واقعہ نگاری کے فرض کے لحاظ سے ایک سرسری غلط انداز نگاہ ڈالتا ہُوا گزر جاتا ہے مثلاً بیژن اور منیژہ کی صحبت عیش کا بیان۔

(۴) عام خیال ہے کہ فردوسی بزم اچھی نہیں لکھتا بے شبہ یوسف زلیخا میں اس کی شاعری کا رُتبہ بہت گھٹ گیا ہے لیکن یہ اس کے رنج وغم اور دل شکستگی کا زمانہ تھا یوسف زلیخا لکھنے سے اس کا مقصد صرف مذہبی جماعت کو خوش کرنا تھا جو اس بات پر فردوسی سے ناخوش تھے کہ اس نے مجوسیوں کی مدح وثنا میں کیوں اس قدر اوقات صرف کی لیکن شاہنامہ میں جہاں جہاں بزم کا موقعہ آیا ہے شاعری کا چمن زار نظر آتا ہے عشقیہ شاعری کی تمام ادائیں وہاں موجود ہیں استعادات اور تشبیہات کا بھی ہلکا سا رنگ ہے شاعرانہ ترکیبیں بھی ہیں کہ از بند جست ومرا کرد بند

(۵) شاعری کا اصل کمال واقعہ نگاری اور جذبات انسانی کا اظہار ہے ان دونوں باتوں میں وہ تمام شعراء کا پیش رو امام ہے وہ جس واقعہ کو لکھتا ہے اس کے تمام جذبات اور گردوپیش کے ہر قسم کے حالات اور واقعات ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پیدا کرتا ہے پھر اس کو اس خوبی کے ساتھ ہوبہو ادا کرتا ہے کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

(۶) رزمیہ میں درد وغم کے اظہار کا کم موقع پیش آتا ہے اور آئے بھی تو بلاغت یہ ہے کہ اس کو زیادہ پھیلایا نہ جائے تاہم کہیں کہیں اس کا موقعہ پیش آگیا ہے تو فردوسی نے اس میں بھی کمال دکھایا ہے سہراب کے مرنے کی خبر سن کر اس کی ماں کی جو حالت ہوئی ہے اور جس طرح اس نے نالہ وزاری کی ہے اس کو اس طرح ادا کرتا ہے ؎

خورشید درجوشید وجامہ درید   بہ زاری براں کودک نارسید

برآورد بانگ و غریو و خروش   زمان تا زمان زو ہمے رفت ہوش

بلاغت کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ کسی واقعہ کے بیان کرنے میں جب حد سے زیادہ زور دینا مقصود ہوتا ہے تو لمبی چوڑی تمہید اور تفصیل وہ کام نہیں دیتی جو ایک پر زور مختصر جملہ کام دیتا ہے شہنامہ میں اس کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں سہراب کی پردرد داستان اس شعر سے شروع ہوتی ہے ؎

کنوں جنگ سہراب و رستم شنو   دگر ہا شنیدستی ایں ہم شنو

رستم افراسیاب کو خط لکھتا ہے اور تہدید کے وسیع مضمون کو ایک مصرعہ میں ادا کرتا ہے

؎ دگر نہ بکام من آمد جواب!   من و گرز و میدان و افراسیاب

۸- صنائع و بدائع شاعری کے زوال کا پیش خیمہ ہیں اس لیے فردوسی کے کلام میں اس کو ڈھونڈنا نہیں چاہیئے، لیکن جو محاسن شاعری ضمناً کسی صفت میں آجاتے ہیں اس کے کلام میں پائے جاتے ہیں اور اعلیٰ درجہ پر پائے جاتے ہیں۔ مثلاً لف و نشر مرتب۔

بہ روز نبرد آں یل ارجمند   بہ شمشیر و خنجر بگرز و کمند
برید و درید و شکست و ببست   یلاں را سر و سینہ و پا و دست

(ماخوذ از شعر العجم شبلی نعمانی)

فردوسی کی کنیت ابوالقاسم ہے اس کے تخلص اور کنیت پر کسی کو اختلاف نہیں، لیکن اس کے نام اور اس کے والد کے نام پر تذکرہ نویسوں میں اختلاف ہے البنداری نے شاہنامہ کے عربی ترجمہ میں اس کا نام حسن بن منصور لکھا ہے لیکن تاریخ گزیدہ میں حسن بن علی اور تذکرہ دولت شاہ سمرقندی اور آتش کدہ میں حسن بن اسحاق بن شرف لکھا

ہے پروفیسر براؤن بھی اس بات پر متفق ہے کہ اس کا نام حسن بن اسحاق بن شرف ہے۔ لیکن فردوسی کے نام اور ولایت پر البنداری کا ترجمہ سب سے قدیمی شاہد ہے اور ایران کے جدید نقاد حافظ محمود شیرانی اور شفق بھی اس سے متفق ہیں اس لئے اس کا نام حسن بن منصور ہی سمجھنا چاہیئے نظامی عروضی سمرقندی نے چہار مقالہ میں فردوسی کے حالاتِ زندگی پر کچھ روشنی ڈالی ہے وہ لکھتا ہے کہ "فردوسی علاقہ طوس میں طابران کے قریب ایک گاؤں باژ کا رہنے والا تھا جہاں اس کے آباء و اجداد کھیتی باڑی کیا کرتے تھے"

فردوسی کا سن پیدائش کسی تذکرہ نویس نے قطعی طور پر نہیں لکھا اور نہ روایات یا اشعار ہی سے اس کا سن پیدائش معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے اس سلسلہ میں قیاس ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے یہ بات حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ شاہنامہ ۴۰۰ ہجری میں مکمل ہوا کیونکہ خود فردوسی کی شہادت اسی سلسلے میں موجود ہے۔

ز ہجرت شدہ پنج ہشتاد بار ٭ کہ من گفتم این نامۂ نامدار

شاہنامہ کی تکمیل کے متعلق چند اور اشعار حسب ذیل ہیں۔

چو سال اندر آمد بہ ہفتاد و یک ٭ ہمی زیر شعر اندر آمد فلک

سی و پنج سال از سرائے سپنج ٭ بسی رنج بردم بہ امید گنج

ان دو اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ جب فردوسی اکہتر سال کا ہوا تو وہ پینتیس ۳۵ سال کی محنت شاقہ کے بعد شاہنامہ مکمل کر چکا تھا گویا ۴۰۰ ہجری میں جب شاہنامہ مکمل ہوا تو اس کی عمر اکہتر سال تھی اس لحاظ سے اس کی پیدائش ۳۲۹ ، ۳۳۰ ہجری ہوتی ہے اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ فردوسی نے ۳۶۵ھ ہجری میں شاہنامہ لکھنا شروع کیا۔

نظامی عروضی سمرقندی کے بقول فردوسی نے خود ہی شاہنامہ لکھنا شروع کیا تھا۔

اور ظاہر ہے کہ اتنی ضخیم اور اہم کتاب ذاتی شوق اور امنگ ہی سے لکھی جا سکتی تھی۔ فردوسی کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ جب شاہنامہ مکمل ہو گیا تو پیری و ناتوانی نے اسے آ لیا حالات بدل گئے خوشحالی کی جگہ افلاس نے لے لی اس لئے فردوسی کو یہ خیال آیا کہ محنت کا کچھ صلہ حاصل کرنا چاہیئے اسی اثنا میں ایک دوست نے مشورہ دیا کہ شاہنامے کو کسی بادشاہ کے حضور میں پیش کیا جائے جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے:

ے به شهرم یکی مهربان دوست بود — تو گوئی که با من بیک پوست بود
مرا گفت کایں نامهٔ شاهوار — اگر گفته آید به شاهی سپار

چنانچہ فردوسی نے سلطان محمود کی شان میں قصیدہ لکھ کر شاہنامے میں شامل کیا اور دربار غزنی میں رسائی حاصل کی صاحب چہار مقالہ کے خیال کے پیش نظر وہ تمام روایتیں غلط ثابت ہوتی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محمود نے فردوسی کو شاہنامہ لکھنے کی فرمائش کی۔ بہر حال دربار غزنویہ میں فردوسی کچھ مدت تک شاہنامہ سنا سنا کر داد تحسین حاصل کرتا رہا لیکن جب انعام و اکرام کا وقت آیا تو حاسدوں نے بدگوئی کی جس کی وجہ سے بادشاہ کا دل مکدر ہو گیا۔ وربقول نظامی عروضی بیس ہزار درہم دے کر ٹال دیا۔ فردوسی اس سلوک سے سخت افسردہ ہوا غسل کرنے کے لئے ایک حمام میں گیا غسل سے فارغ ہو کر باہر آیا عطار سے ایک شربت کا گلاس پیا اور بادشاہ کا انعام حمامی اور عطار میں تقسیم کر کے غزنی سے نکل گیا اس نے محمود کی ہجو کہی اور سر بمہر کر کے محمود کے غلام ایاز کے پاس بھیج دی یہ ہجو کا قصہ بھی محل نظر ہے پروفیسر محمود شیرانی "تنقید بر شعر العجم" میں لکھتے ہیں "کہا جاتا ہے کہ فردوسی محمود کے دربار سے محروم ہوا اس پر اس نے ہجو کہی لیکن یہ ہجو کسی اصل بنیاد پر قائم نہیں موجودہ ہجو دیباچہ بایسنغر مرزا کے عہد سے چلتی ہے اور دیباچہ نگار زیادہ تر اس کا ذمہ دار ہے ہجو کے اکثر اشعار شاہنامے ہی سے نکالے گئے ہیں

گرسماسپ نامہ اور بہمن نامہ سے بھی بعض اشعار حسب ضرورت لئے گئے ہیں کچھ اور نہ معلوم ذرائع سے بھی خوشہ چینی کی گئی ہے پھر اس کالائے دزدیدہ کو مسلسل نظم کی شکل ترتیب دیا گیا اور اس طرح سو شعر کی ہجو تیار ہو گئی"

حافظ محمود شیرانی نے وہ مقامات بھی بتلائے جہاں جہاں سے یہ اشعار لئے گئے ہیں۔ بہر حال فردوسی غزنی سے چل کر ہرات آیا اور ازرقی کے باپ اسماعیل وراق کے ہاں مقیم رہا۔ یہاں سے وہ طبرستان کے حکمران شہریار ناصر ملک کی خدمت میں آیا جہاں اس کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔

ترتیب

شاہنامہ خداوند تعالیٰ کی تعریف وثنا سے شروع ہوتا ہے اس کے بعد عقل و دانش کا بیان ہے پھر رسول کریم اور صحابہ کرام کا ذکر ہے اس کے بعد شاہنامہ کے مواد فراہم کرنے کا حال بیان کیا گیا ہے بعد میں کیومرث کا حال لکھا جو ایران کا اولین بادشاہ ہے اختتام تک پچاس بادشاہوں کی سرگذشت بیان کی ہے شاہنامہ کا خاتمہ ساسانی دور کے آخری بادشاہ یزدجرد اور عربوں کی فتح پہ ہوتا ہے۔

ادبی اہمیت

عربوں کی فتح کے بعد عربی زبان طول و عرض میں رائج ہو گئی اور ایران کی اپنی زبان قصہ ماضی بن کر رہ گئی آخر خلافت عباسیہ میں ملکی حکومتیں قائم ہوئیں تو فارسی زبان کا بھی احیاء ہوا فردوسی نے اس دور میں خالص وطنی نقطہ نظر سے ملکی تاریخ شاہنامے کی صورت میں مرتب کی اور اس طرح ایران کی زبان اور قومی تاریخ دونوں کو ایک نئی زندگی بخشی۔

عربوں کے عہد خلافت میں جو فارسی لکھی جاتی تھی اس میں بیشتر الفاظ عربی کے ہوتے تھے فردوسی کے نزدیک غالباً ایسے الفاظ عرب غلبے کا نشان تھے اس لئے اس نے کوشش کی کہ ان الفاظ سے اجتناب کیا جائے چنانچہ اس نے عربی کے الفاظ

وہیں استعمال کئے ہیں جہاں ان کا استعمال ناگزیر ہے گویا فردوسی نے فارسی زبان کو سہل رواں اور خالص ملکی زبان کی صورت میں پیش کر کے آنے والے ادیبوں کے لئے ایک نئی شاہراہ کھول دی۔

واقعہ نگاری میں فردوسی کو کمال حاصل ہے جو واقعہ بیان کرتا ہے اس کی تمام جزئیات کچھ اس طرح لاتا ہے کہ ہو بہو تصویر کھنیچ جاتی ہے دوسرے سفر میں رستم کا گزر ایک بے آب گیاہ بیابان سے ہوتا ہے گرمی کی شدت کا یہ عالم کہ اُڑتے ہوئے پرندے بھی گر گر پڑتے ہیں "رخش" کا جسم عاجز آجاتا ہے رستم کی زبان سوکھ کر کانٹا ہو جاتی ہے۔

سہراب ایرانی فوج کے ایک سردار کو دیکھتا ہے۔ ہجیر سے ان سب کا اتا پتا پوچھتا ہے یہ شخص کون ہے جو آپے سے باہر ہوا جاتا ہے۔

بجوشد ہمی زمان بہ خروشد ہمی   تو گوئی کہ دریا بجوشد ہمی

جہاں کہیں قدرتی مناظر پیش آئے ہیں ایسے موقلم سے تصویر کشی کی گئی ہے کہ سارا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ فردوسی بیان کو رنگین اور پر زور بنانے کے لئے عموماً ایسی تشبیہیں اور استعارے لاتا ہے جو خالص ایرانی ماحول سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایرانی ماحول سے اگر کوئی مناسب تشبیہہ نہ ملے تو وہ قدرتی ماحول کی طرف رجوع کرتا ہے ؎

بہ تن ژندہ پیل و بجاں جبرائیل   بکف ابر بہمن بدل رود نیل

فردوسی نے رودابہ کے تعارف میں تشبیہات کے گوہر لٹائے ہیں۔

فصیح و بلیغ کلام کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ مختصر اور مدلل ہو اور حقیقت بھی یہ ہے کہ جہاں لمبی چوڑی عبارتیں مؤثر ثابت نہیں ہوتیں وہاں ایک مختصر سا جملہ کام کر جاتا ہے ایران کا سب سے بڑا المیہ یعنی داستان رستم و سہراب

ذیل کے شعر سے شروع ہوتا ہے۔

؎ کنوں جنگ سہراب و رستم شنو دگر ہا شنیدستی ایں ہم شنو

پھر ایک موقعہ پر کہا ہے۔

؎ دگر جز بکام من آید جواب ہمیں گرز و میدان افراسیاب

تنبیہہ اور تہدید کا بڑھے سے بڑا مضمون "ہمیں گرز و میدان افراسیاب" سے بہتر طور پر ادا نہیں کیا جاسکتا۔

جذبات نگاری میں بھی فردوسی کو کمال حاصل ہے ایران اور توران کے دو عظیم ترین بہادر رستم اور سہراب ایک دوسرے کو نہیں جانتے میدان کارزار میں برزآزما ہوتے ہیں انہیں دو بہادروں کی فتح و شکست پر دو عظیم سلطنتوں کی فتح و شکست کا انحصار ہے ان میں ایک باپ ہے دوسرا بیٹا آخر بیٹا باپ کے ہاتھوں مارا جاتا ہے سہراب کی ماں کو اس کا پتہ چلتا ہے اس دردناک کیفیت کو فردوسی نے ایسے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے کہ اس سے بڑھ کر جذبات نگاری کرنا محال تھی اس واقعہ کو فردوسی اس طرح شروع کرتا ہے ؎

خروشید و جوشید و جامہ درید بہ زاری بر آں کودک نارسید

حمید اللہ مستوفی نے فردوسی کا سال وفات ۴۱۶ ہجری لکھا ہے لیکن دولت شاہ سمرقندی کے بیان کے موافق فردوسی کا سال وفات ۴۱۱ ہجری ہے شاہنامے میں فردوسی نے لکھا ہے کہ اب میری عمر اسی سال کی ہے ۴۰۹ اور ۴۱۰ ہجری کے بعد فردوسی نے شاہنامے میں مزید کچھ نہیں لکھا اگر اس کی واردات سنہ ۳۲۹، ۳۳۰ ہجری فرض کرلی جائے تو اس لحاظ سے اس کا سال وفات دولت شاہ سمرقندی کے بیان کے موافق ۴۱۱ ہجری ہی درست معلوم ہوتا ہے۔

(ماخوذ از ادب نامہ ایران مقبول بیگ بدخشانی)

ناصرِ خُسرو

حکیم ناصر خسرو بن حارث قبادیانی ۳۹۴ھ میں بمقام قبادیان حوالی بلخ پیدا ہوئے چنانچہ خود کہتے ہیں۔

بگذشت ز ہجرت پس سی صد نود و چار — بنہاد مرا مادر بر تودہ اغبر

جوانی ہی سے ناصر خسرو نے علوم و فضائل تحقیق ادیان و عقائد، ایران و عرب کی شاعری کا مطالعہ شروع کیا اور ہر خرمن سے خوشہ چینی کی یہاں تک کہ مقام دانش پر فائز ہوتے خود کہتے ہیں:-

بہر نوعی کہ بشنیدم ز دانش! — نشستم بہ در او من مجاور
نماند از ہیچ گوں دانش کہ من زاں — نکردم استفادہ بیش و کمتر

ناصر خسرو نے سلطان محمود اور سلطان مسعود غزنوی کے دربار بھی دیکھے چنانچہ اپنے سفرنامے میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے اس کے بعد انہیں سلجوقی دربار کی دیوانی کی خدمت ملی اور وہ دبیر رہے۔ ناصر خسرو نے تحصیل علم اور تحقیق کے سوا سفر بھی بہت کئے تھے اور جوانی ہی میں ہندوستان، افغانستان اور ترکستان کا سفر کر چکے تھے غالباً اس سیر و سیاحت کا مقصد مختلف قوموں کے حالات اور ان کے عقائد کی تحقیق تھی چنانچہ انہوں نے حجاز میں طول طویل سفر کئے اور اس کے بعد اس بارے میں اپنی تحقیقات کے نتائج پیش کئے ان کا یہ سفر سات سال میں پورا ہوا اس کی ابتدا ۴۳۷ھ میں ہوئی اور انہوں نے حجاز، ایشیائے کوچک، شام اور مصر کی سیاحت کی اور ان ملکوں کی مختلف قوموں اور مذہبوں سے واقفیت حاصل کی خاص کر انہوں نے مصر میں اسماعیلہ شیعوں سے دینی مطالب اور تفسیر کی تعلیم حاصل کی، اسماعیلہ

امام جعفر صادق کے فرزند اسماعیل کو امام ہفتم اور ان کے فرزند محمد کو امام قائم اور اپنے والد کے جانشین مانتے ہیں یہ لوگ اپنے عقائد چھپاتے تھے اور باطنی تھے ناصر خسرو نے ان سے روابط پیدا کئے اور ان کا مذہب اختیار کر لیا اور اس طریقہ سے متعصب گروہ میں داخل ہو کر ایرانیوں میں اس مذہب کی تبلیغ کے لئے ایران کا رخ کیا۔ ناصر خسرو کے اس سفر کا ایک اہم نتیجہ ان کا سفرنامہ ہے جو سفر سے واپس آنے کے بعد لکھا گیا ہے اس سفر سے واپس آنے کے بعد ناصر خسرو بلخ گئے اور اعلانیہ اسماعیلی عقائد کی تبلیغ شروع کر دی اس سلسلہ میں انہوں نے علماء سے مباحثے کئے ان کے عجیب وغریب عقائد کی وجہ سے بہت جلد سنی علماء اور فقہا ان سے ناراض ہو گئے اور سلجوقی امراء سے ان کی شکایت کی سلجوقی امراء نے ان کے خلاف تادیبی رویہ اختیار کیا اور ناصر خسرو وہاں سے فرار ہو کر روپوش ہو گئے اس روپوشی اور آوارہ گردی کی یادگار کتاب "زاد المسافرین" ہے اور اس میں اسماعیلی عقائد کے بنیادی مسائل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور فلسفیانہ مقالات اور تحقیقاتیں درج کی ہیں اس کتاب کا شمار فارسی زبان کی گنتی کی چند فلسفیانہ کتابوں میں ہوتا ہے

سفرنامہ اور زاد المسافرین کے سوا ناصر خسرو نے وجہ دین اخوانی الخوان دلیل المتحیرین، روشنائی نامہ، سعادت نامہ اور دیوانِ اشعار بھی اپنی یادگار چھوڑا ہے اپنی تصانیف کی کثرت کے بارے میں خود کہتے ہیں ؎

منگر بدیں ضعیف تنم زآنکہ در سخن   زیں چرخ پرستارہ فزونست اثرم

ناصر خسرو کے دیوان کے اشعار کی تعداد تیس ہزار تک لکھی ہے لیکن اب اس میں بارہ ہزار سے زیادہ اشعار نہیں ہیں اور اس میں فلسفیانہ، اخلاقی اور مذہبی عبرت آموز قطعات بہت ہیں۔

سبک اور شاعری قصیدوں میں ناصر خسرو کی استادی مسلم ہے اور قصیدہ کے

بعد ان کی مثنوی ہے۔ انہوں نے شعر کی دوسری قسموں کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی ہے ناصر خسرو کے بیشتر قصائد کا موضوع دینی مسائل پر بحث واستدلال ایمان اور معنویت کی دعوت، مادی دنیا کی تحقیر اس فانی دنیا کی آرائشوں اور فریبوں سے اعراض، ریاضت وتقویٰ کی تشویق اور ظاہر و باطن کی طرف رجوع کی تحریک ہے اس لحاظ سے ناصر خسرو کے اشعار اور دوسرے مشہور قصیدہ سراؤں کے اشعار میں بڑا فرق ہے ایک نمایاں فرق تو یہ ہے کہ ناصر خسرو کے اشعار تغزل اور مدح سرائی سے خالی ہیں

ان کی نظر میں حقیقت کی دریافت کے لئے روشن ترین راستہ علم کا راستہ ہے اسی لئے انہوں نے اپنے قصیدے دانش وبینش کی فضیلت میں لکھے ہیں کہتے ہیں :-

علم وادب را طلب کن گر طرب جوئی ہمی ؎ تا بشاخ علم وحکمت بر طرب یابی رطب

ناصر خسرو ایک آزاد، صاحب نظر، ایماندار اور دیانت دار شاعر تھا۔ دیانت، روحانی اور اخلاقی امور کا مدار فکر ہے ناصر خسرو نے نہ صرف ان عقائد کو نظم کا جامہ پہنایا ہے بلکہ وہ خود بھی ان پر یقین رکھتے تھے اس یقین کی وجہ سے ان میں قلبی قوت، فکر رسا اور معنوی فراغت پیدا ہو گئی ہے وہ ہر جگہ اپنے ایمان سے استناد کرتے ہیں اس لئے انہیں قلب کا اطمینان اور سکونِ خاطر حاصل تھا۔ جو ایمان کا پھل ہے ان کی یہ کیفیت ان کے کلام سے ظاہر ہے۔ ایمان کی اسی بلندی اور اوج معنوی سے ناصر خسرو عبرت انگیز اور پند آمیز اشعار پیش کرتے ہیں ان کے اشعار میں مئی و معشوق اور اور باغ وچمن کی جگہ روحانی اور اخلاقی مطالب ملتے ہیں ان کی یہی خصوصیت ان کی اور تحریروں اور اصطلاحوں میں نظر آتی ہے یہی خصوصیت ان کی شاعری

ایک مخصوص رنگ دے دیتی ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ کوئی فرخی کا قصیدہ سن کر اسے عنصری کا سمجھ لے لیکن ناصر خسرو کا سبک دوسروں سے اتنا ممتاز ہے کہ ان کے کلام کا لحن اور انداز ہی سب سے نرالا نظر آتا ہے۔

تذکروں میں ناصر خسرو کی وفات کا سال ۴۸۱ھ ہجری لکھا ہے ان کی قبر صوبہ بدخشاں کے قصبہ یمگان میں موجود ہے۔

(تاریخ ادبیات ایران رضا زادہ شفق)

حکیم ابو معین ناصر بن خسرو بن حارث القبادیانی البلخی المروزی ایران کے بلند پایہ شاعروں سے ایک تھا ان کی ولادت ذلیقعدہ کے مہینے میں ۳۹۴ھ ہجری کو بلخ کے قریبی علاقے قبادیاں میں ہوئی اور حجت کے تقلید سے مشہور ہوئے اس کے درج ذیل دو شعروں میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

یکی رایگاں حجتی گفت بشنو ز حجت مرین حجت رائگاں را

ای حجت زمین خراساں بسی نماند تا اہل جہل روز و شب خویش بشمرند

ناصر خسرو نے سفرنامے میں اپنے آپ کو قبادیانی مروزی لکھا ہے اور قبادیان سے اس کی نسبت اس شعر سے ظاہر ہے

پیوستہ شدم نسب بیمگاں کز نسل قبادیاں گسستم!

لیکن مروزی کی طرف شاعر خود اپنے سفرنامے میں اشارہ کرتا ہے اس کی نسبت مرو کے علاقہ میں قیام کی وجہ سے ہے

ناصر خسرو کی منظومات اور نثری کارناموں سے اس کے علم و حکمت کا پتہ چلتا ہے اس نے آغاز شباب سے ہی علوم و فنون کی تحصیل کے لئے محنت شروع کی۔ قرآن کو حفظ کیا اور اپنے عہد کے تمام علوم معقول و منقول اور خاص طور پہ

یونانی حکمت کے علوم میں مہارت حاصل کی۔ علم کلام میں بھی کافی سوجھ بوجھ رکھتا تھا اس کی منظومات کا نمونہ وہ دیوان ناصر خسرو ہے جو کہ حاجی سید نصراللہ تقوی نے اپنی زیر نگرانی تصحیح فرماکر شائع کیا ہے اور اس میں مجموعی طور پر گیارہ ہزار ستائیس شعر ہیں گویا یہ تعداد اس کی منظومات کا ایک حصہ ہوگا کیونکہ دولت شاہ سمرقندی نے اس کے اشعار کی تعداد تیس ہزار لکھی ہے

دوسرا شعری نمونہ روشنائی نامہ کے نام سے ہے اور تیسرا سعادت نامہ روشنائی نامہ میں پانچ سو بانوے اشعار سے کسی حد تک کم۔ بحر ہزج میں ہیں اور ان کا موضوع پند و موعظت ہے حکمت ہے سعادت نامہ تین سو اشعار پر مشتمل ہے۔ اور روشنائی نامہ کی طرح اس میں بھی پند و موعظت کے مضامین ہیں۔

ناصر خسرو بلاشبہ فارسی کے بڑے بڑے شاعروں اور نثر نگاروں میں سے ہے اس کے کلام میں پختگی ہے اور اس کا ایک خاص اور نادر اسلوب ہے اس شاعر کی زبان سامانی دور کے آخری شاعروں سے ملتی جلتی ہے اور اس کے اسلوب کلام کی قدامت غزنوی دور کے پہلے حصے کے شعراء کے اسلوب کی نشاندہی کرتی ہے اس کے دیوان میں ایسے کلمات اور ایسی نحوی ترکیبوں کا استعمال ہوا ہے جو چوتھی صدی کے آخری حصہ میں مروج تھے اس طرح ناصر خسرو نے جس جگہ ضروری سمجھا ان جدید عربی ترکیبات کو جو سامانی دور کے شعری سرمایہ میں مستعمل ہوئیں استفادہ کرکے ان سے اپنے شعروں میں کام لیا ہے۔

جن دنوں ناصر خسرو مرو میں تھا اور "دیوانی" کے انتظامات میں مشغول تھا کسائی مروزی کی شہرت کا چرچا زبان زد عام تھا چنانچہ اسی وجہ سے ناصر خسرو نے حکیمانہ اور زاہدانہ افکار کے علاوہ سبک و اسلوب کے لحاظ سے بھی اس کا تاثر قبول کیا اور اس کے قصائد کے جواب میں خود بھی قصیدے لکھے۔

اس کے بعد چونکہ ناصر خسرو کی طبیعت میں تبدیلی آگئی اور وہ اسماعیلی مذہب کا پیرو کار بن کر تبلیغ کے لئے خراساں چلا گیا اور اس کے اشعار میں مذہبی رنگ غالب آگیا۔ شاعر نے چونکہ کسی وقت بھی مذہبی تبلیغ کا خیال نہ چھوڑا اس لئے اس کے قصائد کے مقدمات اور نتائج میں جن خیالات و افکار کا اظہار کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مبلغ کسی محفل میں اپنے عقائد کی دعوت دے رہا ہے۔

ناصر خسرو درباری شاعر ہے اور اگر کسی زمانے میں ہوگا تو اس عہد کے اشعار ہم تک نہیں پہنچے وہ ان پرانے حکیم شعرا میں سے جنہوں نے حکمت و موعظت کے بیان میں مکمل مثنویاں لکھ ڈالیں اور اس کے قصائد بھی ان افکار سے خالی نہیں ہیں۔

اس کا اپنا قول ہے کہ در قیمتی لفظ دری را در پای خوکاں نمی ریخت و چول از دنیا و اہل آں منقطع شدہ وچنگ در دامان ولدی علی وآلی او زدہ بود، بدنیا نظری نداشت و بایں حال حاجتی لستانش "خوکاں" احساس نمی کرد۔

نمونہ اشعار یہ ہے۔

آزردہ کرد کثردم غربت جگر مرا گوئی زبون نیافت زگیتی مگر مرا

نکوہش مکن چرخ نیلوفری را بروں کن ز سر باد خیرہ سری را

سلام کن ز من ای باد مر اخراساں را مر اہل فضل و خرد را نہ عام و ناداں را

از گردش گیتی گلہ روا نیست! ہر چیست کہ نیکش را بقا نیست

صبا باز، گل چہ بازار دارد! کہ ہموارش از خواب بیدار دارد

مکر و حسد را نہ دل آواز کن　　　ایں تن خفتہ است را بیدار مکن

(تاریخ ادبیات در ایران ذبیح اللہ صفا)

سلجوقی عہد کا ایک اور نامور شاعر حکیم ناصر خسرو ہے جس نے شاعری کو مذہبی عقائد کی نشر و اشاعت کا وسیلہ بنایا۔

ناصر کی کنیت ابو معین اور لقب حجت ہے جو اسے فاطمی خلیفہ مستنصر باللہ کی طرف سے ملا تھا اس لقب کو وہ اکثر اشعار میں تخلص کے طور پر لاتا ہے۔

ناصر خسرو بلخی شہر قبادیان میں ۳۹۴ ہجری میں پیدا ہوا اسے علم حاصل کرنے کا شوق تھا چنانچہ قرآن مجید حفظ کیا　　فقہ کی تعلیم پائی۔ ریاضی، طب، موسیقی، نجوم و فلسفہ اور علم الکلام میں کمال حاصل کیا ناصر خسرو کو مختلف مذاہب کی تحقیق کا بہت شوق تھا چنانچہ اس نے مذہب زرتشت مذہب مانیہ، یہود و نصاریٰ اور ہندوؤں کے مذاہب کا بہت گہرا مطالعہ کیا۔

ناصر خسرو فارغ التحصیل ہونے کے بعد کچھ عرصہ غزنوی بادشاہوں محمود اور مسعود کے درباروں سے وابستہ رہا بعد میں دربار سلجوقیہ کی ملازمت اختیار کر لی یہاں اسے دبیری کا منصب عطا ہوا پھر محکمہ مال کے ایک ذمہ دار عہدے پر بھی فائز ہوا آخر پینتالیس سال کی عمر میں ملازمت کو خیرباد کہہ کر ۴۳۷ ہجری میں حج کعبہ کو روانہ ہوا اس نے سیاحت کے دوران میں اپنا سفرنامہ مرتب کیا اس میں ان شہروں کا مفصل حال ہے جہاں جہاں اس کا گزر ہوا اس سفرنامے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ مصر میں تین سال مقیم رہا یہاں وہ فاطمی خلیفہ المستنصر کے نظم و نسق، عدل و انصاف اور شان و شکوہ سے بہت متاثر ہوا اس کے علاوہ اسماعیلی عقائد کا بھی اس پر بہت اثر ہوا چنانچہ قیام مصر کے دوران وہ اس نئے دین کا

حلقہ بگوش ہو گیا خلیفہ نے اسے "حجت" کے لقب سے نوازا اور اسے اختیار دیا کہ وہ ایران جاکر اسماعیلیہ عقائد کی نشر و اشاعت کرے۔

ناصر خسرو اور حجاز سے لوٹ کر بلخ واپس آگیا یہاں اس نے دین اسماعیلیہ کی اشاعت کرنی چاہی لیکن علماء اسلام اور امرء سلجوقیہ نے اس کی شدید مخالفت کی کوئی ضرر ایسا نہ تھا جو اسے نہ پہنچایا جاتا وہ سخت بے بس تھا لیکن دین اسماعیل کی محبت میں وہ سب کچھ برداشت کرتا اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بلخ کو خیر باد کہہ جائے۔ ناصر خسرو یہاں سے چل کر پوشیدہ طور پر اسماعیلی عقائد کی اشاعت کرتا رہا لیکن جہاں کہیں جانا اس کے لئے پریشانیاں پیدا ہو جاتیں اس مسافرت میں اسے بہت سی تکالیف جھیلنی پڑیں ؎

آزردہ کرد کژدم غربت جگر مرا گوئی زبون نیافت ز گیتی مگر مرا

اس غریب الوطنی کی یادگار اس کی تصنیف "زاد المسافرین" ہے اس کتاب میں ناصر خسرو نے اسماعیلی عقائد کو دلائل و براہین سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ متعدد فلسفیانہ اور محققانہ مقالات بھی لکھے ہیں اس لحاظ سے "زاد المسافرین" کا شمار فارسی کی معدودے چند فلسفیانہ کتابوں میں ہوتا ہے اس نے یمگان میں گوشہ نشینی اختیار کی اور ۴۸۱ ہجری میں وفات پائی

"سفر نامہ اور "زاد المسافرین" کے علاوہ ذیل کی کتابیں بھی حکیم ناصر خسرو کی یادگار ہیں۔

(۱) **وجہ دین**:۔ یہ کتاب نثر میں ہے اور اس میں اسماعیلیہ عقائد کی وضاحت کی گئی ہے۔

(۲) **روشنائی نامہ**:۔ مثنوی روشنائی نامہ بحر ہزج میں ہے اس میں عقل و دانش علم اخلاق اور علم الٰہیات پر بحث کی گئی ہے۔

۳- سعادت نامہ :- مثنوی سعادت نامہ کا موضوع اخلاقیات ہے یہ مثنوی تیس ابواب اور دو سو ستاسی اشعار پر مشتمل ہے یہ بھی بحر ہزج میں ہے

۴- دیوان :- کہا جاتا ہے کہ ناصر خسرو کا دیوان تیس ہزار اشعار پر مشتمل تھا- لیکن آج کل جو دیوان ملتا ہے اس میں کل گیارہ ہزار اشعار ہیں ناصر خسرو کا دیوان فلسفہ اخلاق پند و موعظت، عقل و دانش اور مذہب ایسے موضوعات پر مشتمل ہے آپ نے متعدد قصیدے بھی لکھے ہیں یہ قصیدے کسی کی مدح و ستائش میں نہیں بلکہ ان میں عقل و دانش کی فضیلت اور دینی مسائل پر بحث کی گئی ہے

ناصر خسرو کے اشعار کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ صاحب نظر اور آزاد منش شاعر ہے اس کے افکار و خیالات سے اس کی ذاتی دیانت اور خلوص ٹپکتا ہے اشعار میں مدح معشوق کے بجائے روحانی اور اخلاقی مطالب ملتے ہیں- شعر و فکر میں ناصر کا ایک خاص انداز ہے کسی شخص کو فرخی کا قصیدہ پڑھ کر یہ گمان ہو سکتا ہے کہ یہ عنصری کا قصیدہ ہے لیکن ناصر خسرو کا قصیدہ پڑھ کر یہ گمان نہیں گزرتا کہ یہ اس کے سوا کسی اور کا قصیدہ ہو سکتا ہے- دیوان میں کچھ قطعات بھی ہیں-

---

(ماخوذ از ادب نامہ ایران مقبول بیگ بدخشانی)

بابا طاہر

بابا طاہر ہمدان کے رہنے والے تھے عارفوں کا مسلک درویشی اور فروتنی ہے اسی لئے بابا طاہر گوشہ گیر رہے اور گمنام زندگی بسر کی اور اپنی زندگی کے تفصیلی حالات بھی نہ چھوڑے صرف بعض صوفیا کی کتابوں میں ان کے معنوی مقام سلوک وریاضت درویشی اور ان کے تقویٰ اور استغنا کا ذکر ملتا ہے ان کی زندگی کے حالات کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے وہ بس اتنا ہے کہ پہلے سلجوقی بادشاہ طغرل سے ۴۴۷ھ میں بمقام ہمدان ان کی ملاقات ہوئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچویں صدی کے وسط میں شیخ کی کافی شہرت ہو چکی تھی اسی سے خیال ہوتا ہے کہ شاید وہ چوتھی صدی ہجری کے آخر میں پیدا ہوئے ہونگے بابا طاہر صاحب دل اور دردمند شاعر تھے ان کے نغمے ان کے سوز دروں کے شاہد ہیں۔ انہوں نے عربی اور فارسی میں بھی چند رسالے لکھے ہیں ۔

ان رسالوں میں ایک بابا طاہر کے مختصر عربی اقوال کا مجموعہ ہے اس میں انہوں نے علم و معرفت ذکر و عبادت وجد و محبت کے بارے میں صوفیانہ عقائد کو مختصر اور موثر جملوں میں بیان کیا ہے ایران میں بابا طاہر کی شہرت کی بڑی وجہ ان کی پر اثر شیریں اور عارفانہ دوبیتی ہے ان دوبیتوں کا وزن عام رباعیوں کے وزن سے کسی قدر مختلف ہے یہ رباعیاں ایک ایسی زبان میں کہی گئی ہیں جو لری زبان سے مشابہ ہے اسی لئے انہیں قدیم کتابوں میں "فہلویات" کے نام سے یاد کیا گیا ہے ان تمام سیدھی سادی اور پر اثر رباعیوں میں شاعر نے دنیا کی وحدت، انسان کی دور افتادگی اور اپنی پریشانی تنہائی، بے مقداری

اور بے حیثیتی کا ذکر کیا ہے ہجران کی شکایت کی ہے اور اپنی طلب معنوی کے کے اشتیاق کا اظہار کیا ہے۔

بابا طاہر نے ہمدان میں وفات پائی اور اسی شہر میں مدفون ہوئے ذیل میں ان کی چند درد ناک اور شیریں رباعیاں نمونے کے طور پہ درج کی جاتی ہیں:-

دلی دیرم خریدار محبت | کزو گرمست بازار محبت!
لباس بافتم برقامت دل | زپود محنت و تار محبت

دیدم لالۂ در دامن خار | وتم آلا لیا کی چینیت یار
بگفتا باغیاں معذور میدار | درخت دوستی دیر آورد بار

موآں رندم کہ نامم بی قلندر | نہ خوں دیرم نہ موں دیرم نہ لنگر
چو روز آید بگردم گرد کوبت | چو سو آیہ بخشتاں وانہم سر

ان چند دلکش رباعیوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا وزن اور ان کے الفاظ کا تلفظ مخصوص ہے ان الفاظ کی شکل ایران کی قدیم زبان جیسی ہے اور پہلوی زبان سے بہت زیادہ ملتی جلتی ہے مثلاً ان میں "من کی جگہ "مو" اور گویُم کی جگہ " وتم" استعمال کیا گیا ہے۔

(تاریخ ادبیات ایران رضا زادہ شفق)

باباطاہر عریاں ہمدانی پانچویں صدی کے شاعروں میں سے ایک اور طغرل

بیگ سلجوقی کا ہمعصر تھا اس کی ولادت چوتھی صدی ہجری کے آخری برسوں میں ہوئی کیونکہ پانچویں صدی کے وسط یعنی ۴۴۷ ہجری میں جب طغرل بیگ ہمدان گیا تھا وہ عارف کامل اور صاحب مقام بزرگ تھے، عام روایت ہے کہ "سلطان طغرل بیگ جب ہمدان آیا تو

اس کو کہا کہ اے ترک! خلق خدا کے ساتھ کیسا سلوک کرو گے سلطان نے کہا جیسا تو کہے بابا طاہر عریاں نے کہا کہ خدا کا فرمان ہے ان اللہ یامر بالعدل والاحسان --- بے شک اللہ عدل و انصاف کا حکم کرتا ہے) سلطان کے آنسو نکل آئے اور کہنے لگا کہ ایسا ہی کروں گا بابا طاہر کے پاس اس ٹوٹے ہوئے لوٹے کی ٹونٹی انگلی میں تھی جس سے سالوں تک وہ وضو کرتا رہا تھا اس کو ہاتھ سے علیحدہ کیا اور سلطان کی انگلی میں پہنا دی اور کہنے لگا کہ میں نے دنیا کی سلطنت تیرے ہاتھ میں دے دی عدل و انصاف پر قائم رہ۔ بادشاہ اس کو تعویذوں کے درمیان اس کو ساتھ رکھتا تھا اور جب کوئی مشکل درپیش ہوتی اس کو انگلی میں پہن لیتا۔ ہدایت نے ان کی وفات ۴۱۰ ہجری لکھی ہے اور یہی معتبر اور درست معلوم ہوتی ہے۔

بابا طاہر عریاں کی یادگار "کلمات قصار" کا عربی میں مجموعہ باقی رہ گیا ہے اس میں اپنے عقائد عرفانی کو علم و معرفت، ذکر و عبادت اور وجد و محبت کے ضمن میں بیان کیا ہے ایک دوسرا مجموعہ زبان لہری کے لہجے میں ترانوں پر مشتمل ہے۔ ان کے اشعار نہایت لطیف انداز اور پر معنی خصوصیات کے حامل ہیں لیکن عام فارسی سخندانوں نے ان میں تصرفات کر دیئے ہیں اور اپنی اصلی حالت سے ہٹ کر فارسی دری کے نزدیک ہو گئے ہیں استادِ فاضل آقائی عبینیٰ استنبول کی لائبریریوں میں سے بابا طاہر کے کچھ اشعار لائے ہیں جو بالکل

دری کے اصل لہجہ میں ہیں ان اشعار کا جب باباطاہر کی موجودہ رباعیات سے موازنہ کرتے ہیں تو ان میں بہت سا اختلاف پایا جاتا ہے

ان رباعیات میں سے جو باباطاہر عریاں کے نام سے منسوب ہیں کچھ درج ذیل ہیں۔

اگر دلبر و دلبر کدومہ — وگر دلبر دلو دلرا چہ نومہ
دل و دلبر بہم آمیتہ دیتم — نذانم دل کہ و دلبر کدومہ

یکی برزیگری نالون دراین دشت — بچشم خون فشان آلالہ می کشت
ہمی کشت و ہمی گفت ای دریغا — کہ باید کشتن و ہشتن دراین دشت

جرہ بازی بدم رفتم بہ نخچیر — بہ دستی زدہ بربال مو تیر
بورہ غافل مچر درچشمہ ساران — ہر آں غافل چرا غافل خوارہ تیر

(تاریخ ادبیات در ایران ذبیح اللہ صفا)

طاہر نام، عریاں تخلص اور آپ کا وطن ہمدان ہے۔ مسلک درویشی تھا اس لئے عمر بھر گوشہ نشین رہے آپ کی زندگی کے حالات تفصیل سے کسی تذکرے میں نہیں ملتے بعض صوفیاء کرام کے تذکروں میں البتہ آپ کی ریاضت، درویشی تقویٰ اور استغنا کا ذکر آتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ۴۴۷ھ میں اولین سلجوقی بادشاہ طغرل بیگ سے آپ کی ملاقات ہوئی تھی۔

باباطاہر عریاں حساس اور دردمند دل رکھتے تھے ان کی یادگار چند قطعات

ہیں جو رباعیات کے نام سے مشہور ہیں یہ قطعات باباطاہر کے قلبی سوز و گداز کا پتہ دیتے ہیں اور بہت شیریں اور مؤثر انداز میں لکھے گئے ہیں۔ مسٹر ہیرن ایلن نے "فغان باباطاہر" کے نام سے انگریزی نثر میں ان کا ترجمہ کیا ہے باباطاہر کے یہ قطعات مقامی بولی لری میں لکھے گئے ہیں جو پہلوی زبان سے قریب تر ہیں۔

باباطاہر عُریاں کا انداز بیان سادہ اور رواں ہے خیالات بھی سادے ہیں ان میں فلسفہ یا گہرائی نہیں آپ کے کلام میں بالعموم انہیں واردات و کیفیات کا ذکر آتا ہے جن سے ہر صاحب دل کو واسطہ و سابقہ پڑتا ہے جو شخص ان کا کلام پڑھتا ہے سمجھتا ہے کہ انہوں نے اس کے دل کی ترجمانی کی

آپ کے قطعات میں اخلاق و عرفان، ہجر و فراق، درد و غم، ایذاکشی اور ایذاطلبی کے مضامین پائے جاتے ہیں۔

(ادب نامہ ایران مقبول بیگ بدخشانی)

عمرِ خیام

ابو الفتح عمر بن ابراہیم جس کا شمار ایران کے بہت بڑے شاعروں اور دانشمندوں میں ہوتا ہے۔ سلجوقی دَور میں بمقام نیشاپور پیدا ہُوا۔

خیام کے حالات زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے خراسان کے مختلف شہروں جیسے طوس، بلخ، بخارا اور مرو کی سیاحت کی تھی بلکہ وہ بغداد بھی گیا تھا اور ایک روایت کی رو سے اس نے حج بھی کیا تھا خیام اپنے زمانے میں بہت بڑے علماء اور فضلاء میں شمار کیا جاتا تھا اور چوٹی کے علماء جیسے غزالی اور سلجوقی سلاطین اور سلجوقی دور کے امراء جیسے ملک شاہ سلجوقی اور خواجہ نظام الملک طوسی سے تعلقات رکھتا تھا سلطانی مجالس اور علمی ادبی محافل میں عزت کے ہاتھوں لیا جاتا اور احترام کے ساتھ صدر میں بٹھایا جاتا تھا۔

ہمارا یہ حکیم شاعر اپنے زمانے کے اکثر علوم اور خاص کر نجوم، ہیئت اور حکمت میں بڑی مہارت رکھتا تھا چنانچہ ملک شاہ نے تقویم کی اصلاح کے لئے جن بڑے بڑے منجموں کو مقرر کیا تھا ان میں سے ایک خیام بھی تھا ملک شاہ کا بیٹا سنجر مرض آبلہ میں مبتلا تھا خیام نے اس کا کامیاب علاج کیا علم حکمت اور دوسرے علوم میں وہ حجۃ الاسلام غزالی جیسے علماء سے مباحثے کیا کرتا تھا۔

خیام کی شہرت کی بنیاد بہت بڑی حد تک اس کی رباعیاں ہیں ان رباعیوں کو اس نے حساب، نجوم، طب اور حکمت کے باریک مسائل کی تحقیق

سے تھک کر پریشان ہو جانے کے بعد تفریح طبع اور اپنے تاثرات کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے کہا ہے ان رباعیوں میں اس نے نہایت بلند افکار کو نہایت سادہ اور شیریں زبان میں ادا کیا ہے۔ خیام سے پہلے شہید بلخی، ابوشکور بلخی، رودکی اور ابوسعید اور دوسرے رباعی گو شاعروں نے بھی رباعیاں کہی ہیں بلکہ انہوں نے وہ مضامین بھی باندھے ہیں جو خیام کا خاص موضوع ہیں چنانچہ اس رباعی کو شہید بلخی سے منسوب کیا گیا ہے ؎

دیدم چندی نشستہ بر جای خروس　　در دشتم گذر افتاد بویرانۂ طوس
گفتا خبر این است کہ افسوس افسوس　　گفتم چہ خبر داری ازیں ویرانہ

لیکن خیام کی رباعیوں کا انداز، ان کی لطافت، ان کی تاثیر اور ان کی تازگی کچھ اور ہی ڈھنگ کی ہے اس کی اکثر رباعیاں عبارت کے لحاظ سے مختصر لیکن مطالب و معانی کا سمندر ہیں گویا جب استاد عقل و برہان کے راستے عالم کے مسائل کے حل کرنے سے تھک جاتا ہے تو بے اختیار ہو کر اپنے احساسات کو راہ دینے پر مجبور ہو جاتا اور اپنی حیرت، تاثر، رقت اور اپنے فکری بوجھ کو شعر کے سانچے میں ڈھال دیتا اور انہیں زبان شعر عطا کر دیتا ہے وہ بیکراں اور بلند ترین فضاؤں میں اڑتا اور عقل و خرد کو شعر و تخیل کے پر لگا دیتا ہے۔

خیام کی شاعری اور فلسفہ

خیام کی رباعیاں تعداد کے لحاظ سے کم اعتبار کے لحاظ سے سادہ لیکن معنی کے لحاظ سے بہت بلند پایہ اور قابل توجہ ہیں حق یہ ہے کہ اس نے نہایت لطیف اور حکیمانہ خیالات کو دوبیتی کے سانچے میں ڈھال کر انہیں موثر ترین انداز میں پیش کیا ہے ؎

خیام کی رباعیوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے حکیم شاعر کا دل بعض باتوں سے بہت متاثر تھا ان باتوں پر اس کا دل جلتا تھا اور اس نے اپنی عمر ان ہی لا دوا دردوں کے علاج پیچھے گذاری ہے لیکن جب اسے اپنے درد کی تسکین کی کوئی دوا دکھائی نہیں دیتی تو وہ ناچار اسی انمسدنی نباؤ سے مجبور ہوکر اپنے ضمیر کی تسکین کے لئے شعر کے دامن میں پناہ لیتا ہے

شاعر کا پہلا دلی تاثر تو وہی انسان کی نادانی اور بے خبری ہے آفرینش کا راز اسے معلوم نہیں دنیا کے معتے اس کے بس کے نہیں کوئی ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ ہم کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں زندگی کی یہ گیر و دار کیا ہے اور انسان زندگی کی اس بھول بھلیاں میں ایسا مایوس اور ایسا دل گرفتہ کیوں بھٹکتا پھر رہا ہے۔

دوری کہ درو آمدن و رفتن ماست — اورا نہ بدایت نہ نہایت پیداست
کس می نزند دمی دریں معنی راست — کیں آمدن از کجا و رفتن بکجا ست

شاعر کا دوسرا غم جس کے بوجھ تلے اس کا دل خون ہوا جاتا ہے یہ ہے کہ انسانی زندگی کا درخت کیوں سرسبز نہیں ہوتا اور خشک ہو کر زمین کے برابر ہو جاتا ہے تندرستی بیماری سے جوانی بڑھاپے سے اور زندگی موت سے بدل جاتی ہے اور دنیا کے بڑے بڑے آدمی تک بھی آخر کار ایک مشتِ خاک کے سوا اور کچھ نہیں رہتے۔

پیش از من تو لیل و نہاری بودست — گردندہ فلک نیز بکاری بودست
زنہار قدم بخاک آہستہ نہی — کان مردمک چشم نگاری بودست

ہمارے شاعر اعظم کا تیسرا تاثر وہی شکایت ہے، ظاہرداری، فریبکاری ریا، دوروئی اور جھوٹ کی جس سے بعض پیشوایان دین کام لیتے ہیں یہ لوگ

ظاہر میں تقویٰ اور تقدس کا جال پھیلاتے ہیں اور باطن میں اپنے اغراض کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ایسے پیشوا لوگوں کی رہبری کے بجائے انہیں گمراہ کرتے ہیں اس موضوع پر اس نے کئی پُر اثر رباعیاں لکھی ہیں زمانے کی گردش کی شکایت، انسان کی ناکامی اور اس کے غم، اس کی عمر بے مقداری اور ناپائداری اور پیران طریقت کی ریا اور سالوس کے ذکر کے بعد وہ ہماری نجات کی تدبیریں بھی سوچتا ہے اور اس تمام رنج و مصیبت کے مقابلہ میں ہمیں جینے کا ڈھنگ سکھاتا ہے یہ ڈھنگ ہے عیش کا، خوشی کا اور ساری دنیا سے بے نیازی کا

روزی کہ گذشتہ است ازو یاد مکن — فردا کہ نیامدہ است فریاد مکن
بر نامدہ و گذشتہ بنیاد مکن! — حال خوش باش و عمر برباد مکن

عمر خیام علوم و فنون کا بڑا ماہر تھا اس نے جبر و مقابلہ اور علم ہندسہ میں رسالہ جبر و مقابلہ، طبیعات اور فلسفہ کون و وجود پر بہت اہم رسالے اور کتابیں تصنیف کی ہیں۔ خیام کی رباعیوں کی تعداد میں اختلاف ہے آج کل عام طور پر حقیقی رباعیاں اس سے منسوب ہیں ان میں سے بڑا حصہ اور دوسرے مشہور رباعی گو شعراء جیسے ابن سینا، خواجہ عبداللہ انصاری، ابوسعید وغیرہ کی رباعیوں پر مشتمل ہے عمر خیام کی رباعیوں کے مختلف مطبوعہ اور قلمی نسخوں میں چھہتر سے لے کر ایک ہزار دو سو تک رُباعیاں خیام سے منسوب ملتی ہیں علماء حال کی تحقیق یہ ہے کہ ۷۶ رباعیاں ہی زیادہ قرین صحت ہیں اور خیام کی واقعی رباعیاں کم و بیش اتنی ہیں۔

خیام کی رباعیوں کا ترجمہ دنیا کی تقریباً تمام مشہور زبانوں میں ہو چکا ہے اور اس کے نام سے ساری دنیا واقف ہے

(تاریخ ادبیات ایران رضا زادہ شفق)

خیام کو آج . . . زمانہ شاعری کی حیثیت سے جانتا ہے لیکن فلسفہ میں وہ بوعلی سینا کا ہمسر اور مذہبی علوم اور فن ادب و تاریخ میں امام فن تھا۔ قاضی عبدالرشید کا بیان ہے کہ ایک دفعہ خیام سے جب مرو کے حمام میں ملا اور سورۂ معوذتین کے معنے دریافت کئے یہ بھی پوچھا کہ ان سورتوں میں بعض الفاظ بار بار کیوں آئے خیام نے برجستہ جواب دینا شروع کیا مفسرین کے اقوال، ان کے دلائل اور شواہد اس تفصیل اور وسعت سے بیان کئے اگر ہماری تقریر قلم بند کرلی جاتی تو اچھی خاصی کتاب بن جاتی۔

فلسفیانہ خیالات کی وجہ سے مذہبی علماء اس سے مخالفت رکھتے تھے اس زمانہ میں مذہبی گروہ کے پیش رو امام غزالی تھے جنہوں نے تہافتہ الفلاسفہ لکھ کر فلسفہ کا ابطال کیا تھا وہ مناظرہ کے لئے خیام کے پاس گئے اور پوچھا کہ آسمان کے تمام اجزاء باہم متشابہ اور متحد الحقیقت ہیں پھر بعض اجزاء میں کیا خصوصیت تھی کہ قطبین قرار پائے خیام مسائل فلسفہ کے بیان کرنے میں نہایت بخل کرتا تھا۔ اس نے پہلے تو یہ کہہ کر ٹالا کہ میں اس مسئلہ کو اپنی "عرائض النفائس" میں تفصیل لکھ چکا ہوں پھر جواب دیا تو اس طرح کہ پہلے ابتدائی مراتب بیان کئے چنانچہ اس مسئلہ سے ابتدا کی کہ "حرکت کس مقولہ سے ہے" پھر اس کو اس قدر پھیلایا کہ یہ مسئلہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ ظہر کی اذان کی آواز آئی امام غزالی یہ کہہ کر اٹھ گئے جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔

نجوم کا فن اگرچہ مہمل چیز ہے لیکن یونانی حکماء علماء عموماً اس کے قائل تھے وہی خیالات مسلمانوں میں بھی منتقل ہوئے خیام اس فن میں کمال رکھتا تھا اور اس لئے منجم کہلاتا تھا ۴۶۷ھ میں بادشاہ وقت نے خواجہ بزرگ

صدرالدین محمد بن المظفر کے پاس آدمی بھیجا کہ میں شکار کو جانا چاہتا ہوں۔
خیام سے کہہ دو کہ اعمالِ نجوم کے ذریعہ سے ایسی تاریخ مقرر کرے کہ برف وبارش
سے محفوظ ہو خیام نے دو دن کو غور و فکر کے بعد ایک دن معین کیا بادشاہ
اسی دن سوار ہوا کوس دو کوس گیا ہوگا کہ بڑے زور کا بادل اٹھا اور چاروں
طرف برف بچھ گئی لوگوں نے خیام کی ہنسی اڑائی بادشاہ نے چاہا کہ وہیں سے
پلٹ جائے خیام نے کہا ابھی بادل پھٹے جاتے ہیں اور پانچ دن تک زمین
نم بھی نہ ہوگی اتفاق یہ کہ خیام کی پیشین گوئی پوری اُتری۔

خیام کی تصنیفات بہت کم ہیں زیچ جو تیار کی تھی اس کا ہمارے
اسلامی ملکوں میں تو پتہ نہیں لیکن یورپ نے چھاپ کر شائع کی ہے باقی چند
رسالے درج ذیل ہیں جن کا ذکر شہر زوری نے کیا ہے۔

طبیعات میں ایک مختصر رسالہ
وجود کی حقیقت پر ایک رسالہ
کون اور مسئلہ تکلیف پر ایک رسالہ (یہ رسالہ مصر میں چھاپا گیا ہے)
رباعیات

عجیب بات ہے کہ خیام فلسفہ میں، نجوم میں، فقہ میں، ادب میں، تاریخ
میں کمال رکھتا تھا لیکن اتنے ستاروں کے ساتھ اس کا افق شہرت بالکل تاریک
ہے جس چیز نے آٹھ سو برس تک اس کے نام کو زندہ رکھا وہ فارسی رباعیات
ہیں اور یہی اس کی شہرت کے بال پرواز ہیں ان رباعیوں کے ساتھ مسلمانوں
نے جس قدر اعتنا کیا اس سے ہزاروں درجہ بڑھ کر یورپ نے کیا

شاعری کی بڑی ضروری شرط اسلوب بیان کی جدت اور دلآویزی ہے
شاعر ایک معمولی بات کو لیتا ہے اور ایسے دل کشا اور ندرت آمیز اسلوب سے

کرتا ہے کہ سب وجد کرتے لگتے ہیں اسلوب بیان کی دلآویزی کے مختلف اسباب ہوتے ہیں کبھی صرف زبان کی بے تکلفی، روانی اور شستگی یہ کام دیتی ہے۔ کبھی عام طریقہ ادا کے بدل دینے سے یہ بات پیدا ہوتی ہے کبھی شاعرانہ استدلال سے کبھی شوخی و ظرافت سے کبھی استعارہ اور تشبیہ کی نادرت سے اور سچ یہ ہے کہ اس کی تمام روایتیں متعین اور مشخص نہیں ہو سکتیں۔

خیام کی رباعیاں اگرچہ سینکڑوں اور ہزاروں ہیں لیکن سب کا قدر مشترک صرف چند مضامین ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی، خوش دلی کی ترغیب، شراب کی تعریف، مسئلہ جبر، توبہ و استغفار ان میں سے ایک ایک مضمون کو وہ سو سو دفعہ کہتا ہے لیکن ہر دفعہ اس طرح بدل کر کہتا ہے کہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی نئی چیز ہے۔

~~ بر سینۂ غم پذیر من رحمت کن   بر جان و دل اسیر من رحمت کن
بر پائے خرابات رو من بخشائے   بر دست پیالہ گیر من رحمت کن

من بندۂ عاصیم رضائے تو کجاست   تاریک دلم نور صفائے تو کجاست
ما را تو بہشت اگر بہ طاعت بخشی   آں بیع بود لطف و عطائے تو کجاست

مشہور ہے کہ ایک دفعہ خیام کی صراحی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی اور ٹوٹ گئی اس پر اس نے رباعی لکھی۔

~~ ابریق مئے مرا شکستی ربّا   بر من در عیش را بہ بستی ربّا
بر خاک بریختی مئے لعل مرا   خاکم بدہن کہ سخت مستی ربّا

کہتے ہیں کہ اس گستاخی پر خدا نے اس کو سزا دی اور اس کی گردن کج ہو گئی

اس پر اس نے برجستہ کہا۔

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو　　واں کس کہ گنہ نکرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی　　پس فرق میانِ من و تو چیست بگو

دنیا کی بے ثباتی اور عبرت انگیزی بزرگ پایہ شعراء کا سب سے بڑا موضوع ہے سعدی، حافظ، ابن یمین، ناصر خسرو سحابی نجفی کی تمام کائنات یہی ہے اس مضمون کی ابتدا درحقیقت خیام نے کی اور اس درجہ تک اس کو پہنچادیا کہ سعدی اور حافظ جیسے بلند پایہ شاعر گویا اس کی سکھائی ہوئی چالیں چلتے ہیں نصیحت سے قطع نظر خیام کی زورِ شاعری کا بھی اس سے اندازہ ہو سکتا ہے اس نے سو سو دفعہ اس مضمون کو باندھا لیکن قوتِ تخیل سے ہر دفعہ ایک نیا پیرایہ پیدا کر دیتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی اور خنجر ہے جو دل پر چرکے لگا رہا ہے۔

خاکی کہ بزیر پائی ہر حیوانی است　　زلفِ صنمی و عارضِ جانانی است
ہر خشت کہ بر کنگرۂ ایوانی است　　انگشتِ وزیری و سرِ سلطانی است

جس طرح عربی زبان میں ابونواس شراب کا جاندادہ ہے۔ فارسی میں خیام دور جام کا ستم زدہ ہے وہ جس شغف جس شوق، جس بیخودی، جس بے اختیاری جوش سے شراب کا نام لیتا ہے اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ وہ درحقیقت شراب پیتا ہے اور یہی ظاہری شراب پیتا ہے افسوس ہے کہ وہ فلسفی اور حکیم تھا صوفی نہ تھا ورنہ حافظ کی طرح یہی شراب، شرابِ معرفت بن جاتی۔

من بی می ناب زیستن نتوانم　　بی جام کشیدہ بارِ تن نتوانم
من بندۂ آں دلم کہ ساقی گوید　　یک جام دگر بگیر و من نتوانم

خیام کا فلسفہ زندگی بظاہر اپیکیورس کی آواز بازگشت ہے۔ یعنی یہ کہ گذشتہ

یا آیندہ سے کچھ بحث نہیں جو کچھ ہے حال ہے اس میں کھاؤ پیو خوش رہو۔ یہ فلسفہ کہ انسان نیکی بدی کا کچھ خیال نہ رکھے جو جی میں آئے کرلے مزے اڑائے بظاہر نہایت خطرناک ہے لیکن خیام سے ایسے خطرناک فلسفہ کی توقع نہیں ہو سکتی اس نے بہت سی رباعیوں میں، معاد، جزا و سزا کا اقرار کیا ہے اور برائیوں سے بچنے کی ہدایت کی ہے خیام جس زندگی کو قابلِ رشک سمجھتا ہے وہ یہ ہے۔

دردہر ہر آنکہ نیم نانی دارد ونہ بہر نشست آشیانی دارد
نی خادم کس بود نہ مخدوم کسی گو شاد بزی کہ خوش جہانی دارد

(شعر العجم شبلی نعمانی)

رباعیات عمر خیام نہایت سادہ اور بے آلائش ہیں تصنع اور تکلف سے بالکل پاک ہیں ان میں فصاحت و بلاغت بدرجہ اتم موجود ہے اس کے علاوہ عالی مضامین اور معانی لطیف کو بڑے اچھے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے ان رباعیات میں خیام نے اپنے ان فلسفیانہ افکار کو بیان کیا ہے جو عام آدمیوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتے ہیں وہ عام مذہبی اعتقادات کا قائل نہیں ہے۔

ان رباعیات کو خیام نے غالباً فلسفیانہ افکار کے تعاقب میں خود گایا ہے اور اس طرح ایک فلسفی کے تفکرات کو احاطہ تحریر میں لاکر شعری سانچے میں پیش کیا ہے ان کے لکھنے کا مقصد شعر و شاعری کے شوق کو پورا کرنا نہیں تھا اور نہ ہی شعراء کے درمیان جگہ پیدا کرنے کی خواہش کی یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے عہد میں شاعری میں شہرت نہ پا سکا اور ایک حکیم اور فلسفی کی حیثیت سے معروف و مشہور ہوا لیکن بعد میں جب اس کی فلسفیانہ خیالات پر مشتمل رباعیوں کو شہرت حاصل ہوئی تو خیام کو شاعروں کی صف میں شمار کیا جانے لگا۔ اس کی چند مشہور رباعیاں درج ذیل ہیں

(۱)

ہر ذرہ کہ بر خاک زمینی بودست   خورشید رخی زہرہ جبینی بودست
گرد از رخ نازنیں بآزرم فشاں   کاں ہم رخ و زلف نازنینی بودست

(۲)

دریاب کہ از روح جدا خواہی رفت   در پردہ اسرار فنا خواہی رفت
می نوش ندانی از کجا آمدہ ای   خوش باش ندانی بکجا خواہی رفت

۳

ایں کوزہ کہ آبخور راہ مزدوریست   از دیدہ شاہی و دل دستوریست
ہر کاسۂ می کہ در کف مخموریست   از عارض مستی و لب مستوریست

۴

ہرگز دل من ز علم محروم نشد   کم ماند ز اسرار کہ مفہوم نشد
ہفتاد و دو سال فکر کردم شب و روز   معلومم شد کہ ہیچ معلوم نشد

تاریخ ادبیات در ایران (ذبیح اللہ صفا)

ابو الفتح عمر خیام بن ابراہیم نیشاپوری علم ہیئت اور علم ریاضی کا بہت بڑا فاضل تھا ان علوم کے لئے شعر و سخن میں اس کا پایہ بہت بلند ہے اس کے علم و فضل کا اعتراف اہل ایران سے بڑھ کر اہل یورپ نے کیا ہے تعجب کا مقام ہے کہ اس نامور عالم کی زندگی کے بعض پہلو پورے طور سے آشکارا نہیں خیام کے متعدد سوانح نگار اس کا سال پیدائش سنہ ۴۰۸ھ یا سنہ ۴۱۰ھ ہجری لکھتے ہیں وہ بھی اس روایت کی بنا پر کہ نظام الملک خیام اور حسن بن صباح ہم سبق تھے تو آخر ہم عمر ہونگے نظام الملک کا سال پیدائش ۴۰۸ یا ۴۱۰ ہجری ہے اس لئے خیام کا سال پیدائش بھی یہی ہوگا۔

خیام کے سال وفات کے متعلق بھی اختلاف ہے خیام کے معاصر وشاگرد نظامی عروضی سمرقندی چہار مقالہ میں لکھتے ہیں "۵۳۰ ہجری میں میں نے خیام کی قبر کی زیارت کی تو مجھے معلوم ہوا خیام چار سال بیشتر عالم فانی کو خیرباد کہہ چکا ہے" اس لحاظ سے خیام کا سال وفات ۵۲۶ ہجری ہوتا ہے۔

خیام امام موفق (متوفی ۴۹۰ ہجری) کی صحبت میں رہ کر قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی، علم ہیئت میں استاد ابوالحسن الانبیری سے تلمذ تھا فلسفے میں اس کا استاد بوعلی سینا تھا جس کا وہ خود اپنے رسالہ "کون و تکلیف" میں اعتراف کرتا ہے۔

تذکروں سے یہ بات واضح ہے کہ خیام کو ۴۶۷ ہجری میں علم وفضل میں بہت شہرت حاصل ہو چکی تھی چنانچہ اسی سال جب ملک شاہ سلجوقی نے اپنے ملک میں ایک عظیم رصدخانہ قائم کرنا چاہا تو اس غرض کے لئے ملک کے بڑے بڑے علماء اور منجم بلائے گئے ان میں خیام بھی تھے۔

خیام کو آج کل شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل ہے لیکن وہ فلسفہ میں بوعلی کا ہمسر اور مذہبی علوم میں امام فن تھا علم نجوم کا تو وہ ماہر مانا گیا تھا بادشاہ وقت خاص خاص تقریبات کی تاریخ مقرر کرانے کے لئے خیام ہی کی طرف رجوع کرتا تھا خیام علم طب میں بھی بڑی مہارت رکھتا تھا۔ خیام ایک آزاد خیال فلسفی تھا اور مذہب کے معاملے میں کسی شدت اور سخت گیری کا قائل نہ تھا اس لئے بعض مذہبی علماء اسے ملحد کہتے تھے۔

تصنیفات :- (۱) رسالہ انتخراج ۲۔ رسالہ جبر و قدر

(۳) زیج ملک شاہی ۴۔ رسالہ مختصر در طبیعات

(۵) میزان الحکم (۶) رسالہ الکون و التکلیف

۷۔ رسالہ عروصات یا رسالۃ التوحید ۸۔ نوروزنامہ ۹۔ رباعیات عمر خیام (۱۰) مکاتیب خیام فارسی ۔

مختلف علوم میں ماہر ہونے کے باوجود خیام کی شہرت کا سرمایہ اس کی فارسی رباعیات ہیں اس بلندپایہ شاعر کا علمی دنیا سے تعارف کرانے میں اہل یورپ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے سب سے پہلے روسی پروفیسر ژنکوفسکی نے رباعیات عمر خیام کا ترجمہ کیا پھر فنٹر جیرالڈ نے خیام کی بعض رباعیوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور بعض ہم مضمون رباعیوں کا مفہوم پیش کر کے کچھ ایسے انداز میں اہل یورپ کو خیام سے روشناس کرایا کہ اسے زندہ جاوید بنا دیا ۔

رُباعیات عمر خیام

خیام جب نجوم ریاضی اور فلسفے کے پیچیدہ مسائل سے فارغ ہوتا تو دلی اور دماغی تفریح کی غرض سے شعر کی طرف مائل ہوتا خیام کی شاعری کا حاصل صرف اس کی فارسی رباعیات ہے رباعیوں کی زبان بڑی سادہ، سہل اور رواں ہے لیکن ان میں فلسفیانہ رموز ہیں جو اس کے ذاتی تاثرات کی آئینہ دار ہیں ۔سب سے پہلی چیز جو خیام کی رباعیوں میں ہمیں نمایاں طور پہ نظر آتی ہے وہ انسانی زندگی کے آغاز وانجام پہ غور وخوض ہے ۔ انسانی زندگی باوجودیکہ بہت مختصر ہے اور اس پہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا لیکن دریافت اور جستجو کی ایک امنگ ہے جو انسان کو قانع نہیں رہنے دیتی اور اس کی بدولت وہ اپنے آغاز وانجام کے متعلق سوچتا رہتا ہے اس کے کانوں میں رہ کر یہ صدا گونجتی ہے ؎

ما ز آغاز و انجام جہاں بے خبریم ❊ اول و آخر ایں کہنہ کتاب افتادہ ست

اس کے باوجود انسان کی گرمئ رفتار اور بے چین روح اسے جستجو اور دریافت کی راہ پہ لگائے رکھتی ہے ، سقراط ، افلاطوں ، ارسطو، اپیکورس

خیام، رازی اور مولانا روم اس جستجو میں لگے رہے اور تحقیق وتلاش کے راستے تراشتے رہے خیام کو بھی اسی امنگ نے دریافت وجستجو میں سرگرم رکھا اس نے بھی جاننا چاہا کہ انسان کہاں سے آتا ہے اسے جانا کدھر ہے زندگی کی کشمکش کی غرض و غایت کیا ہے لیکن وہ کوئی ایسا جواب نہیں پاتا جو اس کی بے چین روح کو تسکین دے سکے خیام چاہتا ہے کہ دنیا کے عقدوں کو عقل کے گرہ کشا ناخن سے کھول دے

یہ حساس فلسفی دیکھتا ہے کہ دنیا میں رنج واندوہ

خیام کے کلام میں حزنیت کی کوئی حد نہیں ہر شخص کسی نہ کسی رنج میں مبتلا ہے زندگی میں ہر وقت موت کا کھٹکا لگا رہتا ہے اس سے خیام کا دل اور دماغ متاثر ہوتا ہے چنانچہ اس کی اکثر رباعیوں میں حزن وملال کے جانکاہ اثرات جھلکتے نظر آتے ہیں۔

پیش از من تو لیل ونہاری بودہ است　　گردندہ فلک نیز بکاری بودہ است
زنہار قدم بہ خاک آہستہ نہی　　کاں مردم چشم نگاری بودہ است

خیام انسانی زندگی کو حسرت وحرماں کا مجموعہ تو خیال کرتا ہے لیکن وہ بے بس ہو کر آنسو نہیں بہاتا بلکہ ایک فلسفی کی طرح ایسی حالت میں بھی جینے کی تدبیر بتاتا ہے یہ تلقین کرتا ہے کہ رنج وغم کو بھولنے کی کوشش کرو جو وقت گزر گیا وہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔

روزی کہ گزشتہ است ازو یاد مکن!　　فردا کہ نیامدہ است فریاد مکن
برنامدہ وگذشتہ بنیاد مکن!　　حالی خوش باش وعمر برباد مکن

فلسفہ جبر خیام کی رباعیوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عقیدہ جبر کا پیرو ہے اس کے نزدیک انسان بے بس اور مجبور ہے اپنے ارادے سے وہ کچھ نہیں کر سکتا انسان کی زندگی کواکب کی گردش کے تابع ہے لیکن کواکب کی گردش بھی

مجبوری کا نتیجہ ہے پس اگر ہم مجبور ہیں تو کواکب کی گردش ہم سے بھی زیادہ بے بس ہے گویا ساری کائنات مجبوری کا پتہ دیتی ہے۔

خوبی و بدی کہ در نہاد بشر است　　شادی و غمی کہ در قضا و قدر است
با چرخ مکن حوالہ کاندر رہِ عقل　　چرخ از تو ہزار بار بے چارہ تر است

فلسفۂ نشاط | خیام لذات و نشاط کا اتنی شیفتگی سے ذکر کرتا ہے کہ اس کی رباعیات بالکل عشرت پسند اپیکورس کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔

یک شیشہ شراب و لبِ یار و لب کشت　　این جملہ مرا نقد و ترا نسیہ بہشت
قومی بہ بہشت و دوزخ اندر گروند　　کہ رفت بدوزخ و کہ آمد ز بہشت

ذکر شراب | شاعر شراب پیتے ہیں لیکن اکثر ان کی شراب کو لوگ رفتہ رفتہ معرفت سمجھنے لگتے ہیں حافظ شیرازی ایسے ہی خوش نصیب شاعروں سے تھے لیکن خیام نے کچھ اتنے شوق اور شیفتگی سے مادی شراب پی ہے کہ کسی کو اس کی شراب نوشی میں شبہ نہیں رہتا۔

ماہیم خریدار می کہنہ و نو　　وانگاہ فروشندہ عالم بہ دو جو
گفتی کہ پس از مرگ کجا خواہم رفت　　می پیش من آر و ہر کجا خواہی رو

شباب کے عارضی ہونے کا غم | خیام کو شباب بہت عزیز ہے اسے افسوس ہے کہ زندگی کا یہ خوبصورت اور گراں مایہ حصہ بہت جلد گزرنے والا ہے ایام شباب کے جلد رخصت ہونے کا بڑے سوز و گداز سے ذکر کیا ہے۔

افسوس کہ نامۂ جوانی طے شد　　وین تازہ بہار زندگی طے شد
آن مرغ طرب کہ نام او بود شباب　　فریاد ندانم کہ کے آمد کے شد

بے ثباتی دنیا | خیام کا دل بے ثباتی دنیا پر سخت کڑھتا ہے دنیا اس کے نزدیک

بے ثباتی کی ایک مجسم داستاں ہے، شاہ وگدا، امیر و وزیر، کوئی فنا کے ہاتھوں محفوظ نہیں رہ سکتا یہ مٹی جو پاؤں تلے روندی جا رہی ہے۔

خاکی کہ بزیر پائی ہر حیوانی است　　زلف صنمی و عارض جانانی است
ہر خشت کہ بر کنگرۂ ایوانی است　　انگشت وزیری و سلطانی است

<u>گفتار کا خلوص</u> | خیام جس بات کو درست سمجھتا ہے اس کا اظہار بڑی بے باکی سے کرتا ہے یہ ہرگز خیال نہیں کرتا کہ دوسرے اس کے متعلق کیا کہیں گے لوگوں کی نظروں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لئے وہ کسی باطل عقیدے کو کبھی حق نہیں کہتا

گویند مرا کہ دوزخی باشد مست　　قولی است خلاف دل در آں نتواں بست
گر عاشق و مست دوزخی خواہد بود　　فردا بینی بہشت را چوں کف دست

<u>اخلاقی تعلیم</u> | آخر ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کے قول و کردار میں بہت فرق ہوتا ہے لوگ ایک دوسرے کا حق غصب کرتے ہیں ایک دوسرے کو اذیت پہنچاتے ہیں۔ اس مضمون کو خیام ایک انوکھے انداز میں پیش کرتا ہے۔

زاہد بہ زنی فاحشہ گفتا مستی　　کز خیر گسستی و بہ شر پیوستی
گفتا من آنکہ می نمایم ہستم　　تو نیز چناں کہ می نمائی ہستی

<u>سال وفات</u> | نظامی عروضی سمرقندی کے قول کے مطابق حکیم عمر خیام کی وفات <u>سنہ ۵۲۶ھ</u> میں ہوئی۔

(ادب نامہ ایران مقبول بیگ بدخشانی)

حکیم سنائی

ابوالمجد مجدود بن آدم سنائی پانچویں صدی ہجری میں پیدا ہوئے اوائل جوانی میں غزنوی دربار سے انتساب رکھتے تھے اور اس خاندان کے بعض بادشاہوں کی جیسے بہرام شاہ وغیرہ انہوں نے اپنے اشعار میں مدح کی ہے۔

سنائی اپنے زمانے کے سلاطین، امراء علماء اور شعراء جیسے مسعود سعد وغیرہ سے تعلقات رکھتے تھے چنانچہ سنائی ہی نے پہلی بار مسعود سعد کے اشعار کو جمع اور مرتب کیا ہے۔

سنائی نے بیت اللہ کا حج کیا اور خراسان کے اکثر شہروں کی سیاحت کی وہ درویشوں کے حلقہ میں گھومے بڑے بڑے صوفیوں سے ملاقات کی اور ان سے فیوضات حاصل کئے اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کار وہ بادشاہوں کے اور ان کی مدح گوئی سے کنارہ کش ہوگئے اور گوشہ گیری اختیار کرلی اسی کے بعد سے ان کی پرمغز صوفیانہ شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔

تذکروں میں لکھا ہے کہ سنائی کے دیوان میں اشعار کی تعداد تیس ہزار کے قریب تھی لیکن دیوان سنائی کے جو نسخے ملتے ہیں ان میں بارہ ہزار یا اس سے کچھ زیادہ اشعار ملتے ہیں ان میں قصائد، غزلیات اور رباعیات ہیں۔ یہ سب نہایت رواں، محکم اور پختہ کلام ہے اسی طرح سنائی کی استادی اور بلاغت ان کی مثنویوں اور خاص کر حدیقہ سے ظاہر ہے لیکن اس کے باوجود یہ بالکل واضح ہے کہ اپنے اشعار میں سنائی کی توجہ الفاظ کی بہ نسبت معنی کی طرف زیادہ رہی ہے بے شبہ سنائی کو ایران کا سب سے بڑا صوفی شاعر سمجھنا چاہیئے

کیونکہ ان سے پہلے کسی نے بھی تصوف میں اتنی پختگی اتنی سلاست اور کلام کی صفائی کے ساتھ شعر نہیں کہے تھے سنائی کی شاعری سے ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنی جوانی میں فارسی شاعروں کے دیوانوں کے سوا عربی شاعروں کے کلام کا بھی مطالعہ کیا تھا فرزدق اور جریر پہلی صدی ہجری کے دو مشہور عرب شاعر گذرے ہیں یہ دونوں شاعر آپس میں مناظرہ کرتے رہتے تھے جریر نے فرزدق کی ہجویں کہی ہیں سنائی نے اپنے ایک شعر میں ان دونوں شاعروں کا نام لیا ہے اور کہا ہے۔

ہست با نفس نفسیت باعث تعلیم دیو　　　بود ہم فرفر زدق داعیہ جرجریر

فارسی کے شاعروں میں خراسان کے شعراء جیسے منوچہری، فرخی اور مسعود سعد کا اثر سنائی کے کلام میں نمایاں ہے سنائی کے دو قصیدے جو حسب ذیل مطلعوں سے شروع ہوتے ہیں منوچہری کے "قصیدہ شمعیہ" کی یاد بالکل تازہ کر دیتے ہیں۔

ای ہمیشہ دل بحرص وآز کردہ مرتہن　　　دادہ یکبارہ عناں خود بدست اہرمن

ای امیر المومنین ای شمع دیں ای بوالحسن　　　ای بیک ضربت ربودہ جان دشمن از بدن

دی ز دل تنگی زماں طرف کردیم در چمن　　　یک جہاں جاں دیدم آنجا رستہ از زندان تن

فرخی نے ربک کی پیروی بھی کی ہے اس شعر میں فرخی کا مصرع لے کر اس پر تضمین کی ہے ؎

مگر داتم دریں عالم زبینش آری وکم عقلی　　　چو رای عاشقاں گیرد چو طبع بیدلاں شیدا"

ایک اور قطعہ میں جو نہایت وجد وکیف کے عالم میں لکھا ہے کہتے ہیں۔

؎ حال با شعر فرخی آریم　　　رقص بر شعر بوالفتوح کنیم

اسی طرح مسعود سعد کے دیوان سے سنائی کے دیوان کا منقابلہ کیجئے تو اس میں بہت سے ایسے قصیدے ملیں گے جو وزن، قافیہ، بعض تشبیہوں اور تعبیروں کے لحاظ سے ایک دوسرے کے بہت مشابہ نظر آئیں گے۔

تقلیدی دور کے بعد جب سنائی عرفانیات کے عالم میں پہنچ گئے تو انہوں نے مستقل طور پر صوفیانہ اشعار لکھنے شروع کئے ان کے یہ سب اشعار ان کے دیوان اور ان کی مثنویوں میں موجود نہیں ایسے اشعار میں استاد سنائی میں تصفیہ نفس، ترک غرور، ترک ظاہر کی تعلیم دیتے ہیں۔

دیوان سنائی میں زیادہ تر ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں لوگوں کی ظاہر پرستی ریاکاری بے عقلی دوست آزاری، بے وفائی اور نا مسلمانی کی برائی کی گئی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے لوگوں کے ہاتھوں ایسی تکلیفیں اٹھائی تھیں اسی وجہ سے وہ ہمیشہ لوگوں کو اصلاح حال، خود پرستی چھوڑنے، صفائے قلب، خدمت خدمت، حق کی پیروی کے لئے حصول دانش، کسب حکمت، شہوت کشی، ترک حرص اور سلوک ایمان اور عرفان حاصل کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

سنائی نے چند مثنویاں جیسے حدیقۃ الحقیقت، طریق التحقیق، سیر العباد الی المعاد یا کنوز الرموز وغیرہ لکھی ہیں بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ سنائی نے ان کے سوا اور بھی مثنویاں لکھی تھیں۔ جیسے کارنامہ، عشق نامہ، عقل نامہ، غریب نامہ یا عفو نامہ وغیرہ سنائی کی مثنویوں میں سب سے زیادہ حدیقہ مشہور ہے یہ مثنوی ۵۲۵ ہجری میں ختم ہوئی اس میں گیارہ باب اور دس ہزار شعر ہیں ہر باب کے اکثر مطالب حکایت اور مثال کے طور پر بیان کئے گئے ہیں اس مثنوی کو شاعر کا شاہکار سمجھنا چاہیئے صوفیانہ مطالب بلاغت اور حسن سبک کے لحاظ سے یہ کتاب صوفیانہ مسائل کی کتابوں میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔

اس تصنیف میں سنائیؒ نے بادشاہ وقت یعنی بہرام شاہ غزنوی (۵۱۲ - ۵۴۸ھ) کی مدح بھی کی ہے۔ سنائیؒ نے رباعیاں اور قطعے بھی لکھے یہ بھی کافی مشہور اور نہایت اچھوتی اور دلکش ہیں ان میں سنائیؒ نے بڑے اچھے اچھے مضامین پیش کئے ہیں۔

سنائیؒ نے طویل عمر پائی اور غزنیں میں انتقال کیا ان کے سال وفات میں اختلاف ہے تقی کاشی نے اپنے تذکرہ میں ان کی وفات کا سال ۵۴۵ھ ہجری لکھا ہے یہی تاریخ صحیح معلوم ہوتی ہے

(تاریخ ادبیات ایران رضا زادہ شفق)

محدود نام، ابو المجد کنیت سنائیؒ تخلص غزنیں وطن تھا ابتدا میں شاعری کا پیشہ کرتے تھے چنانچہ بہرام شاہ کی مدح میں بہت سے قصائد لکھے جو دیوان میں موجود ہیں لیکن پھر خدا نے توفیق دی اور توبہ کی۔

اس زمانہ میں شیخ ابو یوسف ہمدانی مشہور مشائخ میں سے تھے حکیم سنائیؒ نے ان سے بیعت کی۔ شیخ ابو یوسف، ابو علی فارمدی کے مرید تھے جو امام غزالی کے پیر ہیں اس رشتہ سے حکیم سنائیؒ امام غزالی کے برادر زادہ ہیں۔

حکیم سنائیؒ نے جب حدیقہ تصنیف کی تو چونکہ اس میں ایسی باتیں بھی ہیں جو عام عقائد کے خلاف ہیں اس لئے علماء نے سخت مخالفت کی یہاں تک کہ بہرام شاہ تک شکایت پہنچی بہرام شاہ نے دار الخلافہ بغداد سے استفتا طلب کیا وہاں کے علماء نے لکھا کہ یہ مسائل قابل اعتراض نہیں۔

حکیم سنائیؒ کی وفات میں سخت اختلاف ہے تاریخ فرشتہ میں تاریخ گزیدہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بہرام شاہ کے زمانے میں وفات پائی اسی تاریخ میں بعض فضلائ کا قول نقل کیا ہے کہ ۵۲۵ھ میں انتقال ہوا اور اسی سنہ میں حدیقہ بھی تمام ہوئی تھی

دولت شاہ نے ۵۷۶ھ لکھا ہے ریاض العارفین میں ۵۴۶ھ ہے نفحات میں لکھا ہے کہ مرتے وقت یہ شعر زبان پر تھا۔

ے بازگشتم زانچہ گفتم زاں کہ نیست در سخن معنی و در معنی سخن!

حکیم سنائی کی تصنیفات میں ایک کلیات ہے جس میں تیس ہزار شعر ہیں۔ سات مثنویاں ہیں "حدیقہ" "سیر العباد" "کارنامہ بلخ۔ طریق التحقیق" "عشق نامہ" "عقل نامہ" بہروز، بہرام۔ حدیقہ چھپ گئی ہے اور ہر جگہ ملتی ہے باقی مثنویاں نابید ہیں البتہ سیرالعباد کے بہت سے اشعار مجمع الفصحا میں نقل کئے ہیں۔ حدیقہ کی بحر اور وہی انداز ہے۔ کلیات میں قصائد، قطع، غزلیں رباعیاں سب کچھ ہے اور افسوس یہ ہے کہ ان پھولوں میں ہجو کے کانٹے بھی ہیں۔

حکیم سنائی کے کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

ا۔ تشبیب اور قصائد میں انہوں نے گو اپنے اور تمام معاصرین کی طرح کوئی جدت نہیں پیدا کی لیکن پختگی برجستگی اور صفائی میں ان کا کلام تمام معاصرین سے ممتاز ہے اور قدماء میں بھی۔ فرخی کے سوا ان خصوصیت میں کوئی ان کا ہمسر نہیں۔

خیالات اور طرز ادا میں کہیں کہیں جدت بھی پائی جاتی ہے مثلاً کمر بر قنجر بر کی طرح میں جو قصیدہ کہا ہے اس میں ایک قطعہ بند ہے۔

در زینت و در رنگ کلاہ و کمر خویش زحمت چہ کشی در طلب گوہر و زر یہ

ایں اشک من در رنگ رخ من ببر ای شوخ ایں را بہ کلہ بر زن و آں را بہ کمر بہ

یعنی اے معشوق اپنے کمر بند اور کلاہ کی زینت میں اس قدر زحمت کیوں اٹھاتا ہے میرا آنسو اور میرے چہرے کا رنگ لے کر کلاہ اور کمر پر لگا لے کہ زر و گوہر کا کام دیں گے آنسو گوہر اور چہرہ کا رنگ زردی کی وجہ سے زر کے مشابہ ہے۔

۲۔ حکیم سنائی پہلے شخص ہیں جس نے تصوف کو شاعری سے روشناس کیا اس سے

پہلے حضرت ابوسعید ابوالخیر کی چند رباعیاں تصوف میں پائی جاتی ہیں لیکن ان میں صرف جوش عشق کو پرزور طریقہ سے ادا کیا ہے تصوف کے مسائل، اسرار اور معارف نہیں بخلاف اس کے حکیم سنائی کی تصنیفات تصوف کی مستقل تصنیفیں ہیں خود حکیم صاحب کو بھی اس کا دعویٰ ہے۔

کس نہ گفت ایں چنیں سخن بہ جہاں — در کسی گفت گو بیار و بخوان
زیں نمط ہر چہ درجہاں سخن است — گر یکی در ہزار آن من است
چوں ز قران گزشتی وز اخبار — نیست کس را ازیں نمط گفتار

حدیقہ میں تصوف کے تمام مقامات کو الگ الگ عنوان سے لکھا ہے اور نہایت خوبی سے ادا کیا۔

۳۔ قدما کی شاعری اگرچہ نیچرل شاعری تھی لیکن طرز ادا شاعرانہ نہ تھا۔ جس بات کو کہنا چاہتے تھے صاف، بے تکلف سیدھے سادے طور پر کہہ دیتے تھے معمولی بات کو انوکھے پیرائے میں ادا کرنا یا ایک معمولی واقعہ سے منطقیانہ استدلال پیدا کرنا، متوسطین اور متاخرین کا جوہر ہے لیکن اس کے موجد سنائی ہیں۔

۴۔ اخلاقی شاعری کی بنیاد بھی حکیم سنائی نے قائم کی اور گو آگے چل کر اس صنف کو بہت وسعت ہوئی لیکن اصول اور آئین حکیم سنائی نے قائم کر دئے تھے۔

ترا ایزد ہمی گوید کہ در دنیا مخور بادہ — ترا ترسا ہمی گوید کہ در صفرا مخور حلوا
ز بہر دیں تو نگذاری حرام از حرمت یزداں — ولیک از بہر تن مانی حلال از گفتہ ترسا

اختلاط اور صحبت میں خوبیاں بھی ہیں اور برائیاں بھی اس لئے ارباب حال دونوں طرف گئے ہیں لیکن اس نکتہ کی طرف کسی کا ذہن نہیں گیا کہ خوبی

کا جو پہلو ہے وہ بھی زحمت سے خالی نہیں۔

کسی کش خود رہنموں است ہرگز　　بہ گیتی رہ و رسم الفت نورزد
کہ صحبت نفاقی است یا اتفاقی　　دل مرد دانا ہر دو لرزد
اگر خود نفاقی است جاں را بکاہد　　دگر اتفاقی است ہجراں نیرزد

یعنی اگر صحبت منافقوں کے ساتھ ہے تو ظاہر ہے کہ سوہان روح ہے اور اگر خاص احباب کے ساتھ ہے تب بھی اس لئے بری ہے کہ اس حالت میں جدائی کا صدمہ جانگزا ہوگا۔

(۵) جوش اور سرمستی جو حقیقی شاعری ہے ایشیا کے شعراء میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ فارسی شعراء میں مولانا روم پر یہ نشہ چھایا ہوا ہے خواجہ حافظ بھی کبھی کبھی بدمست ہو جاتے ہیں لیکن حکیم سنائی ان سب کے پیشرو ہیں۔

طلب ای عاشقانِ خوش رفتار　　طرب ای شاہدانِ شیریں کار
تا کے از خانہ ہاں رہ صحرا　　تا کہ از کعبہ ہیں در خمار
در جہاں شاہدی و ما فارغ　　در قدح جرعۂ و ما ہشیار

(۶) شاعری کے اجزا میں ایک بڑا ضروری جز تمثیل اور تشبیہ ہے شاعر کبھی کوئی اخلاقی دعویٰ کرتا ہے تو دلیل میں اس کو تمثیل پیش کرنی پڑتی ہے کبھی کسی چیز کی اچھائی یا برائی ثابت کرنا یا کسی چیز کی تصویر اور ہیئت کھینچنا چاہتا ہے تو تشبیہ اور تمثیل کے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ شاعری کی اس صنعت کے موجد بھی حکیم سنائی ہی ہیں۔

تو علم آموختی از حرص اینک ترس کاندر شب　　چو دزدی با چراغ آید گزیدہ تر برد کالا
چو تن جاں را مزیّن کن بہ علم دیں کہ زشت آید　　درون سو شاہ عریاں و برون سو اکو شک دیبا

——— (شعر العجم از شبلی نعمانی)

حکیم ابوالمجد و دین آدم سنائی چھٹی صدی ہجری کے فارسی زبان کے مسلمہ استاد شاعروں میں ایک بلند مقام اور عالی مقدار شاعر ہے اس کا نام عوفی نے .... لباب الالباب" میں مجدالدین آدم السنائی و حاجی خلیفہ نے محمد بن آدم لکھا ہے تاریخ گزیدہ میں بھی محمد ہی درج ہے لیکن جامی اور ہدایت نے اس کے نام کو حکیم ابوالمجد مجدود بن آدم سنائی لکھا ہے اور اس کے اپنے اشارے بھی جو نظم و نثر دونوں میں ہیں اسی کی تصدیق کرتے ہیں چنانچہ دیوان کے نثری مقدمہ میں بھی اور حدیقۃ الحقیقۃ" میں بھی اسی طرح لکھا ہے۔

ہر کہ او گشتہ طالب مجد است — شقی او ز لفظ بوالمجد است

شعرا را ملفظ مقصودم — زیں قبل نام گشت مجدودم

زانکہ جد را بتن شدم بنیت — کرد مجدود ما ضیم کنیت

سنائی کے دیوان میں بعض ایسے اشعار بھی دیکھے گئے ہیں جن میں ایک دوسرے نام کی طرف اشارہ ہے یعنی ان اشعار میں اس نے اپنے آپ کو "حسن" لکھا ہے مثلاً یہ شعر

لیسری داری ہمنام رہی — کہ توئی خادمت او جو یہ من

زانکہ نیکو کند از ہمنامی! — خدمت خواجہ حسن بندہ حسن

اسی وجہ سے برخی اس پر مصر ہے اس کا نام اصلاً "حسن" تھا

اس کی ولادت پانچویں صدی کے دوسرے حصے کے اوائل یا وسط میں ہوئی غزنی میں ہوئی۔ قدیم ترین بادشاہ جس کی مدح سنائی کے دیوان میں ہے مسعود بن ابراہیم ہے (۴۹۲ - ۵۰۸) ہے لیکن اس کے بعد یمین الدولہ بہرام شاہ بن مسعود (۵۱۱ - ۵۵۲) کا ذکر اس کی حدیقہ میں ملتا ہے۔ بہرحال سنائی کا آغاز شاعری کا کارنامہ مداحی معلوم ہوتا ہے مگر اس کے بعد طبیعت پھر

بدل گئی تھی کہ جب بہرام شاہ نے اپنی بہن کا نکاح ان سے کرنا چاہا تو انہوں نے اس کو ٹھکرا دیا سنائیؔ کے سال وفات کے بارے میں اختلاف ہے لیکن آقائی مدرس رضوی نے دیوانِ سنائیؔ کے مقدمہ میں ان کی وفات ۵۲۵ ہجری میں بتائی ہے جو درست معلوم ہوتی ہے ۔

اس کا دیوان مدح، غزلیات، رباعیات، قطعات اور ہجویات پر مشتمل ہے ۔ اس دیوان کے علاوہ ان کے شعری کارناموں میں حدیقۃ الحقیقت۔ شریعت الطریقت، سیر العباد۔ طریق التحقیق، کارنامہ بلخ، عشق نامہ، عقل نامہ، تجربۃ العلم بھی شامل ہیں، یہ تمام مثنویاں ہیں ۔

اس کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت دو سبکوں کی نشاندہی ملتی ہے ۔ یہ دونوں سبک اور سنائیؔ کے افکار کا یہ رجحان اس کی زندگی دو مرحلوں میں مربوط ہے زندگی کے پہلے حصے میں شاعر درباری لہو ولعب میں پڑ گیا اور قصائد و مدح کی طرف متوجہ ہوا اس کے قصائد کی تشبیب میں تغزل کا رنگ ملتا ہے اس حصہ میں وہ قصیدہ گو شعرا عنصری، فرخی مسعود سعد اور خصوصاً فرخی کی پیروی کرتا نظر آتا ہے لیکن زندگی کے دوسرے حصے میں اپنے کلام میں مختلف موضوعات کو لیتا ہے مثلاً احادیث، آیات، تمثیلات و استدلات عقلی کا بیان ہے اس کے علاوہ ان اشعار میں اپنے مقاصد کے لئے علمی اصطلاحات کو استعمال کرتا ہے جس کی وجہ سے اس عہد کے اشعار مشکل، تشریح طلب اور محتاج تفسیر ہیں ۔ (ادبیات در ایران ذبیح اللہ صفا)

سنائیؔ کے قصائد سے پتہ چلتا ہے کہ شروع شروع میں آپ نے فرخی اور منوچہری کا انداز اختیار کیا تھا ان کے بعض اشعار کو تضمین بھی کیا آپ کے

قصائد کی اکثر تشبیہات فرخی سے مشابہہ ہیں لیکن محض تقلید کرنے سے کسی کی شاعرانہ عظمت کا پتہ نہیں اس لئے ان کی درباری شاعری سے ان کا مقام متعین کرنے میں ہمیں مدد نہیں ملتی لیکن جب آپ نے تقلید کو چھوڑ کر تحقیق کی منزل میں قدم رکھا تو یہاں سے آپ کے فکر وخیال کی آزادی کا دور شروع ہوا اس انقلاب نے آپ میں ایک خاص استغنا پیدا کر دیا تقلید کی جگہ اختراع نے لے لی اور شعر وفکر میں آپ کا ایک مخصوص انداز ہوگیا جو اس دور کے تمام شعراء سے مختلف ہے۔

آپ کے انقلابی دور کی شاعری عارفانہ رنگ میں ہے اور فکر کی گہرائی اور خیالات کی وسعت کا پتہ دیتی ہے یہ شاعری دعوت وتعلیم کی شاعری ہے ۔ شاعر فلسفیانہ انداز میں تزکیہ نفس، رد غرور اور ترک ظاہر پرستی کی تلقین کرتا ہوا نظر آتا ہے محنت اور استقلال کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں

عالمی گر دونکو یا شاعری شیریں سخن   عمر ہا باید کہ تا یک کودکی از روی طبع

آپکے دیوان میں اکثر اشعار ظاہر پرستی، ریا کاری، ایذا پسندی اور بے وفائی کی شکایت میں ہیں معلوم ہوتا ہے کہ انہیں دنیا میں تلخ تجربات بھی ہوئے ہیں اس لئے انہوں نے اصلاح حال کی طرف توجہ دلائی ہے اور صفائی قلب کسب حکمت، ترک حرص اور ایمان وعرفان کی دعوت دی ہے۔

حکیم سنائی نے شروع شروع میں فرخی اور منوچہری کی طرز پر قصیدے کہے تھے لیکن ان کے کلام میں بہت پختگی اور برجستگی ہے کہیں کہیں طرزِ ادا میں جدت بھی ہے۔

سنائی پہلا شاعر ہے جس نے تصوف کے اسرار ورموز بیان کرنے کے لئے شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا، ابو سعید ابو الخیر نے بھی اپنے عارفانہ تاثرات رباعیوں

میں پیش کئے ہیں لیکن ان کا کلام تصوف کی کوئی باقاعدہ اور مستقل تصنیف نہیں ہے
بخلاف اس کے حکیم سنائی کی تمام مثنویاں تصوف کے اسرار و رموز کی مستقل تصنیفیں
ہیں چنانچہ مولانا روم ایسے عارف کو بھی اس بات کا اعتراف ہے۔

ترک جوشی کردہ ام من نیم خام — از حکیم غزنوی بشنو تمام
در الٰہی نامہ گوید شرح ایں — آں حکیم غیب و فخر العارفین

تصوف اور اخلاق کے موضوع پر حکیم سنائی کا ایک زندہ جاوید کارنامہ
حدیقۃ الحقیقت" ہے اس میں آپ کی قادر الکلامی پوری طرح سے آشکارا
ہے سنائی نے مثنوی میں اصلاح حالات کے لئے نہایت مفید تعلیم دی ہے۔
سنائی نے رباعیاں اور قطعات بھی لکھے ہیں ان سب کا موضوع بھی
پند و موعظت ہے سنائی نے طویل عمر پائی اور غزنی میں رحلت کی آپ کے
سال وفات کے متعلق تذکرہ نویسوں میں اختلاف پایا جاتا ہے تاریخ گزیدہ
میں ان کا سال وفات ۵۲۵ ہجری بتایا ہے لیکن یہ درست معلوم نہیں ہوتا
کیونکہ اس نے مثنوی "طریق التحقیق" ۵۲۸ میں مکمل کی تھی بدیع الزماں نے
ان کا سال وفات ۵۴۵ ہجری لکھا ہے اس کو ہی درست سمجھنا چاہیئے
(ادب نامہ ایران مقبول بیگ بدخشانی)

مسعود سعد سلمان

مسعود سعد سلمان کا شمار غزنوی اور سلجوقی دور کے مشہور شاعروں میں ہوتا ہے اس کا خاندان ہمدان کا رہنے والا تھا لیکن یہ ہندوستان کے مشہور شہر لاہور میں ۴۴۰ ہجری کے قریب پیدا ہوا اس کے اجداد اہل ادب تھے خصوصاً مسعود کے باپ اور اس کے دادا سلمان کا شمار اپنے زمانے کے عالموں میں ہوتا تھا مسعود کے باپ نے ساٹھ سال تک غزنوی سلاطین کی خدمت کی چنانچہ مسعود اپنے ایک قصیدہ میں کہتا ہے۔

ے شصت سال تمام خدمت کرد پدر بندہ سعد بن سلمان

گہ المعروف بودی از عمال گہ بدرگاہ بودی از اعیاں

سلمان کی ہندوستان میں جاگیر اور جائداد تھی۔ مسعود نے ایام جوانی میں غزنوی سلاطین کے دربار سے تعلق پیدا کیا۔ جب سلطان ابراہیم غزنوی نے اپنے بیٹے محمود ملقب بہ سیف الدولہ کو ۴۶۹ ہجری میں ہندوستان کی حکومت عطا کی تو مسعود سعد اس کی ملازمت میں داخل ہوگیا اور اس کے دفتر کے خاص لوگوں میں اس کا شمار ہونے لگا۔ ہندوستان میں چند سال حکومت دینے کے بعد سیف الدولہ سے سلطان ناراض ہوگیا سلطان نے حکم دیا کہ اسے اس کے بعض ندیموں کے ساتھ گرفتار کر لیا جائے اور ان سب کو پکڑ کر زنداں میں ڈال دیا مسعود سعد کو بھی سات سال تک قلعہ دھک اور قلعہ سو اور پھر تین سال تک قلعہ نامی میں قید رکھا گیا۔ دس سال کی قید کے بعد اس نے اپنا حال ایک قصیدہ میں لکھ کر سلطان ابراہیم کی خدمت میں روانہ کیا اس میں کہتا ہے

بحضرت آمدم انصاف خواہ و داد طلب | خبر نداشتم از حکم ایزد دادار
ہمی ندانم خود را گناہی و جرمی | مگر سعایت زبلیس دشمن مکار

آخر دربار کے ایک امیر عمید الملک ابوالقاسم خاص کی سفارش پر قید سے آزاد کیا گیا مگر زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ اسے دوبارہ گرفتار کرکے قلعہ مرنج میں قید کر دیا۔ اس کے بعد وہ پھر آٹھ سال تک قید رہا۔ ۵۰۰ھ ہجری میں طاہر علی مشگان کی سفارش پر اسے رہائی ملی۔ اس طرح مسعود سعد نے اپنی زندگی کے اٹھارہ بہترین سال زنداں میں بسر کئے۔ دوسری مرتبہ قید سے رہائی پانے کے بعد وہ نہایت شکستہ دل پریشان، کمزور اور بوڑھا ہو گیا تھا اس لئے اس نے بادشاہوں کی خدمت سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

مسعود سعد ایران کے قصیدہ گو شاعروں میں درجہ اول کا شاعر ہے اس کے سبک پر خراساں کے شاعروں کا اثر نمایاں ہے مسعود کی شاعری میں خراسان کے شاعروں کی بہ نسبت معشوق، شراب، اور فطرت کی تعریف کم ملتی ہے لیکن اس کے باوجود اس کے پاس نہایت پاکیزہ اور شیریں تغزل موجود ہے۔ استاد مسعود صرف اپنی مادری زبان کا ہی ادیب نہ تھا بلکہ عربی اور ہندی سے بھی خوب واقف تھا۔ اور عربی میں اس نے شعر کہے ہیں۔ مسعود سعد کا وہ خاص سبک جس نے اسے ایران کے بہت بڑے شاعروں کی صف میں جگہ عطا کی ہے اس کے زندانی اشعار یا حبسیات میں جلوہ گر ہے ایرانی ادبیات میں اس طرح کی شاعری کمیاب ہے ان اشعار میں اندرونی احساسات کی سچی ترجمانی کی گئی ہے ان میں شاعر کی بے پایاں مصیبتوں کی بے مثل عکاسی کی گئی ہے۔ مسعود کے یہ زندانی اشعار اتنے پر اثر اور دلگداز ہیں کہ مغرب کے بعض زندانی اشعار جیسے "شیلن" یا مشہور انگریز شاعر بائرن کے اشعار بھی ان کے سامنے ہیچ ہیں۔ مسعود اپنے

پہلے حضرت ابوسعید ابو الخیر کی چند رباعیاں تصوف میں پائی جاتی ہیں لیکن ان میں صرف جوشِ عشق کو پُر زور طریقہ سے ادا کیا ہے تصوف کے مسائل، اسرار اور معارف نہیں بخلاف اس کے حکیم سنائی کی تصنیفات تصوف کی مستقل تصنیفیں ہیں خود حکیم صاحب کو بھی اس کا دعویٰ ہے۔

کس نہ گفتست ایں چنیں سخن بہ جہاں — ور کسی گفت گو بیار و بخوان

زیں نمط ار چہ در جہاں سخن است — گر یکی در ہزار آں سخن است

چوں ز قرآں گذشتی وز اخبار — نیست کس را ازیں نمط گفتار

حدیقہ میں تصوف کے تمام مقامات کو الگ الگ عنوان سے لکھا ہے اور نہایت خوبی سے ادا کیا۔

۳۔ قدما کی شاعری اگرچہ نیچرل شاعری تھی لیکن طرز ادا شاعرانہ نہ تھا۔ جس بات کو کہنا چاہتے تھے صاف، بے تکلف سیدھے سادے طور پر کہہ دیتے تھے معمولی بات کو انوکھے پیرائے میں ادا کرنا یا ایک معمولی واقعہ سے منطقیانہ استدلال پیدا کرنا، متوسطین اور متاخرین کا جوہر ہے لیکن اس کے موجد سنائی ہیں۔

۴۔ اخلاقی شاعری کی بنیاد بھی حکیم سنائی نے قائم کی اور گو آگے چل کر اس صنف کو بہت وسعت ہوئی لیکن اصول اور آئین حکیم سنائی نے قائم کر دئے تھے:۔

ترا ایزد ہمی گوید کہ در دنیا مخور بادہ — ترا ترسا ہمی گوید کہ در صفرا مخور حلوا

ز بہر دیں تو نگذاری حرام از حرمت یزداں — ولیک از بہر تن مانی حلال از گفتۂ ترسا

اختلاط اور صحبت میں خوبیاں ہیں اور برائیاں بھی اس لئے ارباب حال دونوں طرف گئے ہیں لیکن اس نکتہ کی طرف کسی کا ذہن نہیں گیا کہ خوبی

کا جو پہلو ہے وہ بھی زحمت سے خالی نہیں ۔

کسی کش خود رہنموں است ہر گنہ — بہ گیتی رہ و رسم الفت نورزد
کہ صحبت نفاقی است یا اتفاقی — دل مرد دانا ہر دو لرزد
اگر خود نفاقی است جاں را بلا ہا — دگر اتفاقی است ہجراں نیرزد

یعنی اگر صحبت منافقوں کے ساتھ ہے تو ظاہر ہے کہ سوہان روح ہے اور اگر خاص احباب کے ساتھ ہے تب بھی اس لئے بری ہے کہ اس حالت میں جدائی کا صدمہ جانگزا ہوگا ۔

(۵) جوش اور سرمستی جو حقیقی شاعری ہے ایشیا کے شعراء میں بہت کم پائی جاتی ہے ۔ فارسی شعراء میں مولانا روم پہ یہ نشہ چھایا ہوا ہے خواجہ حافظ بھی کبھی کبھی بدمست ہو جاتے ہیں لیکن حکیم سنائی ان سب کے پیشرو ہیں ۔

طلب ای عاشقانِ خوش رفتار — طرب ای شاہدانِ شیریں کار
تا کے از خانہ ہاں رہ صحرا — تا کہ از کعبہ ہیں در خمار
در جہاں شاہدی و ما فارغ — در قدح جرعۂ و ما ہشیار

(۶) شاعری کے اجزا میں ایک بڑا ضروری جز تمثیل و تشبیہ ہے شاعر کبھی کوئی اخلاقی دعویٰ کرتا ہے تو دلیل میں اس کو تمثیل پیش کرنی پڑتی ہے کبھی کسی چیز کی اچھائی یا برائی ثابت کرنا یا کسی چیز کی تصویر اور ہیئت کھینچنا چاہتا ہے تو تشبیہ اور تمثیل کے بغیر چارہ نہیں ہوتا ۔ شاعری کی اس صنعت کے موجد بھی حکیم سنائی ہی ہیں ۔

تو علم اموختی از حرص اینک ترس کاندر شب — چو دزدی با چراغ آید گزیدہ تر برد کالا
چو تن جاں را مزین کن بہ علم دیں کہ زشت آید — درون سو شاہ عریاں و برون سو کوشک دیبا

——— (شعر العجم از شبلی نعمانی)

حکیم ابوالمجد مجدود بن آدم سنائی چھٹی صدی ہجری کے فارسی زبان کے مسلمہ استاد شاعروں میں ایک بلند مقام اور عالی مقدار شاعر ہے اس کا نام عوفی نے .... لباب الالباب" میں مجدالدین آدم السنائی ، حاجی خلیفہ نے محمد بن آدم لکھا ہے تاریخ گزیدہ میں بھی محمد ہی درج ہے لیکن جامی اور ہدایت نے اس کے نام کو حکیم ابوالمجد مجدود بن آدم سنائی لکھا ہے اور اس کے اپنے اشارے بھی جو نظم ونثر دونوں میں ہیں اسی کی تصدیق کرتے ہیں چنانچہ دیوان کے نثری مقدمہ میں بھی اور حدیقۃ الحقیقۃ" میں بھی اسی طرح لکھا ہے۔

ہر کہ او گشتہ طالب مجد است ‏ ‏ شقی او ز لفظ بو المجد است

شعر او را بلفظ مقصودم ‏ ‏ زیں قبل نام گشت مجدودم

زانکہ جد را بتن شدم بثبیت ‏ ‏ کرد مجدود ما شنیم کنیت

سنائی کے دیوان میں بعض ایسے اشعار بھی دیکھے گئے ہیں جن میں ایک دوسرے نام کی طرف اشارہ ہے یعنی ان اشعار میں اس نے اپنے آپ کو "حسن" لکھا ہے مثلاً یہ شعر

بسپری داری ہمنام رہی ‏ ‏ کہ تو تمی خدمت او جوئیہ من

زانکہ نیکو کند از ہمنامی! ‏ ‏ خدمت خواجہ حسن بندۂ حسن

اسی وجہ سے برخی اس پر مصر ہے اس کا نام اصلاً "حسن" تھا

اس کی ولادت پانچویں صدی کے دوسرے حصے کے اوائل یا وسط میں ہوئی غزنی میں ہوئی - قدیم ترین بادشاہ جس کی مدح سنائی کے دیوان میں ہے مسعود بن ابراہیم ہے (۴۹۲ - ۵۰۸) ہے لیکن اس کے بعد یمین الدولہ بہرام شاہ بن مسعود (۵۱ - ۵۵۲) کا ذکر اس کی حدیقہ میں ملتا ہے - بہرحال سنائی کا آغاز شاعری کا کارنامہ مداحی معلوم ہوتا ہے مگر اس کے بعد طبیعت یکسر

بدل گئی تھی کہ جب بہرام شاہ نے اپنی بہن کا نکاح ان سے کرنا چاہا تو انہوں نے اس کو ٹھکرا دیا سنائی کے سال وفات کے بارے میں اختلاف ہے لیکن آقائی مدرس رضوی نے دیوانِ سنائی کے مقدمہ میں ان کی وفات ۵۳۵ ہجری میں بتائی ہے جو درست معلوم ہوتی ہے ۔

اس کا دیوان مدح، غزلیات، رباعیات، قطعات اور ہجویات پر مشتمل ہے ۔ اس دیوان کے علاوہ ان کے شعری کارناموں میں حدیقۃ الحقیقت۔ شریعت الطریقت، سیر العباد۔ طریق التحقیق، کارنامہ بلخ، عشق نامہ، عقل نامہ، تجربۃ العلم بھی شامل ہیں، یہ تمام مثنویاں ہیں ۔

اس کے کلام کا مطالعہ کرتے وقت دو سبکوں کی نشاندہی ملتی ہے ، یہ دونوں سبک اور سنائی کے افکار کا یہ رجحان اس کی زندگی دو مرحلوں میں مربوط ہے زندگی کے پہلے حصے میں شاعر درباری لہو ولعب میں پڑ گیا اور قصائد و مدح کی طرف متوجہ ہوا اس کے قصائد کی تشبیب میں تغزل کا رنگ ملتا ہے اس حصہ میں وہ قصیدہ گو شعرا عنصری ، فرخی مسعود سعد اور خصوصاً فرخی کی پیروی کرتا نظر آتا ہے لیکن زندگی کے دوسرے حصے میں اپنے کلام میں مختلف موضوعات کو لیتا ہے مثلاً احادیث، آیات، تمثیلات و استدلات عقلی کا بیان ہے اس کے علاوہ ان اشعار میں اپنے مقاصد کے لئے علمی اصطلاحات کو استعمال کرتا ہے جس کی وجہ سے اس عہد کے اشعار شکل، تشریح طلب اور محتاج تفسیر ہیں ۔ (ادبیات در ایران ذبیح اللہ صفا)

سنائی کے قصائد سے پتہ چلتا ہے کہ شروع شروع میں آپ نے فرخی اور منوچہری کا انداز اختیار کیا تھا ان کے بعض اشعار کو تضمین بھی کیا آپ کے

قصائد کی اکثر تشبیہات فرخی سے مشابہہ ہیں لیکن محض تقلید کرنے سے کسی کی شاعرانہ عظمت کا پتہ نہیں اس لئے ان کی درباری شاعری سے ان کا مقام متعین کرنے میں ہمیں مدد نہیں ملتی لیکن جب آپ نے تقلید کو چھوڑ کر تحقیق کی منزل میں قدم رکھا تو یہاں سے آپ کے فکر و خیال کی آزادی کا دور شروع ہوا اس انقلاب نے آپ میں ایک خاص استغنا پیدا کر دیا تقلید کی جگہ اختراع نے لے لی اور شعر و فکر میں آپ کا ایک مخصوص انداز ہوگیا جو اس دور کے تمام شعراء سے مختلف ہے۔

آپ کے انقلابی دور کی شاعری عارفانہ رنگ میں ہے اور فکر کی گہرائی اور خیالات کی وسعت کا پتہ دیتی ہے یہ شاعری دعوت و تعلیم کی شاعری ہے۔ شاعر فلسفیانہ انداز میں تزکیہ نفس، رد غرور اور ترکِ ظاہر پرستی کی تلقین کرتا ہوا نظر آتا ہے محنت اور استقلال کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں

عمرہا باید کہ تا یک کودکی از روی طبع　　　عالمی گردد نکو یا شاعری شیریں سخن

آپکے دیوان میں اکثر اشعار ظاہر پرستی، ریاکاری، ایذا پسندی اور بے وفائی کی شکایت میں ہیں معلوم ہوتا ہے کہ انہیں دنیا میں تلخ تجربات بھی ہوئے ہیں اس لئے انہوں نے اصلاح حال کی طرف توجہ دلائی ہے اور صفائی قلب کسب حکمت، ترک حرص اور ایمان و عرفان کی دعوت دی ہے۔

حکیم سنائی نے شروع میں فرخی اور منوچہری کی طرز پر قصیدے کہے تھے لیکن ان کے کلام میں بہت پختگی اور برجستگی ہے کہیں کہیں طرزِ ادا میں جدت بھی ہے۔

سنائی پہلا شاعر ہے جس نے تصوف کے اسرار و رموز بیان کرنے کے لئے شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا، ابو سعید ابوالخیر نے بھی اپنے عارفانہ تاثرات رباعیوں

میں پیش کئے ہیں لیکن ان کا کلام تصوف کی کوئی باقاعدہ اور مستقل تصنیف نہیں ہے
بخلاف اس کے حکیم سنائی کی تمام مثنویاں تصوف کے اسرار و رموز کی مستقل تصنیفیں
ہیں چنانچہ مولانا روم ایسے عارف کو بھی اس بات کا اعتراف ہے۔

ترک جوشی کردہ ام من نیم خام — از حکیم غزنوی بشنو تمام
در الٰہی نامہ گوید شرح ایں — آں حکیم غیب و فخر العارفین

تصوف اور اخلاق کے موضوع پر حکیم سنائی کا ایک زندہ جاوید کارنامہ
"حدیقۃ الحقیقت" ہے اس میں آپ کی قادر الکلامی پوری طرح سے آشکارا
ہے سنائی نے مثنوی میں اصلاح حالات کے لئے نہایت مفید تعلیم دی ہے۔

سنائی نے رباعیاں اور قطعات بھی لکھے ہیں ان سب کا موضوع بھی۔
پند و موعظت ہے سنائی نے طویل عمر پائی اور غزنی میں رحلت کی آپ کے
سال وفات کے متعلق تذکرہ نویسوں میں اختلاف پایا جاتا ہے تاریخ گزیدہ
میں ان کا سال وفات ۵۲۵ ہجری بتایا ہے لیکن یہ درست معلوم نہیں ہوتا
کیونکہ اس نے مثنوی "طریق التحقیق" ۵۲۸ میں مکمل کی تھی بدیع الزماں نے
ان کا سال وفات ۵۴۵ ہجری لکھا ہے اس کو ہی درست سمجھنا چاہیئے

(ادب نامہ ایران مقبول بیگ بدخشانی)

مسعود سعد سلمان

مسعود سعد سلمان کا شمار غزنوی اور سلجوقی دور کے مشہور شاعروں میں ہوتا ہے اس کا خاندان ہمدان کا رہنے والا تھا لیکن یہ ہندوستان کے مشہور شہر لاہور میں ۴۴۰ ہجری کے قریب پیدا ہوا اس کے اجداد اہل ہمدان تھے خصوصاً مسعود کے باپ اور اس کے دادا سلمان کا شمار اپنے زمانے کے عالموں میں ہوتا تھا مسعود کے باپ نے ساٹھ سال تک غزنوی سلاطین کی خدمت کی چنانچہ مسعود اپنے ایک قصیدہ میں کہتا ہے۔

ے شصت سال تمام خدمت کرد　　پدر بندہ سعد بن سلمان

کہ المعروف بودی از عمال　　کہ بدرگاہ بودی از اعیان

سلمان کی ہندوستان میں جاگیر اور جائداد تھی۔ مسعود نے ایام جوانی میں غزنوی سلاطین کے دربار سے تعلق پیدا کیا۔ جب سلطان ابراہیم غزنوی نے اپنے بیٹے محمود ملقب بہ سیف الدولہ کو ۴۶۹ ہجری میں ہندوستان کی حکومت عطا کی تو مسعود سعد اس کی ملازمت میں داخل ہو گیا اور اس کے دفتر کے خاص لوگوں میں اس کا شمار ہونے لگا۔ ہندوستان میں چند سال حکومت دینے کے بعد سیف الدولہ سے سلطان ناراض ہو گیا سلطان نے حکم دیا کہ اسے اس کے بعض ناریوں کے ساتھ گرفتار کر لیا جائے اور ان سب کو پکڑ کر زنداں میں ڈال دیا مسعود سعد کو بھی سات سال تک قلعہ دھک اور قلعہ سو اور پھر تین سال تک قلعہ نامی میں قید رکھا گیا۔ دس سال کی قید کے بعد اس نے اپنا حال ایک قصیدہ میں لکھ کر سلطان ابراہیم کی خدمت میں روانہ کیا اس میں کہتا ہے

بحضرت آمدم انصاف خواہ و داد طلب | خبر نداشتم از حکم ایزد دادار
همی ندانم خود را گناهی و جرمی | مگر سعایت زبلیس دشمن مکار

آخر دربار کے ایک امیر عمید الملک ابوالقاسم خاص کی سفارش پر قید سے آزاد کیا گیا مگر زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ اسے دوبارہ گرفتار کر کے قلعہ مرنج میں قید کر دیا۔ اس کے بعد وہ پھر آٹھ سال تک قید رہا۔ ۵۰۰ھ ہجری میں طاہر علی مشگان کی سفارش پر اسے رہائی ملی۔ اس طرح مسعود سعد نے اپنی زندگی کے اٹھارہ بہترین سال زنداں میں بسر کئے۔ دوسری مرتبہ قید سے رہائی پانے کے بعد وہ نہایت شکستہ دل پریشان، کمزور اور بوڑھا ہو گیا تھا اس لئے اس نے بادشاہوں کی خدمت سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

مسعود سعد ایران کے قصیدہ گو شاعروں میں درجہ اول کا شاعر ہے اس کے سبک پر خراساں کے شاعروں کا اثر نمایاں ہے مسعود کی شاعری میں خراسان کے شاعروں کی بہ نسبت معشوق، شراب، اور فطرت کی تعریف کم ملتی ہے لیکن اس کے باوجود اس کے پاس نہایت پاکیزہ اور شیریں تغزل موجود ہے۔ استاد مسعود صرف اپنی مادری زبان کا ہی ادیب نہ تھا بلکہ عربی اور ہندی سے بھی خوب واقف تھا۔ اور عربی میں اس نے شعر کہے ہیں۔ مسعود سعد کا وہ خاص سبک جس نے اسے ایران کے بہت بڑے شاعروں کی صف میں جگہ عطا کی ہے اس کے زندانی اشعار یا حبسیات میں جلوہ گر ہے ایرانی ادبیات میں اس طرح کی شاعری کمیاب ہے ان اشعار میں اندرونی احساسات کی سچی ترجمانی کی گئی ہے ان میں شاعر کی بے پایاں مصیبتوں کی بے مثل عکاسی کی گئی ہے۔ مسعود کے یہ زندانی اشعار اتنے پر اثر اور دلگداز ہیں کہ مغرب کے بعض زندانی اشعار جیسے "شیلن" یا مشہور انگریز شاعر بائرن کے اشعار بھی ان کے سامنے ہیچ ہیں۔ مسعود اپنے

عالی مقام اور اپنے کلام کے اثر کی وجہ سے دربار کے بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات رکھتا تھا۔

مسعود سعد نے ۵۱۵ ہجری میں وفات پائی اس کی عمر ۸۰ سال کے لگ بھگ تھی (تاریخ ادبیات رضا زادہ شفق)

مسعود بن سعد سلمان ایران کے پانچویں صدی کے نصف دوم اور چھٹی صدی کے آغاز کے شاعرانِ عظیم میں شمار ہوتا ہے عوفی نے اس کا "سعد الدولہ والدین" کے لقب سے ذکر کیا ہے۔ عوفی کا خیال ہے کہ اس کی جائے پیدائش ہمدان ہے اسی کی تائید تقی الدین کاشی نے کی ہے۔ اس کے باپ کا نام سعد بن سلمان تھا جوکہ غزنوی دربار کے عمال میں سے تھا۔

مسعود کی ولادت علامہ قزوینی کی تحقیق کی بنا پر ۴۴۰، ۴۳۸ ہجری کے درمیان ہے اور اس کی شاعری کا آغاز سلطان ابراہیم کے عہد سلطنت میں ہوتا ہے اور اسی بادشاہ کے عہد میں مسعود اپنے باپ کی وساطت سے درباریوں میں شامل ہوا۔ اور جس وقت سیف الدولہ محمود بن ابراہیم ہندوستان کا حکمران ہوا تو مسعود سعد بھی اس کے ندیموں میں شامل ہوکر ہندوستان چلا گیا اور جب سیف الدولہ محمود کو ۴۶۹ ہجری میں ہندوستان کی حکومت سے معزول کر دیا اور اس کے بعد جب اس کو ۴۸۰ ہجری میں قید کر دیا گیا تو مسعود سعد کو بھی اس کے ساتھ قید خانہ میں ڈال دیا چنانچہ سات سال تک قلعہ سو و دھک اور تین سال قلعہ نای میں مقید رہا۔ ذیل کے شعر میں اس کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ع ہفت سالم بکوفت سو و دھک پس از آنم سہ سال قلعہ نای

مسعود نے دس سال ناکامی و نامرادی اور قید و حبس کی تکالیف برداشت

کیں آخر سلطان ابراہیم محمود کے قصائد لکھ کر اس کے پاس بھیجے اور بادشاہ نے عفو و معذرت خواہی کی اور آخر کار عماد الدولہ ابوالقاسم کی سفارش پر رہائی ملی

مسعود سعد ایران کے فصحاء و شعرا کی صف میں آتا ہے اور وہ اپنے دل پسند سبک اور کلام کی بلاغت کے باعث مشہور ہے۔ انتخاب کلمات اور بیان معنی میں مہارت رکھتا تھا۔ تراکیب کے تناسب و تنسیق پر بھی پوری قدرت حاصل تھی وہ نئی نئی تشبیہات اور تازہ تازہ تراکیب کو استعمال میں لاتا تھا، الفاظ اور مضامین کی تکرار اس کے اشعار میں نہیں ملتی وہ خود کہتا ہے ؎

اشعار من آنست کہ در صفت نظمش　　نہ لفظ معار است و نہ معنی مثنی

اس کے کلام کی یہی خوبیاں تھیں جو اس کے معاصرین کے زبان زد ہو گئیں۔ اس کا اپنا قول ہے کہ اس کے اشعار شعری معرکوں میں دلیل کے طور پر لائے جاتے تھے ؎

اگر دو تن را جنگ! وفتادی اندر شعر　　ز شعر بندہ بدلشان شواہد و برہان!

اس کے وہ اشعار جو قید خانے میں وطن اور محبوب سے جدا ہو کر پریشانی اور آشفتگی کی حالت میں کہے گئے ہیں وہ فصاحت و بلاغت اور الفاظ کے چکاچوند کے علاوہ تاثیر کے لحاظ سے قابل توجہ ہیں اور ناقدان سخن کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ نظامی عروضی اس کے اشعار کے بارے میں لکھتے ہیں "ارباب خرد و اصحاب انصاف دانند کہ حبسیات مسعود در علوم بچہ درجہ است و در فصاحت بچہ پایہ بود وقت باشد کہ من از اشعار او ہمی خوانم، موی بر اندام من بر پای خیزد و جای آں بود کہ آب از چشم من برود"

اس کے فارسی دیوان میں اٹھارہ ہزار شعر ہیں جو قصیدہ، مثنوی، قطعات ترجیعات، مسمط، غزل اور رباعی کی شکل میں ہیں

(تاریخ ادبیات در ایران ذبیح اللہ صفا)

مسعود بن سعد بن سلمان سلطان غزنوی اور سلجوقی دور کا ایک مشہور شاعر ہے اس کے آباؤ اجداد کا وطن ہمدان ہے مسعود کے والد سعد بن سلمان ہمدان چھوڑ کر لاہور آ گئے مسعود یہیں ۴۴۰ ہجری میں پیدا ہوا

مسعود کے باپ کا شمار علماء میں ہوتا تھا چنانچہ علم و فضل کی بدولت دربار غزنویہ میں رسائی ہوئی اور ساٹھ سال تک اسی دربار سے وابستہ رہے جیسے کہ وہ خود لکھتا ہے۔

شصت سال تمام خدمت کرد   پدر بندہ سعد بن سلمان

کہ بہ اطراف بودی از عمال   کہ بدرگاہ بودی از اعیان

اس عرصے میں مسعود کے والد کو خدمات کے صلے میں جاگیریں بھی عطا ہوئیں مسعود آغاز جوانی میں ابراہیم بن مسعود غزنوی (۴۵۰ تا ۴۹۲ ہجری) کے دربار سے وابستہ ہوا اور سلطان ابراہیم او   ے بیٹے سیف الدولہ محمود کے سپرد کی؟ تو مسعود بھی اس کے ساتھ ہندوستان آگیا اور لاہور میں اقامت اختیار کی مسعود نے ایام جوانی کے بہترین قصیدے یہیں لاہور میں سیف الدولہ کی شان میں کہے ہیں مسعود کو لاہور میں بڑی شان و شوکت حاصل تھی اپنے اس محسن حکمران کی علم پروری کی وجہ سے اس نے جوانی کا ابتدائی حصہ بڑے امن و عافیت سے گزارا۔

اس کی یہ خوش دلی زیادہ دیر نہ رہ سکی سلطان ابراہیم کو کسی نے یہ اطلاع دی کہ امیر محمود سلطان ملک شاہ سلجوقی کے ساتھ ساز باز کر رہا ہے اور وہ ہندوستان چھوڑ کر عراق جانے والا ہے چنانچہ امیر سیف الدولہ محمود کی مصاحبت کی پاداش میں سات سال تک سو و دھاک کے قلعوں میں اور تین سال تک قلعہ نائی میں قید رہا چنانچہ وہ کہتا ہے۔

ے ہفت سالم بکوفت سو و دھک پس از آنم سہ سال قلعہ نای!

قید و بند کے اس طویل عرصے میں مسعود نے نہایت پر سوز اور دردناک شعر کہے ہیں جن کی مثال ملنی مشکل ہے نظامی عروضی سمرقندی نے مسعود کے شعروں کا حوالہ دیا ہے جو اس نے سلطان ابراہیم کی خدمت میں اپنی بے گناہی ظاہر کرنے کے لئے لکھے تھے:۔

در بند تو ای شاہ ملک شاہ باید تا بند تو تاجداری شاید
آنکس کہ ز پشت سعد سلمان آید گر زہر شود ملک ترا نگزاید

ان اشعار کا سلطان پر کچھ اثر نہ ہوا اور مسعود بدستور قید و بند کی سختیاں جھیلتا رہا اسیری کے دوران میں مسعود نے پھر سلطان ابراہیم کی خدمت میں ایک اور قصیدہ لکھ کر بھیجا جس کا ایک شعر یہ ہے

ہمی دانم خود را گناہی و جرمی مگر سعایت و تلبیس دشمن مکار

اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسعود سعد کی اسیری محض حاسدوں اور دشمنوں کی بدگوئی اور دراندازی کا نتیجہ تھی دس سال کی اسیری کے بعد سلطان ابراہیم نے اسے عمید الملک ابوالقاسم کی سفارش پر قید سے آزاد کر دیا بالآخر مسعود لاہور چلا گیا اور یہاں اپنی جاگیر کی غور و پرداخت میں مصروف ہو گیا۔ سلطان ابراہیم کی وفات پر مسعود بن ابراہیم نے غزنی کی حکومت سنبھالی اس نے اپنے بیٹے عضد الدولہ شیرزاد کو ہندوستان کی حکومت سپرد کی اور ہندوستان کی فوج کا سپہ سالار نظام الدین ابونصر پارسی کو مقرر کیا جو علم و ادب کا شیدائی اور مسعود کے دوستوں میں سے تھا اس کے توسط سے مسعود سعد کو جالندھر کا حاکم مقرر کر دیا لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ابونصر شاہی عتاب کا شکار ہوا اور اس کی دوستی کی وجہ سے مسعود سعد کو گرفتار کر کے قلعہ مرنج میں ڈالا گیا مسعود

مسعد یہاں بھی آٹھ سال قید رہا بالآخر ۵۰۲ ہجری میں سلطان مسعود کے وزیر طاہر علی کی سفارش سے آزاد ہُوا۔

اب جو زنداں سے باہر آیا تو سخت نحیف و ناتواں ہوگیا تھا اور شاہی دربار کی طرف رجوع کرنے کے بجائے اس نے گوشہ نشینی کو ترجیح دی اور جیتے جی اس گوشے کو نہ چھوڑا آخر پچھتّر سال کی عمر میں اس دارِ محن کو خیرباد کہا

مسعود سعد سلمان کی مشہور تصنیف "حبسیات" ہے جو اس کے اٹھارہ سالہ دورِ اسیری کی یادگار ہے مسعود سعد کو شعر و سخن میں جو اتنا بلند مقام حاصل ہوا وہ اسی حبسیات کی بدولت ہُوا مسعود کی حبسیاتی شاعری رنج و الم کے سلسلہ طویل کا نتیجہ ہے اس میں وہ کراہیں اور آہیں سنائی دیتی ہیں جو قید خانہ کے تاریک گوشوں میں بھرتا رہا۔

مسعود سعد کے فکر و خیال میں بہت جدت ہے ہوا چلتی ہے اور بادل مینہ برساتا ہے یہ روزمرہ کی باتیں ہیں لیکن اس سے مسعود نے کتنا نیا مضمون پیدا کیا ہے۔

ے ای باد مرد ب راہ رالبحر ۔۔۔ وی ابر بیار مرزمین گوہر

مسعود نے کئی کئی ترکیبیں وضع کر کے مضامین اور معانی کو بلند کردیا ہے

مسعود قصیدہ نگاروں کی صفِ اول میں ہے اسے حال زار کے بیان کرنے اور اندوہگین زندگی کی تصویر کھینچنے میں خاص ملکہ حاصل ہے مسعود کی سخن وری کا سکّہ تمام اہلِ دربار کے دلوں پر تھا اور اس کے ہم عصر شعرا اس کی فضیلت کی وجہ سے اس کا بہت احترام کرتے تھے۔ حکیم سنائی ایسے بزرگ نے مسعود کی وفات کے بعد اس کا دیوان مرتب کیا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے دل میں مسعود کی کس قدر قدر و منزلت تھی۔

(ادب نامہ ایران مقبول بیگ بدخشانی)

امیر معزی

محمد بن عبد الملک متخلص بہ معزی نیشاپور میں پیدا ہوا اس کا باپ برہانی، الپ ارسلان کے دربار کا شاعر تھا اس نے الپ ارسلان کے بیٹے ملک شاہ کے عہد حکومت کی ابتدا میں بحالت سفر بمقام قزوین انتقال کیا اپنی موت کو نزدیک دیکھ کر برہانی نے اپنے بیٹے محمدؐ کی سفارش میں ایک قطعہ لکھ کر سلطان ملک شاہ کے پاس بھیجا تھا۔

آمد چہل و شش ز قضا مدت عمرم — در خدمت درگاہ تو صد سال شمردم
بگذاشتم ایں خدمت دیرینہ لبفرزند — واندر سفر از علت دہ روزہ بمردم
رفتم من و فرزند من آمد خلف صدق — او را بخدا و بخداوند سپردم

اگرچہ ملک شاہ کے دربار سے محمد معزی کا تعلق ہو گیا تھا لیکن شاہی تقرب حاصل نہ تھا سلطان کے قرابت مند امیر علی فرامرز نے اسے سلطان کے حضور میں پیش کیا کہتے ہیں کہ ایک روز سلطان رمضان کا چاند دیکھنے کے ارادے سے باہر نکلا اور اس نے دوسروں سے پہلے چاند دیکھ لیا اس موقع پر معزی بھی موجود تھا اس نے فوراً یہ رباعی کہہ کر سلطان کے نذر کی۔

ای ماہ چو ابروان یاری گوئی — یاتی چو کمان شہر یاری گوئی
نعلی زدہ از زر عیاری گوئی — در گوش سپہر گوشواری گوئی

سلطان کو یہ رباعی پسند آئی اور اس نے شاعر کو انعام میں ایک گھوڑا عطا کیا معزی نے فوراً ایک اور رباعی کہہ کر گذرانی۔

چوں آتش خاطر مرا شاہ بدید — از خاک مرا بر زبر ماہ کشید

چوں آب بجی ترانہ از من بشنید	چوں باد بجی مرکب خاصم بخشید

.... سلطان نے اور انعام دیئے اور اس کا مرتبہ بڑھا کر حکم دیا کہ اسے امیر معزی کہا جائے۔

معزی کے دیوان میں اٹھارہ ہزار پانچسو شعر پائے جاتے ہیں اور اس کا دیوان قصائد، غزلیات قطعات اور رباعیات پر مشتمل ہے معزی کی شاعری کے رنگ اور خراسان کے متقدم شعراء کے رنگ میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا حقیقت یہ ہے کہ معزی نے ان شاعروں کی خوب پیروی کی ہے اور اس کے قصیدے کیا موضوع کے لحاظ سے اور کیا الفاظ کے لحاظ سے عنصری اور فرخی کے قصیدوں سے بہت ملتے جلتے ہیں اور بعض جگہ تو ان کے سبک کی مشابہت بہت ہی نمایاں ہے مثلاً اس کا وہ قصیدہ جو اس نے عمید الدولہ جمشید بن بہمنیار وزیر فارس اصفہان کی مدح میں لکھا ہے فرخی کے اس مشہور قصیدے سے بہت ملتا جلتا ہے جو اس مطلع سے شروع ہوتا ہے۔

برآمد نیلگوں ابری زروی نیلگوں دریا	چو رائی عاشقاں گرداں چو طبع بیدلاں شیدا

معزی کے قصیدے کا مطلع ہے ؎

برآمد ساج گوں ابری زروی نیلگوں دریا	بخار مرکز خاکی نقاب قبۂ خضرا

اسی طرح معزی کے کلام میں منوچہری کے کلام کا رنگ اور اس کے مضامین کا پرتو بھی صاف دکھائی دیتا ہے ان شاعروں کے سوا عسجدی کے کلام کا اثر بھی معزی کے کلام پر پڑا ہے اپنے ایک قصیدے کے ضمن میں عسجدی کو یاد کر کے اس کے بارے میں کہتا ہے۔

بوزن و قافیت آں کہ عسجدی گوید	"غلام وار میاں بستۂ و گشادہ نقاب"

معزی بہت بڑا قصیدہ گو اور مدحیہ قصیدہ کا بڑا زبردست استاد تھا اس کا

سب سے بڑا کمال یہ ہے۔ کہ اس نے اس رنگ کے بڑے بڑے خراسانی شاعروں کی پیروی کی ہے اور فن یہ ہے کہ وہ اس فن میں، اس فن کے استادوں کی برابری کرتا ہے اس کے قصیدے عام طور پر مفصل اور محکم ہوتے ہیں اور ان میں تشبیہ، مجاز اور استعارے کی ساری صنعتیں پائی جاتی ہیں معزی نے غزلیں بھی کہی ہیں اور قطعے اور مسمط اور رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ ممدوح کے اوصاف کی مدح میں معزی حد سے زیادہ مبالغہ سے کام لیتا ہے اس کی شاعری کا موضوع تمام تر مدح گوئی ہے تاہم اور دوسرے موضوع اس کے پاس سرے سے ناپید نہیں ہیں مثلاً اپنا مشہور قصیدہ جو اس مطلع سے شروع ہوتا ہے

شغل دولت بی خطر شد کار ملت یا خطر ؎ تا تہی شد دولت و ملت زشاہ دادگر

ملک شاہ اور اس کے وزیر خواجہ نظام الملک طوسی کے مرثیہ میں لکھا ہے جو ایک ہی سال میں کچھ دنوں کے فصل سے اس دنیا سے اٹھ گئے تھے ان اشعار کو فارسی کے درجہ اول کے مرثیوں میں شمار کرنا چاہیئے اس کے سوا معزی نے بعض نہایت پراثر اشعار بھی لکھے ہیں ان میں عرب شاعروں کے مضامین کی پیروی کی گئی ہے اور منوچہری کا سبک اختیار کیا گیا ہے۔

امیر معزی کی ان خوبیوں کے سوا جن کا ذکر ہو چکا ہے اس کے قصیدوں میں سلجوقی عہد کے تاریخی واقعات بھی بہت ملتے ہیں یہ واقعات ۴۶۵ھ یعنی ملک شاہ کے سال جلوس سے لے کر ۵۲۰ ہجری تک کے دور پر حاوی ہیں ان قصیدوں سے سلطان ملک شاہ اور سلطان سنجر کے اخلاق، عادات اور ان کی لڑائیوں اور صلح ناموں کا حال ان کے ندیموں اور خواجہ نظام الملک طوسی اس کے بیٹوں اور دوسرے وزیروں اور دوسرے لوگوں سے متعلق تفصیلات ملتی ہیں۔

شاعر کی زندگی کے آخری دور میں ایک دردناک واقعہ پیش آیا یعنی چھٹی صدی کے پہلے دہے میں ایک روز سنجر تیر اندازی کی مشق کے لئے نکلا بد قسمتی سے اس کا تیر خطا گیا اور معزی کی بدنصیبی سے اس کے جا لگا اس تیر سے معزی بُری طرح زخمی ہوگیا اگرچہ وہ اس زخم سے فوراً ہی نہیں مرا لیکن ایک عرصہ تک وہ اس زخم کی مصیبت سہتا رہا اور آخر ۵۲۱ھ ہجری میں اس نے اپنی جان جان آفرین کے سپرد کردی (تاریخ ادبیات ایران رضا زادہ شفق)

امیر معزی ایران کے ان چند بڑے شاعروں میں سے ایک ہے جن کو ذاتی شاعروں کی صف میں اولیت کا درجہ حاصل ہے اور جن کی استادی اور عظمت کو سب تسلیم کرتے ہیں۔ عوفی نے اس کو "سلطان جہاں بیان ولشکر کش امراء کلام و شہسوار میدان فصاحت" لکھا ہے اور اس کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ "اس کے شعر میں شیرینی اور سلاست ہے اور بیان کی حالت عالم طفولیت سے شباب کو پہنچ گئی ہے اور اس کے قلم کی سیاہ پستان دایہ نے اپنے عہد کے بچوں کو دوبارہ دودھ سے سیر کیا ہے"

معزی کے ہم عصر شعراء یا اس کے بعد کے شاعروں نے اس کی لطیفت طبعی اور استادی کی تعریف کی ہے جیسا کہ ہم سنائی کے شعر میں دیکھتے ہیں اور سید حسن غزنوی کے اس شعر میں پاتے ہیں جس میں اس نے معزی کی طبع کو بلاغت کی میزان قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے :-

ے در شعر ہمی زیادتی جوید رہ   بر طبع معـــزی خراسانی

اس کے علاوہ مجیر کے اس شعر میں جس میں وہ اپنے آپ کو فخریہ انداز میں معزی ثانی شمار کرتا ہے :-

؎ در عہد تو معزی ثانی منم از آنک — ہمتہ گہ تو مدعہ گوبر سنجری است

لیکن اس کے بارے میں دو بڑے شاعروں نے طعن آمیز گفتگو بھی کی ہے ان میں ایک تو خاقانی ہے جس نے درج ذیل دو شعروں میں اپنے آپ کو اس پر ترجیح دیتے ہوئے کہا:۔

؎ با شعرِ من حدیث معزی فرو گذار — کایں رہ سوی کمال پیشاں بسوی نقص

چوں بیشۂ ضمیرِ من آتش دہد بروں — جان معزی آنجا معزی کشد برقص

اور دوسرا انوری ہے جس نے اس شعر میں کہا ہے کہ

کس ندانم از اکابر گردنکشان نظم — کا ورا صریح خون دو دیواں بگردنست

امیر معزی کے شعروں کی سب سے بڑی خوبی ان کی سادگی ہے معزی زیادہ سے زیادہ معانی کو سادہ سے سادہ الفاظ میں ادا کر دیتا ہے اور اس کا کلام تکلف اور تصنع سے خالی ہے اس کے بلند طبعی خیالات کو سادہ عبارت اور سیدھے سادے انداز میں کسی تعقید اور ابہام کے بغیر پیش کر کے ناقدانِ سخن کی توجہ کا مرکز بن گئی ہے اگرچہ اس کی غزلوں میں فرخی کا سا تغزل دیکھنے میں نہیں آتا لیکن اس نے عمدہ غزلیں کہنے کی کوشش ضرور کی ہے اس کے کلام میں صرف مدح اور غزل کے ہی مضامین نہیں ہیں بلکہ پند و موعظت اور توحید و حکمت کا بھی نمایاں اثر پاتے ہیں۔

معزی کے اشعار کی تعداد انیس ہزار تک پہنچتی ہے مگر ایک فاضل مثال عباس اقبال آشتیانی نے مقدمہ، حواشی اور فہرست کے ساتھ ۱۳۱۸ شمسی میں ۱۸۶۲۳ اشعار کو ترتیب دے کر طبع کروا دیا ۔

اس شاعر کا مقام و مرتبہ ملک شاہ کی خدمت میں ایسا ہی تھا جیسا کہ عنصری کا محمود کے دربار میں تھا اور اس کا کام سلطان ملک شاہ کی خدمت میں اس درجہ

کو پہنچ چکا تھا کہ رودکی اور عنصری کے سوا کسی شاعر کو بادشاہوں کے دربار میں حاصل نہ ہوا۔ (تاریخ ادبیات در ایران ذبیح اللہ صفا)

ابو عبداللہ محمد بن عبدالملک کا شمار آخری سلجوقی عہد کے مشہور شعرا میں ہوتا تھا۔ اس کا وطن نیشاپور اور معزی تخلص ہے۔ یہ تخلص اس نے ملک شاہ سلجوقی کے لقب امیر معز الدولہ والدین کی نسبت سے اختیار کیا۔

معزی کا والد عبدالملک برہانی الپ ارسلان سلجوقی کے دربار کا شاعر تھا برہانی نے ملک شاہ سلجوقی کے آغاز حکومت میں وفات پائی اور وفات سے پہلے قطعہ ذیل لکھ کر ملک شاہ کی خدمت میں اپنے بیٹے کی سفارش کی۔

خسروا شاہا مگر آمد عمر برہانی بسر　　تا قیامت دارث عمر چنان چاکر توئی

جان او بہر ساعتی گوید کہ ای فرزند من　　پیش سلطان جہاں حق مرا حق دار توئی

معزی اگرچہ ملک شاہ کے دربار سے وابستہ تھا لیکن کافی عرصہ اس کو باریابی کا شرف حاصل نہ ہو سکا آخر بقول نظامی عروضی علاء الدولہ امیر علی فرامرز کاکویہ کی وساطت سے بادشاہ کی خدمت میں رسائی ہوئی ایک دن بادشاہ کے مصاحب عید کا چاند دیکھنے میں مصروف تھے بادشاہ بھی سراپردہ سے باہر آیا اتفاق کی بات کہ بادشاہ سب سے پہلے چاند دیکھنے میں کامیاب ہوا معزی نے فی البدیہہ ذیل کی رباعی کہی۔

ای ماہ چو ابروان یاری گوئی　　یا نی چون کمان شہر یاری گوئی

نعلی زدہ از زر عیاری گوئی　　در گوش سپہر گوشواری گوئی

ملک شاہ کو رباعی پسند آئی اور معزی کو انعام میں ایک گھوڑا اور خلعت بخشی معزی نے شکرانے کے طور پر ذیل کی رباعی کہی۔

چوں آتش خاطر مرا شاہ بدید　　از خاک مرا بر زبر ماہ کشید
چوں آب یکی ترانہ از من بشنید　　چوں باد یکی مرکب خاصم بخشید

بادشاہ کی نگاہ میں معزی کی قدر و منزلت اور بڑھ گئی چنانچہ حکم ہوا کہ ایسے شاہانہ لقب کی نسبت سے "امیر معزی" کہہ کر پکارا جائے چنانچہ وہ اسی لقب سے مشہور ہوا۔

۴۸۰ ہجری میں ملک شاہ عالم جاودانی کو سدھارا تو اس کے بعد سنجر کے عہد میں بھی معزی کو بہت عزت حاصل ہوئی یہاں تک کہ اسے ملک الشعراء ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہوا۔

معلوم ہوتا ہے اس خوش نصیب شاعر کا انجام اچھا نہ ہوا محمد عوفی لکھتا ہے کہ سلطان سنجر تیر اندازی کی مشق کر رہا تھا کہ ایک تیر خطا ہو کر امیر معزی کے آ لگا تیر کا زخم بالآخر اس کی ہلاکت کا موجب بنا چنانچہ امیر معزی خود کہتا ہے ؎

منت خدای را کہ بہ تیر خدایگاں　　من بندہ بی گناہ نشدم کشتہ رائگاں

معزی کی وفات ۵۴۲ ہجری میں ہوئی۔

عموماً تذکرہ نویسوں نے امیر معزی کی قصیدہ گوئی کے متعلق بہت بلند رائے کا اظہار کیا ہے وہ خود بھی دعویٰ کرتا ہے کہ اگر دوسرے شعراء کے اشعار کو قافلہ فرض کر لیا جائے تو اس کے اشعار قافلہ سالار کی حیثیت رکھتے ہیں ؎

دگر قیاس کنی شعر شاعراں دگر　　بود چو قافلہ و شعر او چو پیش آہنگ

امیر معزی کی طبیعت اگرچہ رسا ہے لیکن اس نے زور طبیعت عنصری، فرخی اور منوچہری کی تقلید کرنے پر صرف کیا ہے۔ قدما کی پیروی کرنے کی وجہ سے بدیع الزماں نے اس کے متعلق بعض تلخ سے فقرات لکھے ہیں مثلاً "امیر معزی، عنصری اور فرخی کے الفاظ و ترکیبات ہی سے قصیدہ تیار کر لیتا ہے اس طرح گویا عنصری اور فرخی

کے دیوانوں کا خون امیر معزی کی گردن پر ہے چنانچہ الوری کا یہ شعر معزی پر صادق آتا ہے۔

کس دانم از اکابر گردن کشان نظم! کورا صریح خون دو دیوان بگردن است"

معزی اپنے بعض قصائد میں منوچہری کی طرح "سبک عرب" کا پیرو بھی نظر آتا ہے۔ عرب شعراء اکثر ویران مقامات پر آنسو بہاتے ہیں دیار محبوب کی تعریف کرتے ہیں محبوب کے اشتیاق میں کوسوں بڑھے چلے آتے ہیں۔ امیر معزی کے کلام میں الٰہی رجحانات کا پتہ چلتا ہے مثلاً:۔

ای ساربان منزل مکن جز در دیار یار من تا یک زمان زاری کنم بر ربع و اطلال و دمن

اس میں شک نہیں کہ امیر معزی نے سبکہ رداسانی کی پیروی کی اور سبک خراسانی کے بہت بڑے پیروؤں یعنی عنصری، فرخی اور منوچہری کے کلام سے متاثر بھی ہوا لیکن تشبیہات کی جدت اور مدح وستائش میں مبالغہ جو قصیدہ نگار کے دو بڑے ضروری وصف سمجھے جاتے ہیں ان میں وہ کسی سے پیچھے نہیں بلکہ اگر کہا جائے کہ ان میں بھی امیر معزی نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی ہے تو بے جا نہ ہوگا

معزی کے قصائد کی تشبیب میں تغزل کی پوری پوری شان پائی جاتی ہے چند شعر درج ذیل ہیں۔

اگرچہ خرمی ہر کس از بہار بود ہمیشہ خرمیٔ من ز روی یار بود
بجو ئبار شوم پیش سرو سجدہ کنم اگرچہ قامت او سرو جوئبار بود
شگفتہ گرچہ بدیع است از چہ اندیشد کسی کہ بستۂ آں زلف تابدار بود

معزی کے بعض قصائد میں ملک شاہ اور سلطان سنجر کے زمانے کے تاریخی حالات بھی ملتے ہیں جن سے اس زمانے کے بعض تاریخی اور معاشرتی حالات پر روشنی پڑتی ہے

(ادب نامہ ایران مقبول بیگ بدخشانی)

انوری

اوحدالدین محمد انوری دشت خاوراں خراسان کے جنوب میں ولایت ابیورد کے قریہ بدنہ میں پیدا ہوا اور اسی مناسبت سے ابتدا میں خاوری اور پھر انوری تخلص اختیار کیا شاید یہ لقب لوگوں نے اسی مناسبت سے عطا کیا تھا چنانچہ خود کہتا ہے۔

سہ دادند مہتراں لقب انوری ولیک — جز خم ہمی چہ خواند خاقان روزگار

انوری کو سب سے زیادہ عروج سلطان سنجر کے دور حکومت میں حاصل ہوا اسی کے بیان کے مطابق دربار سلطانی میں اس کے تقرب کا سبب اس کا قصیدہ ہوا یہ قصیدہ سلطان سنجر کی مدح میں لکھا گیا ہے اور اس مطلع سے شروع ہوتا ہے

سہ گر دل و دست بحر و کان باشد — دل و دست خدایگاں باشد

۵۴۲ ہجری میں سلطان سنجر نے خوارزم شاہ کو سزا دینے کے لئے دوسری بار خوارزم پر حملہ کیا اس حملہ میں انوری بھی سلطان کے ہمرکاب تھا سلطان کی فوجوں نے جب قصبہ ہزار اسب کا محاصرہ کر لیا تو انوری نے سلطان سنجر کو مخاطب کر کے یہ رباعی لکھی اس رباعی کو تیر سے باندھ کر اتسز کی لشکر گاہ میں پہنچا دیا گیا۔

ای شاہ ہمہ ملک زمین حسب تراست — وز دولت اقبال جہاں کسب تراست
امروز بیک حملہ ہزار اسب بگیر — فردا خوارزم و صد ہزار اسب تراست

۵۴۸ھ میں غز ترکوں نے بغاوت کی اور انہوں نے سلطان سنجر کو مغلوب کر کے اسے گرفتار کر لیا اس کے بعد غزوں نے خراسان کو لوٹنا شروع کر دیا انوری بھی اپنے زمانے کے بہت سے عالموں ادیبوں اور فاضلوں کی طرح معیبتوں کا شکار ہوا

اس نے ظالم غزوں کے مظالم اور ان کی ستم رانیوں کے نظارے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی اس خونی واقعہ کے بعد انوری کئی سال تک جیتا رہا اس دوران میں اس کا تعلق سلجوقی بادشاہوں اور امراء کے درباروں سے باقی رہا۔

کہتے ہیں کہ انوری نے نجوم کے لحاظ سے یہ حکم لگایا تھا کہ سیاروں کے اقتران سے (جو ۵۸۲ھ ہجری میں پیش آیا) ہوا کے شدید جھکڑ چلیں گے اور ان سے بڑی بڑی عمارتیں زمین کے برابر ہو جائیں گی اس خبر سے لوگوں میں بڑا ہراس پھیل گیا اور وہ اپنے مکانات چھوڑ کر دشت ہاموں کی طرف نکل گئے لیکن جب وہ مقررہ وقت آیا اور سیاروں کا اقتران ہوا تو ہر طرف اتنا سکون رہا کہ ایک پتہ بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا اس سے انوری کی بڑی رسوائی ہوئی لوگوں نے اس کا بڑا مذاق اڑایا اور اسے بہت ذلیل کیا ناچار انوری نے مرو کا رہنا چھوڑا پہلے نیشاپور گیا پھر بلخ گیا کہتے ہیں اس واقعہ کے بعد سے اس نے شاعری کا پیشہ بھی ترک کر دیا لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑا اور گوشہ گیر ہو کر بیٹھ گیا۔

سبک اور شاعری

اس میں اصلاً کوئی شک نہیں کہ انوری ایران کا سب سے بڑا قصیدہ گو شاعر ہے اس سے پہلے اس فن کے بڑے بڑے استاد عنصری اور فرخی وغیرہ گزر چکے تھے ان استادوں نے قصیدے کی بنیاد رکھی اور فصاحت کے لحاظ سے اس کو بڑے بلند مرتبہ پر پہنچایا لیکن انوری کے عہد تک فارسی شاعری میں بڑی وسعت اور پختگی پیدا ہو چکی تھی اور وہ وقت آ گیا تھا کہ انوری جیسے باکمال شاعر سے کام لیں انوری ان لوگوں میں تھا جو فارسی زبان اور عربی لغت پر پورا پورا عبور رکھتے تھے انوری کی شاعری صرف شاعری نہ تھی بلکہ وہ علوم وحکمت، ریاضی اور نجوم میں بھی ماہر تھا چنانچہ خود کہتا ہے۔

منطق و موسیقی و حکمت شناسم اندکی　　　راستی باید بگویم با نصیبی وافرم

در الٰہی آنچہ تصدیقش کند عقل صریح　　　گر تو تصدیقش کنی در شرح بسطش ماہرم

نیستم بیگانہ از اعمال و احکام نجوم　　　ور ہمی باور نداری رنجہ شو من حاضرم

انوری کا زمانہ آسمان ادب کے ستاروں کے یک جا جمع ہونے کا زمانہ تھا نظامی، خاقانی، ادیب صابر، ظہیر فاریابی رشید الدین وطواط، معزی، ابو الفرج رونی، عمق بخارائی جیسے شاعر اور دوسرے نامی گرامی علماء فضلاء اور نثر نویس کم و بیش اس کے ہم عصر تھے اور شاعری کا معیار بہت بلند ہو چکا تھا ظاہر ہے ایسے زمانے میں انوری جیسا اپج رکھنے والا صاحب علم و فضل اور زبان کے باریک نکتوں اور اس کی گہرائیوں پر عبور رکھنے والا ہی قصیدہ کا مکمل ترین نمونہ پیش کر سکتا ہے۔

اس لئے بلا شبہ انوری کی شاعری میں قصیدہ کیا الفاظ عبارت اور ترکیب کی فصاحت کے لحاظ سے اور کیا پختگی اور معنی کی گہرائی کے لحاظ سے اپنے پورے کمال پر پہنچ چکا تھا قصیدوں کی ابتدا میں تشبیب، وصف اور اظہار عشق کا تغزل انوری کے قصیدوں میں بہت کم ملتا ہے لیکن انوری کی شاعری میں پچھلے استادوں کے قصیدوں کی باقی تمام فنی خوبیاں کمال درجہ پر موجود ہیں الفاظ کی کثرت تشبیہ کی لطافت، مضمون کی گہرائی، طرز ادا کی دلکشی تجنیس، ایہام، استعارہ، تمثیل، صنائع بدائع اور خاص کر مبالغہ جو مدحیہ قصائد کی جان سمجھا جاتا ہے، غرض یہ سب چیزیں اس کے کلام میں ایک خاص بانکپن کے ساتھ جلوہ گر ہیں انوری کی اس طرز کی وضاحت کے لئے اس کے دو مشہور قصیدے پیش کئے جا سکتے ہیں جن کے مطلع درج ذیل ہیں ؎

باز این چہ جوانی و جمالست جہان را　　　وین حال کہ نو گشت زمین را و زمان را

؎ گر دل و دست بحر و کاں باشد دل و دست خدائگاں باشد

ان قصیدوں میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جو الوری کی خصوصیات سمجھی جاتی ہیں ان میں الفاظ کا انتخاب بھی خوب ہے اور معنی کی گہرائی بھی موجود ہے۔ سلاست روانی، پختگی اور قصیدے کے فنی مضامین کے سوا ان اشعار سے شاعر کی عظمت بھی ظاہر ہے اس کے قصیدے مطالعہ میں گہرے غور و فکر کے طالب ہیں۔

دوسری طرف الوری نے اس گہری علمیت اور دانش کی بنا پر نہایت مشکل اور پیچیدہ قصیدے بھی لکھے ہیں ان کی بہت سی ترکیبیں شرح و بسط کی محتاج ہیں یہ سارا تکلف اس نے مدح گوئی کے لئے کیا ہے۔

الوری کی غزل کا رنگ بھی خوب ہے اس نے بڑی اچھی غزلیں لکھی ہیں۔ ہجو لکھنے میں بھی وہ ماہر تھا اسی طرح اس کے بعض نہایت لطیف اور سودمند قطعات بھی اس کی یادگار ہیں۔ غزل میں اس کا مرتبہ متقدمین شعرا اور اس دور کے بعد آنے والوں شاعروں سے کم نہیں۔

الوری کی وفات کی تاریخ میں بڑا اختلاف ہے جو کچھ صحت سے قریب معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ اس نے ۵۸۰ھ ہجری کے قریب وفات پائی۔

(تاریخ ادبیات ایران رضا زادہ شفق)

الوری جس پایہ کا شاعر تھا اس سے زیادہ خوش قسمت تھا ایران میں تین پیغمبر سخن تسلیم کئے گئے ہیں ان میں ایک الوری بھی ہے چنانچہ مشہور ہے ؎

در شعر بہ تن پیغمبرانند ہر چند کہ لا نبی بعدی

ابیات و قصیدہ و غزل را فردوسی و انوری و سعدی

قصیدہ کا جو انداز چلا آرہا تھا اس پر الوری نے کچھ اضافہ نہیں کیا اور

جس قدر کیا اس میں اس کے ہم عصر بھی شریک ہیں انوری کے قصائد کے خصوصیات یہ بتائے جاتے ہیں کہ اس نے جدید مضامین پیدا کئے مبالغہ کو ترقی دی۔ نئی تشبیہیں پیدا کیں لیکن عبدالواسع جبلی، ارزقی اور ظہیران باتوں میں انوری سے کسی طرح کم نہیں البتہ انوری اپنے معاصرین یعنی ادیب صابر۔ لامعی، رشید الدین وطواط معزی وغیرہ سے بعض باتوں میں ممتاز ہے جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اور شعراء کی طرح اس کا کلام مدح پر محدود نہیں وہ ہر طرح کے واقعات اور معاملات ادا کرتا ہے جس سے زبان کو وسعت حاصل ہوتی ہے آج کوئی شخص اگر عام معاملات ادا کرنا چاہے تو اس کو الفاظ میں، بندش میں، ترکیب میں انوری کے سوا اور شعرار کے کلام سے بہت کم مدد ملے گی۔

جس زمانہ میں غزوں (تاتاریوں) نے سلطان سنجر کو گرفتار کر لیا اور کئی برس تک قید میں رکھا تمام ملک میں بدامنی پھیل گئی اہل خراسان نے احمد سلیمان سے [illegible]تہ کرنا چاہا انوری سے درخواست کی کہ ان عبرت انگیز واقعات کو نظم میں ادا کرے انوری نے فرمائش کی تعمیل کی ؎

برسمرقند اگر بگذری ای باد سحر | نامۂ اہل خراساں بہ بر خاقان بر
[illegible]مطلع او رنج تن و آفت جان | نامۂ مقطع او درد دل و سوز جگر
[illegible]ں حال خراساں و رعایا بودہ است | بر خداوند جہاں خاقاں پوشیدہ مگر
[illegible]یومرث لقا، بادشاہ کسریٰ عدل | ای منوچہر لقا خسرو افریدوں فر
[illegible] اہل خراساں بشنو از سر لطف | چوں شنیدی ز سر رحم در ایشاں بنگر
[illegible]ن را ازیں غم فریادرس ای شاہ نژاد | ملک را ازیں ستم آزاد کن ای پاک سیر

انوری کا اصلی مایہ فخر ہجو ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ اگر ہجو کوئی شریعت ہوتی تو انوری اس کا پیغمبر ہوتا ہجو میں اس نے اچھوتے نادر، باریک اور لطیف مضامین

پیدا کئے ہیں ان ہجوؤں میں قوت تخیل جو شاعری کی سب سے ضروری شرط ہے صاف نظر آتی ہے لیکن افسوس اور سخت افسوس ہے۔ کہ اس صنف میں اس کا کلام زیادہ نادر ہے اسی قدر زیادہ فحش ہے سینکڑوں اشعار ہیں لیکن دو ایک کے سوا ایک بھی درج کرنے کے قابل نہیں۔

انوری علوم عربیہ میں کمال رکھتا تھا اس لئے اس کے کلام میں یہ خصوصیت خود بخود پیدا ہو گئی کہ عربی تلمیحات، عربی جملے، عربی الفاظ اس خوبی سے شامل کرتا ہے کہ گویا انگوٹھی پر نگینہ جڑ دیا ملاحظہ ہو

شاعری دانی کدامی قوم کردند آنکہ بود ... اولِ شاں امرؤالقیس آخرِ شاں بوفراس
وین کہ من خادم ہمی بردازم کنوں سامریست ... سامری گوتا بیاید گوشمال لامساس

سنائی کے قصیدے کا جو جواب لکھا ہے اس میں اکثر قافئے اس قسم کے آئے ہیں مثلاً۔

بر دجان پدر رتی در مشیت دہ کہ دیر افتد ... زیاجوج تمنا رخنہ در سد و لومشیتا!
چوں مراد خویش را باملک ری کردم قیاس ... در خراساں تازہ بنہادم اقامت را اساس

جو لوگ انوری کی پیغمبری کے قائل ہیں وہ اس کے ثبوت میں اس کی مضمون آفرینیوں سے استدلال کرتے ہیں۔ متنبی نے مضمون باندھا تھا کہ ممدوح گو انسانوں میں داخل ہے لیکن انسانوں سے فائق ہے جس طرح نافہ کہ ہرن کے خون سے بنا ہے لیکن خون سے اس کو کچھ نسبت نہیں ہے اس سے ترقی کر کے شراب و انگور کی مثال دی کہ" شراب انگور سے بنتی ہے لیکن یہ انگور سے بڑھ کر ہے ممدوح کا بھی یہی حال ہے انوری نے ان سب تشبیہوں کو گرد کر دیا۔

ے ... در جہاں و از جہاں بیشی ... ہمچو معنی کہ در بیان باشد

یعنی اے ممدوح تو دنیا میں ہے لیکن دنیا سے زیادہ ہے جس طرح عبارت

...... میں معنی ہوتے ہیں کہ عبارت ذراسی ہوتی ہے اور مضمون نہایت وسیع ہوتا ہے۔

زحرص خدمت او سرنگوں ہمی آیند بوقت زادن از ارحام مادران اطفال

بچے شوگنا ماں کے پیٹ سے سر کے بل پیدا ہوتے ہیں انوری اس کا سبب یہ قرار دیتا ہے کہ انسان فطرتاً ممدوح کی خدمت کے خواہش مند ہیں اس لئے دنیا میں آتے ہیں تو سر کے بل آتے ہیں مبالغہ جو عوام کے نزدیک شاعری کی ایک اعلیٰ صفت ہے، انوری اس میدان میں سب سے آگے ہے۔

(شعر العجم شبلی نعمانی)

اوحد الدین محمد بن محمد یا اوحد الدین علی بن اسحاق انوری ابیوردی چھٹی صدی ہجری کے نصف دوم کے نامور شاعروں میں سے ہے اس کا تخلص جیسا کہ اس نے خود کہا ہے اور اس کے معاصرین نے بھی تصدیق کی ہے "انوری" ہے لیکن دولت شاہ سمرقندی نے پہلے اس کا تخلص "خاوری" لکھا ہے جو کہ دشت خاوراں کی نسبت سے ہے اور وہ انوری کا شہر ہے لیکن اپنے استاد کے حکم سے اس تخلص کو چھوڑ دیا اور انوری کو انتخاب کیا اور اس روایت کو ہدایت نے بھی دہرایا ہے۔ بہرحال یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ انوری کا لقب اس کو دوسروں نے دیا تھا اس نے خود اختیار نہیں کیا تھا جیسا کہ ذیل کے قصیدہ میں کہا ہے۔

ای در ہنر مقدم اعیان روزگار در نظم و نثر اخطل و حسان روزگار

دادند مہتران لقبم انوری ولیک چرخم ہمی چہ خواند خاقان روزگار

انوری نے جوانی کے ایام مختلف علوم حاصل کرنے میں صرف کئے اس نے فلسفہ اور ریاضیات میں امتیاز حاصل کیا اور خود بھی اس امر کی طرف اپنے شعروں میں اشارہ

کرتا ہے۔

گرچہ دربستم مدح و غزل یکبارگی ظن مبر کز نظم و معانی قاصرم
بلکہ از ہر علم کز اقران من داند کسی! خواہ جزوی گیر آنرا خواہ کلی قادرم
منطق و موسیقی و ہیئت شناسم اندکی راستی باید بگویم با نصیبی وافرم
در الٰہی آنچہ تصدیقش کند عقل سلیم گر تو تصدیقش کنی در شرح و بسطش ماہرم
نیستم بیگانہ از اعمال و احکام نجوم در ہمی باور نداری آنچہ شو من حاضرم

انوری نے ادب و شعر کے فن میں بھی مہارت حاصل کی اور جوانی میں ہی سنجر کے دربار کا رخ کیا۔ سلطان سلجوقی کے دربار میں داخل ہونے کے متعلق دولت شاہ سمرقندی نے یہ حکایت نقل کی ہے۔

"انوری مدرسے میں بیٹھا تھا کہ سلطان سنجر کی سواری گزری اس نے دیکھا کہ ایک آدمی نہائت تزک و احتشام سے جا رہا ہے جس کے ساتھ غلام اور گھوڑے اور دیگر شان و شوکت کے سامان ہیں۔ اس نے پوچھا کہ یہ کون ہے لوگوں نے کہا کہ شاعر ہے انوری نے کہا کہ سبحان اللہ! علم کا مرتبہ اتنا بلند اور میں اس خستہ حالی میں ہوں۔ شاعری میں اس قدر پستی ہے لیکن وہ اس قدر جاہ و حشمت کا مالک ہے خدا کی قسم آج کے بعد شاعری جو میرے مرتبے کے آگے ہیچ ہے اس کو اختیار کروں گا اسی رات سلطان سنجر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے

سہ گر دل و دست بحر و کان باشد دل و دست خدایگاں باشد

اور صبح سویرے ہی بادشاہ کے دربار کا رخ کیا اور مندرجہ بالا قصیدہ پڑھا۔ سلطان سخن شناس تھا اس کے طرز کلام کو جان لیا کہ متین اور دانشمند ہے از حد تعریف کی اور سوال کیا کہ ملازمت کی خواہش رکھتے ہو یا محض لالچ کی غرض سے آئے ہو انوری نے زمین بوس ہو کر کہا:۔

جز آستان توام در جہاں پناہی نیست — سر مرا بجز ایں در حوالہ گاہی نیست

سلطان نے تنخواہ اور خلعت وغیرہ عنایت کی۔

انوری ایران کے ان بزرگترین شاعروں میں اور ان لوگوں میں سے ایک ہے جنہوں نے خود اپنے عہد میں شہرت پائی اور ان کی شاعرانہ استادی مسلم ہوگئی اور اس کے بعد کے شاعروں نے بھی اس کی استادی اور عظمت کو تسلیم کیا ہے، عوفی نے اس کے اشعار کے بارے میں لکھا ہے کہ "اس کے تمام قصائد طبع ہو چکے ہیں ان میں سے کسی پر بھی کوئی انگشت نمائی نہیں کر سکتا"

انوری طبع بلند اور فکر رسا رکھتا تھا۔ وہ دقیق اور مشکل مضمون کو رواں الفاظ اور مروج لہجہ میں نہایت خوبی سے ادا کرنے میں پوری مہارت رکھتا تھا۔ اس کی عظمت اور اہمیت کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ اس کے شعر میں با محاورہ زبان کا استعمال ملتا ہے اور وہ زبان و ادب میں رائج جملہ خوبیوں کو اپنے شعر میں سمو دیتا ہے عربی الفاظ اور عربی ترکیبات کے استعمال کے باوجود کلام میں سادگی قائم رہتی ہے۔ وہ علمی اور فلسفیانہ اصطلاحات سے استفادہ کر کے دقیق افکار اور مشکل مضامین کو تشبیہات و استعارات کی ہمراہی میں نہایت احسن طریقے سے پیش کرتا ہے بعض اوقات تو انوری کا کلام اس درجہ سادہ ہو جاتا کہ عام محاورات کو اپنے شعروں میں استعمال کرتا نظر آتا ہے مثلاً

گفت ایں ہر دو یکی جز کہ شہاب الدین نیست — گفتم آں دیگر گفتا حسن محمود است

گفتم اغلوطہ جدہ ایں چہ دوی باشد گفت — دوی عقل کہ ہم شاہد و مشہود است

اور کبھی ان سادہ الفاظ میں ایسے ایسے ادق مضامین سموئے ہوتے ہیں کہ ان کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے اور وہ شعر توضیح و تشریح کے محتاج ہوتے ہیں وہ اپنے کلام کی سادگی اور روانی کے ساتھ دقیق خیالات کی آمیزش کرتے وقت

کچھ اس قسم کی غنائی کیفیت پیدا کر دیتا ہے کہ اس کی غزلیں نہایت دلکش سماں پیدا کرتی ہیں اور حق تو یہ ہے کہ اسے غزل میں ظہیر فاریابی کے برابر سمجھنا چاہیئے جس نے غزل کو سعدی سے پہلے راہ کمال دکھائی اور پھر سعدی نے اس راہ کے جملہ مراحل کو طے کر کے اپنے عالی اور دقیق خیالات کو غزل کے پیرائے میں ادا کیا۔

انوری قطعات لکھنے میں بھی یدطولیٰ رکھتا تھا اور اس صنفِ شعر میں مدح ہجو کے مضامین ادا کئے ہیں اس کے علاوہ وعظ و تمثیل اور اجتماعی موضوعات کو نہایت احسن طریقہ سے ان میں پیش کیا ہے بہر حال انوری قصیدہ، غزل اور قطعہ کے بیان میں ایران کے چوٹی کے شعرا میں شمار ہوتا ہے اور فارسی شعر و ادب کے مستحکم ارکان میں سے ایک ہے اور اس کا رتبہ اس قدر بڑھا ہوا کہ اس کو فارسی شاعری کے تین پیغمبروں میں شمار کرتے ہیں۔

در شعر سہ تن پیمبرانند — ہر چند کہ لا نبی بعدی
بیت و قصیدہ و غزل را — فردوسی و انوری و سعدی!

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔

باز ایں چہ جوانی و جمالست جہانرا — وایں حال کہ نوگشت زمیں را و زمانرا
جرم خورشید چو از حوت در آید بحمل — اشہب روز کند ادہم شب را ارجل
شادمانی گزیں و نیکی جوی — زندگانی وفا نخواہد کرد!
از سر روزگار گرد برآر — پیش از آں کز سرت برآرد گرد
شہریست انوری و شب و روز ایں غزل — کار جہاں نگر کہ جفای کہ می کشم
مرا گوئی ز پیوندم چہ داری — چہ دارم جز غم ہجران ندارم

(تاریخ ادبیات در ایران ذبیح)

اوحدالدین محمد انوری ابیوارد کے ایک گاؤں بدنہ میں پیدا ہوا ابیورد دشت خاوراں میں واقع ہے اس لئے اس دشت کی نسبت سے شروع شروع میں خاوری تخلص کیا بعد میں بدل کر انوری رکھا۔

دولت شاہ سمرقندی لکھتا ہے کہ انوری نے مدرسہ منصوریہ میں تعلیم حاصل کی کہا جاتا ہے ایک دن مدرسے کے پاس سے ایک شخص زرق برق لباس پہنے گھوڑے پر سوار گزرا اس کے پیچھے ملازم اور نوکر چاکر تھے انوری نے پوچھا یہ کون ہے لوگوں نے بتایا کہ یہ شاعر ہے انوری پکار اٹھا اللہ اللہ علم و حکمت کا درجہ کتنا پست ہے اور میں اس قدر محتاج اور بے کس ہوں شاعری کا درجہ اس قدر بلند ہے اور یہ شخص اتنا دولت مند ہے میں آج سے عہد کرتا ہوں کہ علم و حکمت کو خیرباد کہہ کر شاعری شروع کر دوں گا۔

شاعری کے علاوہ انوری کو ریاضی، فلسفہ، موسیقی اور علم ہیئت میں بھی دسترس حاصل تھی انوری کا شمار ایران کے درجہ اول کے قصیدہ نگاروں میں ہوتا ہے اس لئے اہل ایران اس کا نام فردوسی و سعدی کے ساتھ لیتے ہیں۔

در شعر تن پیمبرانند　　　　ہرچہ کہ لا نبی بعدی

ابیات و قصیدہ و غزل را　　　　فردوسی و انوری و سعدی

ظاہر ہے کہ انوری سے پہلے بھی عنصری، فرخی ایسے نامور اور قصیدہ نگار استاد موجود تھے جنہوں نے اپنی فصاحت و بلاغت سے قصائد کی بنیادیں کافی اونچی اٹھائیں لیکن انوری کے زمانے تک مضامین کے لحاظ سے قصائد میں وسعت نہیں ہوئی تھی۔ انوری نے فلسفہ و حکمت ریاضی ہیئت کے نکات کو شعروں کے پیکر میں سمو کر قصائد میں وسعت پیدا کر دی اب قصیدہ محض ممدوح کی تعریف و توصیف تک محدود نہ رہا بلکہ مختلف علمی مسائل کے اظہار کا وسیلہ بن گیا

انوری ایران کے بزرگترین قصیدہ نگاروں میں ہے اس نے قصیدے میں ابوالفرج رونی کا انداز اختیار ہے۔ وہ خود لکھتا ہے۔

؎ باد معلومش کہ من خادم شعر بوالفراج   تا بدیدستم ولوعی داشتم بس تمام

انوری کے فکر میں توانائی اور طبیعت میں بلا کی روانی ہے اس کے قصیدوں میں فصاحت و بلاغت، تشبیہ و استعارہ، ترتیب الفاظ، پختگی اور دقتِ معانی کا کمال نظر آتا ہے۔

غلو و اغراق قصیدے کا حسن سمجھا جاتا ہے انوری اس صنعت میں یکتائے روزگار معلوم ہوتا ہے۔ صنائع بدائع اور اغراق کے باوجود انوری کے کلام میں سلاست اور روانی ہے۔

؎ گر دل و دست بحر و کاں باشد   دل و دست خدا ئگاں باشد

انوری جہیں رنج و اندوہ کی کیفیت بیان کرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے وارداتِ قلبی پیش کر رہا ہے انوری نے "اشک ہای خراساں" میں جو فریاد نامہ تیار کیا وہ عبرت حسرت و مظلومی کے اعتبار سے ایک بے مثال نظم ہے اس میں نہ صنائع بدائع کی بھرمار ہے نہ الفاظ و تراکیب پر ہی زور طبع صرف کیا گیا اور نہ تشبیہات و استعارے ہی کی کثرت ہے ایک قومی ابتلاء کو دردبھرے اور سادہ الفاظ میں بیان کیا ہے

انوری کو ہجو گوئی میں کمال حاصل تھا مولانا شبلی لکھتے ہیں اگر ہجو گوئی کوئی شریعت ہوتی تو انوری اس کا پیغمبر ہوتا انوری کی ہجووں میں بھی اچھوتے اور نادر مضامین پائے جاتے ہیں اس نے اپنے حریفوں کی جو ہجویں لکھی ہیں۔ اس قدر عریاں اور فحش ہیں کہ ان کا یہاں دہرانا بھی مذاق سلیم پر گراں گزرے گا۔ حریف تو حریف انوری کی ہجووں کے تیروں سے اس کے عزیز و اقارب بھی محفوظ نہ تھے

انوری کے دیوان میں چند ہجویں اس کی بیوی اور بیٹے کی بھی پائی جاتی ہیں اپنے گھوڑے کی بھی ہجو لکھی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ انوری کی ہجو گوئی سے لوگ سخت پریشان تھے اس لئے انتقام لینے کی غرض سے خود ہجویں لکھ کر انوری کے نام سے مشہور کر دیتے تھے اور خمیازہ انوری کو بھگتنا پڑتا تھا چنانچہ ایک مرتبہ جب وہ بلخ آیا تو یہاں کے ایک شاعر فتوحی نے بلخ کی ہجو لکھ کر انوری کے نام منسوب کر دی بلخ کے لوگ سخت برہم ہوئے ممکن تھا کہ وہ دست اندازی بھی کرتے انوری کو اس بے جا تہمت اور لوگوں کی برہمی کی وجہ سے سخت رنج تھا چنانچہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے ایک نظم لکھی جس کا عنوان "سوگند نامہ" ہے اس نظم سے لوگوں کا جوش کچھ ٹھنڈا ہوا یہ نظم انوری کی بہترین نظموں میں شمار ہوتی ہے

انوری کی وفات میں اختلاف ہے "تذکرۃ الشعراء" کے مولف نے ۵۴۷ ہجری، صاحب آتشکدہ نے ۵۴۵ ہجری اور رضا زادہ شفق نے ۵۸۷ ہجری لکھا ہے ۵۸۷ ہجری سبعہ سیارگاں سے غلط فہمی کی بنا پر تصور کی گئی ہے۔

(ادب نامہ ایران مقبول بیگ بدخشانی)

خاقانی شروانی

افضل الدین بدیل بن علی خاقانی کا شمار ایران کے مشہور ترین اور اول درجہ کے قصیدہ گو شاعروں میں ہوتا ہے خاقانی ۵۲۰ھ ہجری میں بمقام شروان پیدا ہوا اپنے نام بدیل کے بارے میں ایک قطعہ میں کہتا ہے

بدل من آمدم اندر جہاں سنائی را — بدیں دلیل پدر نام من بدیل نہاد

کہتے ہیں اس نے پہلے حقائقی لقب اختیار کیا پھر خاقان اکبر منوچہر بن فریدوں شروان شاہ سے انتساب کی مناسبت سے خاقانی تخلص پایا منوچہر اکتیسویں عباسی خلیفہ المقتفی باللہ (۵۳۰، ۵۵۵ھ) کا ہم عصر تھا منوچہر کے پاس خاقانی کو ابوالعلا گنجوی لے کر گیا تھا چنانچہ ابوالعلا خود کہتا ہے۔

چوں شاعر شدم بردمت نزد خاقان — بخاقانیت من لقب برنہادم

خاقانی کے باپ کا نام علی تھا وہ درودگری یعنی نجاری کا پیشہ کیا کرتا تھا چنانچہ ایک قصیدہ میں جو امام ناصر الدین براہیم کے مرثیہ میں اس مطلع کے ساتھ لکھا ہے

نثار اشک من ہر شب شکر ریزیست پنہانی — کہ ہمت را ز تاثیرت از آن پیشانی

اس میں خود اپنی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے۔

بخواں معنی آرائی براہیمی پدید آمد — زلفت آذر صفت علی نجار شروانی

خاقانی کی ماں اس عہد کے ایک عیسائی خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور نسطوری عیسائی تھی بعد میں اس نے دین اسلام قبول کیا معلوم ہوتا ہے شاعر کی زندگی بڑی تنگ دستی میں بسر ہوئی تھی پہلے تو اس کی ماں طباخی اور جلاہی کا پیشہ کرتی تھی اور اسی سے اپنا اور اپنے بیٹے کا پیٹ پالتی تھی۔

خاقانی کا سب سے بڑا سرپرست اس کا چچا کافی الدین عمر بن عثمان تھا یہ فلسفہ اور حکمت کا ماہر تھا اس نے خاقانی کی پرورش علم و ادب کے ساتھ کی شاعر نے کئی جگہ اس کی مہربانیوں کو یاد کیا ہے۔

؎ من فائدہ جوی و او مفیدم — عم بودہ مدرس و معیدم

خاقانی نے اپنے چچا اور دوسرے علماء سے اکتساب فیض کیا ان کے سوا اس زمانے کے شاعروں میں ابوالعلا گنجوی سے بھی خاقانی کو شرفِ تلمذ حاصل تھا ابوالعلا گنجوی نے اپنی بیٹی بھی خاقانی کے نکاح میں دی اور اس نے اسے دربار شاہی میں بھی پہنچایا لیکن بعد میں استاد اور شاگرد میں لڑائی ہو گئی اور دونوں نے ایک دوسرے کی ہجو لکھی۔ ان مقدمات اور خود اس کے اشعار کی شہادت پر اگر ہم اسے ایک عالم فاضل اور دانشمند مان لیں تو ہمارا یہ خیال غلط نہ ہوگا چنانچہ اس کے ہمعصروں نے علم و ادب میں اس کی بڑائی کا اعتراف کیا ہے۔ رشید وطواط کہتا ہے۔

؎ افضل الدین ابوالفضائل بحرِ فضل — فیلسوفِ دین فزای کفر کاہ

اس میں شک نہیں کہ خاقانی نے ادب، فلسفہ، علوم دینی اور آداب قرآن کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان علوم میں کامل دستگاہ پیدا کی تھی یہ حقیقت اس کے کلام سے بھی واضح ہے۔

ہمارے شاعر کی زندگی کچھ ایسی کامیاب نہیں رہی اور اسے فراغت کے ساتھ جینا نصیب نہ ہوا جوانی میں وہ مفلسی اور تنگ دستی کی مصیبتیں سہتا رہا اور تمام عمر بے جگری دوستوں کی آرزو میں ہاتھ گستا رہا جو غم و اندوہ کے موقعہ پر اس کی غمگساری کرتے لڑکپن میں سر سے باپ کا سایہ اٹھا پچیس ۲۵ سال کا ہوا تھا کہ اپنے شفیق چچا کی سرپرستی اور اس کی نوازشوں سے محروم ہوا عمر کا آفتاب ڈھلنے کو ہوا تو ۵۷۱ ہجری میں ان کا جوان سال بیٹا رشید الدین بیس سال کی عمر میں مر گیا اور باپ کو داغ

مفارقت دے گیا خود کہتا ہے سہ

دریغ میوۂ عمرم کز مہر پائی! — بہ بیست سال برآمد بیک نفس بگذشت

مرا ذخیرہ ہمیں یک رشید بود ز عمر — نتیجۂ شب روزی کہ در ہوس بگذشت

ان مصیبتوں کے سوا شاعر اپنی طبیعت کی آزادی، دربار کی عاجزانہ اور کورانہ خدمت سے خودداری سفر کرنے، دنیا اور دنیا والوں کو دیکھنے، دوسرے امیروں کی مدح کرنے کی تمنا اور سب سے بڑھ کر اپنے ممدوحوں یعنی خاقان، کبیر منوچہر اور اس کے بیٹے خاقان کبیر ابو المظفر اخستان کے حاسد حاشیہ نشینوں کے بھڑکانے پر ان کے عتاب کا نشانہ بنا حد یہ کہ سفر سے واپس آنے کے چند سال بعد بھی خدمت سلطانی سے انکار اور اپنی آزاد منشی کے بارے میں ہم اس کی دلکش غزلوں میں یہ شعر پڑھتے ہیں۔

سہ گفتی نکنی خدمت سلطان نکنم نی — یک لحظہ، فراغت بدو عالم نفروشم

شاعر کو اپنی زندگی میں بڑی شکایت لوگوں کے حسد اور شاعر کی قدر و قیمت نہ پہچاننے کی تھی عمر بھر اس کی ہمت نہایت بلند رہی لیکن اس کا مقام اس کی ہمت سے بھی بلند تھا۔

مکہ سے واپس ہوتے ہوئے قدیم ایران کے کھنڈرات دجلہ کے کنارے پر کھڑے دیکھے ان چیزوں نے شاعر کے دل کو بہت متاثر کیا اسی تاثر کا نتیجہ شاعر کا وہ مشہور قصیدہ ہے جو قصیدۂ مدائن کہلاتا ہے مختصر یہ کہ خاقانی کی پوری زندگی مصیبت میں گذری صدمے پہ صدمے اٹھائے اور دنیا نے اسے کبھی چین سے بیٹھنے نہ دیا اس نے عمر بھر دینی اور اخلاقی مسلک کی پیروی کی وہ لوگوں سے وفا اور راستی کا طالب تھا لیکن دنیا نے کبھی اس کو فراغت اور آسائش کے ساتھ بیٹھنے نہ دیا۔

خاقانی نے ۵۹۵ھ ہجری میں بمقام تبریز وفات پائی اور مقبرۃ الشعراء میں جو شہر کے شمالی طرف کوئے سرخاب میں واقع ہے دفن ہوا۔

سبک اور شاعری خاقانی کا شمار ایران کے درجہ اول کے قصیدہ گو شاعروں میں ہوتا ہے خاقانی، نظامی اور ایسے ہی دوسرے شعراء یہ ثابت کرتے ہیں کہ سرزمین ایران کے ہر حصہ میں خواہ وہ خراسان ہو کہ آذربائیجان ادب کے پھول کھل سکتے ہیں۔ خاقانی کی شاعری نہایت محکم اور استوار ہے اور الفاظ و معنی کے لحاظ سے غیر معمولی اور نہایت بلند و لطیف ہے اس کی شاعری کی بہت سی بنیادی خوبیوں میں سے ایک ادبی خوبی یہ ہے کہ وہ عام سطح سے بلند اور عام ڈگر سے الگ ہے یعنی ایسے دقیق اور گہرے معنی کو جو ہر شخص کے خیال میں نہیں آسکتے نہایت جامع اور فصیح الفاظ کے قالب میں ادا کرتا ہے خاقانی کی شاعری کا بڑا حصہ اسی قسم کی شاعری پر مشتمل ہے۔

خاقانی کی شاعری کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی زبان کی طرح عربی زبان پر بھی کامل عبور رکھتا تھا وہ ان دونوں زبانوں کے الفاظ اور ادبی ترکیبوں پر اتنا حاوی ہے کہ ان کو جس طرح چاہتا ہے استعمال کرتا ہے۔ الفاظ اور ترکیبوں کا وہ گویا بادشاہ ہے ترکیبیں اور الفاظ اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں اور وہ ان سے جس طرح چاہتا ہے کام لیتا ہے۔

خاقانی کی شاعری میں نہایت مشکل مضامین بھی ملتے ہیں، ہر قسم کے الفاظ اور ہر قسم کی ترکیبیں اس کے پاس پائی جاتی ہیں اس کے کلام میں آیتیں، ضرب الامثال اور اشارات و کنایات کی کمی نہیں تجنیس، ایہام، تشبیہ، استعارہ وغیرہ جیسے شعری صنائع بھی اس کے پاس کافی پائے جاتے ہیں لیکن اس کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ ان سب میں وہ ایک تازگی پیدا کر دیتا ہے۔ یہی خصوصیت اس کی ترکیبوں میں حتیٰ کہ الفاظ کے انتخاب میں پائی جاتی ہے یہی خصوصیت اس کی اور اسی کے ہم ولایت نظامی کی شاعری کو خراسان اور دوسرے مقاموں کی شاعری سے ممتاز کر دیتی ہے

اس نے نئے نئے الفاظ اور نت نئی ترکیبیں اور اچھوتے معانی سے کام لیا ہے جن کا گنانا تک دشوار ہے لیکن جو ناقدانہ نظر رکھتے ہیں اس کے کلام کے تقابلی مطالعہ سے اس فرق کو آسانی کے ساتھ محسوس کر سکتے ہیں ایسے مطالعہ سے آذر بائیجان اور اور خراسان کے سبک کی خصوصیتیں اور ان کے لفظی اور فنی اختلافات ۔۔۔ ظاہر ہو جاتے ہیں خود خاقانی نے عنصری سے متعلق ایک قصیدہ میں اسی خصوصیت کو اس طرح بیان کیا ہے

ے مرا شیوۂ خاص تازہ است و داشت　　　ہماں شیوہ باستان عنصری

خاقانی کی شاعری میں ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جو مقامی سے تعلق رکھتے ہیں غالباً یہ الفاظ آذربائیجان یا آذری زبان سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً اس شعر میں "اکنوں" کے معنی میں "ایمہ" کا لفظ ؎

نہ بغداد جای شیشہ گرانست　　　بہر کلاب طرب فزای صفاہاں

اس کے اکثر قصیدے بڑے طول طویل ہیں اور نئے مطلعوں سے انہیں پھر شروع کیا ہے ان کی بحریں بھی لمبی ہیں اور بیشتر ردیف کی طرز پر ہیں عام طور پر شاعر مطلع ہی میں اپنے مقصود کا اظہار کر دیتا ہے اور کبھی تغزل یا تشبیب سے کام لیتا ہے اور جلوۂ صبح، طلوع آفتاب یا عشق و محبت یا مناظر قدرت کی عکاسی سے ان کا آغاز کرتا ہے۔

ان تمام خصوصیات اور اچھوتے پن کے باوجود خاقانی کے کلام پر خراسان کے بڑے بڑے شاعروں کا اثر بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً یہ قصیدہ جس کا مطلع درج ذیل ہے، انوری کے سبک کا اثر اس پر نمایاں ہے

ے صماندار سلامت شد دل من　　　کہ دار الملک عزلت ساخت مسکن

خاقانی نے عنصری اور رودکی اور دوسرے شاعروں کی طرف جو اشارے کئے ہیں ان سے ظاہر ہے کہ اس نے ان شاعروں کے کلام کا کافی مطالعہ کیا تھا خاص طور

پر عنصری کے کلام کی اس کی نظر میں بڑی وقعت تھی۔

خاقانی کی شعری خصوصیات اور اس کے اخلاق کے ذکر میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے۔۔۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ وہ اپنے وطن ایران میں جو واقعات پیش آرہے تھے ان کی عکاسی بڑے ماہرانہ انداز میں کرتا تھا ان واقعات میں غزنویوں کے ہجوم کرنے کا خونی حادثہ بھی ہے جو ۵۴۸ھ ہجری میں ولایت خراسان میں پیش آیا تھا اس حادثہ نے ملک کو ویران کر دیا اور بے شمار جانیں اس میں ضائع ہوگئیں امام محمد یحیٰ جیسے بزرگ اس راستے میں شہید ہوگئے ان جانگداز مصائب سے شاعر کا دل بہت متاثر ہوا بے اختیار لب پہ نالہ آگیا اور ان واقعات سے متاثر ہو کر کئی قصیدے لکھے ؎

آں مصر مملکت کہ تو دیدی خراب شد   واں نیل مکرمت کہ شنیدی سراب شد

سفر حج اور زیارت بغداد کے موقعہ پر اسی احساس قلب کے ساتھ ساسانیوں کے پر شکوہ محل کے کھنڈر دیکھے چشم جویاں وگریاں کے ساتھ ان کا نظارہ کیا ایران کا صاحب دل شاعر اس سے اتنا متاثر ہوا کہ بے اختیار اس کی زبان سے یہ عبرت بار اشعار نکل گئے ؎

ہاں ای دل عبرت بیں از دیدہ نظر کن ہاں   ایوان مدائن را آئینہ عبرت دان

(تاریخ ادبیات ایران رضا زادہ شفق)

حسان العجم افضل الدین بدیل (ابراہیم) بن علی خاقانی حقایقی شروانی ایران کے بڑے بڑے شاعروں میں سے ایک ہے حسان العجم کا لقب اس کے چچا کافی الدین عمر نے اس کو دیا تھا اور خاقانی نے خود بھی اپنے آپ کو اس لقب سے یاد کیا

اور عوفی نے بھی اس لقب سے یاد کیا لیکن دوسرے لقب "افضل الدین" سے مشہور ہوا اور اس کے معاصرین بھی اسی لقب سے پکارتے رہے۔

اس کا نام تذکرہ نویسوں نے ابراہیم لکھا ہے لیکن وہ خود اپنے نام کو "بدیل" بتاتا ہے اور اس شعر میں یہی استعمال کیا ہے ۔

بدل من آمدم اندر جہاں سنائی را ‌ ‌ ‌ ‌ بدیں دلیل پدر نام من بدیل نہاد

اس کا باپ نجیب الدین علی درود گر (نجار) اور اس کا چچا کافی الدین عمر بن عثمان طبیب اور فلسفی تھا شاعری میں پہلے اس کا تخلص حقائقی تھا لیکن ابوالعلار نے جب اس کو خاقان منوچہر کی خدمت میں داخل کیا تو اس نے "خاقانی" تخلص اختیار کر لیا۔ خاقان اکبر فخر الدین منوچہر بن فریدوں شروانشاہ کی خدمت میں پہنچنے پر اس کے دربار میں خصوصی مقام حاصل کر لیا اور اس بادشاہ سے گرانبہا صلے وصول کئے مگر تھوڑے عرصہ بعد ہی شروانشاہ کی خدمت سے اکتا گیا اور خراسان کے شاعروں کی صحبت کی غرض سے عراق اور خراسان کے درباروں کی طرف ملتفت ہوا لیکن شروانشاہ نے اس کو اجازت نہ دی کہ وہ اس کو چھوڑ کر اپنی دلی خواہش کو پورا کرے چنانچہ یہ پابندی شاعر کی دلتنگی اور پریشانی کا باعث بنی آخر عراق کا رُخ کیا لیکن راستے میں بیمار ہوگیا اسی عالم میں خراسان پر غزان کے حملہ سنجر کی گرفتاری اور امام محمد بن یحییٰ کے قتل کی خبر اسے پہنچی، سفر کو ملتوی کیا اور پھر "جسگاہ شروان" کو مجبوراً پلٹا۔

آں مصر مملکت کہ تو دیدی خراب شد ‌ ‌ ‌ ‌ وآں نیل مکرمت کہ شنیدی سراب شد

گردون لشکر محمد یحییٰ بباد داد ‌ ‌ ‌ ‌ محنت رقیب سنجر مالک رقاب شد

آں کعبہ وفا کہ خراسانش نام بود ‌ ‌ ‌ ‌ اکنوں بپای پیل حوادث خراب شد

عزمت کہ تری جناب خراسان درست بود ‌ ‌ ‌ ‌ بر ہم شکن کہ بوی اماں زآں جناب شد

بر طاق نہ حدیث سفر آنکہ روزگار　　چوں طالع تو نامزد انقلاب شد

در جنگاہ شروان باو ردِ دل لباز　　کاں ذرہ دراہ نوشتہ یوم الحساب شد

لیکن شروانشاہ کی مجالس میں زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ حج کا قصد کیا اور مکہ و مدینہ کی زیارت کی غرض سے اجازت حاصل کرنے کے لئے بڑے عظیم الشان قصائد کہے۔ سفر سے واپسی پر جمال الدین محمد بن علی اصفہانی وزیر قطب الدین صاحب موصل سے ملاقات کی اور اسی کی معرفت المقتفی لامر اللہ خلیفہ عباسی کی خدمت میں پہنچا ...... اور خلیفہ نے اس کو دبیری کی خدمت سونپی۔ سفر سے واپسی پر بغداد میں خاقانی نے ایوانِ مدائن کو دیکھا اور اس کے کھنڈرات کے بارے میں ایک پر عظمت قصیدہ لکھا مطلع ہے سے

ہاں اے دل عبرت بیں از دیدہ نظر کن ہاں　　ایوان مدائن را آئینۂ عبرت داں

اس کے علاوہ اصفہان میں داخل ہو کر اس شہر کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا اور اس ہجو کے اثرات کو مٹانے کی کوشش کی جو مجیر الدین بیلقانی نے لکھ کر خاقانی کے نام سے منسوب کر دی تھی اور اس کدورت کو جو معززین شہر کے دل میں تھی اس کو صاف کیا۔

شروان میں واپسی پر خاقانی پھر شروانشاہ کے دربار میں شامل ہو گیا لیکن جلد ہی کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر شروانشاہ اور خاقانی کے درمیان ان بن ہو گئی چنانچہ اس نے خاقانی کو قید خانے میں ڈال دیا اور ایک سال کے بعد عز الدولہ کی سفارش سے قید خانے سے نجات پائی۔ خاقانی نے قید خانے میں چند حبسیہ قصائد لکھے جو اس کے دیوان میں موجود ہیں۔ خاقانی نے اپنی عمر کے آخری ایام تبریز میں بسر کئے اور اسی شہر میں وفات پائی اور مقبرۃ الشعراء میں محلہ سرخاب تبریز میں دفن ہوا۔

اس کا سال وفات دولت شاہ سمرقندی کے قول کے مطابق ۵۸۲ھ ہے اس کے علاوہ کتاب "نتائج الافکار" میں اس کی وفات کا واقعہ ۵۹۵ھ میں درج ہے اور یہی زیادہ درست معلوم ہوتا ہے

خاقانی کا شمار ایران کے بزرگ قصیدہ گو شعراء میں ہوتا ہے۔ اس کو نئے نئے مضامین، الفاظ کی ترکیب اور معانی کی تخلیق میں مہارت حاصل تھی۔۔۔۔ اس کا کوئی قصیدہ، قطعہ اور شعر ایسا نہیں ہے کہ جس میں جدت اور تازگی نہ ہو مشکل اور دقیق ردیفوں کے التزام میں اس کی نظیر بہت کم ملتی ہے اس نے بعض وقت ایک فعل کو جیسے "برافگند" "برنخاست" "بنیادہ است" "دنی یابم" "برافروز شکستم" وغیرہ یا فعل اور اس کے تعلقات جیسے "درکشم ہر صبحدم" "ڈر بر خاید بیش ازیں" یا اسم اور صفت کو ردیف قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں اس کی مہارت باقی قصیدہ گو شعراء سے زیادہ ہے۔

اس استاد شاعر نے دوسرے معاصر شاعروں کی مانند سنائی کی روش پر چلتے ہوئے زہد اور وعظ ونصیحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کوشش کی ہے کہ وہ اس حیثیت میں اس کی برابری کرے اور اکثر حکیمانہ قصائد میں اور اپنی غزلیات میں اس استاد (سنائی) کی پیروی کرے اس کے تفاخر میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے آپ کو سنائی کا جانشین سمجھتا ہے اسی وجہ سے وہ آخر عمر میں تصوف کی طرف مائل ہوا اور بقول خود تیس سال تک چلہ میں بیٹھا تھا۔ اس کا نمونہ کلام یہ ہے ؎

رخسار صبح پردہ بعمد برافگند — راز دل زمانہ بصحرا برافگند
صبح دم چوں کلہ بندد آہ دود آسای من — چوں شفق در خوں نشیند چشم شب پیمای من
سبحہ درکف میگذشتم بامداد — بانگ ناقوس مغاں بیروں فتاد

خوی او از خاکساری کم نکرد   سینۂ ما سوخت چشمش نم نکرد
دشمناں با دشمناں از شرم خلق   آشتی رنگی کنند آں ہم نکرد
ای دوست غم تو سر بسر سوخت مرا   چوں شمع ببزم ندد افروخت مرا
من گریہ و سوز دل نمی دانستم   استاد تغافل تو آموخت مرا

(تاریخ ادبیات ایران ذبیح اللہ صفا)

خاقانی کے نام کے متعلق تذکرہ نویسوں میں اختلاف پایا جاتا ہے دولت شاہ سمرقندی نے اس کا نام ابراہیم لکھا ہے مؤلف مجمع الفصحا نے بھی اس کا یہی نام بتایا ہے لیکن جامی نے نفحات الانس میں اس کا نام بدیل لکھا ہے خاقانی خود بھی ذیل کے شعر میں اپنا نام بدیل بتاتا ہے اس لئے اس کا نام یہی سمجھنا چاہیئے۔

؎ بدیل من آوردم اندر جہاں سنائی را   بدیں دلیل پدر نام من بدیل نہاد

خاقانی کا لقب افضل الدین تھا چنانچہ اس کے معاصرین اسے اسی لقب سے پکارتے تھے۔ خاقانی شروان میں پیدا ہوا جو آذربائیجان کے قریب ایک مشہور شہر ہے اس کے باپ کا نام علی ہے جو بڑھئی کا کام کرتا تھا

خاقانی کی والدہ عیسائی مذہب کی پیرو تھی لیکن بعد میں اسلام قبول کر لیا تھا خاقانی ابھی بچہ ہی تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا اس کی تربیت اس کے چچا مرزا کافی بن عثمان نے کی جو خود علم طب اور فلسفہ میں بڑی دسترس رکھتا تھا خاقانی نے چچا کی رہنمائی میں عربی، طب اور علم الٰہیات کا مطالعہ کیا فارغ التحصیل ہو کر شعر و سخن کی تعلیم ابو العلاء گنجوی سے پائی جو اس زمانے کا مشہور شاعر تھا استاد نے شاگرد کے ذوق شعر کو جلا دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اسے جوہر قابل پا کر اپنی بیٹی بھی اس سے بیاہ دی بالآخر استاد ہی کے وسیلے سے اسے خاقان اکبر

منوچہر بن فریدوں شروان شاہ کے دربار میں رسائی ہوئی لیکن تعجب ہوتا ہے کہ جب خاقانی کو شہرت ہوئی تو وہ اُستاد سے منحرف ہوگیا۔

خاقانی پہلے حقائقی تخلص کرتا تھا لیکن دربار میں رسائی ہوئی تو خاقان کی مناسبت سے خاقانی تخلص کیا خاقانی کو زندگی میں بہت سی تلخیوں کا سامنا کرنا پڑا بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا پچیس سال کی عمر میں چچا کی شفقت سے محروم ہوگیا جس نے اس کی پرورش کی تھی ۵۷۱ ہجری میں نوجوان بیٹا داغ مفارقت دے گیا پھر رفیقۂ حیات عالم جاودانی کو سدھاری چنانچہ ان حادثات کا ذکر ذیل کے اشعار میں کرتا ہے ؎

پسر داشتم چہ بلند آفتابی! ز ناکہ بتاری مغاکش سپردم
پدر دلپسر مادرش چوں فرو شد بخاک آں تن در دماکش سپردم

خاقانی کی جوانی مفلسی میں بسر ہوئی کوئی ایسا دلی دوست بھی نہ تھا جو غم واندوہ میں کچھ تسکین دلاتا ؎

درہمہ شروان مرا حاصل نیامد نیم دوست دوست خود نا ممکن است ای کاش بودی آشنا

دربار میں بھی حالات کچھ سازگار نہ تھے اس لئے فکر معاش سے بے نیاز نہ ہو سکا اور نہ زمانے کی رنگینیوں سے محظوظ ہو سکا چنانچہ ایک مرتبہ اس نے خاقان کو خطاب کرکے ذیل کا شعر کہا

؎ وشتی دہ کہ در برم گیرم یا وشاقی کہ برش گیرم

اس شعر میں خاقانی ایک لونڈی یا سر ڈھانپنے کے لئے ایک چادر کی تمنا کا اظہار کرتا ہے خاقان اس کو اپنے لئے توہین کا موجب خیال کرتا ہے کہ اس کے دربار کا شاعر ہو اور یہ التماس کرے کہ اسے پوشاک دی جائے یا کوئی لونڈی عطا کی جائے خاقان سخت زود رنج اور منتقم مزاج شخص تھا حکم دیا خاقانی کا سر

قلم کیا جائے خاقانی نے عتاب شاہی سے ڈر کر معذرت چاہی اور عرض کیا کہ میں نے "با" لکھا تھا لیکن مکھی نقطے پر بیٹھ گئی جس سے نقطہ پھیل گیا اور "یا" بن گیا خاقان اس معذرت سے خوش ہو گیا اور اسے انعام واکرام سے نوازا۔

خاقانی اکثر سیر و سیاحت کی خواہش کرتا لیکن خاقان اسے اجازت نہ دیتا تھا چنانچہ وہ پریشان رہتا آخر ایک مرتبہ خراسان کی سیر کے لئے اجازت چاہی لیکن خاقان کو یہ بھی منظور نہ ہوا چنانچہ خاقانی نے اپنی آزردگیٔ طبع کا اظہار ذیل کے شعر میں کیا ہے ؎

چہ سبب سوی خراساں شدنم نگذارند　　عندلیبم بہ گلستان شدنم نگذارند

آخر خاقانی کو سفر کی اجازت مل گئی لیکن شومیٔ قسمت کہ وہ رے تک ہی پہنچا تھا کہ اسے خراساں میں غز ترکوں کے وحشیانہ ظلم و ستم کی خبر ملی اس لئے وہ وہیں سے واپس ہو لیا۔ ۵۵۱ ہجری میں خاقانی حج کے لئے روانہ ہوا حج کی پوری سرگذشت اس کی مثنوی "تحفۃ العراقین" میں ملتی ہے حج کے دوران میں اس نے مکہ معظمہ کی تعریف میں ایک قصیدہ بھی کہا اس مسافرت میں مدائن جانے کا بھی اتفاق ہوا یہ شہر ساسانی بادشاہوں کا پایۂ تخت رہ چکا تھا طاق کسریٰ کی تباہی اور ایران قدیم کی مٹی ہوئی شان و شوکت کو دیکھ کر خاقانی بہت متاثر ہوا چنانچہ ایک مشہور قصیدہ "ایوان مدائن" لکھا جو خاقانی کی حب الوطنی کے جذبات کی ایک عظیم یادگار ہے اس کا مطلع یہ ہے ؎

ہاں ای دل عبرت بیں از دیدہ نظر کن ہاں　　ایوان مدائن را آئینۂ عبرت دان

واپسی پر خاقانی کا گزر اصفہان سے ہوا اصفہان کے متعلق ایک ہجو خاقانی کے شاگرد مجیر بیلقانی نے لکھی تھی جو خاقانی کے نام سے منسوب کی گئی اس لئے اہل اصفہان خاقانی سے بہت ناراض تھے یہاں اس نے شاگرد کا لگایا ہوا داغ مٹانے کے لئے

اصفہان کی مدح میں ایک طویل قصیدہ لکھا۔

خاقانی دربار خاقان میں پہنچا ہی تھا کہ حاسدوں نے مشہور کر دیا کہ خاقانی اس دربار سے مطمئن نہیں اور کسی دوسرے ممدوح کی تلاش میں ہے چنانچہ خاقان شیروان سخت ناراض ہوا اور اسے ۵۷۰ ہجری میں قلعہ شاہ بیران میں محبوس کر دیا جہاں اس نے اپنی مشہور حبسیہ لکھی۔

تذکرہ نویس یہ بھی لکھتے ہیں کہ خاقان نے چاہا تھا کہ خاقانی کو دربار کا کوئی خاص منصب سپرد کر دے لیکن اسے اپنی فراغت اور آزادی بہت عزیز تھی جسے وہ دولت دو عالم کے عوض دینے کو تیار نہ تھا اس لئے ذمہ داری قبول کرنے سے معذرت چاہی چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

گفتی نہ کنی خدمت سلطان نکنم   یک لحظہ فراغت بدو عالم نفروشم

خصوصیات کلام | خاقانی نے عربی زبان اسلامی تاریخ ، علم ہیئت اور علم الٰہیات کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا اس کا یہ اثر ہے کہ وہ مختلف علوم کی اصطلاحیں اور تلمیحات بے تکلف لاتا ہے پڑھنے والا جب تک ان علوم میں دسترس نہ رکھتا ہو آسانی سے اس کا کلام نہیں سمجھ سکتا مثلاً مکہ معظمہ کی تعریف میں قصیدہ ۔

۲۔ خاقانی کے اشعار میں بیشتر ترکیبیں ایسی ہیں جو سبک خراسانی میں نظر نہیں آتیں یا اگر ہیں تو بہت کم۔

۳۔ خاقانی نے اپنے ہم عصروں کے خلاف واقعہ نگاری کی ہے اس نے بعض قصیدے خاص خاص واقعات پر لکھے ہیں جہاں واقعات کی تصویر کشی کی ہے وہاں کچھ تخیل کا رنگ بھی آ گیا ہے مثلاً "ایوانِ مدائن" کا قصیدہ

۴۔ خاقانی کو عیسائیت کا مطالعہ کرنے کا بھی موقعہ ملا تھا اس لئے عیسائیوں

کی اصطلاحات اور ان کی مذہبی روایتوں کا بے تکلفی سے ذکر کرتا ہے۔ یہ خصوصیت خاقانی کو عیسائی ماں کی گود میں پرورش پانے سے حاصل ہوئی۔

(۵) خاقانی کے اکثر قصائد میں ردیف تو ہے لیکن قافیہ نہیں مثال کے طور پر "ایوان مدائن" اور مکہ معظمہ کی شان میں دو قصیدے لکھے ہیں ان میں قافیہ نہیں ہے

(۶) خاقانی قصیدے کا آغاز تشبیب یا غزل سے کرتا ہے اس میں وہ بالعموم جلوہ، صبح، طلوع مہر عشق یا وسعت طبیعت کا ذکر کرتا ہے۔

(۷) جہاں کہیں رنج واندوہ کا موقع آیا ہے معلوم ہوتا ہے اس نے الفاظ میں دل کی غمگین صدائیں بند کی ہیں مثلاً اپنے بیٹے کی وفات پر جو مرثیہ لکھا ہے۔

(۸) خاقانی نے طبیعت کا زور محض مدحت سرائی پر ہی صرف نہیں کیا بلکہ قصیدوں میں ایسے قطعے بھی لکھے ہیں جن سے مسلسل اخلاقی سبق ملتے ہیں۔

وفات:۔ خاقانی نے آخر عمر میں دربار سے تعلق توڑ کر تبریز میں گوشہ نشینی اختیار کی اور یہیں وفات پائی اس کا سال وفات ۵۹۵ھ ہجری ہے۔

(ادب نامہ ایران منقول بیگ بدخشانی)

نظامی گنجوی

حکیم ابو محمد الیاس بن یوسف بن زکی بن موید نظامی ۵۳۵ھ میں بہ مقام گنجہ پیدا ہوئے جو نواح آذر بائیجان میں واقع ہے نظامی نے اپنے اشعار میں کئی جگہ گنجہ کا ذکر کیا ہے ایک جگہ کہتے ہیں ؎

نظامی ز گنجہ بگشای بند — گرفتاری گنجہ تا چند چند
نظامی کہ در گنجہ شد شہر بند — مباد از اسلام تو تا بہرمند

ان کی تاریخ ولادت کی ایک اور دلیل خود ان کا ایک شعر ہے یہ شعر مخزن اسرار میں ملتا ہے جو ۵۷۰ھ میں لکھی گئی ہے کہتے ہیں۔

پانصد ہفتاد و بس ایام خواب — روز بلند است بمجلس شتاب

نظامی نے جو اشعار رشک کرنے والوں کی برائی میں لکھے ہیں ان میں اپنی جوانی اور رشک کرنے والے شاعروں کا ذکر کیا ہے قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ان کی عمر (۲۵) اور (۴۰) کے درمیان تھی دوسری طرف ان کی جو عمر بتائی گئی ہے اور ان کا سال وفات ہمیں معلوم ہے اس کے لحاظ سے بھی ان کا سنہ ولادت صحت سے قریب ہے

گنجہ کے باشندے سنی اور کرد سنی تھے یہاں علماء و فضلا کی کمی نہ تھی جوانی میں نظامی ان سے بہت متاثر ہوئے تھے اوران کی صحبتوں سے اکتساب فیض کیا تھا۔

نظامی نے اپنی مثنوی لیلیٰ مجنوں میں اپنے والد اور والدہ کا ذکر کیا ہے اور ان کی موت کا دردناک اشعار میں ذکر کیا ہے غالباً نظامی کے والدین

ان کے بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ نظامی نے شادی بھی کی تھی ان کا ایک لڑکا محمد نامی تھا مثنوی خسرو شیریں کے اختتام کے وقت اس کی عمر سات سال کی تھی چنانچہ کہتے ہیں ؎

ببیں ای ہفت سالہ قرۃ العین مقام خویشتن در قاب قوسین

شاعر نے اپنے فرزند کا نام لے کر حکیمانہ نصیحتیں کی ہیں جو نہایت دلکش اور دلنشین ہیں لیکن اقبال نامہ میں اس لڑکے کا نام نہیں لیا ہے۔

اس خوش طبع اور سخن سنج شاعر کے حالات اور اس کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ظاہر داری کے رسوم کا کچھ ایسا پابند نہ تھا۔ انہوں نے امراء کی پیش گاہ میں کبھی اپنا سر نیاز نہیں جھکایا یا شاعری میں سچائی کا راستہ اختیار کیا جھوٹ اور بری باتوں سے پرہیز کیا۔

نظامی کی شہرت کی بنیاد اور ان کی استادی کا ثبوت اس کی کتاب خمسہ یا پنج گنج ہے جو مثنوی کی طرز پر لکھی گئی ہے اس میں کم وبیش اٹھائیس ہزار شعر ہیں ان میں سب سے پہلی مثنوی مخزن الاسرار زہد وتقویٰ اور معنوی مقامات پر لکھی گئی ہے باقی مثنویاں قصص وحکایات پر مشتمل ہیں ان کے نام یہ ہیں۔

خسرو شیریں، لیلیٰ مجنون، ہفت پیکر اور سکندر نامہ

سبک اور شاعری

نظامی کا شمار بہت بڑے داستان سرا شعراء میں ہوتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ فردوسی کے بعد پھر کوئی دوسرا ان کے برابر شہرت حاصل نہ کر سکا بے شبہ داستانی مثنوی کے وہ استاد اور دوسروں کے پیش رو ہیں۔

نظامی کا سبک متین اور ان کی نظم شیریں ہے ان کے شعر صاف اور رواں ہیں اور ان کا کلام تعقید سے بالکل پاک ہے لیکن کہیں کہیں ان کے اشعار

ہیں پیچیدہ عبارتیں بھی دکھائی دیتی ہیں ظاہر ہے کہ داستان سرائی میں حکیم فردوسی کو اپنا نمونہ بنایا تھا اس طرزِ سخن میں خود انہوں نے بڑا کمال حاصل کیا اور امیر خسرو، جامی اور دوسرے شاعروں کے لئے نمونہ ہے "خمسہ" کے بعض اشعار جن میں انسان کے فطری اور طبعی احساس کی عکاسی کی گئی ہے فارسی زبان کی شاعری کے بہترین نمونے ہیں۔

نظامی کے وہ اشعار جو انہوں نے معانی حکمت، توحید اور نعت میں لکھے ہیں بڑے بلند پایہ ایک مخصوص لحن اور بڑی لطافت کے حامل ہیں حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے مقام توحید اور نعت کو اپنے کلام میں اس طرح پیش کیا ہے کہ اس کی وجہ سے ان کے کلام کو ایک خاص عظمت حاصل ہو گئی ہے

اگرچہ شاعر کی نظر داستان سرائی کی طرف ہی رہی ہے اس کے باوجود داستان کے ضمن میں شاعر نے اخلاقی اور حکمی مضامین بھی پیش کئے ہیں اور غفلت سے جاگنے کی نصیحتیں کہی ہیں اس لحاظ سے نظامی کا کلام فردوسی کے کلام سے بہت ملتا جلتا ہے فردوسی نے بھی کہیں کہیں داستان کے ضمن میں پند و عبرت کو نظم کیا ہے پند آمیز اشعار کے درمیان نظامی نے بڑے دلنشین اور لطیف اشعار لکھے ہیں ان میں خاص طور پر وہ اشعار جو انہوں نے اپنے فرزند محمد نظامی کو مخاطب کر کے پدرانہ شفقت کے ساتھ لکھے ہیں ایک خاص لطافت کے حامل ہیں اور بڑے اثر آفریں ہیں۔

نظامی پہلے ایرانی شاعر ہیں جنہوں نے بزمیہ داستان کو اپنی شاعری کا اصلی موضوع قرار دیا انہوں نے رواں مثنوی میں نئی ترکیبیں اور نئی تعبیریں ایجاد کر کے ایک خاص اثر پیدا کر دیا ہے اس لحاظ سے اس صنفِ شاعری میں فضیلت کا سہرا انہیں کے سر ہے ان کا یہ دعویٰ کہ میں نے کسی کی نقل نہیں کی اور اپنے

دل کے حکم پر شعر لکھے ہیں بالکل درست ہے کیونکہ انھوں نے نئے نئے معانی نئی نئی تشبیہیں اور فکر و نظر کے نئے نئے زاوئے پیدا کئے ہیں ۔

عاریت کس نپذیرفتہ ام! — آنچہ دلم گفت بگو گفتہ ام
شعبدہ تازہ برانگیختم — ہیکلی از قالب نو ریختم

نظامی نے داستان سرائی کے ضمن میں بہت سے شاعرانہ کمالات کا مظاہرہ کیا ہے ان میں سے ایک کمال تو پند گوئی ہے دوسرا کمال عبرت آمیز نتائج کا استخراج ہے جو انسانی واقعات اور حالات کے ذکر میں کئے ہیں ۔ شاعر کا ایک اور کمال انسان کے قلبی احساسات کی عکاسی ہے جو لیے شیئہ اچھوتی ہے ۔

نظامی نے خمسہ کی مثنویوں کے سوا قصیدے اور غزلیں بھی لکھی ہیں ان میں سے چند کو جمع کر لیا گیا ہے ان کے نام سے چند قطعے اور رباعیاں بھی ملتی ہیں ان اشعار میں بھی ان کی استادی اور بڑائی نمایاں ہے

(وفات) اسکندر نامہ کے ایک قطعہ کے مطابق اسکندر نامہ کی تالیف کے وقت نظامی کی عمر ساڑھے تراسٹھ سال تھی چونکہ ان کا سن ولادت ۵۳۵ھ ہجری ہے اس لئے ان کا سن وفات ۵۹۹ قرار پاتا ہے ۔

(تاریخ ادبیات ایران از رضازادہ شفق)

الیاس یوسف نام، ابو محمد کنیت، نظام الدین لقب، نظامی تخلص، باپ کا نام موئید وطن عام طور پر گنجہ مشہور ہے لیکن دراصل قم کے رہنے والے تھے چنانچہ خود سکندر نامہ میں فرماتے ہیں ۔

چو در گرچہ در بحر گنجہ گمم — ولی از قہستان شہر قمم!

قم کے اضلاع میں تفرش ایک ضلع ہے اصل وطن یہاں تھا لیکن چونکہ قم صدر مقام ہے اس لئے انتساب میں تفرش کے بجائے قم کا نام لیتے ہیں نظامی کے والد بزرگوار وطن چھوڑ کر گنجہ میں آئے نظامی یہیں پیدا ہوئے سال ولادت کسی نے بیان نہیں کی چونکہ بروایت سن وفات ۵۹۶ھ ہے اور ان کی عمر تقریباً ترسیٹھ برس کی بیان کی جاتی ہے اس لئے سال ولادت ۵۳۲ھ سمجھنا چاہیئے۔

نظامی کا خاندان علمی خاندان تھا ان کے بھائی قوامی مطرزی مشہور شاعر ہیں ان کا ایک قصیدہ ہے جس میں تمام صنائع شاعری جمع کر دیئے ہیں۔ نظامی نے ابتدا میں درسی علوم کی تحصیل کی۔ سلسلہ طریقت میں واخی فرج زنجانی سے بیعت تھی۔ نظامی اگرچہ درویشانہ طبیعت رکھتے تھے لیکن شاعری بھی ازل سے ساتھ لائے تھے گھر میں پہلے سے شاعری کا چرچا موجود تھا اس لئے درسی علوم سے فارغ ہو کر تصنیف کا قلم ہاتھ میں لیا تو حرف موزوں نکلے مشق روز بروز بڑھتی گئی اور کلام کا شہرہ دور دور تک پہنچا یہاں تک کہ اس زمانے کے تمام بڑے بڑے سلاطین نے ان کی قدردانی کی۔ اسباب اس کے متقضی تھے کہ سب سے پہلے قریبی دربار سے تعلق پیدا ہوتا لیکن یہ سعادت دور والوں کی قسمت میں لکھی تھی سب سے پہلے جس کو یہ عزت نصیب ہوئی وہ بہرام شاہ تھا۔ نظامی نے مخزن اسرار ۵۵۹ھ میں اس کے نام پر لکھی اور صلہ میں اس نے پانچ ہزار اشرفیاں، ایک قطار شتر اور انواع واقسام کے بیش قیمت کپڑے بھیجے مخزن اسرار کی تصنیف کے وقت نظامی کا سن تقریباً ۲۵ کا تھا۔

نظامی نے "شیریں خسرو" لکھنی شروع کی تو اس کے چرچے دور دور پھیل گئے طغرل کو خبر ہوئی تو اس وقت فرمان بھیجا کہ ایسی کتاب لکھیئے کہ یادگار رہ جائے

شیریں خسرو" جب انجام کو پہنچی تو محمد بن یلدگز جو درحقیقت تاج و تخت کا مالک تھا وفات کر چکا تھا اور اس کا بھائی قزل ارسلان اس کا قائم مقام مقرر ہوا تھا اس کو شیریں خسرو کے تمام ہونے کی خبر پہنچی تو نظامی کی طلبی کا فرمان بھیجا قاصد فرمان لے کر آیا نظامی نے آداب شاہی کے مطابق فرمان کو پہلے سر پر رکھا پھر تین جگہ بوسہ دے کر کھولا چنانچہ شیریں خسرو کے خاتمہ میں خود فرماتے ہیں۔

ع مثال شاہ را بر سر نہادم   سہ جا بوسیدم و سر برکشیدم

اسی وقت گھوڑے پر سوار ہوئے اور دشت و بیاباں طے کرتے ہوئے قریباً ایک مہینہ میں پائے تخت میں پہنچے نظامی مدحیہ نظم ساتھ لے گئے تھے اس کو سنانا چاہا قاعدہ یہ تھا کہ شعراء اپنا کلام خود نہیں پڑھتے تھے بلکہ کسی خوش لہجہ سے پڑھواتے تھے اس کو راوی کہتے تھے چنانچہ راوی نے قصیدہ پڑھنا شروع کیا۔ یہ بھی دستور تھا کہ جب قصیدہ پڑھا جاتا تھا تو شاعر کھڑا ہو جاتا تھا اور قصیدہ کو ختم ہونے تک کھڑا رہتا تھا نظامی نے بھی اس قاعدہ کو بجا لانا چاہا لیکن قزل ارسلان نے قسم دلا کر منع کر دیا :۔

ع چو بر پا ایستادم گفت بنشیں   بسوگندم نشاند ایں منزلت بیں

راوی نے مدح کے بعد شیریں خسرو کا قصہ شروع کیا بادشاہ نظامی کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے نہایت شوق میں سن رہا تھا اور بار بار بے ساختہ تحسین کرتا جاتا تھا نظامی کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ آپ نے ہمیشہ کے لئے میرا نام زندہ کر دیا اس کا صلہ دینا میرا فرض ہے قزل ارسلان نے ایک گاؤں جس کا نام حمدونیاں تھا اپنی طرف سے جاگیر میں دیا۔

نظامی کی شہرت اب اس قدر عالمگیر ہو گئی کہ اور سلاطین کو بھی آرزو ہوئی کہ ان سے اپنے نام پر تصنیفات لکھوائیں چنانچہ منوچہر نے اپنے ہاتھ سے نظامی

کو دس پندرہ سطروں کا خط لکھ کر بھیجا کہ لیلیٰ مجنوں کی داستان نظم کیجئے۔ نظامی نے بادشاہی ارشاد کی تعمیل شروع کی اور کچھ کم چار مہینے میں انجام کو پہنچائی سال تمام رجب ۵۸۴ھ ہے۔ نظامی نے اس مثنوی کے صلہ میں بادشاہ سے یہ خواہش کی کہ ان کے صاحبزادے ولی عہد سلطنت کے ندیموں اور مصاحبوں میں داخل کئے جائیں۔

۱۴ رمضان ۵۹۳ھ میں سلطان غیاث الدین کرپ ارسلان کی فرمائش سے ہفت پیکر لکھی جس میں بہرام گور کا قصہ ہے۔

قزل ارسلان کے مرنے کے بعد اس کا بھتیجا ابوبکر نصرۃ الدین ۵۸۷ھ میں مسند آرا ہوا نظامی کو اس خاندان سے قدیم تعلق تھا اس وقت تک انہوں نے جو کتابیں لکھی تھیں سلاطین وقت کی فرمائش سے لکھی تھیں لیکن سکندر نامہ اپنی خواہش سے لکھا اور ابوبکر نصرۃ الدین کے نام سے موسوم کیا یہ کتاب ۵۹۹ھ میں انجام کو پہنچی۔ کتاب لکھ کر بادشاہ کے حضور میں پیش کی تو مقرر رقم کے علاوہ سواری کا گھوڑا بیش قیمت کپڑے خلعت وغیرہ عطا ہوا۔ اس کتاب پہ ان کی شاعری اور عمر دونوں کا خاتمہ ہو گیا، سال وفات میں سخت اختلاف ہے دولت شاہی میں ۵۹۶ھ میں لکھا ہے لیکن یہ خود نظامی کی تصریح کے خلاف ہے تقی کاشی نے ۶۰۶ھ لکھا ہے جامی ۵۹۲ھ بیان کرتے ہیں لیکن اس قدر قطعی ہے کہ ۵۹۹ھ کے بعد ان کی وفات ہوئی اور غالباً چھٹی صدی سے آگے نہیں بڑھے۔

پنج گنج کے سوا نظامی کا اور بہت سا کلام تھا جو آج مفقود ہے دولت شاہ کا بیان ہے کہ اس میں غزلیں موشحات اور صنائع کے بیس ہزار شعر تھے تذکروں میں چند قصائد، قطعات اور غزل کے جستہ جستہ اشعار پائے جاتے ہیں تعجب یہ ہے کہ عشقیہ شاعری کی نقش آرائیاں انہی کی بدولت وجود میں آئیں لیکن غزلیں پھیکی

اچھے مزہ ہیں مگر بعض شوخ جملے بھی زبان سے نکل جاتے ہیں ؎

بوسہ میخواہم ازاں لب تو چہ میفرمائی   گر صواب است بگو ورنہ خطای بکنم

قصیدے بہت ہیں لیکن ان میں کوئی خاص بات نہیں سنائی کا انداز ہے اخلاق اور تصوف کو ترکیب دے کر کہتے ہیں لیکن سنائی سے بہت پیچھے ہیں اس لئے مقبول نہ ہو سکے البتہ ایک قطعہ نہایت صاف صاف شستہ اور پر لطف کہا ہے جس کا آج تک جواب نہ ہوسکا جس کا مطلع درج ذیل ہے ؎

دوش رفتم بہ خرابات دمرا راہ نبود   می زدم نالہ و فریاد کس از من نشنود

ایران میں جسقدر شعراء گذرے ہیں وہ خاص خاص انواع شاعری میں کمال رکھتے تھے مثلاً فردوسی رزم کا مرد میدان ہے عشقیہ شاعری میں اس کو کمال حاصل نہیں سعدی اخلاقی اور عشقیہ شاعری کے پیغمبر ہیں لیکن رزم میں پھیکے ہیں۔ خیام صرف فلسفہ لکھ سکتا ہے حافظ صرف غزل لکھ سکتے ہیں بخلاف اس کے نظامی نے رزم بزم، فلسفہ، عشق اور اخلاق سب کچھ لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے لاجواب لکھا ہے البتہ مدح ان سے نہیں بن پڑتی۔

نظامی بہت سی باتوں کے موجد ہیں۔

سب سے پہلے انہی نے پانچ مختلف بحروں میں مثنویاں لکھیں جس کی تقلید اس وقت سے آج تک بڑے بڑے شعرا کرتے آئے ہیں۔ چنانچہ ان کے خمسہ پر تمام اکابر شعراء نے خمسہ لکھا ہے مخزن اسرار اور ہفت پیکر کی بحر کو اول انہی نے مثنوی میں داخل کیا۔ سب سے پہلے انہی نے ایک مثنوی (مخزن اسرار) میں پانچ نعتیں لکھیں اور ہر ایک کا جدا رنگ ہے۔

سب سے پہلے انہی نے فلسفیانہ مباحث کو نظم کیا۔

سب سے پہلے انہی نے ساقی نامہ کا خاکہ قائم کیا۔

ع نسب نامہ دولت کیقباد   ورق بر ورق ہر سوی برد باد

دارا سلسلۂ کیانی کا آخیر فرمانروا تھا اور اس کے مرنے سے گویا اس عظیم الشان خاندان کی تاریخ مٹ گئی اس مضمون کو تشبیہہ نے کس قدر مؤثر اور بلند کر دیا۔

فارسی میں فلسفیانہ مسائل ناصر خسرو کے سوا کسی نے ادا نہیں کئے لیکن ناصر خسرو نے تمام اصطلاحیں وہی عربی کی قائم رکھی ہیں اس پر عام خیال یہ ہے کہ فارسی میں فلسفیانہ خیالات ادا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے بو علی سینا کی کتاب حکمت علائیہ سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ نظامی نے فلسفیانہ مسائل اس حد تک لکھ دیئے ہیں کہ زبان کی کم مائیگی کی شکایت نہیں ہوسکتی اور اگر متاخرین بھی اس کے نقش قدم پر چلتے تو فارسی زبان ایک فلسفیانہ زبان بن گئی ہوتی۔

نظامی کی شاعری کا بڑا حصہ اخلاق کے متعلق ہے مخزن الاسرار کے سو جو خاص اسی مضمون پر لکھی ہے اور مثنوی میں بھی جا بجا اخلاقی ہدایتیں موقع لکھو ہیں۔

جذبات انسانی کی اہم اور لطیف نوع کو نظامی نے جس رتبہ پر پہنچایا قدما میں فردوسی کے سوا اس کی نظیر نہیں مل سکتی اور انصاف یہ ہے کہ فردوسی بھی اس خصوصیت میں ان کی ہمسری نہیں کر سکتا فردوسی نے جہاں جذبات کا اظہار کیا ہے معمولی اور سادہ حالت کو ادا کیا ہے بخلاف اس کے نظامی نہایت نازک، لطیف اور دقیق پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

نظامی نے مناظر قدرت کو جا بجا لکھا ہے اور جہاں لکھا ہے نیچر کی تصویر کھینچ دی ہے۔ مناظر قدرت میں باغ و بہار ایک عام موضوع ہے جس پر تمام شعرأ

نے طبع آزمائیاں کی ہیں اور دادِ سخن دی ہے لیکن نظامی یہاں بھی سب سے علیحدہ اور سب سے ممتاز ہیں تمام شعراء نے صرف بہار کا سماں دکھانے پر اکتفا کیا ہے لیکن نظامی نے اس کے ساتھ یہ بھی دکھایا ہے کہ بہار میں ایک رنگین مزاج پر کس طرح نشہ سا چھا جاتا ہے۔

ایران کی شاعری کا اصل مایہ ناز عشقیہ شاعری ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ عشق و عاشقی کے معاملات اور راز و نیاز جس رنگینی اور دلفریبی سے ایرانی شاعر نے ادا کئے دنیا کی اور کوئی زبان اس انداز سے ادا نہیں کر سکتی اس قسم کی شاعری کے لئے غزل مخصوص کر دی گئی ہے اور اس کے موجد شیخ سعدی خیال کئے جاتے ہیں بے شبہ غزل کے موجد سعدی ہیں لیکن غزل کی اصلی روح یعنی عشقیہ شاعری کی ایجاد نظامی کا خاص کارنامہ ہے عشقیہ مثنویاں نظامی سے پہلے بھی لکھی گئیں جن میں فردوسی کی یوسف زلیخا بھی موجود ہے لیکن مثنویاں وہی قدما کی غزلیں ہیں نظامی نے عشقیہ شاعری کی جس طرح بنیاد ڈالی اور اس کو ترقی دی وہ کچھ اس طرح ہے کہ عشق و عاشقی کے خیالات ادا کرنے کے لئے ایک خاص زبان درکار ہے جس کے الفاظ نازک لطیف اور شیریں ہوں خاص قسم کے استعارات اور تشبیہیں ہوں ادا میں دلآویزی اور دلفریبی ہو یہ زبان خاص نظامی نے پیدا کی ہے قدماء کی عشقیہ مثنویوں کا نظامی کی کسی مثنوی سے مقابلہ کرو تو یہ فرق صاف نظر آتا ہے۔

(شعر العجم شبلی نعمانی)

حکیم جمال الدین ابو محمد الیاس بن یوسف بن زکی بن مؤید نظامی گنجوی فارسی شاعری کے عظیم استادوں میں سے ہیں اس کے نام و لقب کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے عوفی نے اس کو "الحکیم الکامل نظامی الگنجہ" لکھا ہے

لکھا ہے اور اس کے نام و نسب کی تشریح نہیں کی ہے۔ نظامی نے خود اپنے نام و نسب کے بارے میں اپنے شعروں میں اشارات کئے ہیں ان اشارات کی بنا پر اس کا نام الیاس، باپ کا نام یوسف بن زکی بن مؤیدہ ہے

در خط نظامی از نہی گام   بینی عدد ہزار و یک نام
والیاس کالف بری ز لامش   ہم بانوو دو نہ است نامش
زاینگونہ ہزار و یک حسامم   با صد کم یک سلیح دارم
گر شد پدرم بنسبت جد   یوسف پسر زکی مؤید
با دور بد اوری چہ کوشم   دور است نہ جور، چوں خروشم

تمام تذکرہ نویسوں نے نظامی کی جائے ولادت "گنجہ" لکھی ہے اس نے خود بھی اپنے اشعار میں "گنجہ" ہی نسبت بتائی ہے۔

نظامی ز گنجینہ بکشا گنج   گرفتاری گنجہ تا چند چند

اس کی تاریخ ولادت معلوم نہیں ہے لیکن اس کے بعض اشعار سے ۵۳۰ سال سے پہلے قرار دی جا سکتی ہے کیونکہ مخزن الاسرار اس نے اپنی جوانی کے عالم میں لکھی اور اس کا سن تصنیف ۵۷۰ ہے گویا اس وقت تک ابھی اس کی عمر چالیس سال کو نہ پہنچی تھی پس ۵۳۰ سے پہلے یا نزدیک اس کا سن ولادت کہا جا سکتا ہے۔

دولت شاہ سمرقندی نے اس کو فرج زنجانی کے مریدوں کے زمرے میں شمار کیا ہے خواہ یہ قول صحیح ہو یا غلط لیکن نظامی کے اشعار سے اس کا تصوف اور صوفیانہ افکار سے قلبی تعلق صاف ظاہر ہوتا ہے۔

نظامی کی تاریخ وفات کا ذکر بھی مختلف صورتوں میں ہوا ہے دولت شاہ سمرقندی اس کو ۵۷۰ لکھتا ہے حاجی خلیفہ "کشف الظنون" میں ۵۹۶ھ قرار دیتا

ہے اور ہدایت ۵۷۶ھ بتاتا ہے لیکن اپنے معاصرین میں سے نظامی صرف خاقانی سے واقفیت رکھتا تھا اور اس استاد کے مرنے کے بعد ۵۹۵ میں مرثیہ لکھا اور کہا:۔ ؎

ہمی گفتم کہ خاقانی دریغا گوئی من باشد   دریغا من شدم آخر دریغا گوئی خاقانی

نظامی کے اشعار کی تعداد دولت شاہ سمرقندی نے دیوان کے علاوہ ۲ ہزار لکھی ہے اور اب ان میں وہ دستیاب ہوتے ہیں جو مرحوم وحید دستگردی نے "گنجینہ گنجوی" کے نام سے فراہم کئے ہیں باقی اشعار پرانے جنگی معرکوں کی نذر ہو گئے۔ نظامی کی پانچ مثنویاں پنج گنج کے نام سے مشہور ہیں ان کو "خمسہ نظامی" بھی کہا جاتا ہے

ان میں سے پہلی مثنوی "مخزن اسرار" ہے جو بحر سریع میں ۲۲۶۰ اشعار پر مشتمل ہے اور شاعر نے اس کو فخر الدین بہرام شاہ بن داؤد کے نام منسوب کیا ہے اس نے اس تحفہ کے عوض پانچ ہزار دینار اور پانچ اشتر نظامی کو عطا فرمائے تھے یہ مثنوی ۵۷۰ ہجری میں لکھی گئی اس کی تائید میں ذیل کا شعر ملاحظہ ہو۔

پانصد و ہفتاد پس ایام خواب   روز بلند است بمجلس شتاب

یہ مثنوی شاعر کی پہلی منظوم کوشش ہے اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے... نظامی نے اس کو چالیس سال کی عمر سے تھوڑا سا پہلے لکھا ہے اس کے بیس مقالوں میں پند و موعظت اور حکمت کے مضامین درج ہیں

دوسری منظوم مثنوی خسرو شیریں ہے اس کو نظامی نے ۵۷۶ھ میں پایہ تکمیل کو پہنچایا چنانچہ کہتا ہے کہ

گذشتہ پانصد و ہفتاد و شش سال   نزد بر خط خوبان کس چنیں فال!

"خسرو شیریں" میں ۶۵۰۰ اشعار ہیں جو بحر ہزج مسدس مقصور و محذوف میں ہیں اور خسرو پرویز کی شیریں کے ساتھ عشق بازی کا اس میں بیان ہے۔ یہ عشقیہ داستان عہد ساسانی کی آخری داستانوں میں سے ہے جس کا ذکر مختلف کتابوں میں ملتا ہے ان میں شاہنامہ ثعالبی و شاہنامہ فردوسی بھی ہیں

تیسری مثنوی "لیلیٰ و مجنوں" ہے جس کو نظامی نے ۵۸۴ ہجری میں شروان شاہ ابو المظفر اخستان بن منوچہر کے نام سے منسوب کر کے لکھا اس مثنوی کے چار ہزار سات سو شعر د چھ ماہ کے ؛ تھوڑے سے عرصے میں تکمیل کو پہنچے نظامی نے اس واقعہ کے دوسرے قصیوں میں بہت کچھ تصرفات کر کے اس کو نظم کیا ہے۔

چوتھی مثنوی کا نام "بہرام نامہ" یا "ہفت پیکر" یا "ہفت گنبد" ہے جس کو شاعر نے ۵۹۲ ہجری کو علاؤالدین کرپ ارسلان بادشاہ مراغہ کے نام سے پانچہزار ایک سو چھتیس شعروں میں مکمل کیا یہ منظوم قصہ بہرام گور (بہرام پنجم ساسانی ۴۲۰، ۴۳۸ میلادی) کی داستان ہے جس میں پہلے تو شاعر نے بہرام کے بچپن، جوانی اور تخت حکومت حاصل کرنے اور اپنی حکمرانی کے دوران مختلف کارہائے نمایاں کرنے کا ذکر کیا ہے پھر اس کی داستان کو ہفت اقلیم کے بادشاہوں کی سات لڑکیوں کے ساتھ منسلک کیا ہے اور ہر ایک لڑکی کے لئے ایک خاص رنگ کا گنبد تعمیر کیا گیا تھا اور ہر ہفتے میں سے ایک دن ان لڑکیوں میں سے ایک کو مہمان بنایا جاتا تھا اور ہر ایک سے ایک ایک کہانی سنی جاتی تھی یہ سات کہانیاں جو نظامی نے ان سات دلہنوں کی زبان سے ادا کروائی ہیں بڑی عجیب و غریب اور دلچسپ داستانیں ہیں۔ اس کے بعد نظامی نے بہرام کی غفلت کی وجہ سے ملک میں

افزانفری ، ایران پر حملۂ چین کا ذکر ، وزیر مملکت کے ظلم کی داستان اور بہرام کو اصلاحِ احوال کے لئے انتباہ کیا ہے اور کہانی کا اس جگہ خاتمہ کیا گیا ہے کہ بہرام ایک گور کے تعاقب میں گیا اور پھر نہیں پلٹ سکا۔

پانچویں مثنوی اسکندر نامہ ہے یہ کتاب دس ہزار پانچ سو اشعار کا مجموعہ ہے اور دو حصّوں میں تقسیم ہے نظامی نے پہلے حصّے کا نام "شرفنامہ" اور دوسرے کا نام "اقبال نامہ" رکھا ہے اس کو ۵۹۷ ہجری میں مکمل کیا گیا جیسا کہ اس کے شعر سے ظاہر ہے سہ

تباریخ پانصد نود ہفت سال چہارم محرم بوقت زوال

نظامی نے اس کتاب کے پہلے حصّے "شرفنامہ" میں اسکندر بن فیلقوس کی کہانی جس کو فردوسی ادھورا چھوڑ گیا تھا منظوم کیا ہے شرفنامہ اسکندر کی ولادت سے فتح ممالک اور وطن کو واپسی کے واقعات پر مشتمل ہے اور "اقبالنامہ" میں علم و حکمت کی باتیں، اسکندر کی مجالس اور اس کی زندگی کے انجام کا ذکر ہے نظامی نے اس داستان کو رقم کرتے میں فردوسی کی پیروی کی ہے۔

نظامی کو بلا شک و شبہ فارسی زبان کے اُستاد شاعروں کی صف میں شمار کیا جاسکتا ہے یہ فردوسی اور سعدی کے پایہ کے شاعروں میں سے ہے اگرچہ فارسی زبان میں داستانسرائی کا رواج نظامی سے شروع نہیں ہوا تھا بلکہ ادبِ فارسی میں شروع ہی سے واسطہ پڑتا رہا لیکن تنہا وہ شاعر جس نے چھٹی صدی تک کے خاتمے تک فارسی کی تمثیلیہ شاعری کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا وہ نظامی گنجوی ہے وہ مناسب الفاظ و کلمات کے انتخاب میں ، تازہ اور خاص ترکیبات کے ایجاد کرنے میں نئے نئے اور دلپسند مضامین لانے میں ،

جزئیات اور تفصیلات کے ادا کرنے میں، جذبات انسانی کی عکاسی اور تشبیہات واستعارات کے استعمال میں ان شاعروں کی صف میں شمار ہوتا ہے جن کے پایہ تک بعد میں ہم نظیری کو بھی نہیں پاتے ہیں۔ اس کے کلام کا عیب صرف یہ ہے کہ وہ نئے نئے معانی مضامین کی خاطر تخیل کے اوہام میں گرفتار ہو جاتا ہے اس کے علاوہ نئے نئے کلمات اور نئی نئی ترکیبوں کی تلاش میں لفظی بازی گری کا شکار نظر آتا ہے ضمناً یہ شاعر عام رواج کے مطابق علمی اصطلاحات اور عربی الفاظ و ترکیبات کو بہت زیادہ استعمال میں لاتا ہے۔ فلسفیانہ افکار و اصول کے استعمال سے غافل نہیں ہوتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے بعض اشعار اس قدر مشکل اور پیچیدہ ہو جاتے ہیں جو تشریح و توضیح کی عدم موجودگی میں سمجھ سے بالاتر ہوتے ہیں۔

لیکن حق تو یہ ہے کہ یہ شاعر سلیم الفطرت اور دقیق النظر ہے اور مذکورہ بالا نقائص کو اس خوبیٔ ادا سے پیش کرتا ہے کہ تمام برائیاں قارئین کی نظر سے اوجھل رہتی ہیں نظامی نے اپنی منظوم داستانوں کو اس ترتیب و تنظیم سے پیش کیا ہے کہ جلد ہی شاعروں نے اس کی تقلید شروع کر دی اور وہ لوگ جنہوں نے اس کی پیروی کی بہت سے ہیں۔ پہلا بزرگ شاعر جس نے نظامی کے "پنج گنج" کی تقلید کی امیر خسرو دہلوی ہے اس کے بعد خواجو، جامی، حاتفی، قاسمی، عرفی، مکتبی، فیضی، اشرف مراغی اور آذر بیکدلی کا نام لیا جاتا ہے انہوں نے اس کی مثنویوں کی تقلید کی ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے نظامی نے "پنج گنج" کے علاوہ دیوان قصائد و غزلیات بھی مکمل کیا۔ نظامی کے قصائد بے شمار ہیں اس نے سنائی کی پیروی میں وعظ و حکمت کے مضامین پر مشتمل قصیدے کہے اسی طرح اس کی بے شمار غزلیات کا سراغ بھی ملتا ہے۔ ان غزلیات

وقصائد کا مجموعہ دیوان کی صورت میں موجود ہے اور دولت شاہ سمرقندی کے قول
کے مطابق اس کے دیوان کے اشعار کی تعداد بیس ہزار تک پہنچتی ہے

(تاریخ ادبیات در ایران ذبیح اللہ صفا)

حکیم ابو محمد الیاس بن یوسف نظامی آذربائیجان کے شہر گنجہ میں پیدا ہوئے بچپن میں ہی باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا ادھر باپ فوت ہوا ادھر ماں نے داغ مفارقت دے دیا تعلیم وتربیت آپ کے ماموں کے زیر نگرانی ہوئی۔ افراد خانہ کو شعر وادب کا ذوق تھا چنانچہ آپ کے بھائی مطرزی قوامی خود ایک صاحب طرز شاعر تھے آپ کو بھی شعر وشاعری سے فطری لگاؤ تھا اس لئے تعلیم سے فراغت پاکر شعر وشاعری شروع کی۔

آپ نے زندگی کا بیشتر حصہ گنجہ میں گزارا صرف ایک مرتبہ آذربائیجان تک جانے کا اتفاق ہوا اسکی بھی یہ صورت ہوئی کہ آذربائیجان کے اتابک حکمران قزل ارسلان نے آپ کے کلام کی شہرت سنکر اپنے ہاں آنے کی دعوت دی چنانچہ وہ وہاں چلے گئے۔

نظامی کے ہم عصر حکمران اتابکان آذربائیجان، اتابکان موصل اور شروان کے شروانشاہ تھے لیکن آپ آزاد فطرت کے مالک تھے طبیعت نے گوارا نہ کیا کہ حصول دولت کے لئے کسی کا قصیدہ کہیں اس لئے کسی دربار سے تعلق پیدا نہ ہوا اور نہ کسی دہلیز پر ان کی پیشانی جھکی جو کچھ کہتے تھے اپنی خواہش اور اپج سے کہتے تھے البتہ یہ ضرور ہے کہ انہوں نے اپنی مثنویاں بعض حکمرانوں کے نام منسوب کی ہیں مثلاً "مخزن اسرار" آذربائیجان کے اتابک ایلدگز کے نام "خسرو شیریں" اس کے دو بیٹوں محمد اور قزل ارسلان کے نام "لیلی مجنون" شروانشاہ منوچہر کے نام "سکندر نامہ" موصل کے حکمران عزالدین مسعود اول کے نام اور مثنوی

ہفت پیکر" قزل ارسلان کے جانشین نصرت الدین ابوبکر کے نام منسوب کی ہے۔
نظامی زاہد و عابد شخص تھے لیکن زہد و اتقاء کا کبھی دعویٰ نہیں کیا شعر و سخن میں انہیں یکتائی کا درجہ حاصل تھا لیکن کبھی اس کی نمود و نمائش نہیں کی عمر بھر انہوں نے کبھی شراب نہیں پی۔ اس کے نزدیک شاعری کا مقصد یہ نہیں کہ امراء و رؤسا کی مدحت سرائی میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جائیں بلکہ یہ کہ ادب میں کوئی زندہ جاوید یادگار چھوڑی جائے نظامی نے خودداری پہ کبھی حرف نہیں آنے دیا مثنویوں میں بعض حکمرانوں کی تعریف ضرور کی ہے لیکن صرف اسی حد تک جس حد تک شاید وہ مستحق تھے آخر عمر میں نظامی گوشہ نشین ہو گئے

نظامی کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی فضیلت صرف شعر و شاعری تک محدود نہ تھی بلکہ انہیں جوانی میں تاریخ و ادب اور علم ہیئت سے گہری رغبت تھی علم نجوم میں خاصی مہارت تھی۔

آپ کی غیر فانی شہرت کا سرمایہ آپ کی تصنیف خمسہ یا پنج گنج ہے جو پانچ مختلف مثنویوں پہ مشتمل ہے۔ مثنویوں کے اشعار کی تعداد اٹھائیس ہزار بیان کی جاتی ہے مثنویوں کے نام حسب ذیل ہیں۔ مخزن اسرار، خسرو شیریں، لیلیٰ مجنوں، ہفت پیکر، سکندر نامہ۔

۱۔ مخزن اسرار :۔ یہ نظامی کی اولین مثنوی ہے جس کے شروع میں تمہید ہے اس کے بعد بیس مقالے ہیں جو اخلاق و تصوف کے موضوع پہ لکھے گئے ہیں یہ مثنوی ۵۷۱ھ میں مکمل ہوئی

۲۔ خسرو شیریں :۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے جس کا مواد قدیم ساسانی عہد کی ایک داستان سے ماخوذ ہے اس مثنوی کا سال اختتام ۵۷۶ھ ہے

۳۔ لیلیٰ مجنوں :۔ اس مثنوی کا موضوع نہ صرف ایران بلکہ ترکی میں بہت مقبول رہا

ہے اکثر شعراء نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے اس عظیم داستان کا تعلق سرزمین عرب سے ہے لیکن اس میں جو رنگ آمیزی کی گئی ہے وہ خالص ایرانی ہے یہ مثنوی ۵۸۴ھ میں مکمل ہوئی

۴۔ ہفت پیکر:۔ اس داستان کا ماخذ بھی ساسانی عہد کا ایک قدیم قصّہ ہے۔ اس داستان کا مخلص یہ ہے کہ ساسانی شہزادہ بہرام گور شاہی محل "خورنق" کے ایک پوشیدہ کمرے میں سات مختلف ممالک کی شہزادیوں کی تصویریں دیکھتا ہے شاہزادہ ان تصویروں کو دل و جان سے چاہنے لگتا ہے آخر جب بہرام اپنے والد یزدگرد کی وفات پر تخت نشین ہوتا ہے تو وہ اپنی زندگی کا مقصد یہ سمجھتا ہے کہ ان شہزادیوں کو حاصل کرے چنانچہ وہ ان سے شادی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور تصویروں کے بجائے خود شہزادیاں شاہی محل "خورنق" کی زینت بن جاتی ہیں یہ مثنوی ۵۹۳ھ کی تصنیف ہے۔

۵۔ سکندر نامہ:۔ یہ مثنوی دو حصّوں پر مشتمل ہے ایک حصّے کا نام "اقبال نامہ" ہے اور دوسرے کا نام خرد نامہ "اقبال نامہ میں سکندر کی فتوحات کا ذکر ہے اور خرد نامہ میں اس کے علم و دانش کا بیان ہے سکندر نامہ کا سن تالیف ۵۹۰ ہجری ہے

نظامی کی مثنویاں توحید، نعت اور حکمت کے بیان سے شروع ہوتی ہیں حمد اور نعت لکھتے وقت شعر و فلسفہ کو کچھ اس طرح ملا دیتے ہیں کہ مضمون بلند اور باعظمت ہو جاتا ہے یہ خصوصیت آپ کی تمام مثنویوں میں نظر آتی ہے۔

نظامی نے یوں تو داستان سرائی کی ہے لیکن ساتھ ساتھ انہوں نے نہایت سودمند اخلاقی اور فلسفیانہ مسائل بھی بیان کئے ہیں بعض بعض جگہ اپنے بیٹے محمد نظامی کو خطاب کر کے نصیحتیں کی ہیں ان نصیحتوں کا انداز ایسا ہمہ گیر اور اثر خیز ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ بیٹے کا نام لے کر وہ نوع انسان کی نئی پود کو خطاب کر رہے ہیں۔

<u>خصوصیات شعری</u> ساقی نامہ:۔ جب کسی مے گسار کو نشے کی طلب ہوتی ہے تو

وہ ساقی کو پکارتا ہے نظامی کو جب بیان کا سوز نغمے پر اکساتا ہے تو وہ بھی ساقی سے شراب مانگتے ہیں لیکن نظامی کی شراب وہ نہیں جو انسان پر خود فراموشی کا عالم طاری کر دیتی ہے بلکہ ان کی شراب بھولی ہوئی باتوں کو یاد دلانے والی ہوتی ہے اس سے بیان کی قوت تیز اور استدراک کی قوت روشن ہوتی ہے نظامی کا ساقی ان کا اپنا تخیل ہے اور شراب کے جام ان کے افکار ہیں اس قسم کا شاعرانہ آغاز جس میں شاعر ساقی کو خطاب کر کے مضمون کی تمہید پیش کرتا ہے "ساقی نامہ" کہلاتا ہے نظامی ہی وہ شاعر ہے جس سے پہلے پہل ساقی نامہ لکھ کر فارسی ادب میں ایک نئی صنفِ سخن کا آغاز کیا چنانچہ آپ اکثر اپنے مضمون کا آغاز ساقی نامہ ہی سے کرتے ہیں۔

زورِ کلام: نظامی سے پہلے بالعموم مثنوی لکھنے کا انداز یہ تھا کہ شاعر واقعات کو سادگی کے ساتھ ادا کر دیتا تھا نظامی کسی واقعہ کو بیان کرتے ہوئے ایسے الفاظ تراکیب اور تشبیہات استعمال کرتے ہیں جن سے بیان باعظمت اور پرشکوہ ہو جاتا ہے

واقعہ نگاری: واقعہ نگاری نظامی سے پہلے بھی اکثر شعراء نے کی ہے لیکن آپ نے مظاہر کی تصویر کچھ اس انداز میں کھینچی ہے کہ ان کی حیات و حرکت بھی تصویر کے ساتھ ساتھ ہمیں محسوس ہونے لگتی ہے

تشبیہ و استعارہ: اکثر شعراء اپنے کلام میں ایسی تشبیہیں اور استعارات لاتے ہیں جن سے حالات و واقعات کی تصویر کھنچ جاتی ہے اور مضمون زیادہ بلند ہو جاتا ہے لیکن نظامی نے اس فن میں اور بھی جدت پیدا کی مثلاً ذیل کے شعر میں برفباری کا منظر پیش کیا ہے ؎

زبار یدن ابر کافور باد   سمن رستہ از دست ہای چنار

نظامی کی تشبیہوں میں نہ صرف یہ کہ ذوقِ نظارہ کی تسکین ہوتی ہے بلکہ قوتِ لمس بھی محفوظ ہوتی ہے مثلاً شیریں کے حوض میں نہانے کا بیان۔

نظامی تشبیہ کے ذریعہ حرکت و رفتار کا تصور بھی پیدا کر دیتے ہیں مثلاً شیریں کا آراستہ ہو کر خسرو کی طرف جانے کا بیان۔

جذبات نگاری:۔ قدما میں جذبات نگاری کی طرف جن شعراء نے اعتنا کیا ان میں فردوسی کا جواب نہیں لیکن فردوسی نے انہیں حالات سے متاثر ہو کر جذبات نگاری کی جو تیزی وضاحت سے اس کے سامنے تھے نظامی کی نظر جذبات کے ان دقیق اور عمیق پہلوؤں پر بھی گئی ہے جو عام نظر سے اوجھل ہیں۔

نظامی کی ہمہ گیری:۔ ایران کے متقدمین میں اقلیم سخن کے بڑے بڑے تاجدار گزرے ہیں لیکن کسی کی قدرت سخن سرائی میں نظامی کی طرح ہمہ گیری نہ تھی۔ فردوسی کا نام رزمیہ مثنوی شاہنامہ کی بدولت زندہ ہے، عشقیہ شاعری میں انہیں کمال حاصل نہیں ہو سکا۔ خیام نے صرف رباعی میں فلسفہ و حکمت کی ترجمانی کی اور کوئی صنفِ سخن انہیں اپنی طرف مائل نہ کر سکی۔ انوری اور خاقانی قصیدے کے استاد تھے لیکن کسی اور صنف سخن میں نہ چل سکے سعدی غزل اور اخلاقی شاعری کے بادشاہ ہیں لیکن رزمیہ نظم ان کے بس کی بات نہیں حافظ غزل سرائی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے لیکن مثنوی میں انہیں کوئی ملکہ حاصل نہیں ان کے برعکس نظامی ہیں کہ انہیں رزمیہ مثنوی میں فردوسی کے بعد سب سے اونچا مقام حاصل ہے عشقیہ مثنوی میں تو سارے ایران میں اب تک ان کا کوئی ثانی نہیں اور اخلاقی شاعری میں بھی ان کا اب تک نام لیا جاتا ہے۔

(ادب نامہ ایران مقبول بیگ بدخشانی)

شیخ فریدالدین عطّار

شیخ فرید الدین محمّد مشہور بہ عطار، جو صوفی شاعروں میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں نیشا پور میں پیدا ہوئے ان کی تاریخ ولادت قطعی طور پر معلوم نہیں بہرصورت وہ چھٹی صدی ہجری کے وسط یعنی خراسان کے سلجوقیوں کے آخری دور میں پیدا ہو چکے تھے اخبار اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ عطار نے بڑی لمبی عمر پائی تھی غالباً ان کی عمر ایک سو سال سے بھی اوپر تھی لیکن عطار کے دیوان میں ان کی عمر کے بارے میں ایک ہی بار ذکر ملتا ہے اور یہ ساٹھ یا ستر یا اس سے کچھ زیادہ سال کی عمر کا ذکر ہے چنانچہ ایک قصیدہ میں کہتے ہیں

؎ مدّت سی سال سودا پختہ ایم — مدّت سی سال دیگر سوختیم

عطار نے اپنی جوانی کا زمانہ علوم و معارف کی تحصیل، مشائخ کی خدمت، تہذیب نفس اور کسب علوم میں گذارا آخر میں وہ خود بھی مقام ارشاد پر فائز ہوئے اور اہل دل کا کعبہ بنے بعض تذکروں اور خود ان سے منسوب اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ عطار نے کافی سفر کئے تھے اور مصر، دمشق، ہندوستان، ترکستان اور مکہ کی سیاحت کی تھی۔ عطار کے لقب کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ دوا بیچا کرتے تھے۔ اور اسی ضمن میں بیماروں کا علاج بھی کرتے تھے چنانچہ مثنوی خسرونامہ میں کہتے ہیں

؎ بداروخانہ پانصد شخص بودند — کہ در ہر روز نبضم می نمودند

جسمانی امراض کے علاج سے انہیں فرصت ہوتی تو وہ روحانی مسائل کی طرف متوجہ ہوتے تھے اور معنوی اشعار لکھا کرتے تھے چنانچہ مصیبت نامہ اور الٰہی نامہ دو مثنویوں کے نظم کرنے کے بارے میں کہتے ہیں۔

مصیبت نامہ کاندوہ جہانست الٰہی نامہ کا سرار عیانست
بدار و خانہ کردم ہر دو آغاز چگویم زود رستم زیں و آں باز

تذکروں اور خود شیخ کی منثور اور منظوم تصانیف سے آشکار ہے کہ انہوں نے نہ صرف عارفوں کے حالات کی تلاش اور ان کے اسرار معلوم کرنے کی کوشش میں اپنی زندگی بسر کی بلکہ وہ تمام عمر طریق عرفان میں سلوک کی سیر کرتے رہے اور عشق الٰہی کی آگ میں جلتے رہے یہی وجہ ہے کہ عارف شاعروں کے امام مولانا جلال الدین انہیں اپنا بزرگ اور پیشوا مانتے ہیں اور ان کے مقابلے میں اپنے آپ کو ہیچ شمار کرتے ہیں فرماتے ہیں۔

ے ہفت شہر عشق را عطار گشت ما ہنوز اندر خم یک کوچہ ایم

عطار کی طبیعت نہایت رواں اور ان کی فکر نہایت بلند پرواز تھی چنانچہ انہوں نے نثر اور نظم میں کئی تالیفیں یادگار چھوڑی ہیں ان کی تصانیف کی تعداد لوگوں نے قرآن کی سورتوں کی تعداد کے برابر لکھی ہے بہر حال یہ مسلم ہے کہ شیخ نے بہت سی کتابیں لکھی تھیں کیونکہ کسی نے ان کی بسیار نویسی پر انہیں طعنہ دیا تھا اور ان پر بیہودہ گوئی کا الزام لگایا تھا اسی تنقید کے جواب میں اپنی طرف سے صفائی پیش کرتے ہیں

کسی کہ چوں منی را عیب جوی است ہمیں گوید کہ او بسیار گوی است
ولیکن چوں بسی دارم معانی بسی گویم تو مشتوی تو دانی

عطار نے ان مثنویوں کے سوا جن کا ذکر کیا جا چکا ہے پندنامہ، اسرارنامہ جواہر نامہ، شرح القلب، مختار نامہ وغیرہ کے نام سے اور بھی مثنویاں لکھی ہیں لیکن شیخ عطار کی سب سے بڑی یادگاروں میں اول ان کے قصائد اور غزلیات کا دیوان ہے جس میں دس ہزار کے قریب شعر ہیں دوم مثنوی منطق الطیر اور سوم تذکرۃ الاولیا۔ عطار کے دیوان میں جا بجا شور انگیز اور عارفانہ اشعار ہیں۔

سبک اور شاعری | شیخ عطار نے خراسان کے دوسرے شاعروں کی طرح قصائد بھی لکھے ہیں لیکن بنیادی طور پر ان قصیدوں میں دو فرق نمایاں ہیں ایک تو یہ کہ شیخ نے اپنے قصیدے میں تغزل سے کام نہیں لیا ہے اور یہ قطعی طور پر فرخی، عنصری اور منوچہری کے لحن و روش سے مختلف ہے ان کے کلام میں ان قصیدہ گو شاعروں کی سی پختگی اور استحکام ہے اور نہ یہ قصیدے ان قصیدہ گو شاعروں کے پایہ کو پہنچتے ہیں دوسرے یہ کہ ان قصیدہ گو شاعروں کے قصیدوں کا بڑا حصہ لوگوں کی مدح سرائی کے لئے وقف ہے لیکن عطار نے لوگوں کی مدح سرائی سے اپنا دامن بالکل پاک رکھا چنانچہ خود کہتے ہیں

ع :۔ بعمر خویش مدح کس نگفتم

عطار کے قصائد نعت اور پند و عرفاں کے لئے وقف نہیں ان میں عطار قرآن کی آیتوں پر تضمین کرتے ہیں عرفانی اور صوفیانہ غزل کی استادی میں سنائی کے سوا کوئی عطار پر سبقت نہ لے جا سکا اور اگرچہ سنائی نے بھی ان سے پہلے صوفیانہ اور شیریں غزلیں لکھی ہیں لیکن سوز و دلکشی اور اثر و جذ آفرینی کے لحاظ سے سنائی کا کلام ان کے پایہ کو نہیں پہنچتا اس فن میں عطار نہ صرف سب سے بڑے ماہر ہیں بلکہ ان کے بعد مولانا جلال الدین اور حافظ جیسے زبردست صوفی شاعروں نے انہیں اپنا نمونہ بنایا عطار کے دیوان میں شروع سے آخر تک آتش عشق سوز محبت اور شور و حرارت کے وہ مظاہر نظر آتے ہیں کہ اسے پڑھ کر صاحب دل قاری کے دل میں آگ سی لگ جاتی ہے عطار کی غزلیں ایسے مطالب اور معانی میں ایک سے بڑھ کر ایک بہتر اور شور انگیز ہیں ان کے وزن میں تنوع ہے اور انہوں نے عام طور پر دلکش اوزان اختیار کئے ہیں دیوان عطار کے اکثر اشعار ردیف پر ہیں اور ان میں قافیہ بہت کم ہے۔

اگرچہ عطار کا کلام پیچیدگی سے دور اور سادہ ہے اور انہوں نے معانی کے

مقابلہ میں الفاظ کی پرواہ نہیں کی ہے پھر بھی انہوں نے تشبیہوں کے موقع پر شعری صنائع، بلند پروازی اور نکتہ پردازی سے ضرور کام لیا ہے۔

عطار کے اشعار کا بڑا حصہ ان کی کئی مثنویاں ہیں ان میں سے بعض کے نام ہم ا... لے چکے ہیں ان سب میں صوفیانہ مضامین نظم کئے ہیں عطار کا طرز بیان اکثر مثنویوں میں بشمول منطق الطیر یہ ہے کہ صوفیانہ مطالب کو ادا کرنے کے لئے حکایتیں بیان کرتے اور تمثیل میں اپنا مقصود ادا کر دیا ہے اسی سبک کو مولانا جلال الدین رومی نے خاص طور پر اختیار کیا۔

عطار کی وفات کی تاریخ میں بڑا اختلاف ہے یقین سے صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ وہ ۶۱۸ھ میں زندہ تھے اور روایتوں کی رو سے ۶۲۷ھ میں مغلوں کے ہاتھوں شہید ہوگئے ان کی تربت نیشاپور کے جنوب میں بمقام شادیاخ موجود ہے

(تاریخ ادبیات ایران رضا زادہ شفق)

خواجہ صاحب بچپن سے درد آشنا تھے ان کے والد قطب الدین حیدر کے مرید تھے جو مشہور مجذوب گزرے ہیں اور ۵۹۷ھ تک زندہ رہے جبکہ خواجہ صاحب کی عمر ۴۲ برس کی تھی خواجہ صاحب نے بچپن ہی میں ان سے فیض حاصل کیا تھا لیکن چونکہ اسلام رہبانیت کو گوارا نہیں کرتا اسی وجہ سے حضرات صوفیہ کو ان کے مجاہدات اور ریاضتیں مشاغل دنیوی سے مانع نہیں آتیں اس لئے خواجہ صاحب نے باوجود فقر اور تصوف کے عطار خانہ اور مطلب کا تعلق قائم رکھا اور متعدد کتابیں اسی حالت میں تصنیف کیں یہ ممکن ہے کہ اخیر میں جذبہ محبت زیادہ بڑھا تو خود بخود اور چیزوں سے دل اچاٹ ہوگیا۔ اسی حالت میں فقیر کا واقعہ گزرا اور اس نے آگ پر روغن کا کام دیا خواجہ صاحب کی تحریروں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس عالم میں انہوں نے مدت تک سیاحی بھی کی۔

خواجہ صاحب نے اگرچہ بہت سے بزرگوں سے فیض اٹھایا تھا لیکن جیسا کہ دولت شاہ نے لکھا ہے خرقہ فقر مجدالدین بغدادی سے حاصل کیا تھا۔ مجدالدین بغدادی، قطب الدین خوارزم شاہ کے طبیب خاص تھے جس زمانہ میں چنگیز خاں دنیا کے مرقع کو زیر و زبر کر رہا تھا خواجہ صاحب نیشاپور میں تھے۔ نیشاپور کی غارتگری میں ایک مغل نے خواجہ صاحب نے پکڑ کر قتل کر دینا چاہا برابر سے ایک مغل بولا کہ ہزار روپے پر میرے ہاتھ بیچ ڈالو خواجہ صاحب نے مغل سے کہا کہ اتنی قیمت پر کبھی نہ بیچنا میرے دام بہت زیادہ ہیں ایک اور مغل آ نکلا اس نے کہا اس غلام کو میرے ہاتھ ایک تو برہ گھاس کے معاوضہ میں فروخت کر دو خواجہ صاحب نے گرفتار کرنے والے سے کہا ضرور بیچ ڈالو میری قیمت اس سے کہیں کم ہے خواجہ صاحب کی اس اختلاف بیانی کو وہ تمسخر سمجھا اور ان کو قتل کر ڈالا وہ اس نکتہ کو کیا سمجھ سکتا تھا کہ واقعی انسان سے بڑھ کر کوئی چیز گراں نہیں اور نہ اس سے بڑھ کر کوئی چیز ارزاں ہے۔ مغل نے خواجہ صاحب کو قتل کر دیا لیکن خواجہ صاحب کا خون خالی نہیں جا سکتا تھا۔ مغل کو ان کی عظمت کا حال معلوم ہوا تو توبہ کر کے ان کے مزار کا مجاور ہو گیا اور مرتے دم تک جدا نہ ہوا۔

خواجہ صاحب کی تصنیفات کی تفصیل یہ ہے۔ اسرار نامہ، الہٰی نامہ، مصیبت نامہ، جواہر الذات، وصیت نامہ، منطق الطیر، بلبل نامہ، حیدر نامہ، گل و ہرمز سیاہ نامہ، اشتر نامہ، مختار نامہ، ان کے علاوہ غزلوں اور رباعیوں کا دیوان ہے کل اشعار ایک لاکھ سے زیادہ ہیں فقرا کا تذکرہ لکھا ہے جو تذکرۃ الاولیاء کے نام سے مشہور ہے۔

صوفیانہ شاعری کے چار ارکان ہیں سنائی، اوحدی، مولانا روم اور خواجہ

فریدالدین عطار، خود مولانا روم باوجود ہم رنگی کے فرماتے ہیں ـــ

ع :- از پس سنائی و عطار آمدیم ـ

؎ ہفت شہر عشق را عطار گشت ما ہماں اندر خم یک کوچہ ایم

خواجہ صاحب نے تصوف کے جو خیالات ادا کئے ہیں وہ سنائی سے زیادہ دقیق نہیں لیکن زبان اس قدر صاف ہے کہ اس وصف کا گویا ان پر خاتمہ ہوگیا ہر قسم کے خیالات، اس بے تکلفی، روانی اور سادگی سے ادا کرتے ہیں کہ نثر میں بھی اس سے زیادہ صاف نہیں ہو سکتے ـ

اس کے ساتھ قوت تخیل بھی اعلیٰ درجہ کی ہے بہت سے نئے مضامین پیدا کئے ہیں ـ اور جو پہلے بندھ چکے ہیں ان کو ایسے نئے پہلو سے ادا کرتے ہیں کہ بالکل نیا مضمون معلوم ہوتا ہے مثلاً یہ مضمون کہ معلومم شد کہ ہیچ معلوم نشد ـ

سقراط، فارابی، بوعلی سینا الگ الگ طریقہ سے ادا کر چکے ہیں تاہم خواجہ صاحب اس کو بالکل صورت بدل دی فرماتے ہیں ؎

کاملی گفتہ است می باید بسی ! عقل و حکمت تا فزود گویا کسی

باز باید عقل بے حد و قیاس ! تا شود خاموش یک حکمت شناس

وحدت وجود کا مضمون حد سے زیادہ پامال ہو چکا تھا تاہم خواجہ صاحب کے پیرائے نئے ہیں ؎

پر شد از دوست ہر دو کون ولیک سوئے او زہرۂ اشارت نیست

خواجہ صاحب کا جو فلسفہ ہے وہ ذیل کے اشعار سے معلوم ہوگا

عبادت اور وحی کی حقیقت :-

روزہ حفظ دل است از خطرات پس بود باشاہ افطار

حج چہ باشد ز خود سفر کردن بہ کجا! جانب ہدایت کار

وحی چہ بود ہر آنچہ در دل تو   سرزند از نتائج اسرار

انسان اصل حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا:۔

ے وصل تو گنجی است ہم نہاں ز خود   ہر کہ گوید یافتم دیوانہ ایست

ے بیگانہ شدم از ہر دو عالم   واگرنہ کہ آشنائی من کیست

ے پیرہن یوسف است یک یک ذرات   یوسف ز میانہ ناپدید است چہ سود

وحدت وجود:۔

ے جہاں از تو پُر و تو در جہاں نہ   ہمہ در تو گم و تو در میاں نہ

ے دریں معنی کہ من گفتم شکی نیست   تو بی چیشی و عالم جز ہیچی نیست

شعرالعجم ۔ شبلی نعمانی

فرید الدین ابو حامد محمد بن ابوبکر ابراہیم بن اسحاق عطار کدکنی نیشاپوری ایران کی چھٹی صدی کے آخر اور ساتویں صدی کے شروع کے معروف و مشہور شعراء میں سے ہے اس کی کنیت ابو طالب کہی جاتی ہے اس کا سال ولادت دولت شاہ سمرقندی کے بقول ۵۲۷ھ، قاضی نور اللہ کے کہنے کے مطابق ۵۱۳ھ ہے مگر ہدایت نے ریاض العارفین اور مجمع الفصحا میں ۵۱۲ھ لکھا ہے۔ دولت شاہ کا بیان ہے کہ وہ شادیاخ کے شہر میں پیدا ہوا جیسا کہ ہمیں معلوم ہے حملۂ غزاں سے ۵۴۸ھ میں نیشاپور کا شہر ویران ہوگیا اور اس کے چند سال بعد نیشاپور کے دائیں جانب شادیاخ نے اس کی جگہ پائی اور اب جبکہ مغلوں کے حملہ نے اس (شادیاخ) کو برباد کردیا تو نیشاپور نے اپنی پرانی حیثیت حاصل کر لی۔ اس بنا پر عطار خواہ کدکن میں ہو یا شادیاخ میں ایک ہی بات ہے کیونکہ دونوں نیشاپور کے نزدیکی علاقے ہیں۔

اس کے ابتدائی حالات کے بارے میں زیادہ معلومات میسر نہیں سوائے اس کے کہ اس کا باپ شادیاخ میں عظیم القدر عطار تھا اس کی وفات کے بعد فریدالدین نے باپ کا کام سنبھالا اور مکان کو آراستہ کیا یہ امر ملحوظ رہے کہ عطاری سے مراد یہاں دارو فروشی ہے۔ عطار نے آغاز حیات میں ہی اپنے دارو فروشی کے کام کو جو طبی معلومات کا لازمی جزو ہیں حفظ کیا اور طبابت کے کام میں پوری سرگرمی دکھانی شروع کی چنانچہ اس نے خسرو نامہ میں کہا ہے

ے بمن گفت ای بمعنی عالم افروز — چنیں مشغول طب گشتی شب و روز

شیخ عطار ہدایت کے قول کے مطابق طب میں مجدالدین بغدادی (سلطان محمد خوارزمشاہ کے خاص حکیم) کا شاگرد تھا اسی دارو گری کے زمانے میں عطار کے تغیر احوال کا واقعہ پیش آیا اس حادثہ کے بارے میں مولانا جامی اس طرح رقمطراز ہیں کہ " کہتے ہیں اس کے توبہ کا سبب یہ تھا کہ ایک دن شیخ عطار اپنی دکان میں اپنے عطاری کے کام میں مشغول تھے کہ ایک درویش اس جگہ آیا اور چند بار "شیئ اللہ" کہا اس نے درویش کی طرف توجہ کی تو اس نے کہا کہ اے خواجہ تو کس طرح مرے گا! عطار نے کہا جس طرح تو مرے گا درویش نے کہا تو میری طرح مر سکتا ہے عطار نے کہا ہاں! درویش نے اپنا لکڑی کا پیالہ سر کے نیچے رکھا اور "اللہ" کہہ کر وہیں جان دے دی اس واقعہ سے عطار کا حال متغیر ہو گیا۔ دکان لٹا دی اور اس طریقہ (تصوف) پر چل نکلا "

دولت شاہ کا خیال ہے کہ شیخ عطار نے اس درویش کے حال کا مشاہدہ کر لیا اور شیخ الشیوخ العارف رکن الدین کے حلقہ عقیدت میں چلا گیا جو اپنے زمانہ کا مشہور عارف اور محقق تھا اس نے (شیخ عطار) نے شیخ رکن الدین کے ہاتھ پر بیعت کی اور مجاہدہ ریاضت میں مشغول ہوا چند سال تک درویشوں

کے حلقہ میں رہے۔

بہر حال شیخ عطار نے اپنی عمر کا کچھ حصہ سالکانِ طریقت کے راستے پر چلنے میں بسر کیا اور مکہ سے ماوراء النہر تک بہت سے مشائخ کی زیارت کی اور اسی سفر کے دوران مجدالدین بغدادی کی خدمت میں پہنچا شیخ عطار ایک باعمل انسان تھے عطاری کے زمانے میں بھی اپنی فعالی کا مظاہرہ کرتے رہے اور پھر آخری عمر میں جبکہ وہ گوشہ گیر تھے پورے طور پر فعل و عمل میں مصروف رہے انہوں نے بہت سی مثنویوں کو نظم کیا اس کے علاوہ غزلیات، قصائد، رباعیات کے دیوان اور دیگر نفیس اور عمدہ کتابوں کی تالیف میں سرگرم عمل رہے۔

دولت شاہ سمرقندی رقمطراز ہے کہ مثنوی کی کتابوں کے علاوہ اس کے دیوان کے اشعار کی تعداد چالیس ہزار ہے۔ اور ان میں بارہ ہزار رباعیات شامل ہیں تصوف اور طریقت کی کتابوں میں "تذکرۃ الاولیاء" لکھی وہ دیگر رسالے بھی شیخ عطار کے نام سے منسوب ہیں ان میں "اخوان الصفا" کا نام لیا جا سکتا ہے ان کی نظم کی کتابوں میں۔ اسرار نامہ، الٰہی نامہ، مصیبت نامہ، جواہر الذات، وصیت نامہ، منطق الطیر۔ بلبل نامہ، حیدر نامہ، شتر نامہ، مختار نامہ، شاہنامہ مشہور ہیں۔ کہتے ہیں انہوں نے چالیس رسالے نظم کئے تھے شیخ کے قصائد، غزلیات، قطعات اور رباعیات اور مثنویوں کے اشعار کا مجموعہ سو ہزار شعروں پر مشتمل ہے ان کے علاوہ دوسری نظم کی کتابیں مظہر العجائب حیلاج نامہ، لسان الغیب، مفتاح الفتوح اور بیر نامہ (بیسر نامہ) ہیں

شیخ عطار ایران کے بزرگ اور استاد صوفی شعراء اور تاریخ ادبیات ایران کے نامور لوگوں میں سے ہیں ان کا کلام نہایت سادہ ہے اس کے کلام میں سوز، عشق اور ذوق و شوق کی مستی موجود ہے ہمیشہ سالکان راہِ طریقت نے

حقیقت کے لئے شوق کا تازیانہ ضروری قرار دیا ہے اور وہ اس سے اپنے مقصود کی رہبری کا کام لیتے ہیں اس نے اپنے عارفانہ کلام کو اپنے عالی مقاصد کے حصول کے لئے بغیر کسی آرائش اور بناوٹ کے پیش کیا ہے۔ زبان و شعر میں جو ان کو قدرت حاصل ہے اس کی نظیر بہت کم ملتی ہے ان کی سادگی و روانی آب زلال کی مانند ہے اس کی دلکش اور نرم گفتاری عرفان کے جملہ حقائق کو دلوں میں جاگزین کر دیتی ہے۔

اس کے اشعار کا نمونہ یہ ہے۔

درد دل را دوا نمی دانم — گم شدم سر ز پا نمی دانم
ہر چہ از ماہ تا بماہی ہست — ہیچ از خود جدا نمی دانم
در راہ تو ہر کہ خاک در شد — در عالم عشق معتبر شد
گر سر عشق خواہی از کفر و دیں گذر کن — کانجا کہ عشق آمد چہ جای کفر و دین است
نور ایماں از بیاض روی اوست — ظلمت کفر از سر یک موی اوست

ہر چہ کہ آں برای ما خواہد بود — آں چیز ہمی بلای ما خواہد بود
چوں تفرقہ در بقای ما خواہد بود — جمعیت ما فنای ما خواہد بود

(تاریخ ادبیات در ایران ذبیح اللہ صفا)

محمد نام اور لقب فرید الدین ہے آپ کے والد ابو بکر ابراہیم کا پیشہ عطاری تھا چنانچہ آپ نے بھی معاش کا یہی وسیلہ اختیار کیا اسی لئے عطار کے نام سے مشہور ہوئے آپ مطب بھی کرتے تھے خواجہ عطار نیشاپور میں پیدا ہوئے رضا زادہ شفق لکھتے ہیں کہ آپ کی تاریخ پیدائش معلوم نہ ہو سکی لیکن کہا جا سکتا ہے

کہ چھٹی صدی ہجری کے وسط میں تولد ہوئے اور سو برس کی عمر پائی آپ کی مثنویوں میں ستر برس کے اشارے پائے جاتے ہیں۔

خواجہ عطار نے جوانی کے ایام میں اپنے والد کے مرشد قطب الدین حیدر سے اکتساب فیض کیا اور انہی کی رہنمائی میں تصوف کے مراحل طے کئے اہل تصوف ریاضتوں اور مجاہدوں کے ساتھ ساتھ دنیاوی امور کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیتے تھے اس لئے آپ نے دنیاوی مشاغل بھی جاری رکھے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے کوفہ، دمشق، مصر، ہندوستان اور ترکستان کی سیاحت بھی کی اور سفر کے دوران میں آپ صرف عارفوں کے حالات ہی کی جستجو نہیں کرتے تھے بلکہ خود بھی معرفت کی منزلیں طے کرتے تھے۔

پروفیسر براؤن مرزا محمد قزوینی کے حوالے سے خواجہ عطار کی کتاب .... مظہر العجائب" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کتاب سے آپ کے انتہائی شیعہ رجحانات کا پتہ چلتا ہے انہی رجحانات کی وجہ سے سمرقند کے ایک عالم نے کفر کا فتویٰ لگایا اور صرف اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ اس نے برقان ترکمان کے روبرو ان پر کفر کا الزام لگا کر انہیں جلاوطن کرنے کا مشورہ بھی دیا اس پر آپ مکہ معظمہ چلے گئے اور قیام مکہ کے دوران اپنی کتاب "لسان الغیب" تصنیف کی۔

خواجہ عطار کی وفات کے متعلق تذکرہ نویسوں میں اختلاف پایا جاتا ہے مگر اکثر کا اتفاق رائے ۶۲۷ پر ہے۔

خواجہ عطار کی طبیعت میں روانی اور فکر میں جولانی تھی چنانچہ نظم و نثر میں متعدد کتابیں آپ کی یادگار ہیں قاضی نور اللہ اپنے تذکرے "مجالس المومنین" میں لکھتے ہیں کہ خواجہ عطار کی کتابوں کی تعداد کلام مجید کی سورتوں کے برابر

ہے جو تعداد میں ایک سو چودہ ہیں - اس بیان میں کچھ مبالغہ ہے کیونکہ ان کی صرف تیس کتابوں کا پتہ چلتا ہے، ان میں مصیبت نامہ، الٰہی نامہ خسرو نامہ، پند نامہ، جواہر نامہ، شرح القلب، مظہر العجائب، لسان الغیب، مختار نامہ، دیوان، منطق الطیر اور تذکرۃ الاولیاء کا ذکر اکثر تذکروں میں ملتا ہے آپ کی آخری تین کتابیں خاص طور سے مشہور ہیں

تذکرۃ الاولیاء میں اولیاء کرام اور صوفیاء و مشائخ کے اخلاق و کردار اور سوانح حیات درج ہیں -

منطق الطیر ایک تمثیلی مثنوی ہے جو ۴۶۰۰ اشعار پر مشتمل ہے مثنوی کے آغاز میں اللہ تعالٰے کی حمد و ثنا، رسول اکرم کی نعت اور صحابہ کرام کی منقبت میں اشعار لکھے گئے ہیں مثنوی کے پینتالیس مقالے ہیں آخر میں ایک خاتمہ ہے مضمون پرندوں کے اجتماع سے شروع ہوتا ہے پرندوں کا خیال ہے کہ کوئی ملک بادشاہ کے بغیر خوش حال نہیں رہ سکتا ہم بھی بادشاہ کے بغیر امن و امان کی زندگی نہیں گزار سکتے سب کا خیال ہے کہ سیمرغ ہمارا بادشاہ ہے اس کی تلاش کرنی چاہیئے چنانچہ یہ پرندے ہدہد کو اپنا راہنما بناتے ہیں۔ ہُدہُد وعدہ کرتا ہے کہ وہ انہیں سیمرغ تک پہنچا دے گا بشرطیکہ سب راستے کی صعوبتیں برداشت کرنے کو تیار ہوں اکثر پرندے تلاش سے گھبراتے ہیں اور ان کا ساتھ دینے سے معذرت کرتے ہیں کچھ ایسے ہیں جو اس مسافرت میں تھک کر پیچھے رہ جاتے ہیں بہرحال صرف تیس پرندے سات ہولناک وادیوں میں سے گزرتے ہوئے سیمرغ کی بارگاہ میں پہنچتے ہیں لیکن جب وہ سیمرغ کے روبرو کھڑے ہو کر اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں تو انہیں معلوم ہوتا ہے کہ سیمرغ اور تیس پرندے ایک ہی چیز کے دو نام ہیں گویا جس حقیقت کو وہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے یہاں آئے تھے وہ ان کے باطن میں موجود تھی -

یہ ایک تمثیلی مثنوی ہے جس میں تیس پرندے تیس سالک ہیں اور سیمرغ ان

کا محبوب ہے سالکوں نے "طلب و جستجو" "عشق" "معرفت" "استغنا" "توحید" "حیرت" اور "فنا" کی سات وادیاں عبور کی ہیں۔ وادی فنا میں جا کر گویا تیس پرندے خود اپنی حقیقت پا لیتے ہیں

عطار کے دیوان میں خراسان کے دوسرے شعرا کی مانند قصائد بھی ہیں۔ لیکن عطار کے قصائد دوسرے شعراء کے قصائد سے دو صورتوں میں مختلف ہیں عطار کے قصیدوں میں تشبیب یا تغزل نہیں اور خراسانی مکتب خیال کے دوسرے شعرا، فرخی، عنصری، منوچہری کی سی پختگی بھی ان میں نہیں دوسرے یہ کہ خراسانی شعراء کے قصائد محض مدحت سرائی پر مشتمل ہوتے ہیں لیکن عطار نے مدحت سرائی کو ترک کر دیا ہے چنانچہ وہ خود کہتے ہیں۔

بعمر خویش مدح کس نگفتم   دری از بہر دنیا من نہ سفتم

عطار کے قصائد نعت اور پند و موعظت پر مشتمل ہیں ان موضوعات کو عطار نے آیات قرآنی سے مؤثر اور مزین کیا ہے قصائد میں دنیا کی ناپائیداری کا ذکر ہے اور انسان کو بیدار ہونے کی تلقین ہے

اس میں کلام نہیں کہ سنائی نے عطار سے پہلے صوفیانہ رنگ میں تشبیبیں کہیں لیکن سوز و گداز اور تحریک پیدا کرنے میں وہ عطار کے مرتبے کو نہیں پہنچتے اس فن میں عطار صوفی شعرا کے رہبر و رہنما ہیں عطار کا دیوان آتش عشق، سوز محبت اور نغمہ وحدت سے بھرپور ہے تصوف کے دقیق مسائل کے باوجود خواجہ عطار کی زبان سادہ اور رواں ہے اشعار میں کہیں ابہام یا پیچیدگی نہیں تشبیہات جو آپ استعمال کرتے ہیں بہت واضح اور شگفتہ ہیں مثلاً لالہ سرخ کو سوختہ دل عشاق یاسمن کو دلہن سے نرگس کو زرد رو عاشق سے غنچہ بے دہن کو ناوک چرخ گلستان سے تشبیہ دی ہے۔

(ادب نامہ ایران مقبول بیگ بدخشانی)

مغلوں اور تیموریوں کا دور

ایران پر مغلوں کا استیلا ساتویں صدی عیسوی ہجری کے اوائل میں ترکستان کی طرف سے چنگیز خاں کے حملہ سے شروع اور ایران میں اس کی اولاد کی تاسیس سلطنت پر ختم ہوا۔ چنگیز کی یہ اولاد ایران میں ایلخانوں کے نام سے آٹھویں صدی ہجری تک حکومت کرتی رہی مغلوں کے حملہ سے پہلے ہی سلجوقیوں کی سلطنت نے اپنی جگہ خوارزم شاہیوں کو دیدی تھی علاؤالدین محمد ثانی خوارزم شاہ جو اس سلسلہ کے مشہور سلاطین میں تھا مغلوں کے ہجوم میں گرفتار ہوا۔ میدان کارزار میں شکست کھائی اور سلسلہ خوارزم شاہی ۶۲۸ھ میں اس قوم کے ہاتھوں ختم ہوگیا۔

خوارزم شاہیوں کے معاصروں اور رقیبوں میں ایک اتابکان فارس بھی تھے جو خود بھی مغلوں کے استیلا سے دوچار ہوئے لیکن ان کی اطاعت کی اور دور اندیشی سے ان کو خراج پیش کر کے جنوبی ایران کو محفوظ رکھا آخرکار ۶۸۶ھ کے یہ بھی ختم ہو گئے۔

سلسلہ ایلخانی کا پہلا حکمران ہلاکو تھا اور اس سلسلہ کے مشہور سلاطین اباقاآن غازان اور اولجایتو تھے ایران میں غازان پہلا مغل سلطان تھا جس نے دین اسلام اختیار کیا۔

مغلوں کی سلطنت کے انقراض کے کوئی نصف صدی بعد تیموریوں نے جو اصلاً مغلوں کے قرابت دار ہیں ایران میں اپنی سلطنت کی بنیاد رکھی اور دسویں صدی ہجری کے اوائل یعنی صفوی خاندان کی ابتدا تک فرمانروائی کرتے رہے تیموریوں کے سلسلہ کے مشہور فرمانروا تیمور لنگ شاہ رخ، الغ بیگ اور ابوسعید تھے۔

مغلوں کی سلطنت کے انقراض کے بعد ایران کے مختلف حصوں میں دوسرے حکمرانوں کے چھوٹے چھوٹے سلسلے بھی وجود میں آئے جیسے جلایری، سربداری آئی کرت، مظفری اور قرہ قوینلو ان میں سے اکثر ایلخانوں کے انقراض اور تیمور کے ظہور کی درمیانی نصف صدی کے وقفہ یعنی آٹھویں صدی ہجری کے نصف دوم میں مختلف اقطاع ملک پر حکومت کرتے رہے۔

مغلوں کا فتنہ اور تیمور کا حملہ تاریخ کی ایک بہت بڑی مصیبت ہے جو نہ صرف ایران میں ظاہر ہوئی بلکہ اس نے ایشیا اور یورپ کے ایک بہت بڑے حصہ کو ویران اور پریشان کر دیا۔ شمالی ایران کے تقریباً تمام شہر اور ان کے ساتھ ہزاروں دیہات اور قصبات غارت و برباد ہوئے اور ان کے مکینوں کا قتل عام ہوا اس قتل و غارتگری اور بربادی کا اثر سب سے زیادہ ادبیات اور علوم پر پڑا نہ صرف بے شمار علماء و فضلا انتہائی عذاب دے دے کر مار ڈالے گئے بلکہ مساجد، مدارس، متبرک اور وقف عمارتیں اور کتب خانے جن میں علوم و آثار کے بے شمار خزانے تھے لوٹ اور غارتگری کے نذر ہو کر نیست و نابود ہو گئے اس مصیبت سے جو اہل علم کسی طرح بچ گئے وہ ادھر اُدھر فرار ہو کر روپوش ہو گئے ان مقامات میں علم و فضل کا نام و نشان تک باقی نہ رہا یہاں علم و معرفت کی جگہ وحشت و بربریت نے لے لی باوجود ہمہ اس سرزمین میں غارتگری اور فتنہ نمودار ہونے کے باوجود علمی آثار اور ادبیات ایران کامل طور پر زوال پذیر نہیں ہوئے بلکہ صدمات مغول کے پہلے دور کے بعد انہیں فرصت مل گئی اور وہ پھر پروان چڑھنے لگے بلکہ علوم کے بعض شعبوں میں خاص کر تاریخ میں مغول اور تیموری دور خاص امتیاز کا حامل ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ اس دور کے بعد نے ایران کی ادبی تاریخ میں اہمیت پیدا کر لی۔ اس تضاد کی پہلی وجہ یہ ہے کہ ایران میں تمدن علوم اور ادب کی بنیادیں سامانیوں کے عہد سے مضبوط ہوتے لگیں اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا ان میں پختگی کمال پیدا ہوتا گیا اس سرزمین کے ہر گوشہ سے سینکڑوں اہل دانش اٹھے اور اپنی تالیفات اور آثار

یادگار چھوڑ گئے اس تمام معنوی ذخیرہ کو جو صدیوں کی نہایت مستحکم اور استوار یادگار تھی ایک حملہ مغول سے جو ہر چند بہت شدید اور خونریز تھا بالکل نابود ہو جانا ممکن نہ تھا۔ کچھ کتابیں اور آثار اتفاقاً وحشی مغلوں کی نظر سے بچ رہے کچھ بعض دور از دست شہروں میں بھیج دیئے گئے اسی طرح چند بزرگ اور دانش مند جلاد مغلوں کے ہاتھ سے جان بچالے گئے اور خاص کر جنوبی ایران کے ملکوں میں جو اس غارت گر قوم کی تباہ کاریوں سے مامون تھے پناہ گزین ہوئے کچھ ہندوستان اور ایشیائے کوچک چلے گئے اور ان مقامات پر اطمینان کے ساتھ ایرانی ادبیات اور علوم و فنون کی نشر و اشاعت میں مشغول ہو گئے

دوسری وجہ یہ کہ اگرچہ ابتدا میں مغول اور تیمور سلاطین درندے اور آدم خور تھے لیکن ایران میں مقیم ہو جانے اور اس قوم کے افکار سے مانوس ہونے کے بعد ان کی ماہیت ہی بدل گئی تاخت و تار کی عادت اور حرص و آز کی خصلت بالکل چھوٹ گئی اور بتدریج اسلام اور ایران کے تمدن سے یہ آشنا ہونے لگے علماء و فضلا کی صحبت پسند آنے لگی اور اس میں سے بعضوں نے خود ہنر پیدا کیا اور اہل ہنر کی سرپرستی کی یہاں تک کہ بعض ایرانی اہل دانش کو جیسے خواجہ نصیر الدین طوسی، خواجہ شمس الدین محمد جوینی صاحب دیوان، اس کے بھائی عطا ملک جوینی اور رشید الدین فضل اللہ کو مشیر بنایا گیا یا وزارت اور امارت پر انہیں فائز کیا گیا ان میں سے ہر شخص نے اپنی جگہ اہل فضل کی سرپرستی اور حمایت کی خواجہ نصیر الدین طوسی کے حلقہ درس میں سینکڑوں شاگرد ہوتے تھے اس طرح وہ ایرانی اور اسلامی علوم و فضائل کی نشر و اشاعت کرتے تھے، اباقاخان کا وزیر صاحب دیوان علماء و فضلاء کا مربی تھا اور شیخ سعدی جیسے استاد نے اس کی مدح و تحسین کی ہے اس کا بھائی ملک عطا جوینی جسے مغل بادشاہ کی طرف سے حکومت

ملی یعنی علم و ادب کی خدمت میں ہمیشہ کمربستہ رہا۔ اصل میں خاندان جوینی ایرانی علوم کی نشر و اشاعت اور حسن خدمت میں ہمیشہ سے ممتاز رہا۔ غازان ... وزیر رشید الدین فضل اللہ کا شمار اس کے عہد کے بہترین علماء طبیبوں اور مورخوں میں ہوتا ہے اور یہ عقل و تدبیر میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا

پس یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ مغل اور تیموری عہد میں اتنی ویرانی اور پریشانی کے باوجود نامی گرامی علماء فضلا پیدا ہوئے نہ صرف یہ کہ درجہ اول کے ایرانی شاعر جیسے سعدی نے اس عہد میں شہرت پائی اور مولانا جلال الدین رومی، حافظ، جامی اور دوسرے مورخ، ادیب اور شاعر اس دور میں ظہور پذیر ہوئے بلکہ سرزمین ایران نے خود بعض مغولی اور تیموری شہزادوں اور امیروں کی ایسی تربیت کی کہ ان میں بھی صاحب ذوق لوگ پیدا ہونے لگے خود تیمور اپنی بے پناہ قساوت، خونخواری اور درشتی کے باوجود ادبیات اسلام و ایران کے معنوی لذائذ سے محظوظ ہوتا تھا۔ ادیبوں اور ظریفوں کی مجلسیں اسے پسند تھیں اس کی اولاد اور اس کے جانشین بھی کم و بیش صاحبان فضل و دانش کو دوست رکھتے تھے منجملہ ان کے الغ بیگ نے علماء کی سرپرستی کی، علم نجوم میں کافی مہارت حاصل کی اور زیچ تیار کی۔ الغ بیگ کا بھائی بایسنقر بھی خاص ادبی ذوق رکھتا تھا فارسی اشعار اور کتابوں کا نہایت ذوق شوق کے ساتھ مطالعہ کیا کرتا تھا اس کی مجلس میں ہمیشہ ایرانی شاعروں، مورخوں، خوشنویسوں اور نقاشوں کا مجمع رہتا تھا خوش نویسی میں خود استاد تھا اس کے علاوہ تیموریوں کی ہندی شاخ نے بھی ایرانی ادبیات کو رواج دیا۔ تیموری النسل بابر کے جانشینوں کے عہد میں ہندوستان فارسی ترجموں اور تالیفوں کا مرکز بن گیا۔

دوسرے حکمران خاندانوں میں بھی اہل فضل کچھ کم نہ تھے اتابکان فارس میں ابوبکر اور اس کا بیٹا سعد، سعدی کے سرپرست تھے اور جو اہل فضل

مغلوں کی یورش سے بھاگ کر ان کے پاس پناہ گزیں ہوئے تھے ان کی دلداری کرتے تھے۔ مظفریوں میں شاہ شجاع حافظ کا شیدائی تھا اور آل کرت میں فخرالدین نے اپنے پایۂ تخت کو ادیبوں کا مرکز بنا دیا تھا۔

اس عہد کا اہم ترین ادبی واقعہ ایران سے باہر فارسی زبان کا پھیلنا تھا کیونکہ ایرانی ادیبوں کی ہجرت اور بعض تیموری یا مغل سلاطین کے اثر سے ہمسایہ اور اطراف کے ملکوں اور خاص کر ہندوستان میں فارسی زبان رائج ہوگئی اور ان ملکوں میں فارسی زبان میں لکھنے والے مصنف اور شاعر پیدا ہوئے، ہندوستان میں فارسی زبان کے مشہور شعرا جیسے امیر خسرو فیضی، ظہوری دکنی اور عرفی شیرازی نے اسی عہد کے بعد شہرت حاصل کی ہندوستان سے گزر کر ترکی میں بھی ان شاعروں کی تقلید اور اتباع ہونے لگی اور اس طرح ان ملکوں میں فارسی زبان کی بہت بڑی خدمت کی گئی۔

لیکن افسوس کی بات ہے کہ عہد مغول و تیموری کے غیر فطری طرزوں نے فارسی زبان کو عموماً اور اس کی نثر کو خصوصاً مصنوعی اور غیر فطری بنا دیا سیدھی سادی اور شیریں نثر لکھنے کی قدیم طرز بالکل متروک ہوگئی بہت سے لکھنے والے لفاظی پر اتر آئے اور اپنے مطالب کو طول طویل استعاروں اشاروں اور کنایوں میں ادا کرتے لگے عبارت آرائی ہوتے لگی بے ضرورت عربی الفاظ استعمال ہونے لگے حشو و زوائد سے کام لیا جانے لگا بے ضرورت مغلق الفاظ اور عبارتیں، بے جا مغالطے اور نارواتشبیہیں رواج پاگئیں حتیٰ کہ تاریخی مطالب بھی اس لفاظی کے اصول کے ایسے تابع ہوگئے کہ ایک ذرا سے مطلب کے بیان کرنے کے لئے بڑی بڑی کتابوں کو بوجھل اور ثقیل عبارتوں سے پر کرنے لگے اگر تاریخ معجم یا تاریخ وصاف جیسی کسی کتاب کے دجو اس عہد کے اہم آثار میں ہے، پر تکلف طرز کا جس کی ایک مدت تک دوسرے مصنف تقلید کرتے رہے مثال کے طور پر تاریخ بیہقی سے مقابلہ کیا جائے تو ان دونوں کے اسلوب میں

زمین وآسمان کا فرق نظر آئے گا اور اس سے فارسی زبان کے سبک کا صریح تنزل واضح ہو جائے گا۔

یہ ظاہر ہے کہ اس طرز کو عمومیت حاصل نہیں ہوئی تھی بلکہ نظم ونثر میں لکھنے والوں نے اسی قبل مغول طرز کو پیش نظر رکھا تھا یا کم از کم دوسروں کی طرح ظاہر پیرادازی میں غرق نہیں ہوئے تھے اسی لئے فصیح وشیریں نظم ونثر لکھتے تھے گلستان اور تاریخ جوینی یا تاریخ وصاف اور جامع التواریخ جو سب کی سب ایک ہی عہد کی تصنیفیں ہیں ان کی طرزوں میں اختلاف کی وجہ یہی ہے

دور مغول کی نظم کے بارے میں کہنا چاہیئے کہ اسی دور نے عرفانی یا صوفیانہ شاعری کے مکمل نمونے پیدا کئے اور واقعہ یہ ہے کہ اسی عہد میں تصوف کے بہترین اور لطیف ترین معانی نے موزون فارسی عبارت کا قالب اختیار کیا اسی طرز میں کہنے والوں میں مشہور ترین حافظ، جامی اور خصوصاً جلال الدین رومی اسی عہد میں پیدا ہوئے اس مسلک کے زور پکڑنے کے عوامل میں شاید ایک مغلوں کا ظلم وستم، لوٹ وغارت گری بھی ہے کہ اس کی وجہ سے صاحب دلان ایران دنیا کے خارج کے اس ہنگامے سے رنجیدہ اور دل شکستہ ہو کر عالم داخلی کی طرف متوجہ ہوئے اسی کی معنویت پر غور وفکر کیا ریاضت کے ذریعہ تسلی خاطر حاصل کی اور عالم ظاہر کے آشوب کا بدل عالم باطن کے سکوت وسکون اور صفائی کے ذریعہ کیا۔

سعدی شیرازی

مشرف الدین مصلح بن عبداللہ سعدی شیرازی ایران کے آسمان ادب کا وہ درخشندہ ستارہ جس کی بدیع نظم ونثر نے فارسی زبان کو فصاحت کے درجہ کمال پر پہنچایا جس نے بلاغت کا بہترین نمونہ پیش کیا اور حقیقت میں اپنے اس شعر کے مطابق ؎

ہفت کشور نمی کنند امروز — بے مقالات سعد انجمنی

ہر زمانہ میں مقبول اہل ذوق وادب رہا

بوستاں کے ایک شعر کے مطابق جو سعدی نے ۶۵۵ھ میں تصنیف کیا اور کہا ہے

؎ الا اے کہ عمرت بہفتاد رفت — مگر خفتہ بودی کہ برباد رفت

ایسی صورت میں یہ شعر انہوں نے اپنے آپ سے خطاب کر کے کہا ہے، وہ ۵۸۵ھ میں پیدا ہوئے ہونگے اور ایک شعر کے مطابق جو گلستاں میں آیا ہے۔

ای کہ پنجاہ رفت ودر خوابی — مگر این پنج روزہ دریابی

گلستاں کی تالیف کے وقت یعنی ۶۵۶ھ میں اپنے آپ کو خطاب کر کے کہا ہے تو ان کی تاریخ ولادت ۶۰۶ھ کے لگ بھگ آتی ہے۔

تاریخی قرائن دوسرے مفروضے کو حقیقت سے بہت قریب کر دیتے ہیں اول تو یہ کہ کلیات سعدی میں سلطان فارس اتابک سعد زنگی (۵۹۱-۶۲۳ھ) کا ذکر نہیں ملتا حالانکہ شاعر اس خاندان سے منتسب تھا اور اس خاندان کے بادشاہوں کی مدح کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر سعد کے زمانے میں ابھی بالکل نوعمر جوان اور گمنام تھا دوسرے چونکہ سعدی کی وفات ۶۹۱ھ اور ۶۹۴ھ کے درمیان ہوئی اس لئے ان کی ولادت ۵۸۵ھ کی نسبت اوائل قرن

میں زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس طرح ان کی عمر سو سال سے بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

تیسرے یہ کہ سعدی گلستان اور بوستان میں ابوالفرج بن جوزی (متوفی ۶۵۶ھ)، شہاب الدین سہروردی (ابوحفص عمر بن محمد صاحب عوارف المعارف متوفی ۶۳۲ھ) جیسے استادوں اور واعظوں کا نام اس طرح لیتے ہیں جیسے ان لوگوں نے ان کو پند و نصیحت کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ بغداد میں ان بزرگوں کے ارشاد اور تدریس کے موقع پر ہمارے شاعر نے ان سے تلمذ کر کے اکتساب فیض کیا ہے اس وقت ان کی اٹھتی جوانی اور قرین قیاس یہ ہے کہ اس زمانے میں بیس بائیس سال سے زیادہ ان کی عمر نہ ہوگی۔

پس ان کی ولادت ۶۰۶ھ کے لگ بھگ ہوئی ہوگی اوائل جوانی ہی میں شاعر کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا چنانچہ کہتے ہیں ؎

مرا باشد از حال طفلاں خبر　　که در طفلی از سر برفتم پدر

سعدی کے اجداد اہل علم و دانش تھے اور علوم دینی میں شہرت رکھتے تھے۔ سعدی نے ابتدائی تعلیم شیراز میں حاصل کی اور اس کے بعد بغداد روانہ ہوئے اور یہاں مشہور مدرسہ نظامیہ اور دوسری علمی محفلوں میں کسب علوم و فضائل کیا۔ شوق جہانگردی کے سوا ان کا وطن ایران مغلوں کے ہجوم میں گرفتار اور فارس خوارزمشاہیوں اور اتابکوں کی اولاد کی کشمکش میں مبتلا تھا اس لئے ان کا دل اپنے وطن سے اچاٹ ہوگیا اور پھر انہوں نے جہانگردی شروع کر دی اور تیس سال سے چالیس سال کی مدت مسافرت ہی میں گزاری، بغداد شام اور مکہ سے لے کر شمالی افریقہ تک گھومتے رہے مختلف شہر اور گوناگوں ملتوں کو دیکھا مختلف مذاہب اور فرقوں سے واقف ہوئے اور مختلف طبقات انسانی سے اختلاط پیدا کیا۔ اس طولانی سفر اور آفاق و انفس کی سیر کے بعد ہمارا جہاندیدہ شاعر تجارب معنوی اور افکار عالیہ کی ایک دنیا لئے ہوئے شیراز واپس

ہوا اس زمانے میں یہاں اس کا ممدوح اور سرپرست اتابک ابوبکر بن سعد زنگی (۶۲۳ - ۶۶۸ھ) حکومت کرتا تھا اور ہر طرف امن وامان تھا چنانچہ کہتے ہیں

؎ چو باز آمدم کشور آسودہ دیدم   پلنگاں رہا کردہ خوی پلنگی
چناں بود در عہد اول کہ دیدی   جہانی پر آشوب وتشویش وتنگی
چنیں شد در ایام سلطان عادل   اتابک ابوبکر بن سعد زنگی

اس زمانے میں شاعر کو فراغت ہوئی اور اسے تصنیف وتالیف کا خیال آیا اپنے نغموں اور اپنے کلام کو جمع کیا بوستان اور گلستاں لکھی اور اپنے اشعار وقطعات کو مرتب کیا۔

سعدی ان خوش نصیب شاعروں میں تھے جنہوں نے اپنی زندگی میں بلکہ ابتدائے جوانی ہی میں اپنی شہرت کا غلغلہ سُنا اور ان کی یہ ناموری اتابک ابوبکر کے زمانے میں کمال کو پہنچی بوستان میں کہتے ہیں۔

؎ کہ سعدی کہ گوئی بلاغت ربود   در ایام بوبکر بن سعد بود

سعدی نے اسی زمانے میں یعنی ۶۵۵ھ میں بوستان نظم کی چنانچہ فرماتے ہیں ؎

ز ششصد فزوں بود پنجاہ وپنج   کہ من گفتم این نامبردار گنج

اس کے ایک سال بعد گلستان تصنیف کی اس کے مقدمہ میں کہا ہے ؎

دراں مدت کہ مارا وقت خوش بود   ز ہجرت ششصد وپنجاہ وشش بود

ان دو تصانیف کے سوا استاد کے قصائد، غزلیات، قطعات، ترجیع بند، رباعیات، مقالات اور عربی قصائد بھی ہیں جو ان کے دیوان کلیات میں جمع کر دئے گئے ہیں۔

سعدی نہ صرف ایران بلکہ تمام اسلامی ممالک اور تمام عالم علم وادب میں اپنے زمانے سے لے کر اب تک گنتی کے چند بڑے بڑے نامور شعرا میں شمار ہوتے ہیں ہر جگہ ان کے افکار اور اشعار شوق ورغبت کے ہاتھوں لئے اور عقیدت کی آنکھوں سے لگائے گئے ہیں یہاں تک کہ کتاب گلستان

سلاطین ہند اور سلاطین عثمانی کے درس میں رہی ہے اور ان ملکوں کے بادشاہ اور شہزادے اس کے اشعار از بر رکھتے تھے۔

سعدی کے سبک کی تقلید کیا نظم اور کیا نثر دونوں میں ایران کے بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے کی ہے نظم اور نثر میں کئی رسالے اور کئی کتابیں ان کے سبک کی پیروی میں لکھی گئی ہیں گلستاں کی طرز میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں جامی کی بہارستان، آٹھویں صدی کے شاعر مجد خوافی کی روضۂ خلد، معین الدین جوینی کی نگارستان اور قاآنی کی پریشان

اس عظیم المرتبت شاعر کی وفات ۶۹۱ھ ۶۹۴ھ کے درمیانی سالوں میں خود ان کے وطن شیراز میں ہوئی اور وہ اسی شہر میں دفن ہوئے۔

سبک و فکر

اگر ہم تاریخ ادبیات میں ایسے استادوں سے روشناس ہونا چاہتے ہوں جو ایک خاص سبک کے موجد ایک خاص مسلک کے بانی اور اپج وحدت کے مالک گزرے ہیں اور ان کی پیروی کی گئی ہے۔ تو ہمیں سعدی کا مطالعہ کرنا چاہیئے کیونکہ بغیر کسی تردید کے خوف کے کہا جاسکتا ہے کہ ایسے صاحبان کمال میں ایک سعدی شیرازی بھی ہیں۔

سعدی نے شعر کی تمام صنفوں میں طبع آزمائی کی ہے اور حق یہ ہے کہ وہ ہر صنف سے خوب عہدہ برآ ہوئے ہیں سعدی کے قصیدے متقدمین کے سبک میں ہیں لیکن ان سے زیادہ روشن، سادہ اور بے تکلف ہیں ان کا موضوع حمد، ثنا، پند و نصیحت مرثیہ اور مدح ہے۔

استاد شیراز کے قصائد میں جو نکتہ خاص طور پر قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے مدح میں متقدمین کی طرح کبھی تفصیل، اغراق اور مضمون آفرینی سے کام نہیں لیا بلکہ وہ خصوصیت جو سعدی کے قصائد کو ایک امتیاز خاص

بخشتی ہے اور اس حیثیت سے ان کو تمام گذشتہ شعراء پر فوقیت عطا کرتی ہے یہ ہے کہ وہ ایک نہایت شگفتہ اور دلپذیر انداز میں اپنے زمانے کے بادشاہوں اور امیروں کو عدل و نیکوکاری کی طرف متوجہ کرتے ہیں وہ ان کو زمانے کے انقلاب، جاہ وجلال کے زوال اور تغیر احوال پر متنبہ کرتے ہیں اور انہیں بیدار کرنے سے نہیں چوکتے اس طرح کی دلیرانہ نصیحت اس زمانے تک نہ صرف ادبیات ایران میں بلکہ تمام دنیا کی ادبیات میں اپنی نظیر نہیں رکھتی مثال کے طور پر مجدالدین حاکم شیراز، عطا ملک جوینی اور انکیانو کی مدح میں قصائد پیش کئے جا سکتے ہیں یہ بدیہی واقعہ ہے کہ اس استاذ ازل نے قدما کے اشعار کا مطالعہ کیا تھا ان کے سبک اور ان کے مضامین سے اچھی طرح استفادہ کیا تھا اور ان میں اپنی طرف سے نہایت خوب تصرف کیا قصیدہ جو ایک آدھ استثنا کے سوا سرتاسر مدح سرائی کے لئے وقف تھا اس کو انہوں نے پند و نصیحت اور ہدایت کا عنوان قرار دیا۔

شاعری میں سعدی کی دوسری امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے مدحیہ قصیدے کو جتنا نظر انداز کیا اتنی ہی غزل کو آرائش بخشی یہ صحیح ہے کہ ان سے پہلے بڑے بڑے شاعروں نے تغزل کے رنگ میں کہا تھا یا غزلیں لکھی تھیں لیکن یہ شعر رسمی تھے اور سب کے ..... پیش نظر وہی قصیدہ تھا غزل کو ضمنی اور ثانوی حیثیت حاصل تھی ادھر سعدی نے غزل کو اکثر احساسات کے تعبیر کا ذریعہ بنایا اور قصیدہ پر جسے انہوں نے ایک خاص مقصد کے لئے استعمال کیا اسے ترجیح دی، غزل کو رواج دیا اس میں عشق و ذوق، شور و شوق، تخیل کی بلند پروازی نکتہ پردازی اور مضمون آفرینی کو ایسے کمال کے ساتھ پیش کیا ہے کہ بلا مبالغہ سعدی اور ان کے بعض ہم عصروں کے ظہور کے بعد غزل فارسی کے اقسام شعر میں ردیف اول میں شمار ہونے لگی یہاں ان کی دو غزلوں سے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

مشنو ای دوست کہ غیر از تو مرا یاری ہست — یا شب و روز بجز فکر توام کاری ہست
عشق سعدی نہ حدیثی است کہ تنہا ماند — داستانیست کہ در ہر سر بازاری ہست

من ندانستم از اول کہ تو بی مہر و وفائی — عہد نابستن از آں بہ کہ بہ بندی و نپائی
داستان عیب کنندم کہ چرا دل بتو دادم — باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی
سعدی آں نیست کہ ہرگز ز کمندت بگریزد — تا بدانست کہ در بند تو خوشتر کہ رہائی

سعدی کا تیسرا امتیاز کہ اس میں بھی وہ پیشوا اور بے شبہ بے ہمتا ہیں وہ ان کی شیریں اور رواں نثر ہے جو ہر طرح ان کی نظم کی ہم پلہ ہے ان سے پہلے کسی نے ایسی نثر نہ لکھی سعدی کی نثر مسجع ہے اور اس کا سب سے اچھا نمونہ کتاب گلستان ہے جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایرانی ادبیات کا گل سرسبد ہے اس شاہکار تصنیف میں سعدی نے صنعت سجع کی خواب داد دی ہے انہوں نے الفاظ کے انتخاب حسن انتخاب حسن وزن اور تناسب کو فارسی عبارت میں خوب سجایا ہے ان کی عبارتیں آب رواں کی طرح رواں، آہنگ جاناں کی طرح جاذب شیریں، گوش نواز اور دلفریب نکلی ہیں جیسے۔

نہ ہر کہ بقامت مہتر بقیمت بہتر — تونگری بہ ہنر است نہ بمال۔ و بزرگی بعقل است نہ بہ سال —

سعدی کی وہ نثر جو گلستان میں اپنی بہار دکھا رہی ہے اس کی ایک خوبی عبارت کے ضمن میں موزوں اشعار اور شواہد کا لانا ہے جس سے ان کی بات میں ایک خاص اثر پیدا ہو جاتا ہے

چوتھے یہ کہ گلستان در حقیقت پند و نصیحت اور تہذیب و اخلاق پہ لکھی ہوئی کتاب ہے اور اس کی تمام حکایتوں اور مثالوں کا مقصد ادب، تربیت اور تہذیب نفس ہے استاد کا کمال یہ ہے کہ ان حقائق کو طول طویل استدلال اور

دیا ہے۔ پوری کتاب گلستان حسب ذیل آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔

(۱) در سیرت پادشاہاں (۲) در اخلاق درویشاں (۳) در فضلت قناعت

(۴) در فوائد خاموشی (۵) در عشق و جوانی (۶) در ضعف و پیری

(۷) در تاثیر صحبت (۸) در آداب صحبت

اس طرح پوری کتاب اجتماعی اخلاقی اور تربیت کے بہترین نکات سے مملو ہے اور یہ بھی ایک بڑی فضیلت ہے کہ اس کتاب کو عالمی ادب میں بلندترین مقام حاصل ہے کیونکہ اس کی ہر بات میں ایسے عمیق اور سودمند مطالب درج ہیں جن سے ہر شخص اپنی زندگی میں دوچار ہوتا ہے

کتاب بوستاں کا موضوع بھی تربیت ہے اس سے ظاہر ہے کہ سعدی اجتماعی اور اخلاقی مثنوی میں ماہر اور باکمال ہیں اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے سابقین جیسے شیخ عطار کے کام کو درجہ کمال پر پہنچا دیا ہے اور ایسے حقائق جو نہایت اہم اور سودمند ہیں حکایتوں کے پیرایہ میں بیان کر دئے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ استاد سعدی شیرازی کے آثار خواہ نظم میں خواہ نثر میں ایسے عقائد و افکار کے مظہر ہیں جو ان کی ایک عمر کے تجربہ، غور و فکر، آفاق و انفس کے مطالعہ سیر و سفر، مختلف قوموں اور ملتوں سے ملنے اور تاریخی واقعات کے مشاہدے سے حاصل ہوئے ہیں چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

در اقصای عالم بگشتم بسی   بسر بردم ایام با ہر کسی

تمتع ز ہر گوشۂ یافتم   ز ہر خرمنی خوشۂ یافتم

ایسے ہی گراں بہا تجربوں کو سعدی نے نہایت موزوں اور دلکش عبادت میں نہایت برجستہ حکایات و امثال اور اشعار کے پیرائے میں بیان کر دیا ہے اور اس طرح بیان کیا ہے کہ اس سے بہترین اخلاقی اور اجتماعی جھوٹوں کا ایک ایسا نفیس مجموعہ اور بہترین ادبی فارسی کا ایک ایسا نمونہ عالم وجود میں آیا ہے جس کا مطالعہ بدون تردید "متعلماں را بکار آید و مترسلان را بلاغت افزاید"

مصلح الدین لقب اور سعدی تخلص تھا ان کے والد اتابک سعد بن زنگی بادشاہ شیراز کے ملازم تھے اس تعلق سے شیخ نے سعدی تخلص اختیار کیا۔

سال ولادت معلوم نہیں وفات کی نسبت سب متفق ہیں کہ ۶۹۱ھ میں ہوئی عمر کی مدت عام تذکروں میں ۱۰۲ سال کی لکھی ہے۔ شیخ کے بچپن کے حالات اگرچہ کسی تذکرہ نویس نے قلمبند نہیں کئے لیکن خود شیخ کے بیانات سے بہت ہی دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ شیخ کے والد نے جب شیخ کو پڑھنے کے لئے بٹھایا تو لکھنے کی تختی، کاغذ اور ایک طلائی انگوٹھی خرید کر دی یہ اس وقت اس قدر کمسن تھے کہ کسی نے مٹھائی دے کر ان سے انگوٹھی اڑالی چنانچہ خود فرماتے ہیں

ز عہد پدر یاد دارم ہمی! — کہ باران رحمت برو ہر دمی
کہ در طفلیم لوح و دفتر خرید — ز بہرم یکی خاتم زر خرید
بدر کرد ناگہ یکی مشتری! — بہ شیرینی از دستم انگشتری

ان کے باپ ان کی تربیت اس طرح کرتے تھے جس طرح ایک عارف سالک مرید کو تزکیۂ نفس کی منزلیں طے کراتا ہے وہ بات بات پر ان کو ٹوکتے تھے اور ان کی غلطیوں پر تنبیہ کرتے تھے۔ - - - - - - - - -

- -

- - - - - - - اور کے اثر سے شیخ کو بچپن ہی میں زہد و عبادت کا چسکہ پڑ گیا تھا شیخ کے باپ نے ان کے بچپن ہی میں وفات پائی اور جس ناز و نعم سے پل رہے تھے وہ سامان جاتے رہے لیکن ان کی والدہ ان کی جوانی تک زندہ رہیں اور ان سے بھی ان کو اخلاقی سبق ملتے رہتے تھے گلستاں میں لکھا ہے:۔

"وقتی کہ از جہل جوانی بانگ بر مادر زدم، دل آزادہ بر کنجی نشست و گریاں ہمی گفت مگر خوردی را فراموش کردی کہ درشتی می کنی دبابِ ششم

شیراز میں اگرچہ تحصیل علم کا ہر قسم کا سامان مہیا تھا سیکڑوں علماء و فضلا درس وتدریس میں مشغول تھے اس کے علاوہ اتابک مظفر الدین تکلۂ بن زنگی المتوفی ۵۹۱ھ کا مدرسہ موجود تھا لیکن اس زمانہ میں تحصیل کمال کے لئے ممالک دور دراز کا سفر اور مشہور درسگاہوں میں حاضر ہونا لازمی امر خیال کیا جاتا تھا اس زمانہ میں سب سے بڑا مدرسہ جس کو یونیورسٹی کہہ سکتے ہیں نظامیہ بغداد تھا شیخ نے نظامیہ میں تحصیل علم شروع کی شیخ نے تحصیل علم سے فارغ ہو کر سیر وسیاحت شروع کی اور ایک مدت دراز تک سفر کرتے رہے جس کی مدت عام تذکرہ نویس ۳۰ برس لکھتے ہیں

شیخ کا شمار صوفیا کبار میں ہے اور بے شبہ وہ پاکیزہ باطن اور صاحب حال تھے لیکن ان کی مخصوص حالت یہ ہے کہ وہ اس رتبہ پر مجاہدہ اور ریاضت کے بعد پہنچے تھے ان کی اصل سرشت یہ نہ تھی بچپن سے شباب بلکہ ادھیڑ پن کے زمانہ تک ان میں وہ اوصاف نظر آتے ہیں جو مولویوں کا خاصا ہیں یعنی خود بینی حرف گیری مشاجرت و مخاصمت۔ باپ کی صحبت کے اثر سے بچپن میں عبادت کا ذوق وشوق پیدا ہو گیا تھا۔

شیخ نے چونکہ بیماریاں اٹھا کر صحت پائی تھی اس لیئے وہ امراض (اخلاقی) کی حقیقت، ماہیت، علامات اور طریق علاج سے جس قدر واقف ہو سکے دوسرا نہیں ہو سکتا تھا۔ شیخ کے مزاج میں ظرافت حد سے زیادہ تھی ایک دفعہ ایک مکان کرایہ پر لینا چاہتے تھے ایک یہودی پڑوس میں رہتا تھا اس نے کہا ضرور خرید لیجئے میں اس مکان کی حالت سے خوب واقف ہوں اس میں کوئی عیب نہیں شیخ نے کہا بجز اس کے کہ آپ اس کے ہمسایہ ہیں

شیخ کی شاعری | شریعت شعر کے تین پیغمبر ہیں ان میں ایک شیخ بھی ہیں۔

در شعر سہ تن پیغمبرانند۔   ہر چند کہ لا نبی بعدی

ابیات و قصیدہ و غزل را　　فردوسی و انوری و سعدی

ہر پیغمبر جداگانہ شریعت کا پیغمبر ہے شیخ کی پیغمبری کا صحیفہ غزل ہے خواجہ حافظ نے غزل کو معجزہ بنادیا ہم کہتے ہیں کہ ع

استاد غزل سعدی است پیش ہمہ کس اما

حضرت امیر خسرو دغرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ غزل میں سعدی کا پیرو ہوں لیکن اور اصناف سخن میں شیخ کی شاعری اس درجہ پر تسلیم نہیں کی گئی امیر خسرو شیخ کی غزل گوئی کی تعریف کر کے لکھتے ہیں۔

لیک اگر سعدی دگر بازی دست　　شعر شاں ہست بداں گونہ کہ ہست

شیخ پہلا شخص ہے جس نے فارسی شاعری کا صحیح استعمال کیا۔ سب سے بڑی چیز جو شیخ کی خصوصیات شاعری میں ہے آزادی ہے عرب کی شاعری کی یہی روح تھی جو عجم میں آکر گم ہو گئی تھی عرب کے شعراء سلاطین اور امراء کے متعلق ہر قسم کے خیالات نہایت آزادی سے ادا کرتے تھے شیخ کو کوئی دربار سے تعلق رہا ابوبکر سعد زنگی اس کا خاص ممدوح اور آقا تھا اٹکیانو جو خاندان اتابک کے خاتمہ کے بعد ہلاکو کے جانشین کی طرف سے شیراز کا گورنر تھا اس سے بھی شیخ کو تعلق رکھنا پڑتا تھا ان سب کے مقابلہ میں اس نے اپنی آزادی قائم رکھی ابوبکر بن سعد زنگی نے ہلاکو خاں کی اطاعت قبول کر لی تھی اور جب بغداد تاراج ہوا تو ابوبکر نے مبارکباد کے لئے سفارت بھیجی باایں ہمہ شیخ نے بغداد کی تباہی اور خلیفہ مستعصم باللہ کے قتل کا مرثیہ لکھا اور اس قدر پُراثر لکھا کہ لوگوں کے دل ہل گئے یہ مرثیہ درحقیقت ابوبکر بن سعد زنگی کی ہجو تھی کہ اس نے اسلام کی تباہی اور بربادی میں ہلاکو خاں کو ساتھ دیا شیخ نے اس مرثیہ میں ابوبکر کا بھی ذکر کیا اور ہجو ملیح کے طور پہ مدح کے پیرایہ میں چوٹ کی ہے

خسرو صاحبقراں غوث زماں بوبکر سعد　　آنکہ اخلاقش پسندیدہ ست و صافش گزیں

مصلحت بود اختیار رؤے روشن بین او　　　　زیردستاں را سخن گفتن نشاید جز چنیں

یعنی ابوبکر نے جو ہلاکو کی مدد کی تو اس میں کچھ مصلحت ہوگی۔

شیخ نے مدحیہ قصائد کو عرب کے قدیم انداز پر لانا چاہا اس نے سلاطین وامراء کی مدح میں بہت سے قصیدے لکھے ہیں لیکن ان کے صحیح اوصاف بیان کرتا ہے اور مبالغہ آمیز خیالات جو مدحیہ قصائد کے عنصر میں داخل ہوگئے تھے ان کو لغو بتاتا ہے۔

شیخ کی شاعری عموماً جذبات سے لبریز ہے وہ شاعری کی کسی صنف کو رسم اور تقلید کی حیثیت سے نہیں برتتا وہ جانتا ہے کہ شاعری کا اصلی عنصر جذبات ہیں اس لئے وہ اسی وقت شعر کہتا ہے جب اس کے دل میں کوئی جذبہ پیدا ہوتا ہے غزل اس وقت تک محض معشوق کی مداحی تھی شیخ نے اس میں عشق کے اصلی جذبات ادا کئے۔

اس وقت تک مرثیہ کا عام انداز یہ تھا کہ اشخاص کا مرثیہ لکھتے تھے قومی یا ملکی مرثیہ کا مطلق رواج نہ تھا شیخ سعدی پہلا شخص ہے جس نے قوم اور ملک کا مرثیہ لکھا عباسیوں کی سلطنت گو اب برائے نام رہ گئی تھی پھر بھی پانچ سو برس کی اسلامی یادگار تھی اور بغداد تمام اسلامی دنیا کا مرکز تھا اس لئے اس کا مٹنا قوم کا مٹنا تھا شیخ نے اس بنا پر خلیفہ بغداد اور سلطنت کا مرثیہ لکھا اور جس دل سے لکھا اس کا اندازہ ان اشعار سے خود کر سکتے ہو؎

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں　　　　بر زوال ملک مستعصم امیرالمومنین

ای محمد! گر قیامت سر بروں آری زخاک　　　　سر بروں آر و قیامت درمیاں خلق بیں

خون فرزنداں عم مصطفے اشد ریختہ　　　　ہم بر آں خاکے کہ سلطاناں نہادندی جبین

شیخ کے کمال شاعری کا اصلی معیار اس کا پیرایۂ ادا ہے اس سے زیادہ کوئی شخص اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتا کہ کس مضمون کے مؤثر کرنے کا سب سے بڑھ کر کونسا طریقہ ہے جن جن مضامین کو اس نے لیا ہے ان کو جس پیرایہ

میں ادا کیا ہے متقدمین اور متاخرین میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی - اسی کا نتیجہ ہے کہ اخلاق میں سینکڑوں ہزاروں کتابیں لکھی گئیں لیکن بوستان اور گلستان کے آگے کسی کا چراغ نہ جل سکا۔ مناظر قدرت کے مضامین میں بہار کا مضمون سب سے زیادہ پامال ہے اور اب تک پامال ہوتا آتا ہے لیکن شیخ کے قصیدہ کا اب تک جواب نہ ہو سکا مطلع ہے ؎

بامداداں کہ تفاوت نہ کند لیل و نہار　　خوش بود دامن صحرا و تماشای بہار

یہ مسلم ہے کہ شیخ غزل کے ابوالآبا ہیں قدماء تو سرے سے غزل کہتے ہی نہ تھے قصائد کے ابتداء میں عرب کے طرز پر جو تشبیب کہتے تھے یہی اس زمانہ کی غزل تھی متاخرین قدماء مثلاً انوری ظہیر وغیرہ نے قصیدہ سے الگ کر کے غزلیں لکھیں لیکن کسی قسم کا اثر اور کسی قسم کی خیال بندی اور نکتہ آفرینی نہ تھی البتہ چونکہ زمانہ کے امتداد سے قدرتی طور پر زبان خود بخود سادہ اور صاف ہو جاتی تھی اس لئے غزل کی صفائی اور سادگی بھی روز بروز ترقی کر لی جاتی تھی شیخ نے جو باتیں غزل میں پیدا کیں حسب ذیل ہیں -

۱- شیخ کے زمانہ سے پہلے جو شاعر گذرے وہ عشق کے زخم خوردہ نہ تھے ان میں سے بعض تو سرے سے عشق کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا - شیخ کے زمانہ میں قوم کے شجاعانہ جذبات فنا ہو چکے تھے اس لئے زندگی کا جو سہارا رہ گیا تھا یہی عشق و عاشقی تھی حسن اتفاق سے شیخ میں یہ جذبہ فطری تھا اور چونکہ وہ تمام عمر ہر قسم کے دنیوی تعلقات سے آزاد رہا اس لئے اس جذبہ کی گرمی اور تیزی اسی طرح مشتعل رہی -

گر دلی داری بہ دلداری سپار　　ضایع آں کشور کہ سلطانیش نیست
ماجرای عقل پرسیدم ز عشق　　گفت معزول است و فرمانیش نیست

(۲) شیخ سے پہلے عشق کے واردات اور معاملات نہیں کرتے تھے شیخ پہلا شخص ہے جس نے اس کی ابتدا کی ۔

مرا راحت از زندگی دوش بود　　　که آں ماہ رو در آغوش بود

(۳) شیخ کی غزلوں کے حسن قبول کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ جو خیالات ادا کرتا ہے عموماً وہ ہوتے ہیں جو عموماً عشاق اور ہوس پیشہ لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں

حدیث عشق اگر گوئی گناہ است　　　گناہ اول ز حوا بود و آدم

گر کند میل بہ خوباں دل من خوردہ مگیر　　　کیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

۴۔ شیخ پہلا شخص ہے جس نے غزل میں زاہدوں اور واعظوں کا پردہ فاش کیا ہے اور ریاکاری کی دقیق اور باریک کارسازیوں کی قلعی کھولی ہے

محتسب در قفای رنداں مست　　　غافل از صوفیاں شاہد باز

۵۔ مدح، ذم، رزم، مرثیہ، غرض جس قدر انواع مضامین ہیں اگرچہ ان پر ہزاروں بلکہ لاکھوں اشعار مل سکتے ہیں۔ لیکن اساس مضامین چند ہی ہوتے ہیں۔ شیخ کے بعد اگرچہ غزل کو بہت ترقی ہوئی اور خواجہ حافظ نے اس عمارت کو اسی قدر بلند کر دیا کہ طائر خیال بھی وہاں تک نہ پہنچ سکتا لیکن غور سے دیکھو تو اکثر مضامین اور طرز خیال کی داغ بیل شیخ نے ڈالی تھی۔

(۶) شیخ سے پہلے غزل میں جو مضامین ادا کئے جاتے تھے صاف صاف سرسری طور پر ادا کر دیتے تھے شیخ نے طرز ادا میں بہت سی جدتیں کیں اور بیان کے نئے نئے اسلوب پیدا کئے

ہیچ کس بے دامن تر نیست اما دیگراں　　　بازمی پوشند و ما بر آفتاب افگندہ ایم

(شعر العجم شبلی نعمانی)

ایلخانی فتنہ کے ہاتھوں جب سرزمین ایران بے گناہوں کے خون سے لالہ زار بنی عین اسی زمانے میں ایک ایسی نادرہ روزگار ہستی وجود میں آئی جس کے ادبی کارناموں نے اہل ایران کے مجروح دلوں پہ مرہم کا کام کیا یہ بزرگوار

ابیات و قصیدہ و غزل را — فردوسی و انوری و سعدی

ہر پیغمبر جداگانہ شریعت کا پیغمبر ہے شیخ کی پیغمبری کا صحیفہ غزل ہے خواجہ حافظ نے غزل کو معجزہ بنا دیا ہم کہتے ہیں کہ ع

استاد غزل سعدی است پیش ہمہ کس اما

حضرت امیر خسرو دغرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ غزل میں سعدی کا پیرو ہوں لیکن اور اصناف سخن میں شیخ کی شاعری اس درجہ پر تسلیم نہیں کی گئی امیر خسرو شیخ کی غزل گوئی کی تعریف کر کے لکھتے ہیں۔

لیک اگر سعدی دگر بازی دست — شعرشاں ہست بداں گونہ کہ ہست

شیخ پہلا شخص ہے جس نے فارسی شاعری کا صحیح استعمال کیا۔ سب سے بڑی چیز جو شیخ کی خصوصیات شاعری میں ہے آزادی ہے عرب کی شاعری کی بھی روح تھی جو عجم میں آکر گم ہو گئی تھی عرب کے شعراء سلاطین اور امراء کے متعلق ہر قسم کے خیالات نہایت آزادی سے ادا کرتے تھے شیخ کو کوئی دربار سے تعلق رہا ابوبکر سعد زنگی اس کا خاص ممدوح اور آقا تھا انکیانو جو خاندان اتابک کے خاتمہ کے بعد ہلاکو کے جانشین کی طرف سے شیراز کا گورنر تھا اس سے بھی شیخ کو تعلق رکھنا پڑتا تھا ان سب کے مقابلہ میں اس نے اپنی آزادی قائم رکھی ابوبکر بن سعد زنگی نے ہلاکو خاں کی اطاعت قبول کر لی تھی اور جب بغداد تاراج ہوا تو ابوبکر نے مبارکباد کے لئے سفارت بھیجی بایں ہمہ شیخ نے بغداد کی تباہی اور خلیفہ مستعصم باللہ کے قتل کا مرثیہ لکھا اور اس قدر پر اثر لکھا کہ لوگوں کے دل ہل گئے یہ مرثیہ درحقیقت ابوبکر بن سعد زنگی کی ہجو تھی کہ اس نے اسلام کی تباہی اور بربادی میں ہلاکو خاں کو ساتھ دیا شیخ نے اس مرثیہ میں ابوبکر کا بھی ذکر کیا اور ہجو ملیح کے طور پر مدح کے پیرایہ میں چوٹ کی ہے

نہ بر صاحبقراں عزت زماں بوبکر سعد — آنکہ اخلاقش پسندیدہ ست و صافش گزیں

زیردستاں راسخن گفتن نشاید جز چنیں　　مصلحت بود اختیار رئے روشن بین او

یعنی ابوبکر نے جو ہلاکو کی مدد کی تو اس میں کچھ مصلحت ہوگی۔

شیخ نے مدحیہ قصائد کو عرب کے قدیم انداز پر لانا چاہا اس نے سلاطین وامراء کی مدح میں بہت سے قصیدے لکھے ہیں لیکن ان کے صحیح اوصاف بیان کرتا ہے اور مبالغہ آمیز خیالات جو مدحیہ قصائد کے عنصر میں داخل ہوگئے تھے ان کو لغو بتاتا ہے۔

شیخ کی شاعری عموماً جذبات سے لبریز ہے وہ شاعری کی کسی صنف کو رسم اور تقلید کی حیثیت سے نہیں برتتا وہ جانتا ہے کہ شاعری کا اصلی عنصر جذبات ہیں اس لئے وہ اسی وقت شعر کہتا ہے جب اس کے دل میں کوئی جذبہ پیدا ہوتا ہے غزل اس وقت تک محض معشوق کی مداحی تھی شیخ نے اس میں عشق کے اصلی جذبات ادا کئے۔

اس وقت تک مرثیہ کا عام انداز یہ تھا کہ اشخاص کا مرثیہ لکھتے تھے قومی یا ملکی مرثیہ کا مطلق رواج نہ تھا شیخ سعدی پہلا شخص ہے جس نے قوم اور ملک کا مرثیہ لکھا عباسیوں کی سلطنت گو اب برائے نام رہ گئی تھی پھر بھی پانچ سو برس کی اسلامی یادگار تھی اور بغداد تمام اسلامی دنیا کا مرکز تھا اس لئے اس کا مٹنا قوم کا مٹنا تھا شیخ نے اس بنا پر خلیفہ بغداد اور سلطنت کا مرثیہ لکھا اور جس دل سے لکھا اس کا اندازہ ان اشعار سے خود کر سکتے ہو۔

بر زوال ملک مستعصم امیر المومنین　　آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

سر برہ دل آرد قیامت درمیاں خلق بیں　　ای محمد! گر قیامت سر بروں آری زخاک

ہم بر آں جائے کہ سلطاناں نہادندی جبیں　　خوں فرزنداں عم مصطفےٰ شد ریختہ

شیخ کے کمال شاعری کا اصلی معیار اس کا پیرایۂ ادا ہے اس سے زیادہ کوئی شخص اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتا کہ کس مضمون کے مؤثر کرنے کا سب سے بڑھ کر کونسا طریقہ ہے جن جن مضامین کو اس نے لیا ہے ان کو جس پیرایہ

میں ادا کیا ہے متقدمین اور متاخرین میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی - اسی کا نتیجہ ہے کہ اخلاق میں سینکڑوں ہزاروں کتابیں لکھی گئیں لیکن بوستان اور گلستان کے آگے کسی کا چراغ نہ جل سکا۔ مناظر قدرت کے مضامین میں بہار کا مضمون سب سے زیادہ پامال ہے اور اب تک پامال ہوتا آتا ہے لیکن شیخ کے قصیدہ کا اب تک جواب نہ ہوسکا مطلع یہ ہے ؎

بامداداں کہ تفاوت نہ کند لیل و نہار خوش بود دامن صحرا و تماشای بہار

یہ مسلم ہے کہ شیخ غزل کے ابوالآبا ہیں قدماء تو سرے سے غزل کہتے ہی نہ تھے قصائد کے ابتداء میں عرب کے طرز پر جو تشبیب کہتے تھے یہی اس زمانہ کی غزل تھی متاخرین قدماء مثلاً انوری ظہیر وغیرہ نے قصیدہ سے الگ کر کے غزلیں لکھیں لیکن کسی قسم کا اثر اور کسی قسم کی خیال بندی اور نکتہ آفرینی نہ تھی البتہ چونکہ زمانہ کے امتداد سے قدرتی طور پر زبان خود بخود سادہ اور صاف ہو جاتی تھی اس لئے غزل کی صفائی اور سادگی بھی روز بروز ترقی کر لی جاتی تھی شیخ نے جو باتیں غزل میں پیدا کیں حسب ذیل ہیں -

۱- شیخ کے زمانہ سے پہلے جو شاعر گذرے وہ عشق کے زخم خوردہ نہ تھے ان میں سے بعض تو سرے سے عشق کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا - شیخ کے زمانہ میں قوم کے شجاعانہ جذبات فنا ہو چکے تھے اس لئے زندگی کا جو سہارا رہ گیا تھا یہی عشق و عاشقی تھی حسن اتفاق سے شیخ میں یہ جذبہ فطری تھا اور چونکہ وہ تمام عمر ہر قسم کے دنیوی تعلقات سے آزاد رہا اس لئے اس جذبہ کی گرمی اور تیزی اسی طرح مشتعل رہی -

گر دلی داری بہ دلداری سپار ضائع آں کشور کہ سلطانیش نیست

ماجرای عقل پرسیدم ز عشق گفت معزول است و فرمانیش نیست

(۲) شیخ سے پہلے عشق کے واردات اور معاملات نہیں کرتے تھے شیخ پہلا شخص ہے جس نے اس کی ابتدا کی -

؎ مرا راحت از زندگی دوش بود — کہ آں ماہ رو در آغوش بود

(۳) شیخ کی غزلوں کے حسن قبول کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ جو خیالات ادا کرتا ہے عموماً وہ ہوتے ہیں جو عموماً عشاق اور ہوس پیشہ لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں ؎

حدیث عشق اگر گوئی گناہ است — گناہ اول زحوا بود و آدم

؎ گر کند میل بہ خوباں دل من خردہ مگیر — کیں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

۴۔ شیخ پہلا شخص ہے جس نے غزل میں زاہدوں اور واعظوں کا پردہ فاش کیا ہے اور ریا کاری کی دقیق اور باریک کارسازیوں کی قلعی کھولی ہے

؎ محتسب در قفای رنداں ست — غافل از صوفیاں شاہد باز

۵۔ مدح، ذم، رزم، مرثیہ، غرض جس قدر انواع مضامین ہیں اگرچہ ان پر ہزاروں بلکہ لاکھوں اشعار مل سکتے ہیں۔ لیکن اساس مضامین چند ہی ہوتے ہیں۔ شیخ کے بعد اگرچہ غزل کو بہت ترقی ہوئی اور خواجہ حافظ نے اس عمارت کو اسی قدر بلند کر دیا کہ طائر خیال بھی وہاں تک نہ پہنچ سکتا لیکن غور سے دیکھو تو اکثر مضامین اور طرز خیال کی داغ بیل شیخ نے ڈالی تھی۔

(۶) شیخ سے پہلے غزل میں جو مضامین ادا کئے جاتے تھے صاف صاف سرسری طور پر ادا کر دیتے تھے شیخ نے طرز ادا میں بہت سی جدتیں کیں اور بیان کے نئے نئے اسلوب پیدا کئے ؎

ہیچ کس بے دامن تر نیست اما دیگراں — بازمی پوشند ما بر آفتاب افگندہ ایم

(شعر العجم شبلی نعمانی)

ایلخانی فتنہ کے ہاتھوں جب سرزمین ایران بے گناہوں کے خون سے لالہ زار بنی عین اسی زمانے میں ایک ایسی نادرہ روزگار ہستی وجود میں آئی جس کے ادبی کارناموں نے اہل ایران کے مجروح دلوں پہ مرہم کا کام کیا یہ بزرگوار

ہستی شیخ سعدی علیہ الرحمۃ ہیں۔

شیخ سعدی شیراز میں پیدا ہوئے سال پیدائش کسی قدیم تذکرہ نویس نے نہیں لکھا ایران کے ایک جدید تذکرہ نویس احسان معتقد لکھتے ہیں کہ سعدی تقریباً ۵۸۰ ہجری میں پیدا ہوئے لیکن اگر ان کی وفات جیسا کہ تذکرہ نویس لکھتے ہیں ۶۵۰ ہجری کے لگ بھگ ہوئی ہو تو ان کی عمر ایک سو ستر سال ہوتی ہے اس سلسلے میں آپ کے بعض اشعار ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ ان کی رو سے آپ کا سال ولادت ۶۰۶ ہجری ہے۔

احسان معتقد نے بعض دوسرے تذکرہ نویسوں کے مطابق آپ کا نام مصلح الدین لکھا ہے لیکن پروفیسر براؤن نے آپ کا نام شرف الدین بن مصلح الدین عبداللہ لکھا ہے شفق نے بھی آپ کا نام مشرف الدین ہی لکھا ہے اس لئے یہی نام درست سمجھنا چاہیئے۔

آپ کا خاندان علم و فضل کی وجہ سے مشہور تھا اس خاندان کے اکثر افراد علماء دین تھے جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں ؂

ہمہ قبیلۂ من عالماں دین بودند　　مرا معلم عشق تو شاعری آموخت

آپ نے ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی لیکن یہ سلسلہ دیر تک قائم نہ رہ سکا کیونکہ آپ بچپن میں ہی پدری محبت سے محروم ہو گئے والد کی وفات کے بعد آپ نے شیراز کے علماء سے تحصیل علوم کی۔ اس زمانے میں طالب علم کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ تعلیم کے سلسلے میں دور دراز کا سفر بھی کرے چنانچہ آپ شیراز سے چل کے بغداد پہنچے اور ابن جوزی ایسے مشہور استاد سے منتہاء تعلیم کی، ان کے علاوہ یگانہ روزگار عارف شیخ شہاب الدین سہروردی سے بھی کسب فیض کیا۔

شیخ سعدی کے سینے میں بے چین اور بیقرار دل تھا اس لئے آپ ایک جگہ کے قیام پر مطمئن نہ ہو سکتے تھے تعلیم سے فراغت پاکر آپ نے سیر و سیاحت

شروع کی۔ آپ نے دوران سیاحت کے طویل عرصہ میں چودہ حج کئے۔ سعدی کی سیاحت کے دوران میں کئی نامور خاندان صفحہ ہستی سے ناپید ہوئے۔ سلجوقیوں اور خوارزمشاہیوں کے مابین جنگیں ہوئیں جن کی وجہ سے دونوں حکومتیں کمزور ہو گئیں خوارزمشاہوں کی سلطنت آخر تاتاریوں کے ہاتھوں ختم ہوئی۔ اسکندریہ اور دمشق میں قحط پڑا ؎

چناں قحط سالی شد اندر دمشق　　کہ یاراں فراموش کردند عشق

شیراز جو سعدی کا وطن تھا اسی زمانہ میں بارہا قتل و غارت سے دوچار ہوا یہ تمام حادثات اس کی زندگی میں ظہور پذیر ہوئے جس سے آپ بہت متاثر ہوئے۔

آپ کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ آپ مختلف حیثیات کا مجموعہ تھے حسن پرست تھے، زاہد تھے، رند تھے، واعظ تھے عابد شب زندہ دار تھے اس لئے انہوں نے دنیا کو ہر نظر سے دیکھا۔ طویل سیاحت میں سعدی نے خصائل انسانی اور زمانے کی نیرنگیوں کا مطالعہ کرنے میں عمر صرف کر دی یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنے کلام میں اخلاق انسانی کی نہایت مؤثر تصویر کشی کی ہے

سعدی کے طویل عرصہ وطن سے باہر رہنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ شیراز اور گرد و نواح کے علاقوں میں امن و امان نہ تھا یہ زمانہ سعد زنگی کی حکومت کا تھا ٦٢٢ ہجری میں وہ فوت ہوا تو عنان حکومت اس کے بیٹے سعد بن زنگی نے سنبھالی اس حکمران نے تاتاریوں سے مصالحت کرکے فارس کو قتل و غارت سے بچا لیا اور ایک مرتبہ پھر اہل فارس کو سکھ نصیب ہوا سعدی نے سُنا، تو اس کے قلب مجروح کو بڑی تسکین ہوئی وطن کی محبت آخر کار ٦٦٥ ہجری آپ کو فارس کے دارالسلطنت شیراز میں لے آئی۔ اور وہیں سنہ ٦٩١ ہجری میں وفات پائی۔ آپ کا مزار "سعدیہ" کے نام سے موسوم ہے ؎

بعد از وفات تربت ما در زمین مجو　　در سینہ ہای مردم عارف مزار ماست

سعدی کی مشہور آفاق تصانیف گلستان اور بوستاں ہیں ان کے علاوہ کلیات بھی آپ کی یادگار ہے۔ کلیات عربی فارسی قصائد، مراثی، ملمعات غزلیات، خطابات اور ہزلیات پر مشتمل ہے آپ نے عطار کے طرز پر پند نامہ بھی تالیف کیا۔

جس طرح شاہنامہ فردوسی رزم مثنوی معنوی تصوف و عرفان میں بے مثال ہیں اسی طرح بوستان علم اخلاق میں اپنی مثال آپ ہے بوستاں ۶۵۵ھ میں لکھی گئی۔ بوستاں میں اخلاقی مسائل نہایت سہل اور موثر انداز میں بیان کئے گئے ہیں مزید وضاحت کے لئے دلچسپ حکایتیں بھی لکھی ہیں جن کی وجہ سے آپ کے پند و نصائح دلوں پر دیرپا اثر چھوڑ جاتی ہیں "بوستان" حمد اور نعت سے شروع ہوتی ہے اس کے بعد دس باب ہیں۔

سعدی غزل کے امام سمجھے جاتے ہیں متقدمین الگ غزل تو نہیں کہتے تھے لیکن قصیدہ کے شروع میں محبوب کو خطاب کر کے چند عشقیہ اشعار لکھتے تھے جن میں حسن و شباب کا ذکر ہوتا تھا انہی اشعار کو تشبیب یا غزل کہتے تھے سعدی سے پہلے انوری اور ظہیر فاریابی نے قصیدے سے الگ بھی غزلیں لکھیں لیکن ان میں بھی قصیدے ہی کی شان پائی جاتی تھی اگر چہ ان کی زبان قصیدے کی طرح پرشکوہ نہیں بلکہ غزل کی طرح لطیف ہوتی تھیں حکیم سنائی اور مولانا روم نے بھی غزلیں کہیں لیکن ان کا موضوع غزل، تصوف، معرفت حق اور عشق حقیقی ہے سب سے پہلے شاعر سعدی جنہوں نے غزل کو صحیح معنوں میں غزل بنایا آپ نے غزل میں ذیل کی چند نئی باتیں پیدا کیں۔

(۱) ذاتی جذبات :- سعدی کی غزلیات میں ذاتی جذبات کا عکس جھلکتا نظر آتا ہے معلوم ہوتا ہے جو کچھ کہتے ہیں آپ بیتی کہتے ہیں اسی وجہ سے ان کی غزلیات شوروستی اور رقت احساس کی مظہر ہیں نمونہ کے لئے یہ غزل میں کا مقطع مندرجہ ذیل ہے۔

سعدی از جور فراقت بہ روزیں می گفت ؎ عہد شکستی و من بر سر پیماں بودم

(۲) سعدی سے پہلے غزل میں عاشقانہ مضامین بڑے انداز سے ادا کئے جاتے تھے لیکن آپ یہ مضامین بڑی جدت سے ادا کرتے ہیں۔ معمولی سے مضامین آپ کے اسلوب بیان سے بہت بلند ہو جاتے ہیں ؎

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم ؎ باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

(۳) سعدی محض شاعر ہی نہیں بلکہ بینا دل عارف بھی ہیں چنانچہ بعض غزلیں آپ نے تصوف و عرفاں کے بیان میں لکھی ہیں جن کو پڑھ کر اہل حال و قال پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ایک عارفانہ غزل کا مقطع دیکھئے ؎

سعدیا گر بکند سیل فنا خانۂ دل ؎ دل قوی دار کہ بنیاد بقا محکم از وست

(۴) سعدی نے اخلاقیات کو موضوع بنا کر بھی غزلیں کہی ہیں یہ غزلیں محض پند و موعظت کا مرقع نہیں بلکہ ان میں احساس آدمیت کو ابھارا گیا ہے۔

ہمہ عیب خلق دیدن نہ مروت است و مردی ؎ نگہی بخویشتن کن کہ تو ہم نگاہ داری

سعدی ایک آزاد خیال شاعر تھے وہ جو خود محسوس کرتے شعر میں ادا کر دیتے اس لئے ان کی جبیں کسی کی چوکھٹ پر نہیں جھکی انہوں نے قصیدے تو کہے ہیں لیکن یہ تملق اور خوشامد سے قطعاً پاک ہیں ان میں پند و نصائح کا عنصر غالب ہوتا ہے ان قصائد میں گویا انہوں نے بے ثباتی دنیا، ہمدردی خلائق اور اصلاح نفس پر زور دار وعظ کئے ہیں

آپ نے یہ قصائد دنیاوی منفعت کے خیال سے نہیں کہے بلکہ محض اخلاقی ضروریات کے پیش نظر کہے ہیں چنانچہ وہ خود کہتے ہیں ؎

از من نیاید آنکہ بدہقاں و کدخدائی ؎ حاجت برم کہ کار گدایاں خرمن است

سعدی کی ایک خصوصیت جو انہیں دوسرے قصیدہ گو شعرا سے ممتاز کرتی ہے بیان کی سادگی اور صفائی ہے سعدی سے پہلے قصیدے کا کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ الفاظ پر شکوہ ہوں اور تعریف و توصیف میں زیادہ سے زیادہ مبالغہ

اور اغراق سے کام لیا جائے لیکن سعدی وہ پہلے شاعر ہیں۔ جنہوں نے قصیدے میں بھی اپنی ایک نئی راہ نکالی ہے ان کی توجہ الفاظ و تراکیب پر نہیں بلکہ معانی و بیان کی طرف ہوتی ہے جو کچھ کہنا چاہتے ہیں واضح طور پر سیدھے سادے الفاظ میں کہہ دیتے ہیں لیکن لطف یہ ہے کہ ان کی سادگی بیان بہت دل کش اور مؤثر ہوتی ہے۔

سعدی نے عام شعراء کی طرح مرثیے بھی کہے ہیں لیکن مرثیہ گوئی میں بھی ایک نئی بات پیدا کی ہے آپ وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے فرد کا مرثیہ لکھتے وقت پوری قوم کی نوحہ خوانی کی ہے خلفائے عباسیہ کی حکومت اگرچہ اب برائے نام رہ چکی تھی لیکن یہ پانچ سو سال کی ایک عظیم اسلامی یادگار تھی جس کے ڈنکے ایشیا اور یورپ میں بجتے تھے۔ بغداد اس کا دارالسلطنت تھا جو اسلامی علوم و فنون کا مرکز رہ چکا تھا اس لئے ہلاکو کے ہاتھوں اس جلیل القدر حکومت کا تباہ ہونا بہت بڑا قومی حادثہ تھا سعدی نے اس حکومت کے آخری تاجدار خلیفہ مستعصم باللہ کا مرثیہ لکھا گویا پوری قوم اور ملک کا مرثیہ لکھا ؎

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمین بر زوال ملک مستعصم امیر المومنین

(ادب نامہ ایران مقبول بیگ بدخشانی)

مولانا جلال الدین رومی

ایران کے سب سے بڑے صوفی شاعر مولانا جلال الدین فرزند سلطان العلماء بہاؤالدین محمد بن حسین الخطیبی ۶۰۴ھ میں بمقام بلخ پیدا ہوئے. بلخ ایک عرصہ دراز سے ایرانی ادبیات، لغت اور عقائد کے مراکز میں شمار کیا جاتا تھا۔ آپ کے والد حسب روایت علاؤالدین خوارزم شاہ کے داماد تھے۔ اپنے زمانے کے بہت بڑے عارفوں اور علماء میں شمار ہوتے تھے اور شیخ نجم الدین کبریٰ کے خلیفہ تھے خوارزم شاہ کے پاس آپ کو بڑا تقرب حاصل تھا لیکن کہتے ہیں کہ آپ کے مواعظ، شہرت اور اثر ونفوذ کی وجہ سے وہ آپ کا دشمن ہوگیا، تصوف کے مخالف بھی آپ کو تکلیف دینے لگے اور بلخ کے باشندے بھی آپ کے درپے آزار ہوگئے مجبوراً آپ نے ہجرت کا ارادہ کیا اور اپنے صاحبزادے جلال الدین کے ساتھ بغداد کے راستے حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے مولانا کے صاحبزادے سلطان ولد کی تصنیف کی ہوئی مثنوی کے بعض اشعار کی رو سے یہ سفر فتنہ مغول کے ظہور کے وقت اختیار کیا گیا تھا غالباً یہ فتنہ کافی رنگ لا چکا تھا اس لئے ممکن ہے یہ سفر ۶۱۷ھ کے قریب اختیار کیا گیا ہو۔ اس لحاظ سے اس وقت مولانا جلال الدین کی عمر چودہ سال کے لگ بھگ ہوگی۔

کہتے ہیں کہ مولانا بہاؤالدین ولد نے نیشاپور میں شیخ فریدالدین عطار کی بھی زیارت کی اور انہوں نے جلال الدین کو اپنے سینے سے لگایا دعا دی اور انہیں مثنوی اسرار نامہ تحفۃً عطا کی بغداد سے روانہ ہونے اور حج بیت اللہ سے مشرف ہونے کے بعد آپ ملاطیہ پہنچے اور اس شہر میں چار سال تک اقامت گزین رہے اس کے بعد لارندہ آئے جو اس زمانہ میں سلاجقہ ایشیائے کوچک کا ایک حکومتی

مرکز تھا اس شہر میں بھی آپ سات سال تک مقیم رہے اس کے بعد آپ ملاحقہ ایشیائے کوچک کے بارھویں بادشاہ سلطان علاؤالدین کیقباد (۶۱۷ - ۶۳۴) کی دعوت پر اس کے پایۂ تخت قونیہ پہنچے یہ بادشاہ بڑا علم پرور بادشاہ گزرا ہے یہاں بہاؤالدین ولد جو ظاہری اور باطنی علوم میں بہت بلند مرتبہ رکھتے تھے لوگوں میں رشد و ہدایت اور علوم و فضائل کی نشر و اشاعت میں مشغول ہو گئے خود علاؤالدین کیقباد آپ سے غیر معمولی ارادت رکھتا تھا۔

مولانا جلال الدین نے ابتدائی تعلیم و تربیت اور ارشاد و ہدایت کی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی ان کی وفات کے ایک سال بعد (جو ۶۲۸ھ میں واقع ہوئی) سید برہان الدین محقق ترمذی جو بہاؤالدین ولد کے شاگرد تھے اور زمرہ خواص اولیاء، اہل طریقت میں شمار کئے جاتے تھے قونیہ آئے جلال الدین نے ان کی مجالس درس سے کسب فیض کیا اور پورے نو سال تک اس مرد عارف کے ارشاد کے تحت زندگی بسر کی اس کے بعد سیاحت، اخذ معرفت اور اصحاب طریقت کا فیض.. صحبت، اٹھانے کے لئے شام کا سفر اختیار کیا عرصے تک حلب اور دمشق میں اقامت گزیں رہے مقامات بلند حاصل کئے اور معنوی تجارب اور علمی اکتسابات کی منزلیں طے کرنے کے بعد قونیہ لوٹے یہاں آپ سلطان کے حکم پر اپنے والد کی طرح علوم شرعی کی تعلیم اور تدریس میں مشغول ہو گئے اسی طرح وہ اپنے اس مبارک کام میں مشغول تھے کہ گردش روزگار سے ایک روز نوادر دوراں سے آپ کی ملاقات ہو گئی اس ملاقات نے مولانا جلال الدین کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا یہ شمس الدین تبریزی تھے جو اپنے وقت کے صوفی پیروں میں مجذوب پیر تھے اور اپنے سالس میں گرمی، اپنی ذات میں ایک زبردست کشش اور اپنے بیان میں غیر معمولی اثر رکھتے تھے ایک شہر سے دوسرے شہر تک راہ پیمائی کرتے درویشوں، عارفوں اور صاحبان راز سے انس و محبت رکھتے تھے انکہ ۶۴۲ھ کا سال ہوگا کہ آپ جلال الدین کی تلاش میں قونیہ تشریف لائے

ایک ہی نظر میں جلال الدین کے دل میں عشق و حقیقت کا شعلہ بھڑکا اور انہیں اپنا معنوی شیفتہ بنالیا اور وہ آخر تک ان کے روحانی پیشوا اور مرشد بن گئے۔

کہتے ہیں کہ شمس تبریزی نے مقام وجد و شوق میں عنان اختیار اپنے ہاتھ سے دے دی تھی اور مضمرات دروں کو برملا کہنے لگے تھے عوام کی سطحی عقائد پر تنقید کرتے ہیں بے باک ہوگئے تھے اور اسرار دروں فاش کرنے لگے تھے ان کی سماع وطرب کی محفلیں بے باکانہ منعقد ہونے لگی تھیں اس لئے روایت ہے کہ ان کے بہت سے دشمن پیدا ہوگئے تھے ایک دن قونیہ کے عوام نے شورش کر کے ان کو مجمع عام میں قتل کر ڈالا اس حادثہ میں مولانا کے سب سے بڑے فرزند بھی سخت زخمی ہوئے اور زخموں سے جان بر نہ ہوسکے لیکن غزلیات سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شمس ایک روز غائب ہوگئے اور مولانا دو سال تک شب و روز اپنے کعبہ مقصود کے فراق میں گھلتے رہے ان کی تلاش و جستجو میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا لیکن ان کا پتہ نہ پا سکے

اس واقعہ کے بعد سے مولانا جلال الدین نے ریاضت اور عالم عرفان کے تجارت میں بہت ہی اونچا مرتبہ حاصل کیا اور اس مسلک کے سالکوں کے قطب مانے گئے اس گروہ کے مشائخوں کی رسم کے مطابق آپ نے بھی اپنے خلیفہ مقرر فرمائے آپ کے پہلے خلیفہ صلاح الدین فریدوں زرکوب ہوئے مولانا نے ان کی طرف خاص توجہ فرمائی اور ان سے بڑی محبت رکھتے تھے یہاں تک کہ آپ کی اس توجہ کی وجہ سے صلاح الدین زرکوب مولانا کے تمام مریدوں کے محسود بن گئے تھے اس طرح زرکوب دس سال تک اس خدمت پر مامور رہے ان کے بعد مولانا نے ۶۵۷ھ میں حسام الدین کو اپنی خلافت عطا فرمائی آپ مولانا کی زندگی میں گیارہ سال تک مولانا کے خلیفہ رہے اور مولانا کی وفات کے بعد بارہ سال تک آپ کے جانشین رہے۔

مثنوی معنوی مولانا جلال الدین کے افکار کا گراں بہا ثمرہ اور ان کے اشعار کا بہترین مجموعہ ہے بلکہ یہ فارسی زبان میں تصوّف کا مکمل ترین دیوان ہے اس میں چھ دفتر ہیں اور اشعار کی تعداد چھبیس ہزار ہے جو بحر رمل میں کہے گئے ہیں

مثنوی کے بعد مولانا کی سب سے اہم تصنیف ان کی غزلیات کا مجموعہ ہے جو دیوان کس تبریزی کے نام سے جمع کیا گیا یعنی اس دیوان کو انہوں نے اپنے مرشد اور روحانی قائد کے نام منتسب کیا ہے اس دیوان کے اشعار کی تعداد تیس ہزار بتائی گئی ہے لیکن چھپے ہوئے دیوان میں پچاس ہزار شعر ہیں غالبًا بعد کے لوگوں نے اپنی طرف سے اس میں اضافہ کر دیا ہے۔

مولانا جلال الدین کی شاعری رسائی مقصود، اتقان مطلب، لطافت معنی، باریکی خیال، عرفانی فکر کی صفائی اور پختگی کی شاعری ہے گویا سنائی نے شاعری کا قوام اور اس میں سوزونیت نام پیدا کی شیخ عطار نے اسے لطیف معانی اور شور وشوق کا منظہر بنایا اور مولانا جلال الدین نے اسے اوج کمال پر پہنچایا اگر کوئی ایرانی شاعروں کے کارواں پر ذرا گہری نظر ڈالے تو وہ بے اختیار کہہ اٹھے گا کہ فردوسی داستانی اور رزمیہ شاعری کا استاد ہے خیام حکیمانہ رباعی کا ماہر ہے انوری کی شاعری فنی قصیدہ کا مکمل نمونہ ہے نظامی بزمیہ اور عشقیہ داستان بیان کرنے پر قادر ہیں سعدی اچھوتی نثر اور دلکش غزل کے مالک ہیں۔

مولانا جلال الدین عرفانی مثنوی میں بے مثال ہیں اور حافظ عرفانی غزل کے آقا ہیں مولانا جلال الدین نے معانی کا رشتہ فکر دقیق اور حسن رقیق سے باندھ دیا ہے اور الفاظ میں ان کو نہایت اچھی طرح واضح کیا ہے آپ نے اپنی مثنوی کا بیشتر حصہ املا کرایا ہے اور حسام الدین اسے ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں اسی طرح چھ دفتر عالم وجود میں آئے جن میں چھبیس ہزار سے زیادہ

اشعار ہیں ان میں آپ نے عبارت آرائی، الفاظ کے موزون استعمال اور لغت پر اپنی پوری پوری قدرت کا ثبوت دیا ہے اس پر کمال یہ ہے کہ دوسرے تمام شاعروں کے برخلاف استاد کی توجہ الفاظ کی زینت کی طرف بالکل نہیں رہی ہے انھوں نے مثنوی کا وزن بھی اپنے مقصد کی ادائی میں آسانی کے لئے اختیار کیا ہے تاکہ معنوی شاعری پر گرانی محسوس نہ ہو عرفانی حقائق اور معانی بیان کرنے کا شوق مولانا پر کچھ اس درجہ غالب تھا کہ انھوں نے لفظی آرائش کی بندش اور عروض وقوافی کی قید وبند پر ایسی توجہ نہیں کی ہے یہی وجہ ہے کہ ہمیں مثنوی میں بعض ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو فصاحت لفظی اور بعض ترکیبوں، قافیوں اور لفظوں کے اعتبار سے جاذب ودلکش نہیں اس لئے آپ نے اس حقیقت پر نظر رکھتے ہوئے فرمایا ہے ؎

غیر نطق و غیر ایما و سجل　　　　بد ہزاراں ترجمان خیزد زدل

اور جہاں لطائف معارف بیان کرنے کے لئے آپ نے حال پیدا کر کے قال کی قید وبند کو اٹھا دیا ہے وہاں قافیوں میں ہم آہنگی باقی نہیں رہی ہے اس لئے فرماتے ہیں۔

قافیہ اندیشم و دلدار من!　　　　گویدم مندیش جز دیدار من

حرف وصوت وگفت را برہم زنم　　　　تاکہ بے این ہر سہ با تو دم زنم

عارفوں کے لطائف سخن سمجھنے کے لئے عموماً اور مولانا کی تصانیف سمجھنے کے لئے خصوصاً اسلامی علوم سے شیفتگی اور صفا کے ضمیر، شوق ومعرفت اور ذوق وحدت کی صوفیانہ اصطلاحوں سے واقف ہونا ضروری ہے اور اسی صورت میں ان کی تصانیف پر سے راز کا پردہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

اس مختصر سی کتاب میں مثنوی معنوی کے مطالب وافکار کی شرح وتفصیل ممکن نہیں کیونکہ دریا کوزہ میں نہیں سما سکتا ؎

گر بریزی بحر را در کوزۂ!　　　　چند گنجد قسمت یک روزۂ

اس لئے یہاں صرف چند اشارے کئے جاتے ہیں کیونکہ العاقل تکفیہ الاشارہ کے مصداق عاقل کے لئے بس اشارہ کافی ہے ؎

گر بگویم شرح ایں بے حد شود　　مثنوی ہفتاد من کاغذ شود

دنیا کی ہستی ایک ہے اور وہ خدائے تعالیٰ کی ذات ہے اس کے سوا کوئی موجود نہیں جو کچھ ہے در حقیقت اسی کی ذات ہے اور دنیا تمام اس کی جلوہ گاہ ہے ہماری روح بھی اس کی ہستی کی ایک شعاع ہے جو اپنے مبداء نور سے جُدا ہو کر اس جہاں ظاہر وکثرت تعین میں آئی ہے اس لئے یہ اپنے دلدار کے شوق وعشق اور اس کی حسرت دیدار میں اپنی مدت بسر کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ ظلم کے ظلماتی حجابات کو چاک کر کے اپنی اصل سے جا ملے اس کے ہجر کے نالے ایسے ہی ہیں جیسے نے کو نیستاں سے کاٹ لینے کے بعد اس کے اندر سے نکلتے سنائی دیتے ہیں ظاہر بینوں اور کور دلوں نے اپنے اصلی مبداء کو فراموش کر دیا ہے اور وہ روح کی پکار کا جواب دینے سے معذور ہیں۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند　　وز جدائی ہا شکایت می کند
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند　　از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق　　تا نمایم شرح درد اشتیاق
ہر کسی کو دور ماند از اصل خویش　　باز جوید روزگار وصل خویش

وحدت کی یافت کی حقیقت کے ادراک کے لئے سوزندہ عشق چاہیئے ایسا عشق جس کی آگ ظاہر کی تمام ہستی اور تمام جسمانی غرور کو جلا کر خاکستر کر دے فرماتے ہیں ؎

عشق ہای کز پی رنگی بود　　عشق نبود عاقبت ننگی بود
خام را جز آتش ہجر و فراق　　کہ پزد کہ وا رہاند از فراق
چوں توئی تو ہنوز از تو نرفت　　سوختن باید تو را در نار تفت

جو ذات خداوندی کے عشق سے سرفراز ہوا وہ بتوں کی، اوہام کی اور نقش

ظاہر کی پرستش کیسے کر سکتا ہے ۔

عاشق تصویر و وہم خویشتن — کی بود از عاشقان ذوالمنن
عاشق آن وہم گر صادق بود — آں مجازش تا حقیقت می کشد

سر وحدت سے اتنی آشنائی اور عوامل جمعیت سے اتنی آگاہی کہ انسان کثرات سے نکل کر جمع الجمع کے مقام پر پہنچ جائے بہت دشوار ہے جب کسی کو یہ مقام حاصل ہو جاتا ہے تو وہ ہر شخص کے آگے اس مقام کا راز بیان نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے لئے بڑی تربیت اور بہت زیادہ تہذیب نفس کی ضرورت ہے اسی لئے تو صوفیوں کو اہل راز کہا گیا ۔

گفت پیغمبر کہ ہر کو سر نہفت — زود باشد با مراد خویش جفت
دانہ چوں اندر زمیں پنہاں شود — سر آں سر سبزی بستان شود

راز عرفانی کے افشا میں دو برائیاں ہیں ایک تو اہل ظاہر اور بے مغز پوست پرستوں کی طرف سے اور دوسرے اپنے آپ کو عالم ظاہر کرنے والوں کی طرف سے یہ لوگ جدل کے زور پر استدلال کرنا چاہتے ہیں جب تک عقل کا قیاس نور عرفان سے منور نہ ہو جائے لاکھ عقل سر پٹکے حق تک اس کی رسائی ممکن نہیں ۔

پای استدلالیاں چوبیں بود — پای چوبیں سخت بی تمکین بود

خلاصہ یہ کہ اس عارف کامل کے کلام کا موضوع وحدت پر نظر، رجوع بباطن، ظاہر سے روگردانی، خلوص وصفا کی تعلیم، ظاہر پرستی اور ریاکار اور بیرونی نمائش سے گزر کر کشائش دروں سے ربط تجلی آفاق سے ضرب نظر اور نور اشراق کے نظارہ کی دعوت ہے ۔

مولانا نے اپنی کتاب "فیہ مافیہ" میں بھی وہی افکار اور وہی خیالات ظاہر کئے ہیں جو آپ نے مثنوی میں بیان کئے ہیں اس کے سوا ترجیع بندوں، رباعیوں اور مکاتب میں بھی اسی پیمانہ پر یہی سودا نظر آتا ہے اور یہاں بھی وہ اپنے

شمع مقصود کے پروانے نظر آتے ہیں۔

(تاریخ ادبیات ایران رضا زادہ شفق)

محمد نام جلال الدین لقب، عرف مولانا روم حضرت ابوبکر صدیق کی اولاد میں تھے۔ مولانا کے والد کا لقب بہاؤالدین اور بلخ وطن تھا علم وفضل میں یکتائے روزگار گنے جاتے تھے خراسان کے تمام دور دراز مقامات سے ان ہی کے یہاں فتوے آتے تھے بیت المال سے روزینہ مقرر تھا اسی پر گذر اوقات ہوتی تھی وقف کی آمدنی سے مطلقاً متمتع نہیں ہوتے تھے معمول تھا کہ صبح سے دوپہر تک علوم درسیہ کا درس دیتے ظہر کے بعد حقائق اور اسرار بیان کرتے پیر اور جمعہ کا دن وعظ کیلئے خاص تھا۔

یہ خوارزم شاہیوں کی حکومت کا دور تھا اور محمد خوارزم شاہ جو اس سلسلہ کا گل سرسبد تھا مسند آرا تھا وہ بہاؤالدین کے حلقہ بگوشوں میں تھا، اور اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔

مولانا روم سنہ ٦٠٤ھ ہجری میں، بمقام بلخ پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اپنے والد شیخ بہاؤالدین سے حاصل کی شیخ بہاؤالدین کے مریدوں میں سید برہان الدین محقق بڑے پایۂ کے فاضل تھے مولانا کے والد نے مولانا کو ان کی آغوش تربیت میں دیا۔ وہ مولانا کے اتالیق بھی تھے اور استاد بھی مولانا نے اکثر علوم و فنون ان ہی سے حاصل کئے اٹھارہ یا انیس برس کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ قونیہ میں آئے جب ان کے والد نے انتقال کیا تو اس کے دوسرے سال یعنی سنہ ٦٢٩ھ ہجری میں جب ان کی عمر پچیس برس کی تھی تکمیل فن کے لئے شام کا قصد کیا اس زمانہ میں دمشق اور حلب علم وفنون کے مرکز تھے مولانا نے اول حلب کا قصد کیا اور مدرسہ حلاویہ کی دارالاقامۃ (بورڈنگ) میں قیام کیا۔ مولانا نے مدرسہ حلاویہ کے سوا حلب کے اور مدرسوں میں بھی علم کی تحصیل کی طالب علمی ہی کے زمانے میں عربیت، فقہ

حدیث اور تفسیر اور معقول میں یہ کمال حاصل کیا کہ جب کوئی مشکل مسئلہ پیش آتا اور کسی سے حل نہ ہوتا تو لوگ ان کی طرف رجوع کرتے

دمشق کی نسبت یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس مدرسے میں رہ کر تحصیل علم کی "مناقب العارفین" میں لکھا ہے کہ مولانا نے سات برس تک دمشق میں رہ کر علوم کی تحصیل کی اور اس وقت مولانا کی عمر چالیس برس کی تھی یہ امر قطعی ہے کہ مولانا نے تمام علوم درسیہ میں نہایت اعلیٰ درجہ کی مہارت پیدا کی تھی۔

مولانا کے والد نے جب وفات پائی تو سید برہان الدین اپنے وطن ترمذ میں تھے یہ خبر سن کر ترمذ سے روانہ ہوئے اور قونیہ میں آئے مولانا اس وقت لارند میں تھے سید برہان الدین نے مولانا کو خط لکھا اور اپنے آنے کی اطلاع دی مولانا اس وقت روانہ ہوئے قونیہ میں شاگرد استاد کی ملاقات ہوئی دونوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا اور دیر تک دونوں پر بے خودی کی کیفیت رہی افاقہ کے بعد سید نے مولانا کا امتحان لیا اور جب تمام میں کامل پایا تو کہا کہ صرف علم باطنی رہ گیا ہے اور یہ تمہارے والد کی امانت ہے جو میں تم کو دیتا ہوں چنانچہ نو برس تک طریقت اور سلوک کی تعلیم دی۔

یہ سب کچھ تھا لیکن مولانا پر اب تک ظاہری علوم کا رنگ غالب تھا علوم دینیہ کا درس دیتے تھے وعظ کہتے تھے فتویٰ لکھتے تھے سماع وغیرہ سے سخت احتراز کرتے تھے ان کی زندگی کا دوسرا دور درحقیقت شمس تبریز کی ملاقات سے شروع ہوتا ہے زین العابدین شروانی نے مثنوی کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ شمس تبریز کو ان کے پیر بابا کمال الدین جندی نے حکم دیا کہ روم جاؤ وہاں ایک دل سوختہ ہے اس کو گرم کر آؤ شمس پھرتے پھراتے قونیہ پہنچے شکر فروشوں کی کارواں سرا میں اترے ایک دن مولانا روم کی سواری بڑے تزک و احتشام سے نکلی شمس نے سرراہ ٹوک کر پوچھا کہ "مجاہدہ و ریاضت سے کیا مقصد ہے؟" مولانا نے کہا اتباع شریعت شمس ... نے کہا یہ تو سب جانتے ہیں۔ مولانا نے

کہا اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے شمس نے فرمایا علم کے یہ معنی ہیں کہ وہ تم کو منزل تک پہنچا دے" پھر حکیم سنائی کا یہ شعر پڑھا۔

علم کز تو ترا نہ بستاند
جہل ازاں علم بہ بود بسیار

مولانا پر ان جملوں کا یہ اثر ہوا کہ اسی وقت شمس کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

مثنوی کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ شمس اول دفعہ جب ناراض ہو کر چلے گئے تو اپنے وطن تبریز پہنچے اور مولانا خود جاکر ان کو تبریز سے لائے چنانچہ خود مثنوی میں اس واقعہ کی طرف ان اشعار میں اشارہ کیا گیا ہے۔

ساربانا بار بکشا ز اشتراں
شور تبریز ست وکوئے دلستان

فر فردوس ست ایں پالیز را
شعشعہ عرش است ایں تبریز را

ہر زمانے فوج روح انگیز جاں
از فراز عرش بر تبریز یاں

سپہ سالار نے جو بقول نور چالیس برس تک مولانا کی خدمت میں رہے شمس تبریز کی نسبت صرف اس قدر لکھا ہے کہ وہ رنجیدہ ہو کر کسی طرف نکل گئے اور پھر ان کا پتہ نہ لگا اور تمام تذکرے متفق اللفظ ہیں کہ ان کو اسی زمانہ میں جبکہ وہ مولانا کے پاس مقیم تھے مولانا کے بعض مریدوں نے حسد کی وجہ سے قتل کر دیا۔

"نفحات الانس" میں ہے کہ خود مولانا کے صاحبزادے علاؤالدین محمدؒ نے یہ حرکت کی نفحات الانس میں شمس کی شہادت کا سال ۶۴۵ھ ۔۔۔ لکھا ہے غرض شمس کی شہادت یا غیبوبت کا زمانہ ۶۴۲ھ اور ۶۴۵ھ کے بیچ بیچ ہے۔ شمس کی شہادت نے مولانا کی حالت بالکل بدل دی۔

مدت تک مولانا کو شمس کی جدائی نے بیقرار و بے تاب رکھا ایک دن اسی جوش و خروش کی حالت میں گھر سے نکلے راہ میں شیخ صلاح الدین زرکوب کی دکان تھی وہ چاندی کے ورق کوٹ رہے تھے مولانا پر ہتھوڑے کی آواز نے سماع کا اثر پیدا کیا وہیں کھڑے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حالت طاری ہو گئی۔ شیخ مولانا کی حالت دیکھ کر باہر نکل آئے مولانا نے ان کو آغوش میں لے لیا اور

اسی جوش و مستی میں دوپہر عصر تک یہ شعر گاتے رہے ؎

یکے گنجی پدید آمد ازیں دکان زرکوبی زہی صورت زہی معنی زہی خوبی زہی خوبی

شیخ صلاح الدین نے وہیں کھڑے کھڑے دکان لٹوا دی اور دامن جھاڑ کر مولانا کے ساتھ ہو گئے مولانا کو صلاح الدین کی صحبت سے بہت کچھ تسلی ہوئی ۹ برس تک متصل ان سے صحبت گرم رہی بالآخر ۶۶۲ھ میں شیخ بیمار ہوئے اور تین چار روز بیمار رہ کر وفات پائی۔

صلاح الدین کی وفات کے بعد مولانا حسام الدین چلپیؒ کو جو معتقدان خاص میں تھے ہمدم و ہمراز بنایا اور جب تک زندہ رہے انہی سے دل کو تسکین دیتے رہے حسام الدین ہی کی درخواست اور استدعا پر مولانا نے مثنوی لکھنی شروع کی۔

تذکرہ نویسوں نے گو تصریح نہیں کی لیکن قرائن صاف بتاتے ہیں کہ شمس کی ملاقات سے پہلے مولانا کے شاعرانہ جذبات اس طرح ان کی طبیعت میں پنہاں تھے جس طرح پتھر میں آگ ہوتی ہے شمس کی جدائی گویا چقماق تھی اور شرارے ان کی پرجوش غزلیں۔ مثنوی کی ابتدا اسی دن سے ہوئی مولانا صلاح الدین کی شان میں بھی نہایت ذوق و شوق کی غزلیں اور اشعار لکھتے تھے۔

ان کی تصنیفات میں مثنوی اور دیوان جس کو شمس تبریز کا دیوان سمجھا جاتا ہے۔ نہایت اہم ہیں۔

فارسی شاعری کی ابتدا سلاطین کی مداحی اور ان کی تفریح خاطر سے ہوئی اور یہی وجہ تھی کہ اصناف سخن میں سب سے پہلے قصائد وجود میں آئے کیونکہ عربی زبان میں قصائد مدح و ثنا کے لئے ایک مدت سے مخصوص ہو چکے تھے قصائد کی ابتدا غزل سے کی جاتی تھی جس کو تشبیب کہتے ہیں اتنے تعلق سے غزل گوئی کا بھی آغاز ہوا لیکن اس قسم کی سادہ غزل جو قصائد کی تمہید کے لئے زیبا تھی

سلاطین میں سے آل سامان اور سلطان محمود کو یہ ذوق پیدا ہوا کہ ان کے آباؤ اجداد یعنی شاہان عجم کے کارنامے نظم میں ادا ہوں تاکہ ضرب المثل کی طرح زبانوں پر چڑھ جائیں اس بنا پر مثنوی ایجاد ہوئی جو واقعات تاریخی کے ادا کرنے کے لئے اصناف نظم میں سب سے بہتر صنف تھی فردوسی نے اس صنف کو اس قدر ترقی دی کہ آج تک اس پر اضافہ نہ ہو سکا لیکن مثنوی بلکہ کل اصناف شاعری کی ترقی اس وقت تک جو کچھ ہوئی تھی واقعہ نگاری، خیال بندی اور صنائع بدائع کے لحاظ سے تھی ذوق اور کیفیت کا وجود نہ تھا حضرت سلطان ابوالخیر نے رباعی میں تصوف اور طریقت کے خیالات ادا کئے اور یہ پہلا دن تھا کہ فارسی شاعری میں ذوق اور وجد و مستی کی روح آئی دولت غزنویہ کے اخیر زمانہ میں حکیم سنائی نے حدیقہ لکھی جو نظم میں تصوف کی پہلی تصنیف تھی حدیقہ کے بعد خواجہ فریدالدین عطار نے متعدد مثنویاں تصوف میں لکھیں جن میں سے منطق الطیر نے زیادہ شہرت حاصل کی اس امر کی بہت سی شہادتیں موجود ہیں کہ خواجہ عطار کی تصنیفات مولانا کے لئے دلیل راہ تھیں۔

ارباب تذکرہ لکھتے ہیں کہ حسام الدین چلپئی نے مولانا سے درخواست کی کہ منطق الطیر کے طرز پر ایک مثنوی لکھی جائے مولانا نے فرمایا کہ خود مجھ کو بھی رات یہ خیال آیا اور اسی وقت یہ چند شعر موزون ہوئے۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند وز جدائی ہا شکایت می کند

مثنوی کی تصنیف میں حسام الدین چلپئی کو بہت دخل ہے اور درحقیقت یہ نایاب کتاب انہی کی بدولت وجود میں آئی وہ مولانا کے مریدان خاص میں سے تھے اور مولانا اس قدر ان کی عزت کرتے تھے کہ جہاں ان کا ذکر کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ پیر طریقت اور استاد کا ذکر ہے مثنوی کے چھ دفتر ہیں اور بجز دفتر اول کے ہر دفتر .... ان کے نام سے مزین ہے، دفتر دوم میں لکھتے ہیں ؎

ے مدتی این مثنوی تاخیر شد — مہلتی بایست تا خون شیر شد
چوں ضیاء الحق حسام الدین عناں — بازگرداند ز اوج آسمان
چوں بہ معراج حقائق رفتہ بود — بی بہارش غنچہ ہا ناشگفتہ بود

دفتر سوم میں فرماتے ہیں ے

ای ضیاء الحق حسام الدین بیار — این سوم دفتر کہ سنت شد سہ بار

چوتھے دفتر میں ارشاد فرماتے ہیں :-

ای ضیاء الحق حسام الدین توئی — کہ گذشت از مہ بنورت مثنوی

پانچویں دفتر میں لکھتے ہیں ے

شہ حسام الدین کہ نور انجم است — طالب آغاز سفر پنجم است

چھٹے دفتر میں تحریر فرماتے ہیں ے

ای حیات دل حسام الدین بسی — میل می جوشد بہ قسم سادسی
پیشکش می آرمت ای معنوی! — قسم سادس در تمام مثنوی!

مثنوی کا جب پہلا دفتر ختم ہوا تو حسام الدین چلپیؒ کی بیوی نے انتقال کیا اس واقعہ سے ان کو اس قدر صدمہ ہوا کہ دو برس تک پریشان اور افسردہ رہے چونکہ مثنوی کے سلسلہ کے وہ بانی اور محرک تھے مولانا بھی دو برس تک چپ رہے آخر جب خود حسام الدین نے استدعا کی تو پھر مولانا کی زبان کھلی عام روایت ہے کہ مولانا نے ۶۷۲ھ میں انتقال کیا اور چھٹے دفتر کے پورے کرنے کی نوبت نہیں آئی لیکن خود مولانا نے چھٹا دفتر پورا کیا چنانچہ اس کے چند اشعار یہ ہیں ے

ای ضیاء الحق حسام الدین فرید — دولتت پائندہ فقرت بر مزید
چونکہ از چرخ ششم کردی گذر — بر فراز چرخ ہفتم کن سفر
سعد اعداد ست ہفت اے خوش نفس — زانکہ تکمیل عدد ہفت است بس

مثنوی کو جس قدر مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی فارسی کی کسی کتاب کو نہیں،

ہوئی صاحب مجمع الفصحا" نے لکھا ہے کہ ایران میں چار کتابیں جسقدر مقبول ہوئیں
کوئی کتاب نہیں ہوئی شاہنامہ، گلستان، مثنوی مولانا روم دیوان حافظ۔ ان
چاروں کتابوں کا موازنہ کیا جائے تو مقبولیت کے لحاظ سے مثنوی کو ترجیح
ہوگی کسی کتاب کی مقبولیت دو طریقوں سے ہوتی ہے کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ سادگی
اور صفائی اور عام دلآویزی کی وجہ سے پہلے وہ کتاب عوام میں پھیلتی ہے پھر
رفتہ رفتہ خواص بھی اس کی طرف توجہ کرتے ہیں اور مقبول عام ہو جاتی ہے
کبھی یہ ہوتا ہے کہ کتاب عوام کی دسترس سے باہر ہوتی ہے اس لئے اس پر
صرف خواص کی نظر پڑتی ہے خواص جسقدر زیادہ اس پر توجہ کرتے ہیں اسی قدر
اس میں زیادہ نکات اور دقائق پیدا ہوتے جاتے ہیں خواص کی توجہ اور
اعتنا و تحسین کی وجہ سے عوام میں بھی چرچا پھیلتا ہے اور لوگ تقلیداً اس کے
معتقد اور معترف ہوتے ہیں رفتہ رفتہ یہ دائرہ تمام ملک کو محیط ہو جاتا ہے
مثنوی کی مقبولیت اس قسم کی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کی مقبولیت اور
کسی کتاب کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ فارسی زبان میں جس قدر کتابیں نظم یا
نثر میں لکھی گئی ہیں کسی میں ویسے دقیق، نازک اور عظیم الشان مسائل اور اسرار
نہیں مل سکتے جو مثنوی میں کثرت سے پائے جاتے ہیں اسی قسم کے نکات اور
دقائق کا عربی تصنیفات میں بھی مشکل سے پتہ لگتا ہے اس لحاظ سے اگر علماء اور
ارباب فن نے مثنوی کی طرف تمام اور کتابوں کی نسبت زیادہ توجہ کی اور یہاں
تک مبالغہ کیا کہ ع ہست قرآں در زبان پہلوی — تو کچھ تعجب کی بات نہیں

ان سرسری باتوں کے بیان کے بعد اب ہم مثنوی کے خصوصیات کسی قدر تفصیل
کے ساتھ لکھتے ہیں سب سے بڑی خصوصیت جو مثنوی میں ہے وہ اس کا طرز
استدلال اور طریقہ افہام ہے استدلال کے تین طریقے ہیں، قیاس، استقراء، تمثیل
چونکہ ارسطو نے بھی ان تینوں میں قیاس کو ترجیح دی ہے اس لئے اس کی تقلید سے
حکماء اسلام میں بھی اسی طریقہ کو زیادہ تر رواج ہوا چنانچہ مولانا روم نے زیادہ

تو اسی قیاس تمثیلی سے کام لیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ عام طباع کے افہام و تفہیم کا آسان اور اقرب الی الفہم یہی طریقہ ہے استدلال تمثیلی کے لئے تخیل کی بڑی ضرورت یہ ہے جو شاعری کی سب سے ضروری شرط ہے اس بنا پر مثنوی کے لئے یہی طریقہ زیادہ مناسب تھا مولانا کی شاعری کو جس بنا پر شاعری کہا جاتا ہے وہ یہی قوت تخیل ہے، التصوف اور سلوک کے مسائل اور مسلمات عام ادراک بشری سے خارج ہیں اس لئے جو شخص خود اس عالم میں نہ آئے وہ ان باتوں پر یقین نہیں کر سکتا الٰہیات کے اکثر مسائل بھی عام لوگوں کی فہم سے برتر ہیں اس لئے ان مسائل کے سمجھانے کا سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ ان کو مثالوں اور تشبیہوں کے ذریعہ سے سمجھایا جائے وہ ان دقیق مسائل کو ایسی نادر اور قریب الفہم تمثیلوں سے سمجھاتے ہیں جن سے بقدر امکان ان کی حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے یا کم از کم ان کے امکان کا یقین ہو جاتا ہے مثلاً یہ مسئلہ کہ خدا کا تعلق عالم سے اور ارواح کا تعلق جسم سے اسی طرح ہے کہ نہ اس کو متصل کہہ سکتے ہیں نہ منفصل نہ قریب نہ بعید نہ داخل نہ خارج یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو بظاہر سمجھ میں نہیں آتا مولانا اس کو اس طرح تمثیل کے ذریعہ سمجھاتے ہیں۔

قرب بیچوں است غفلت را بہ تو   آں تعلق ہست بیچوں ای عمو
اتصالے بی تکیف بی قیاس   ہست رب الناس را با جان ناس
نور چشم و مردمک در دیدہ است   از چہ راہ آید؟ بغیر از شش جہت
ایں تعلق را خرد چوں پی برد   بستۂ فصل است و وصل است ایں خرد
تاب نور چشم با پیہ است جفت   نور دل در قطرۂ خونی نہفت
شادی اندر گردہ و غم در جگر   عقل چوں شمعی درون مغز سر
رائحہ در انف و منطق در لسان   لہو در نفس و شجاعت در جنان

حاصل یہ کہ آنکھ میں قوت باصرہ، ناک میں شامہ، زبان میں گویائی، دل،

میں شجاعت یہ تمام چیزیں اس قسم کا تعلق رکھتی ہیں جس کو نہ متصل کہہ سکتے ہیں نہ منفصل نہ قریب نہ بعید اسی طرح روح کا تعلق جسم سے اور خدا کا تعلق مخلوقات سے ہے ۔

مثنوی کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ فرضی حکایتوں کے ضمن میں اخلاقی مسائل کی تعلیم کا جو طریقہ قدامت سے چلا آتا تھا مولانا نے اس کو کمال کے مرتبہ تک پہنچا دیا ۔ اخلاق و سلوک کے بعض مسائل ایسے ہیں جو میں اہل نظر مختلف الرائے ہیں ان مسائل کو مولانا نے فرضی مناظروں کے ذیل ادا کیا ہے جس سے تمام غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں ۔

مثنوی کے علاوہ مولانا کی دوسری تصنیف ان کا دیوان ہے اس میں تقریباً پچاس ہزار شعر ہیں چونکہ غزلوں کے مقطع میں عموماً شمس تبریز کا نام ہے اس لئے عوام اس کو شمس تبریز ہی کا دیوان سمجھتے ہیں ۔ اس میں صرف غزلیں ہی غزلیں ہیں قصیدہ یا قطعہ وغیرہ مطلق نہیں مولانا کی شاعری کا دامن مدح کے داغ سے بالکل پاک ہے یہ امر عموماً تسلیم کیا جاتا ہے کہ مولانا کے زمانے تک غزل نے کبھی قسم کی ترقی نہیں کی تھی اور کر بھی نہیں سکتی تھی ۔ غزل دراصل سوز و گداز کا نام ہے اور اس وقت تک جو لوگ شعر و شاعری میں مشغول تھے صرف وہ تھے جنہوں نے معاش کی ضرورت سے اس فن کو پیشہ بنایا تھا عشق عاشقی سے ان کو سروکار نہ تھا چنانچہ اس زمانے کے جس قدر شعراء ہیں ۔ ان کے کلام میں صنائع لفظی اور الفاظ کی مرصع کاری کے سوا جوش اور اثر نام کو بھی نہیں پایا جاتا انوری ، خاقانی ، عبدالواسع جبلی ، مسعود سعد سلمان کی غزلیں آج بھی موجود ہیں ان میں سوز و گداز کا پتہ نہیں ۔

ایران کی شاعری میں درد واثر کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ارباب حال یعنی حضرات صوفیہ میں بعض بالطبع شاعر تھے عشق و محبت کا سرمایہ ان کو تصوف سے ملا ان دونوں کے اجتماع نے ان کے کلام میں جوش اور اثر پیدا کیا ۔ سلطان ابو سعید

ابوالخیر، حکیم سنائی، خواجہ فریدالدین عطار اس خصوصیت کے موجد اور بانی ہیں لیکن ان حضرات نے دردِ دل کا اظہار زیادہ تر رباعیات، قصائد اور مثنویات کے ذریعہ سے کیا تھا غزلیں اب تک سادگی کی حالت میں رہیں ساتویں صدی ہجری میں دولت سلجوقیہ کے فنا ہونے سے صلہ گستری اور فیاضی کا بازار سرد ہو چکا تھا اس لئے شعراء کی طبیعتوں کا زور قصائد سے ہٹ کر غزل کی طرف متوجہ ہوا اور ان میں سے بعض فطری عاشق مزاج تھے اس لئے ان کے کلام میں خود بخود وہ بات پیدا ہوگئی جو غزل کی جان ہے۔ تمام اہل تذکرہ متفق ہیں کہ جن لوگوں نے غزل کو غزل بنایا وہ شیخ سعدی عراقی اور مولانا روم ہیں۔

مولانا کی اکثر غزلیں کسی خاص حالت میں لکھی گئی ہیں اس وجہ سے ان غزلوں میں ایک ہی حالت کا بیان چلا جاتا ہے عام غزلوں کی طرح ہر شعر الگ نہیں ہوتا مولانا کے کلام میں جو وجد، جوش اور بے خودی پائی جاتی ہے اوروں کے کلام میں نہیں پائی جاتی وہ فطرتاً پرجوش طبیعت رکھتے تھے شمس تبریز کی صحبت نے اس نشہ کو اور تیز کر دیا تھا ان کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص محبت کے نشے میں چور ہے اور اس حالت میں جو کچھ منہ میں آتا ہے کہتا جاتا ہے مثلاً ایک غزل میں کہتے ہیں ؎

بنما رخ کہ باغ و گلستانم آرزوست بکشای لب کہ قند فراوانم آرزوست
یکدست جام بادہ و یکدست زلف یار رقص چنیں میانۂ میدانم آرزوست

ان کے کلام کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عشق و محبت کے جوش میں عاشق پر جو خاص خاص حالتیں گذرتی ہیں ان کو اس خوبی سے ادا کرتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے ان کی تصویر کھنچ جاتی ہے اور یہ شاعری کا سب سے بڑا کمال ہے۔ مثلاً کبھی عاشق کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ معشوق کو یوں ہماری بیتابی اور جگر سوزی کی قدر نہ ہوگی جب تک وہ خود بھی کسی پر عاشق نہ ہو اور اس کو بھی...... اس قسم کے معاملات پیش نہ آئیں اس حالت کو اس طرح ادا کرتے

ہیں ؎

ای خداوندا یکی یار جفا کارش دہ — دلبر عشوہ گر سرکش و خونخوارش دہ
چند روزی زپی تجربہ بیمارش کن — با طبیباں دغا پیشہ سروکارش دہ
تا بداند کہ شب ما بچساں می گردد — درد عشقش دہ و عشقش دہ و بسیارش دہ

تصوف کے مقامات میں دو مقام آپس میں متقابل ہیں فنا و بقا مقام فنا میں سالک پر خضوع، مسکینی اور انکسار کی کیفیت غالب ہوتی ہے بخلاف اس کے بقا میں سالک کی حالت جلال اور عظمت سے لبریز ہوتی ہے مولانا پر یہ نسبت زیادہ غالب رہتی ہے اس لئے ان کے کلام میں جو جلال، ادعا، بیباکی اور بلند آہنگی پائی جاتی ہے صوفیہ میں سے کسی کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔

(مولانا روم از شبلی نعمانی)

ایران کے صوفی شاعروں میں جلال الدین رومی کا مقام بہت بلند ہے آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ روم (ترکی) میں گذرا اس لئے آپ نے مولانا روم کے نام سے شہرت پائی "مثنوی معنوی" آپ کی ایک زندہ یادگار ہے جو زمانہ حال اور مستقبل کے طالبان معرفت کے لئے شمع ہدایت کا کام دے گی۔

مولانا کے آبا و اجداد عربی النسل تھے اور عرب سے آکر بلخ میں آباد ہوئے مولانا یہیں پیدا ہوئے آپکا خاندان علم و فضل کی وجہ سے مشہور تھا تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ آپ کے خاندان نے بڑے بڑے محدث اور فقیہ پیدا کئے۔

آپ کے والد محمد بن حسین خطیبی جو بہاؤالدین کے نام سے مشہور ہوئے اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے درس و تدریس ان کا پیشہ تھا ان کے علم و فضل کی وجہ سے خوارزم کے حکمران سلطان علاؤالدین محمد کو آپ سے بڑی عقیدت تھی اہل بلخ تو ان کے شیدا تھے جب وعظ کرتے تو خواص و عام دیوانہ ان کے وعظ میں شریک ہوتے

شیخ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا ' ہزاروں عقیدت مند آپ کے درس سے مستفیض ہونے کے لئے کھنچے چلے آئے تھے مولانا بہاؤالدین نے ۶۱۷ھ میں جب مولانا جلال الدین رومی کی عمر بارہ سال تھی بلخ کو خیرباد کہا راستے میں ان کا گزر نیشاپور سے بھی ہوا یہاں بقول دولت شاہ سمرقندی ان کی ملاقات خواجہ فریدالدین عطار سے ہوئی خواجہ صاحب نے جلال الدین کو ہونہار پاکر اس کی فضیلت کی پیشگوئی کی اسے دعا دی اور اپنی کتاب "اسرار نامہ" کا ایک نسخہ تحفے کے طور پر پیش کیا، جلاوطنوں کا یہ قافلہ نیشاپور سے چل کر بغداد آیا اور پھر مکہ معظمہ گیا یہاں سے چل کر یہ لوگ روم (ترکی) کے شہر ملاطیہ پہنچے جہاں یہ چار سال رہے پھر لارندہ گئے جسے آجکل قرمان کہتے ہیں یہاں ان کا قیام سات سال تک رہا اس عرصہ میں مولانا جلال الدین نے شادی کی اور دو بچے بھی ہوئے اس کے بعد یہ لوگ قونیہ آ گئے قونیہ علاؤالدین... کیقباد ...سلجوقی کا پایہ تخت تھا اور تہذیب وتمدن کا مرکز سمجھا جاتا تھا یہاں تھوڑے ہی عرصہ بعد مولانا بہاؤالدین کا ۶۲۸ ہجری میں انتقال ہوگیا۔

مولانا کے انتقال کے بعد ایک بزرگ سید برہان الدین محقق ترمذی جو بلخ میں ان کے شاگردوں میں تھے قونیہ آئے اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا مولانا بھی ان کے درس میں شامل ہوتے رہے سید برہان الدین شیخ طریقت بھی تھے چنانچہ ان سے مولانا روم نے صوفیانہ طریقت کی تعلیم پائی اور سلوک کی منزلیں بھی انہی کی رہنمائی میں طے کیں سید برہان الدین کی وفات پر آپ ان کے جانشین بنے اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔

اسی اثنا میں مولانا کی ملاقات ایک درویش سے ہوئی جس نے مولانا کی زندگی ہی کو بدل ڈالا یہ درویش شمس الدین تبریزی تھے - جو بہت نحیف ونزار شخص تھے لیکن ان کے بیان میں کشش اور ان کی شخصیت میں جاذبیت تھی وہ درویشوں کی تلاش میں شہر بہ شہر گھومتے پھرتے تھے

بھی تلاش۔ انہیں قونیہ میں لے آئی مولانا نے شمس کو دیکھ کر یہ محسوس کیا کہ یہ وہی فوق العادہ انسان ہے جن کی مدت سے تلاش تھی مولانا نے شمس کے ہاتھ پر بیعت کی اور انہیں گھر لے آئے یہاں سے مولانا کی زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا ہوتا ہے شمس تبریزی کی ملاقات سے پہلے آپ مدرسے کے تعلیمی مشاغل میں مصروف رہتے تھے اور لوگ اکتساب فیض کر کے بہت خوش اور مطمئن تھے لیکن اب آپ نے تعلیمی مشاغل سے ہاتھ اٹھا لیا اور "نغمہ" نے" کی اندرونی آواز پر کان لگا دیئے

اہل قونیہ مولانا کی اس تبدیلی کو دیکھ کر سخت رنجیدہ ہوئے اور شمس تبریزی کو برا بھلا کہنے لگے شمس کو ان کی باتیں ناگوار گزریں اور وہ وہاں سے اٹھ کر دمشق کو چل دئے مولانا نے اپنے بیٹے سلطان ولد کو ان کے پیچھے بھیجا اور وہ منت سماجت کر کے انہیں پھر قونیہ لے آئے ذوق وسماع کی محفلیں پھر سے برپا ہونے لگیں اہل قونیہ کے دلوں پر یہ بات گراں گزری کہ ایک اجنبی شخص مولانا پر اس قدر چھا جائے کہ وہ اپنے ارادتمندوں کو بالکل بھول ہی جائے چنانچہ انہوں نے شمس تبریزی کے خلاف ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا اہل ظاہر کی مخالفت بڑھتی گئی تو شمس وہاں سے دفعتاً غائب ہو گئے اور کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں گئے بعض تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ مولانا کے بیٹے علاؤالدین نے انہیں قتل کر دیا تھا۔

مولانا کو اپنے پیر کی صحبت سے محروم ہو جانے کا سخت قلق تھا ہر وقت انہیں کی یاد رہتی تھی سلطان ولد اپنی مثنوی "ابتدا نامہ" میں لکھتے ہیں کہ مولانا نے اسی رنج فراق میں صوفیانہ غزلیات کا ایک دیوان پیر کے نام تصنیف کیا تھا وہ اپنے پیر کی یاد میں بنسری کی تان کے ساتھ رقص کرتے آخر مولانا مرحوم کے پیرو کاروں نے جو فرقہ مولویہ کے نام سے موسوم ہیں اس رقص کو اپنی ریاضت کا حصہ بنا لیا۔

شمس تبریزی کے بعد آپ کی توجہ ایک شخص صلاح الدین زرکوب کی طرف ہوئی صلاح الدین کی ملاقات کے متعلق مولانا جامی "نفحات الانس" میں لکھتے ہیں کہ مولانا کو مدت تک شمس کی جدائی نے بے قرار رکھا ایک دن اسی جوش و خروش کی حالت کی حالت میں گھر سے نکلے راہ میں شیخ صلاح الدین زرکوب کی دکان تھی وہ چاندی کے ورق کوٹ رہے تھے مولانا پر ہتھوڑی کی آواز نے سماع کا اثر پیدا کیا وہیں کھڑے ہوگئے اور وجد کی حالت طاری ہوگئی شیخ مولانا کی حالت دیکھ کر اسی طرح ورق کوٹتے رہے یہاں تک کہ بہت سی چاندی ضائع ہوگئی انہوں نے ہاتھ نہ روکا آخر شیخ باہر نکل آئے مولانا نے ان کو اپنی آغوش میں لے لیا اور اس جوش و مستی میں دوپہر سے عصر تک یہ شعر گاتے رہے ؎

یکی گنجی پدید آمد ازیں دکان زرکوبی زہی صورت زہی معنی زہی خوبی زہی خوبی

شیخ صلاح الدین نے وہیں کھڑے کھڑے دکان لٹوا دی اور مولانا کے ساتھ ہوگئے۔ مولانا کو صلاح الدین زرکوب کی صحبت میں ایک گونہ اطمینان ہوا چنانچہ ان کی شان میں آپ نے بہت پرجوش اشعار کہے ہیں۔

مولانا کے دو فرزند تھے سلطان ولد اور علاؤالدین محمد، اول الذکر راہِ سلوک میں اپنے والد کے پیرو تھے حسام الدین کی وفات پر انہی کو آپ کا خلیفہ بننے کی سعادت حاصل ہوئی یہ بھی شعر کہتے تھے ان کی تصانیف میں خاص طور سے قابل ذکر مثنوی "ابتدا نامہ" ہے جس میں مولانا کی زندگی کے حالات لکھے ہیں آپ کا فرزند علاؤالدین محمد وہی ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ شمس تبریزی اس کی گردن پر ہے۔

مولانا کو مثنوی لکھنے پر حسام الدین نے مائل کیا تھا مثنوی کا پہلا دفتر ختم ہوا تو حسام الدین کی بیوی کا انتقال ہوگیا جس سے انہیں سخت قلبی صدمہ پہنچا اس سے مولانا بھی سخت پریشان رہے چنانچہ دوسرے دفتر کی

تصنیف معرض التوا میں پڑ گئی مولانا نے دفتر دوم کے آغاز میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

مدتی ایں مثنوی تاخیر شد　　　مہلتی بایست تا خوں شیر شد

مثنوی کے بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا شعر کہتے تھے اور حسام الدین ..... ان اشعار کو قلم بند کرتے جاتے تھے اس مثنوی کے پانچ دفتر مکمل ہو گئے ابھی چھٹا دفتر زیر تصنیف تھا کہ مولانا بیمار ہو گئے اور مثنوی کی تصنیف کا سلسلہ بند ہو گیا ایک دن آپ کے صاحبزادے نے مثنوی کی تصنیف کا ذکر چھیڑا تو فرمایا سفر آخرت درپیش ہے اب یہ راز کسی اور کی زبان سے ادا ہوگا چنانچہ آپ کا شعر ہے ؎

باقی ایں گفتہ آید بی گماں　　　در دل ہر کس کہ باشد نور جاں

اس وجہ سے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چھٹا دفتر مولانا نے خود نہیں لکھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا کو صحت ہوئی تو چھٹا دفتر خود ہی مکمل کیا اور ساتواں دفتر بھی لکھا جس کا مطلع ہے ؎

ای ضیاء الحق حسام الدین سعید　　　دولتت پاینده، عمرت بر مزید

مثنوی سے پہلے اخلاق و تصوف پر جو کتابیں تصنیف ہوئیں ان کا انداز یہ تھا کہ مختلف عنوان قائم کر کے ان پر اظہار خیال کیا جاتا اور پھر مزید روشنی کے لئے حکایات لکھی جاتیں حکیم سنائی اور خواجہ عطار کا یہی انداز تھا لیکن مثنوی معنوی میں کسی قسم کی ترتیب و تبویب نہیں دفتروں کی جو تقسیم ہے ان میں بھی مضامین کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا بلکہ مولانا حکایتیں اور قصے لکھتے ہیں اور علمی مسائل حسب موقع بیان کرتے جاتے ہیں ان کے پیش نظر یہ بات ہے کہ جو لوگ علمی مضامین پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کر سکتے وہ قصہ اور حکایت کی دلچسپی کی وجہ سے اس طرف مائل ہو جائیں چنانچہ ذیل کے شعر میں اس طرف اشارہ کیا ہے ؎

؎ خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں   گفتہ آید در حدیث دیگراں

مثنوی کی خصوصیات

(۱) مثنوی کی سب سے بڑی خصوصیت مولانا کا طرز استدلال اور سمجھانے کا طریقہ ہے۔ مولانا کو یہ احساس ہے کہ فلسفیانہ موضوع گہرائی کے باعث آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا اس لئے وہ جب کوئی بحث چھیڑتے ہیں اسے تشبیہوں اور تمثیلوں کے ذریعے قارئین کے ذہن نشین کراتے جاتے ہیں

۲۔ اگرچہ مولانا سے پہلے بھی فرضی حکایتیں لکھ کر اخلاقی مسائل کی تعلیم دی جاتی تھی لیکن مولانا نے اپنے فلسفیانہ شعور اور شاعرانہ صلاحیتوں کی بدولت اس طریق تعلیم کو کمال کے مرتبے پہ پہنچا دیا ہے

۳۔ مولانا ہدایت اور تعلیم کو سخن پردازی اور شاعری کی نسبت زیادہ اہمیت دیتے ہیں ان کے پیش نظر عالم و عارف بھی ہیں اور مبتدی و عامی بھی ان کا روئے سخن سب کی طرف ہے اس لئے زبان بھی ایسی ہی استعمال کی ہے جو سب کی سمجھ میں آ سکے۔

۴۔ جن جن مسائل پہ مذہبی یا عقلی لحاظ سے لوگوں کو اختلاف ہے انہیں مولانا مناظروں کی صورت میں بیان کرتے ہیں مسائل کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں پر پر زور دلائل پیش کرتے ہیں۔ پھر محققانہ انداز میں خود فیصلہ دیتے ہیں جس سے تمام غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں

(۵) مثنوی میں قرآنی معارف کی نہایت شرح و بسط سے تفسیر کی گئی ہے یہاں تک کہ مثنوی کا آغاز بھی کلام مجید کے انداز پر ہوا ہے کلام مجید کے شروع میں سورہ فاتحہ ہے جو کلام مقدس کا لب لباب ہے اسی طرح مدنے "،کہ روح انسانی قرار دے کر تصوف و معرفت کا ماحصل ابتدائی چند اشعار میں پیش کر دیا ہے باقی کے تمام دفاتر انہی اشعار کی تفسیریں ہیں اسی لئے مولانا روم کے ہموطنین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے ؎

مثنوی معنوی، مولوی !   ہست قرآن در زبان پہلوی

امیر خسرو

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے ہندوستان کی قدیم ادبی زبان یعنی سنسکرت ایران پاکستان کی فارسی کی رشتہ دار ہے اور اہل ہند اور اہل ایران ہم نژاد ہیں موجودہ فارسی کا رواج ہندوستان میں بعد اسلام اور خاص کر غزنویوں کی سلطنت کے بعد ہوا ہے مغلوں کے عہد میں یہ زبان ہندوستان میں خوب چلی پھولی اور فارسی زبان میں شعر کہنے والے شاعر اور علماء و فضلا پیدا ہوتے لگے ان میں مشہور ترین شاعر امیر خسرو ابن امیر سیف الدین محمود دہلوی ہیں جو اس عہد کے بعض مشہور ایرانی شاعروں کے ہم عصر ہیں آپ کے والد ترکستان کے شہر کش کے رہنے والے تھے یہ مغلوں کے ہنگامے میں ہندوستان فرار ہو گئے اور یہاں شہر پٹیالہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اسی شہر میں ۶۵۱ھ کے لگ بھگ امیر خسرو تولد ہوئے چونکہ آپ کے والد عالم اور اہل فضل تھے اسی لئے خسرو نے بھی علوم و فنون کی تحصیل شروع کی اور اپنی قومی زبان فارسی کے آثار اور اشعار کا دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرنے لگے یہاں تک کہ اس زبان پر آپ نے کامل عبور حاصل کر لیا اور ایام جوانی سے شعر کہنا شروع کر دیا آپ نے بڑی کثرت سے شعر کہے ہیں اور آپ کا جو کچھ کلام باقی رہ گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ درجہ اول کے شاعر تھے ۔

امیر خسرو کی اقامت گاہ دہلی تھی دہلی کے سلاطین کے یہاں آپ کی بڑی عزت تھی ان میں سے بعض سلاطین کی آپ نے اپنے اشعار میں مدح کی ہے اور ان کا نام لیا ہے

امیر خسرو ہندوستان کے ایک مشہور صوفی بزرگ اور مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے خسرو نے آپ ہی سے سلوک، طریقت،

ریاضت اور درویشی کی تعلیم حاصل کی الفاظ و معنی کے لحاظ سے اپنی شاعری میں انہوں نے ایران کے مشہور شعرا خاص کر خاقانی، نظامی اور سعدی کو اپنے پیش نظر رکھا خصوصاً غزل میں سعدی کے سبک کی پیروی کی چنانچہ خود کہتے ہیں۔ ع جلد منخم دارد شیرازه شیرازی

لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ امیر خسرو اپنے ایک جداگانہ ہی لحن کے مالک ہیں اور یہ لحن ایسا ہے جو تفاوت مراتب کے ساتھ ہندوستان کے دوسرے فارسی شاعروں کے ہاں بھی نظر آتا ہے اس سبک نے بتدریج وہ صورت اختیار کی جو "ہندی سبک" کے نام سے مشہور ہے۔

امیر خسرو کا دیوان جس میں بیشتر مدحیہ قصیدے سلاطین دہلی کے نام ہیں پانچ حصوں میں منقسم ہے

۱۔ تحفۃ الصغر :۔ یہ شاعر کی جوانی کا کلام ہے اس میں زیادہ تر قصیدے، غزلیں، اور ترجیع بند ہیں قصیدوں میں سلطان غیاث الدین بلبن اس کے بیٹے اور حضرت نظام الدین اولیا کی مدح ہے۔

۲۔ وسط الحیٰوۃ :۔ یہ شاعر کی بیس اور تیس سال کی عمر کے کلام کا مجموعہ ہے قصیدوں میں حضرت نظام الدین اولیا، بلبن اعظم کے بیٹے اور شاعر کے سرپرست لضرت الدین سلطان معز الدین کیقباد کی مدح کی ہے۔

۳۔ غرۃ الکمال :۔ یہ شاعر کی تیس اور چالیس سال کی عمر کا کلام ہے اس کے مقدمہ میں فارسی شعر کے محاسن گنائے ہیں اور عربی شعر پر اس کی فوقیت ثابت کی ہے اور ایران کے عظیم المرتبت شعراء جیسے سنائی، خاقانی سعدی، اور نظامی کا نام لیا ہے اس دیوان کے قصیدوں میں حضرت نظام الدین اولیا، سلطان معز الدین کیقباد، جلال الدین فیروز شاہ (۶۸۹-۶۹۵) اور ان کے جانشینوں یعنی رکن الدین اور علاؤ الدین وغیرہ کی مدح کی ہے یہ دیوان پچھلے دو دیوانوں سے زیادہ ضخیم ہے اور اس میں قصیدے،

ترجیع بند اور قطعے ہیں۔

۴۔ بقیّہ نقیّہ :۔ یہ شاعر کے بڑھاپے کا کلام ہے اس کا ایک حصّہ علاؤالدین محمد شاہ (۶۹۵ - ۷۱۵) اور اس کے بیٹے اور دوسرے امیروں کی مدح میں ہے۔

۵۔ نہایت الکمال :۔ یہ شاعر کی زندگی کے آخری دنوں کا کلام ہے اس میں جتنے قصیدے ہیں وہ سلطان غیاث الدین بلبن (۷۰۲ ، ۷۲۰) کی مدح میں ہیں اس میں سلطان قطب الدین مبارک شاہ (متوفی ۷۷۵) کا ایک مرثیہ بھی شامل ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ شاعر کے قصیدوں سے اس کی غزلیں زیادہ بہتر ہیں اور اس بارے میں جیسا کہ اوپر بتا چکے ہیں شاعر نے بڑے بڑے اُستادوں کی پیروی کی ہے۔

بعض اوقات امیر خسرو اپنے قصیدوں کی ابتدا نہایت دلنشین تغزل سے کرتے ہیں مثلاً ان کے یہ شعر ملاحظہ ہوں :۔

صبا ناگاہ آن آمد کہ راہ بوستان گیرد　　زمین را سبزہ در دیبا و گل در پرنیان گیرد
بھد از چشمہ موج آب لرزان در زمین افتد　　زند بر لالہ باد تند و آتش در زبان گیرد
زبان از گفتن آتش نسوزد لیکن از سوسن　　حدیث لالہ گوید ترسم آتش در جہان گیرد
تماشا کن کہ چون بگرفت لالہ کوہ را دامن　　کسی کو تیغ بے موجب کشد خونش چنان گیرد

خاقانی کی طرح امیر خسرو نے بھی نہایت طول طویل قصیدے لکھے ہیں ان میں سے ایک قصیدہ خاقانی کے اس قصیدے پر لکھا ہے جس کا مطلع یہ ہے

دل من پیر تعلیم است و من طفل زبان دانش

امیر خسرو کے قصیدے کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے ؎

دلم طفلست و پیر عشق استاد زبان دانش
سواد لوحہ سبق دمسکنت گنج دبستانش!

اس قصیدے میں شاعر نے تقویٰ اور اخلاقیات کے مضامین کے سوا صوفیانہ نکات بھی بیان کئے ہیں ان میں سے ایک شعر یہ بھی ہے ۔

مشو بینا بچشم مہر کہ نارو دیدہ خود راہم بدل بیں تا ببینی ہر چہ خواہی ماہ تا بانش

امیر خسروؔ کی غزلیں غزل کی حد سے آگے نہیں بڑھی ہیں اور ان کا موضوع بیشتر عاشقانہ مضامین ہی ہیں ان میں آرزوئے دیدار، ہجران یار، نرگس بیمار سوزش شمع وار کے مضامین باندھے ہیں یار کرشمہ ساز، زلف کمند انداز سیل اشک خدنگ نرگس مست ۔ ابروئے چوگاں اور کبک خوش گام وغیرہ سے بحث کی ہے ۔ زہد خرقہ پوشاں اور دیر ولد نوشاں کا آپس میں مقابلہ کیا چشم تریا اور اس کے احوال و اشکال فراواں کی خوب داد دی ہے ۔

امیر خسروؔ حکیم نظامی سے خاص اعتقاد رکھتے تھے اور اس استاد کی تقلید میں خمسہ کہا ہے ان کے خمسہ کو ذیل کے عنوان میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔

۱۔ **مطلع الانوار** :۔ یہ مثنوی نظامی کی مثنوی مخزن الاسرار کے جواب میں لکھی ہے اس میں بیشتر دینی و اخلاقی اشعار ہیں یہ مثنوی ۶۹۸ھ میں اختتام کو پہنچی اور علاؤالدین محمد شاہ کے نام معنون کی گئی ۔

۲۔ **شیریں و خسرو** :۔ یہ مثنوی نظامی کی مثنوی خسرو شیریں کے مقابل لکھی ہے اور یہ بھی ۶۹۸ھ میں اتمام کو پہنچی ہے اس نظم کے آخر میں شاعر نے اپنے صاحبزادے مسعود سے خطاب کیا ہے اور اس مثنوی کو بھی علاؤالدین محمد شاہ کے نام معنون کیا ہے ۔

۳۔ **مجنوں و لیلیٰ** :۔ یہ نظامی کی مثنوی لیلیٰ و مجنوں کے جواب میں لکھی گئی ہے اس کا سنہ تصنیف بھی متذکرہ بالا سال ہے اور اسی حکمراں کے نام معنون کی گئی ہے اس مثنوی کا سب سے پراثر حصہ وہ اشعار ہیں جن میں شاعر نے اپنی ماں اور اپنے بھائی کی وفات کا ماتم کیا ہے اس کا مطلع ہے ۔

امسال دو نور ز اختر ام رفت ہم مادرم و ہم برادرم رفت

۴۔ آئینہ سکندری :۔ یہ نظامی کے سکندر نامہ کا جواب ہے اور ۶۹۹ھ میں نظم ہوئی ہے اور یہ بھی علاؤالدین کے نام معنون کی گئی ہے۔

۵۔ ہشت بہشت :۔ یہ مثنوی نظامی کی مثنوی ہفت پیکر کا جواب ہے اور اس میں بہرام کی حکایت بیان کی گئی ہے یہ مثنوی ۷۰۱ھ میں نظم ہوئی ہے اور اس کے خاتمے پر شاعر نے بیان کیا ہے کہ پورا خمسہ تین سال کی مدت میں کہہ گیا ہے اور اس زمانے کے ایک عالم و فاضل قاضی شہاب الدین نے ان کا مطالعہ کر کے ان کی تصحیح کی ہے۔

مذکورہ بالا تصانیف کے سوا امیر خسرو کی اور بھی تصانیف اور منظومات ہیں جیسے "قرآن السعدین" "دریہ سپہر" "مفتاح الفتوح" یہ سب کتابیں سلاطین ہند کے حالات اور ان کے اوصاف پر لکھی گئی ہیں یہ ادبی قیمت سے زیادہ تاریخی اہمیت کی حامل ہیں منثور تصانیف میں ایک تصنیف "خزائن الفتوح" بھی تاریخ پر لکھی ہے۔ ہزل، مطائبہ، تنقید اور شکوائی قصیدے پر بھی خسرو نے قلم اٹھایا ہے۔

امیر خسرو نے نہ صرف پچھلے قصے نظم کئے ہیں بلکہ اپنے زمانے کے قصے بھی نظم کئے ہیں چنانچہ اپنے ہم عصر اور ممدوح علاؤالدین محمد کے بیٹے خضر خاں کی سرگذشت کو ایک نہایت پر اثر انداز میں مثنوی خضر خاں و دول رانی میں بیان کیا ہے امیر خسرو موسیقی میں بھی استاد تھے چنانچہ شعر و موسیقی کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا ہے۔

مصرع :۔ پاسخش گفتم کہ من ھد بر دو معنی کاملم

امیر خسرو کو فن انشا میں بھی درک حاصل تھا چنانچہ اس موضوع پر انہوں نے رسائل الاعجاز کے نام سے ایک کتاب یادگار چھوڑی ہے

فی الجملہ امیر خسرو کو ہندوستان میں مقیم سب سے بڑا ایرانی شاعر کہا جا سکتا ہے ان کا امتیازی وصف کلام کی روانی ہے وہ نظم سخن میں سرعت خیال

اور جودت طبع کے حامل تھے چنانچہ صرف خمسہ۔ جس میں تقریباً آٹھ سو شعر ہیں صرف تین سال کی مدت میں نظم کیا ہے وہ ہندوستان کے دوسرے شاعروں کی طرح ایک خاص لحن اور ایک خاص لطافت رکھتے ہیں وہ بعض الفاظ اور ترکیبوں کے استعمال میں ایرانی شاعروں کے محل استعمال سے اتنے دور ہوگئے ہیں کہ اپنی طبیعت کی روانی، اعلیٰ ذوق اور اپنے ایجاد پسند ذہن رسا کے باوجود اپنے متقدم نظامی کے درجہ کو نہ پہنچ سکے۔

امیر خسرو نے ۷۲۵ھ بہ مقام دہلی وفات پائی۔

(تاریخ ادبیات ایران رضا زاد شفق)

امیر خسرو اگرچہ ہندی نژاد تھے لیکن ایرانی شعراء کو بھی ان کی شاعری اور زباندانی کا اعتراف کرنا پڑا جامی بہارستان" میں لکھتے ہیں کہ خمسہ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا طوطی ہند جوان کا خطاب تھا ایرانی بھی اسی خطاب سے یاد کرتے تھے۔

عرفی: بہ روح خسرو از یں پارسی شکر دادم | کہ کام طوطی ہندوستان شود شیریں
خواجہ حافظ: شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند | زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

آذری نے جواہر الاسرار" میں لکھا ہے کہ شیخ سعدی خسرو سے ملنے کے لئے شیراز سے دلی میں آئے اگرچہ یہ روایت قرین قیاس نہیں اور بعض تذکرہ نویسوں نے صراحتہً اس واقعہ سے انکار کیا ہے تاہم اس سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ آذری کے نزدیک خسرو اس پایہ کے شخص تھے کہ سعدی کا ان کی ملاقات کے لئے سفر کرنا ممکن تھا اور اس قدر تو تمام مورخوں اور تذکرہ نویسوں کو تسلیم ہے کہ جب سلطان شہید نے سعدی کو شیراز سے بلایا تو انہوں نے بڑھاپے کا عذر کیا اور لکھ بھیجا کہ خسرو جوہر قابل ہیں ان کی تربیت کی جائے اس وقت خسرو کی عمر ۲۲ برس سے زائد نہ تھی۔

امیر خسرو کی شاعری قدرتی تھی وہ ماں کے پیٹ سے شاعر پیدا ہوئے تھے ان کے باپ دادا شاعری سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھتے تھے بلکہ قلم کے بجائے تیغ سے کام لیتے تھے تاہم امیر کے دودھ کے دانت بھی نہ ٹوٹے تھے کہ ان کی زبان سے بے اختیار شعر نکلتے تھے دیباچہ غرۃ الکمال میں خود لکھتے ہیں۔

"در آں صغرسن کہ دنداں می افتاد، سخن می گفتم و گوہر از دہانم می ریخت"

دیوان تحفۃ الصغر کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :- "چوں مرا استادے سر آمدہ دبر سر نیامدہ بود کہ بر سر دقائق دال شدنے وآہوئے مشکبار قلم را از سودا خطا باز آوردے"

ایک مدت تک یوں ہی لیطور خود کہتے رہے استاد کے بجائے اساتذہ کے دیوان کو سامنے رکھ کر ان کا تتبع کرتے تھے جس دیوان کا مطالعہ کرتے تھے اسی انداز پر کہنا شروع کرتے خاقانی کا کلام دیکھا تو بہت مغلق نظر آیا اس کے الفاظ حل کئے لیکن خود تحفۃ الصغر میں لکھتے ہیں کہ اس کا تتبع نہ ہوسکا پہلا دیوان بالکل بے اصلاح ہے امیر اس کو مرتب کرنا بھی نہیں چاہتے تھے لیکن بھائی کی خاطر مجبور ہوگئے۔

لیکن بالآخر وہ اپنا کلام اساتذہ کو دکھلانے لگے ہشت بہشت کے خاتمہ پر تصریح کی ہے کہ یہ کتاب شہاب کی اصلاح یافتہ ہے۔

معاصر استادوں کے علاوہ خسرو نے قدیم اساتذہ سے بہت فیض حاصل کیا ہے اور وہ ان کے کلام کو سامنے رکھ کر کہتے تھے اور اسی طرح سے فائدہ اٹھاتے تھے جس طرح کوئی شاگرد زندہ استاد سے شاعری سیکھتا ہے اسی بنا پر لیلیٰ مجنوں میں نظامی کی نسبت لکھتے ہیں ؎

زندہ است بہ معنی او شادم | در نیست منش حیات دادم

شیخ سعدیؒ سے استفادہ کا اشارہ کرتے ہیں۔

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت　　شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود

امیر خسرو کے حالات شاعری میں یہ سب سے عجیب تر واقعہ ہے کہ وہ اپنے کلام پر آپ ریویو کرتے ہیں اور ایسی بے لاگ رائے دیتے ہیں کہ ان کا دشمن سے دشمن بھی ایسی آزادانہ رائے نہیں دے سکتا "قرآن السعدین" میں انہوں نے کیقباد اور بغرا خاں کا حال لکھا ہے لیکن اصل واقعہ کو چھوڑ کر خاص خاص چیزوں کی تعریف میں اس قدر مصروف ہو جاتے ہیں کہ واقعات کا سلسلہ بالکل ٹوٹ جاتا ہے اور کلام نہایت بے ربط ہو جاتا ہے اس عیب کو خود ظاہر کرتے ہیں۔

وصف بر آں گونہ فرو راندہ ام　　کز غرض قصہ فرو ماندہ ام
عیب چناں نیست کہ بنہفتہ ام　　کانچہ بگویند ہمہ گفتہ ام
چوں متہم اندر قلب کاں خویش　　معترف عجز بہ نقصان خویش
عیب یکی نیست کہ جویند باز　　چوں ہمہ عیب است چگویند باز

غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ شاعری کی تین قسمیں ہیں

۱۔ استاد تمام: جو کسی طرز خاص کا موجد ہو جیسے حکیم سنائی، انوری، ظہیر، نظامی،

۲۔ استاد نیم تمام: جو خود کسی طرز خاص کا موجد نہیں لیکن کسی خاص طرز کا پیرو ہے اور اس میں کمال بہم پہنچایا ہے

۳۔ سارق: جو اوروں کے مضامین چراتا ہے پھر لکھتے ہیں کہ استادی کی چار شرطیں ہیں۔

طرز کا خاص موجد ــــ اس کا کلام شعرا کے انداز پر ہو۔ صوفیوں اور واعظوں کے طریقہ پر نہ ہو۔ غلطیاں اور لغزشیں نہ کرتا ہو۔

یہ شرائط لکھ کر فرماتے ہیں کہ میں درحقیقت استاد نہیں اسلئے کہ چار شرطوں میں سے مجھ میں صرف دو شرطیں پائی جاتی ہیں یعنی میں سرقہ نہیں کرتا

اور میرا کلام صوفیوں اور واعظوں کے انداز پر نہیں لیکن دو شرطیں مجھ میں موجود نہیں اول تو میں کسی طرز خاص کا موجد نہیں دوسرے میرا کلام لغزشوں سے خالی نہیں ہوتا

امیر خسرو نے شعر و شاعری کے متعلق دیوانوں کے دیباچہ میں بہت سے نکتے لکھے ہیں جن سے اس فن کے متعلق مفید نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ غرۃ الکمال کے دیباچہ میں اس پر بحث کی گئی ہے کہ فارسی اور عربی شاعری میں کس کو ترجیح ہے فیصلہ فارسی کے حق میں کیا ہے اور اس کی یہ دلیلیں.. لکھی ہیں۔

۱۔ عربی میں ایسے زحافات ہیں کہ اگر فارسی میں ہوں تو کلام ناموزون ہو جائے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فارسی کے اوزان ایسے منضبط اور لطیف ہیں کہ ذرا سی کمی بیشی برداشت نہیں کر سکتے۔

۲۔ عربی زبان میں ایک ایک چیز کے لئے متعدد مترادفات ہیں اس لئے شاعری آسان ہے ایک لفظ کسی وزن یا بحر میں نہ کھپ سکا تو دوسرا موجود ہے بخلاف اس کے فارسی میں نہایت محدود الفاظ ہیں باوجود اس کے فارسی شعرا پر میدان شاعری تنگ نہیں۔

۳۔ عربی زبان میں صرف قافیہ ہے ردیف نہیں

اب غور کرو عربی زبان کو متعدد طرح کی وسعت حاصل ہے وزن اتنا وسیع کہ جتنے زحافات چاہیں استعمال کرتے جائیں لفظوں کی بہتات کہ ایک لفظ کے بجائے دوسرا اور دوسرے کے بجائے تیسرا موجود ہے ردیف کی سرے سے ضرورت نہیں نرے قافیہ پر مدار ہے جس قدر قافیے ملتے جائیں کہتے جاؤ ان سب وسعتوں کے ساتھ عربی شاعری فارسی شاعری پر غالب نہیں آسکتی۔

اس کے علاوہ عرب کا شاعر اگر ایران میں آئے اور برسوں قیام کرے تاہم فارسی زبان میں شعر نہیں کہہ سکتا لیکن ایران کا شاعر بے تکلف عربی میں شاعری

کرسکتا ہے زمخشری اور سیبویہ عجمی تھے لیکن زباندانی میں عرب سے کم نہ تھے فارسی کے وجوہ ترجیح لکھ کر لکھتے ہیں کہ اور بہت سے وجوہ ہیں لیکن میں اس لیئے قلم انداز کرتا ہوں کہ کوئی مذہبی تعصب کے پردے میں مخالفت پر آمادہ نہ ہو جائے۔

امیر خسرو فن شاعری میں جن خصوصیات کے لحاظ سے ممتاز ہیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ ایران میں جس قدر شعرا گزرے ہیں خاص خاص اصناف شاعری میں کمال رکھتے تھے مثلاً فردوسی و نظامی مثنوی میں انوری اور کمال قصائد میں، سعدی اور حافظ غزل میں یہی لوگ جب دوسری صنعت میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو پھیکے پڑ جاتے ہیں بخلاف اس کے امیر خسرو قصائد، مثنوی اور غزل تینوں میں ایک درجہ رکھتے ہیں۔ مثنوی میں نظامی کے بعد آج تک اُن کا جواب نہیں ہوا غزل میں وہ سعدی کے دوش بدوش ہیں قصائد میں ان کی چنداں شہرت نہیں ہوئی لیکن کلام موجود ہے۔

۲۔ ایشیائی شاعری پر عام اعتراض ہے کہ خاص خاص چیزوں پر نظمیں نہیں لکھی گیئں مثلاً قلم، کاغذ، کشتی، دریا، شمع، صراحی، جام، خاص خاص میوے اور پھولوں وغیرہ وغیرہ پر ایسی مسلسل اور لمبی نظمیں نہیں ملتیں جن سے ان کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے امیر خسرو نے ایشیائی شاعری کی اس کمی کو پورا کر دیا ہے انھوں نے قرآن السعدین میں اکثر اسی قسم کی نظمیں لکھی ہیں اور اس کتاب سے ان کا بڑا مقصد اسی قسم کی شاعری کا نمونہ قائم کرنا تھا۔

۳۔ تشبیہہ شاعری کے چہرے کا غازہ ہے لیکن تقلید پرستی نے یہ حالت پیدا کر دی تھی کہ جن چیزوں کی جو تشبیہیں ایک دفعہ قدماء کے قلم سے نکل گیئں ان کے سوا گویا دنیا کی تمام چیزیں بیکار تھیں۔ امیر خسرو نے بہت سی نئی تشبیہیں خود پیدا کیں وہ چونکہ ہندی زبان سے آشنا تھے اس لیئے تشبیہات

میں ان کو برج بھاکا کے سرمایہ سے بہت مدد ملی ہوگی۔

مثنوی میں وہ نظامی کے پیرو ہیں نظامی کے پنج گنج میں تین قسم کی مثنویاں ہیں رزمیہ، عشقیہ اور صوفیانہ امیر خسرو نے بھی ان تینوں مضامین کو لیا ہے اور ہر رنگ کو نظامی کے انداز میں لکھا ہے۔

قران السعدین ان کی سب سے پہلی مثنوی ہے جو ۳۶ برس کی عمر میں لکھی اس لئے اس میں تکلف اور آورد بہت ہے لیکن باوجود اس کے اکثر جگہ نہایت بلند، رواں اور برجستہ ہے مثنوی کا قصہ نہایت بے ہودہ تھا یعنی باپ بیٹوں کی مخالفانہ خط وکتابت اور حملہ کی تیاری بیٹا یعنی کیقباد و نہایت گستاخ اور بے تمیز تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہی صاحب تخت تھا اور اسی کی فرمائش سے یہ مثنوی لکھی گئی بیٹا یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کی گستاخیاں جن کو وہ اپنی دلیری کے کارنامے سمجھتا تھا مفصل اور آب ورنگ کے ساتھ لکھی جائیں اور یہ ثابت کیا جائے کہ باپ کے ہوتے تخت سلطنت کا مستحق بیٹا ہے اس جھوٹی منطق کو امیر خسرو نے جہاں تک ہوسکا خوب نباہا ہے۔

قران السعدین کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نظم اور لطائف نظم کی پابندی کے ساتھ تاریخی حیثیتیں تمام ملحوظ رکھی گئی ہیں اس طرح کہ کوئی نثر لکھتا تو اس سے بڑھ کر ان باتوں کو نہ لکھتا۔

خمسہ میں پانچ مثنویاں ہیں یعنی مطلع الانوار، شیریں خسرو، لیلیٰ مجنوں، آئینہ سکندری اور ہشت بہشت جس ترتیب سے ہم نے ان کتابوں کے نام لکھے ہیں یہی ان کی تصنیف کی ترتیب ہے چنانچہ امیر خسرو نے خود ہشت بہشت میں تشریح کی ہے ان پانچوں کتابوں کی تصنیف کا زمانہ کل سوا دو سو برس ہے اور یہ قادر الکلامی اور پرگوئی کا حیرت انگیز اعجاز ہے۔

قصیدہ میں ان کا کوئی خاص انداز نہیں ہے کمال اسماعیل، خاقانی اور انوری کی تقلید کرتے ہیں اور جس کے جواب میں قصیدہ کہتے ہیں اس کا تتبع

کرتے ہیں ان قصائد میں مدحیہ مضامین ہمیشہ بدمزہ اور پھیکے ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ مدح دل سے ان کو پسند نہیں صرف معاش کی ضرورت سے یہ ذلت گوارا کرتے ہیں اس لئے قصیدہ میں   اور مضامین کو لیتے ہیں اور ان میں زور طبع دکھاتے ہیں مثلاً بہار کا سماں، برسات کی رُت، صبح وشام کی کیفیت ایک قصیدہ میں برسات کے آغاز سے تمہید شروع ہوتی ہے اور صرف مطلع میں سب کچھ کہہ دیا ہے سه

ابر بارید و ہمہ روی زمیں را تر کرد   خبر آرید کہ سبزہ چہ قدر سر بر کرد

غزل قدماء کے زمانے تک کوئی مستقل چیز نہ تھی سعدی نے غزل کو غزل بنا دیا امیر خسرو کی غزل گوئی پر تقریظ کرنی ہو تو صرف یہ کہنا کافی ہے کہ وہی خمخانہ سعدی کی شراب ہے جو دوبارہ کھنچ کر تیز ہو گئی ہے۔

غزل کی جان کیا ہے درد و سوز و گداز، جذبات، معاملات عشق، عجز و نیاز اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ یہ جذبات اور معاملات جس زبان میں ادا کئے جائیں وہی زبان ہو جس میں عاشق معشوق سے راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے یعنی سادہ ہو بے تکلف ہو نرم ہو لطیف ہو نیاز آمیز ہو اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ چھوٹی چھوٹی بحریں ہوں جملوں کی ترکیبوں میں نام کو بھی الجھاؤ نہ ہو۔۔ قریب الفہم خیالات ہوں اس حد تک امیر خسرو شیخ سعدی کے دوش بدوش ہیں لیکن وہ اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں انہوں نے غزل کی اصلیت کے علاوہ کمال شاعری کی بہت سی چیزیں اضافہ کیں اور ایجادات اور اختراعات کے چمن کھلا دیئے۔

وہ شگفتہ اور چھوٹی چھوٹی بحریں اختیار کرتے ہیں جن میں خواہ مخواہ بات کو صفائی، سادگی اور اختصار سے ادا کرنا پڑتا ہے۔

سه تو چہ دانی نیاز مندی چیست   چوں خدایت بر کس نیاز نہ داد

سوز و گداز کے خیالات جب وہ ادا کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آگ

سے دھواں اٹھ رہا ہے اس میں کبھی معشوق سے اپنا حال کہتے ہیں کبھی اپنی تصویر کھینچتے ہیں کبھی خود اپنے آپ پر ان کو رحم آتا ہے ؎

ماجرائے دوست پرسیدی کہ چوں بگذشت حال
اے سرت گردم چہ مے پرسی بدشواری گذشت

غزل کی ترقی کا نوروز لطف ادا اور جدت اسلوب ہے جس کے موجد شیخ سعدی ہیں لیکن پھر وہ نقش اولین تھا امیر خسرو کی بوقلموں طبیعت نے جدت اسلوب کے سیکڑوں نئے نئے پیرائے پیدا کر دئے جو اگلوں کے خواب و خیال میں بھی نہ آئے تھے ؎

جاں ز تن بردی و در جانی ہنوز دردہا دادی و درمانی ہنوز
ہر دو عالم قیمت خود گفتہ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

عموماً شعرا اور اہل فن اپنے کلام کا رتبہ عام بول چال سے برتر سمجھتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک جداگانہ زبان پیدا ہو گئی ہے۔ جس کا نام علمی زبان ہے مگر امیر خسرو کی غزلیں اکثر اس زبان میں ہوتی ہیں کہ گویا دو آدمی آپس میں بیٹھ کر بالکل بے تکلف سیدھی سادی باتیں کر رہے ہیں اس میں کہیں کہیں خاص محاورے بھی آجاتے ہیں اس کے علاوہ امیر خسرو نے اکثر مسلسل غزلیں لکھی ہیں اور خاص خاص کیفیتوں کا نقشہ اس خوبی سے کھینچا ہے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔ خیال بندی اور مضمون آفرینی کا موجد کمال اسماعیل خیال کیا جاتا ہے لیکن کمال کی جدت قصائد کے ساتھ مخصوص ہے غزل میں اس نے اس رنگ کی مطلق آمیزش نہیں کی غزل میں نئے نئے مضامین اور نئے نئے اسلوب پیدا کرنے امیر خسرو کا ایجاد ہے اور انہی پر خاتمہ ہو گیا ہے ؎

پیش تو آفتاب نتواں جست روز روشن چراغ نتواں کرد

امیر خسرو نے صنائع و بدائع میں جو بھی کمال دکھایا ہے ان کے صنائع بے تکلف ہوتے ہیں اور اس حد تک نہیں پہنچتے کہ نکتہ گیری کی زد میں آئیں صنعت

طباق یعنی اضداد ان کی خاص مرغوب چیز ہے اور وہ اس کو بڑی خوبی سے نباہتے ہیں۔

ع درد ہا دادی و درمانی ہنوز

(شعر العجم شبلی نعمانی)

امیر خسرو کے والد سیف الدین محمود لاچین قبیلے سے تعلق رکھتے تھے ترکستان کا شہر کش آپ کا وطن تھا۔ فتنہ تاتار میں وطن سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور پٹیالی میں مقیم ہو گئے۔ سیف الدین کی شادی ایک دس ہزاری خرچہ کے افسر اعماد الملک کی بیٹی سے ہوئی جس سے امیر خسرو ۶۵۱ھ ہجری میں پیدا ہوئے۔

امیر خسرو نے باقاعدہ تعلیم نہیں پائی تذکروں سے اس قدر پتہ چلتا ہے کہ آپ نے خواجہ اسد الدین سے فن خطاطی سیکھا تھا آپ متعدد زبانیں بھی جانتے تھے بچپن ہی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا پھر آپ کے نانا اعماد الملک نے آپ کی تربیت کی۔ اعماد الملک کا شمار اس زمانے کے بڑے سرداروں میں ہوتا تھا اس کے دربار میں امراء و رؤسا کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ امیر خسرو کا بچپن انہی لوگوں میں گزرا جہاں وہ کی مجلسوں میں مصاحبوں کی بذلہ سنجیوں سے لطف اندوز ہوتا اور شعراء و موسیقاروں کے نغموں سے محظوظ ہوتا تھا اسی طرح اس کے شعر و نغمہ کے فطری جذبے کی تربیت ہوتی رہی امیر خسرو بچپن ہی سے شعر کہنے لگا تھا۔ اعماد الملک فوت ہوا تو امیر خسرو نے شعرا کے مربی و محسن ملک چھجو کے دربار کا رخ کیا جس کی سخاوت کے چرچے بہت دور دور تک ہوتے تھے یہاں انہوں نے ملک چھجو اور دوسرے امرا کے قصیدے کہہ کر اپنے شعر و سخن کی دھاک بٹھائی کہ بیس سال کی عمر میں ان کا شمار اول درجے کے شعراء میں ہونے لگا ملک چھجو کے دربار سے کسی وجہ سے دل برداشتہ ہوئے

بلبن کے بیٹے بغرا خاں کے دربار میں چلے گئے اور اس کے بعد بلبن کے دوسرے بیٹے محمد قاآن حاکم ملتان نے اس کو اپنی مصاحبت میں لے لیا قاآن کے دربار میں شاہنامہ، دیوان سنائی، قصائد خاقانی اور نظامی کی مثنویاں پڑھی جاتیں اور علماء مختلف شعراء پر تنقید و تبصرہ کرتے تھے محمد قاآن بھی ان تنقیدوں میں حصہ لیتا تھا اسی دربار میں خسرو اور حسن سنجری کی دوستی اور محبت کا چرچا رہا ملتان میں امیر خسرو پانچ سال تک رہے اور اپنے کلام کا دوسرا مجموعہ "وسط الحیات" تصنیف کیا جس کا چرچا ہندوستان سے دور ایران میں بھی پھیل گیا تھا چنانچہ شیخ سعدی اس کے بڑے مداح تھے تیمور خاں نے جب ملتان پر حملہ کر کے شہزادہ محمد کو شہید کر دیا تو بقول شبلی نعمانی امیر خسرو اور حسن کو اسیر کر لیا اور انہیں بلخ بھیج دیا وہاں وہ دو سال رہے لیکن ڈاکٹر وحید مرزا نے اس سے اختلاف کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ وہ بلخ نہیں پہنچے بلکہ محافظوں کی موت کی وجہ سے واپس دلی آنے کا موقعہ مل گیا اور بلبن کے دربار میں شہزادہ محمد کا مرثیہ سنایا جسے لوگ مہینوں تک پڑھتے رہے جس کا شعر ہے ؎

واقعہ است ایں یا بلا از آسمان آمد پدید

آفت است ایں یا قیامت در جہاں آمد پدید

پورا مرثیہ نہایت دردناک ہے اس کا بلبن پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ اسی صدمے سے راہی ملک و بقا ہوا۔ بلبن فوت ہوا تو ۶۸۵ ہجری میں بغرا خاں کا بیٹا کیقباد تخت نشین ہوا اور بادشاہ بن کر عیش و عشرت میں زندگی بسر کرنے لگا بغرا خاں نے اس کی عشرت پسندی کا ذکر سنا۔ تو دہلی کا رخ کیا بیٹے کو خبر ملی تو اس نے باپ کے ساتھ مقابلہ کرنے کی ٹھان لی اس عرصہ میں باپ اور بیٹے کے درمیان مصالحت کے لئے نامہ و پیام ہوتے رہے آخر دونوں میں صلح ہو گئی کیقباد چاہتا تھا کہ اس صلح کے واقعہ کو نظم کیا جائے چنانچہ امیر خسرو

اس خدمت پر مامور ہوا امیر خسرو نے چھ ماہ کے عرصہ میں مثنوی "قران السعدین" لکھی جس میں اس واقعہ کا مفصل حال لکھا ہے یہ مثنوی ۶۸۸ھ ہجری میں لکھی گئی۔

کیقباد کی وفات کے بعد جلال الدین خلجی کے ہاتھ میں عنانِ حکومت آگئی وہ بڑے جاہ و جلال کا بادشاہ تھا اگرچہ وہ سخت گیر تھا لیکن اس کی طبیعت میں رنگینی اور مزاج میں شگفتگی بھی تھی شعر بھی کہتا تھا امیر خسرو نے اس زمانے میں مثنوی "مفتاح الفتوح" لکھی جو جلال الدین خلجی کی فتوحات پر مشتمل ہے سلطان جلال الدین کا انجام اچھا نہ ہوا اس کے بھتیجے علاؤالدین خلجی نے ۶۹۵ھ ہجری میں اسے دھوکے سے قتل کر کے ملک کی باگ ڈور سنبھالی۔

علاؤالدین کا یہ فعل بہیمانہ ضرور تھا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ بہت باعزم شخص تھا اس کی ملکی فتوحات اور انتظام سلطنت کے ساتھ ساتھ علم پروری بھی حیرت انگیز تھی اس کے دربار میں علماء فضلاء کا جمگھٹا لگا رہتا اس میں زیادہ شہرت امیر خسرو اور حسن کو حاصل تھی امیر خسرو نے علاؤالدین کی فتوحات کو اپنی مثنوی "خزائن الفتوح" میں نظم کیا ہے۔

امیر خسرو نے نظامی گنجوی کے خمسے کے جواب میں جو پانچ مثنویاں تصنیف کیں وہ علاؤالدین خلجی کے زمانے ہی میں لکھی گئی تھیں اور اسی بادشاہ کے نام سے منسوب ہیں۔

امیر خسرو نے مثنوی "نہ سپہر" قطب الدین مبارک کے عہد میں لکھی تو انہیں ہاتھی کے برابر روپے تول کر دیئے گئے ۷۱۶ ہجری میں امیر خسرو نے حضرت نظام الدین اولیاء کے ہاتھ پر بیعت کی حضرت آپ سے بہت محبت کرتے تھے اور انہیں ترک اللہند کا لقب دیا تھا۔ جب قطب الدین مبارک ۷۲۱ ہجری میں اپنے ایک نومسلم غلام کے ہاتھوں قتل ہوا تو خاندان خلجی میں کوئی لائق شہزادہ نہ پاکر امراء نے ایک ترک امیر غازی ملک کو تخت و تاج

سونپا چنانچہ وہ غیاث الدین تغلق کے نام سے تخت نشین ہوا اس نے بڑی فراخدلی سے امیر خسرو کی سرپرستی کی امیر خسرو نے اس کا حق ادا کرنے کے لئے مثنوی "تغلق نامہ" لکھی اور اسے سلطان کے نام سے منسوب کیا یہ اسی عہد کی تاریخ ہے غیاث الدین بلبن نے جب بنگال پر فوج کشی کی تو امیر خسرو بھی ہمرکاب تھا ابھی یہ بنگال ہی میں تھا کہ اپنے مرشد نظام الدین اولیاء کے انتقال کی خبر ملی آپ نے سُنا تو سخت پریشان ہوئے اور دہلی کی راہ لی یہاں پہنچ کر چھ ماہ تک مرشد کے مزار کی مجاوری کی اس کے بعد آپ بھی راہئ ملک بقا ہوئے آپ کا سال وفات ۷۰۵ہجری ہے۔

امیر خسرو ان خوش نصیب شعراء میں سے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی ہی میں شہرت و قبولیت حاصل کرلی تھی امیر خسرو نے اپنی بیشتر کتابیں خود اپنی زندگی ہی میں ترتیب دیں آپ نے اپنے پانچ دیوانوں میں خاصے طویل دیباچے خود اپنے قلم سے لکھے ہیں اکثر قصائد کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا گیا ہے کہ یہ کب اور کس کی شان میں کہے گئے ہیں یہ التزام مثنویوں میں بھی قائم ہے امیر خسرو خوش ذوق فنکار تھے اس لئے آپ نے مثنویوں کی ترتیب و تدوین بڑے اہتمام سے کی ہے کتابوں کی ترتیب میں آپ کے بعض دوستوں نے بھی مدد دی ان میں تاج الدین زاہد خاص طور پر قابل ذکر ہیں

مولانا جامی آپ کی تصنیفات کی تعداد ننانوے بتاتے ہیں لیکن اب صرف بائیس کتابیں دستیاب ہوتی ہیں۔

امیر خسرو کے قصائد خاقانی، انوری اور کمال اسمٰعیل کے قصیدوں پر کہے گئے ہیں آپ کا اپنا کوئی خاص انداز نہیں آپ کے قصائد میں مدح عموماً پھیکی ہوتی ہے لیکن قصائد کی تشبیب میں زور طبع جھلکتا نظر آتا ہے آپ کے بعض قصائد پند و موعظت سے لبریز ہیں بعض میں تصوف و عرفان کی چاشنی بھی ہے قصیدہ "بحرالابرار" ان مطالب کی عمدہ مثال ہے۔

غزل گوئی میں امیر خسرو کے پیش رو سعدی علیہ الرحمۃ ہیں آپ کی شاعری کا شباب عین اس وقت شروع ہوا جب سعدی اپنا شباب گزار چکے تھے سعدی شیراز میں بیٹھے ہوئے غزل سرائی کرتے اور یہاں دہلی میں اہل ذوق ان کی شیریں نوائی سے متاثر ہوتے تھے چنانچہ امیر خسرو نے بھی فن غزل گوئی میں انہی کی پیروی کی اسی وجہ سے آپ کو "طوطی ہند" کا لقب ملا۔ امیر خسرو محض مقلد نہ تھے انہوں نے غزل میں بعض نئی باتیں بھی پیدا کیں جن کا مختصر ذکر درج ذیل ہے۔

(۱) **سوز و گداز** :۔ امیر خسرو کے پیش رو سعدی کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے غزل کا الگ وجود قائم کر کے اسے ترقی دی اسلئے انہیں غزل کا امام کہا جاتا ہے لیکن ان کی غزلیات میں جذبات کی حدت اور سوز و گداز حسن کی دلکشی اور دلربائی کو کچھ اس طرح نظم کے پیکر میں ڈھال دیا ہے کہ پڑھ پڑھ کر دل وجد کرتا ہے

کافری رفت و دلم غارت کرد　　شہر اسلام و مرا داد نبود
می روی گریہ می آید مرا　　ساعتی بنشیں کہ باراں بگذرد

۲۔ **تشبیہات کی جدت** :۔ امیر خسرو کی تشبیہات بالعموم تازہ اور طبعزاد ہوتی ہیں کوئی غزل ایسی نہیں جس کی تشبیہوں میں یہ خصوصیت نہ ہو تشبیہوں کے انتخاب میں ہندی ماحول سے بھی آپ کو بہت کچھ مدد ملی ہے فارسی شاعری میں عموماً رفتار محبوب کو مور یا چکور کے خرام سے تشبیہ دی جاتی ہے لیکن خسرو کو کبوتر کی مستانہ چال میں بھی وہی کیف و مستی نظر آتی ہے ؎

خرام آں صنم ناز بیں بعیاری　　کبوتری بخرام آمدہ است پنداری

۳۔ **منظر کشی** :۔ منظر کشی کے لئے ضروری ہے کہ شاعر کے دل کو فطرت کے حسن و جمال سے گہرا لگاؤ ہو اور الفاظ و بیان پر پوری پوری قدرت ہو یہ دونوں صفات امیر خسرو کے ہاں بدرجہ کمال ہیں مثنوی "قران السعدین" میں آپ

کا فن منظر کشی انتہا کو پہنچا ہوا ہے ساری مثنوی قلمی تصویروں سے منقش ہے آپ کی عکاسی مختصر مگر جوش اور تاثیر سے بھرپور ہوتی ہے ؎

باد صبا چو از رخ او زلف در ربود — ابر سیاہ کشادہ شد و آفتاب گرد
خلقی براہ منتظر جان سپردن آمد — ای ترک نیم مست عناں را کشیدہ تر

۴۔ معاملہ بندی :۔ عشق و ہوسناکی میں جو معاملات پیش آتے ہیں ان کے بیان کو بقول مولانا شبلی اہل لکھنو معاملہ بندی کہتے ہیں مولانا معاملہ بندی کا موجد امیر خسرو کو سمجھتے ہیں ؎

جانا! اگر شبیت دہن بر دہن نہم — خود را بخواب سازم گوکیں دہاں کیست

۵۔ موسیقی :۔ امیر خسرو موسیقی کے ماہر تھے اس لئے جہاں ان کی توجہ حسن کلام پر تھی وہاں حسن صوت پر بھی تھی چنانچہ انہوں نے شعوری و غیر شعوری طور پر بھی کوشش کی ہے کہ شعر میں زیادہ سے زیادہ ترنم پیدا کیا جائے یہ اسی کا اثر ہے کہ سرود و نغمہ کی صدائیں ان کے الفاظ میں سمائی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ایسے متناسب اور ہم آہنگ الفاظ لاتے ہیں کہ شاعری موسیقی کا قالب اختیار کر لیتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طاؤس و رباب کی سریں مصرعوں میں ڈھل گئی ہیں۔ علامہ شبلی کا خیال ہے کہ امیر خسرو کی چھوٹی بحر والی غزلوں میں موسیقی کا لطف زیادہ ہے اور طویل بحر والی غزلوں میں کم لیکن میرا خیال ہے کہ طویل بحر والی غزلوں میں زیر و بم کی زیادہ گنجائش ہے ؎

نمی دانم چہ منزل بود شب جائیکہ من بودم — بہر سو رقص بسمل بود شب جائیکہ من بودم

مضمون آفرینی ــــ مضمون آفرینی جو سبک ہندی کی خصوصیت ہے کمال اسمٰعیل کی ایجاد ہے لیکن اس کی مضمون آفرینی قصائد تک محدود رہی غزل میں اس کا موجد امیر خسرو ہے ؎

زہی عمر دراز عاشقان گر — شب ہجراں حساب عمر گیرند
کسی نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی — مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

تصوّف: امیر خسرو نے اپنے کلام کے ذریعے تصوف کا ہمہ گیر اور آفاقی پیغام دیا ہے۔ یہ پیغام ان تعلقات کا نتیجہ ہے جو حضرت نظام الدین اولیاؒ اور امیر خسرو کے درمیان پیری مریدی کی صورت میں قائم ہے امیر خسرو نے اپنے مرشد کی زبان بن کر صوفیانہ عقائد کی تبلیغ بالکل اسی طرح کی جیسے کہ سرسید کے خیالات کی تبلیغ ایک مخصوص رنگ میں حالیؔ نے کی تھی۔

امیر خسرو لوگوں کو تصوف کی سادہ تعلیم سے آشنا اور روشناس کرانا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے پیچیدہ ترکیبوں اور دقیق اصطلاحوں سے گریز کیا اور تصوف کی تعلیم کو سادہ، سلیس اور عام فہم بنا دیا۔

امیر خسرو کی غزل میں عشق مجازی کا جو غلبہ نظر آتا ہے اس کی وجہ ایک تو یہی مسلک تصوف کی سادگی ہے اور دوسری یہ کہ عشق مجازی چونکہ افراد میں مشترک ہے اور اس کے واردات عموماً سب پر گزرتے ہیں اس لئے اس کے باریک سے باریک نکتوں کو سمجھنے میں قارئین کو دشواری پیش نہیں آتی تیسری وجہ یہ ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ ہندوستان کی غیر مسلم آبادی کو رجوع الی اللہ کرنا چاہتے تھے جو مجاز پرستی کی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اس لئے صوفیانہ عقاید کی تبلیغ کا بہتر ذریعہ یہی تھا کہ عشق مجازی کی ترجمانی کی جاتی آپ کی اکثر غزلوں میں عشق مجازی کا رنگ جھلکتا ہے مثلاً یہ غزل جس کا مقطع ہے ؎

بیک آمدن ببردی دل و جان صد چو خسرو　　کہ زید اگر بدینسان دو سہ بار خواہی آمد

غزل میں تسلسل: غزل دلی جذبات کے اظہار کا نام ہے چنانچہ غزل میں عموماً مختلف قسم کے جذبات پیش کئے جاتے ہیں لیکن عاشق کی باتیں کبھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں اور کبھی ان میں تسلسل پایا جاتا ہے۔ اس لئے غزلوں کے اشعار مختلف بھی ہوتے ہیں اور متواتر بھی امیر خسرو کی بعض غزلیں مسلسل ہیں کسی ایک کیفیت میں اتنی شدت اور ہمہ گیری ہوتی ہے کہ اس کے اثر میں پوری غزل لکھ دیتے ہیں مثال کے طور پہ ایک غزل جس کا مقطع ہے ؎

خسرو غریب است و گدا افتادہ در شہر شما　　باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

آپ کے اسلوب بیان پر ہندی ماحول کا اثر معلوم ہوتا ہے

ہندی ماحول کا اثر ہندی ماحول کے زیر اثر انہوں نے ہندی الفاظ کو اتنی موزونیت کے ساتھ استعمال کیا ہے کہ وہ فارسی زبان کا جزو معلوم ہوتے ہیں۔

مقبولیت شعر و فکر میں آپ کو اتنا بلند مقام حاصل ہے کہ اکثر شعرا نے آپ کی عظمت کا اعتراف کیا ہے حافظ شیرازی آپ کے بہت معتقد تھے عرفی اور غالب نے اپنے کلام میں خسرو کی عظمت کے اعتراف میں اشارے کئے ہیں۔

(ادب نامہ ایران مقبول بیگ بدخشانی)

عراقی

فخر الدین نام اور وطن عراق تھا اسی نسبت سے عراقی تخلص کیا والد کا نام ابراہیم ہے "سیر العارفین" کے مصنف لکھتے ہیں کہ آپ شہاب الدین سہروردی کے خواہر زادے تھے

مولانا جامی نے "نفحات الانس" میں عراقی کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے عالم طفلی ہمدان میں گزارا۔ بچپن ہی میں کلام مجید حفظ کیا پھر ہمدان کے مدرسے میں داخل ہو گئے طبیعت لاابالی تھی بچپن نے حسن و جمال کے دلدادہ تھے سترہ برس کے تھے کہ قلندروں کی ایک جماعت ہمدان میں وارد ہوئی ان کے ساتھ ایک صاحب جمال لڑکا تھا اسے دیکھ کر دل دے بیٹھے قلندروں کا قیام جب تک ہمدان میں رہا آپ بھی ساتھ ساتھ رہے لیکن جونہی کہ قافلہ محبوب نے کسی اور جگہ کا رخ کیا آپ بھی چار ابرو کا صفایا کر کے ساتھ ہو لئے یہ قافلہ ایران سے چل کر ہندوستان آیا اور ملتان میں مقیم ہو گیا عراقی نے یہاں بہاؤالدین زکریا کا ذکر سنا تو خدمت میں حاضر ہوئے اور حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے چنانچہ اپنی ارادت کا ذیل کے شعر میں ذکر کیا ہے ؎

پرسی اگر از جہاں کیست امام الانام   نشنوی از آسماں جز زکریا جواب

حضرت بہاؤالدین کی کشش اتنی زیادہ تھی کہ وہ محبت مجاز پر غالب آ گئی حضرت شیخ نے آپ کو جہاں گرد قلندروں کی صحبت سے نکال کر خلوت میں لا بٹھایا یہاں آپ نے چلہ کشی اختیار کی ابھی دس ہی دن گزرے تھے کہ وجد کی کیفیت طاری ہوئی اور اسی حال میں یہ غزل کہی جس کا مطلع ہے ؎

نخستیں بادہ کاندر جام کردند   ز چشم مست ساقی وام کردند

یہ غزل آپ خوش الحانی کے ساتھ زور زور سے پڑھتے اور روتے تھے غزل کا چرچا شہر بھر میں اس تیزی سے ہوا کہ خرابات نشین بھی اسے چنگ و بربط سے گاتے سنے گئے۔ شیخ کے ارادتمندوں نے عراقی کی شکایت کی اور غزل کا ذکر کیا۔ شیخ عراقی کے حجرے میں گئے اور فرمایا وہ غزل ہمیں بھی سناؤ جس کا شہر بھر میں اتنا چرچا ہو رہا ہے انہوں نے غزل سنائی جب اس مقطع پر پہنچے ؎

چو خود کردند راز خویشتن فاش　　عراقی را چرا بدنام کردند

حضرت زکریا فرمانے لگے "کار او تمام شد" عراقی کو گلے لگا کر انہیں اپنا خرقہ پہنا دیا پھر رابطہ اس قدر بڑھا کہ اپنی صاحبزادی سے عراقی کا نکاح بھی کر دیا جن سے کبیر الدین پیدا ہوئے۔ شیخ کی وفات کے بعد عراقی حج کو چلے گئے اس کے بعد آپ مختلف مقامات پر رہے آخر مصر میں چھ ماہ کا عرصہ گزار کر شام آ گئے جہاں آپ کا فرزند کبیر الدین ملتان سے چل کر آپ سے آملا عراقی نے یہیں ۶۸۸ھ ہجری میں انتقال کیا اور شام کے عظیم صوفی شیخ محی الدین ابن عربی کے پہلو میں دمشق میں دفن ہوئے۔

عراقی کے کلام میں سبک خراسانی کی طرح سادگی اور روانی ہے لیکن جذبات کے اظہار اور محبوب کے ذکر و فکر کا جہاں تک تعلق ہے آپ "سبک عراقی" کے پیرو ہیں آپ پر عشق مجازی کا اس قدر غلبہ تھا کہ جہاں جہاں گئے، عشق و محبت کی داستان چھوڑ گئے۔ غزلیات آپ کی داخلیت کی یادگار ہیں ان میں آپ نے واردات قلبی کا اظہار نہایت والہانہ انداز میں کیا ہے یہی عشق مجازی آپ کے لئے عشق حقیقی کا بھی وسیلہ بنا لیکن مجاز اس قدر حاوی تھا کہ آپ کے عشق حقیقی پر بھی عشق مجازی کا گمان گزرتا ہے یہ خصوصیت آپ کے تمام کلام میں جاری و ساری ہے ؎

ہاں عراقی جاں بجاناں دہ گرانجانی مکن
بیش ازیں بی رندی خوب یار نتواں زیستن

خواجو کرمانی

کمال الدین ابوالعطاء محمود بن علی کرمانی متخلص بہ خواجو خود اپنے قول کے مطابق یعنی مثنوی گل و نوروز کے ایک قلمی نسخہ کے ایک شعر کے مطابق ۱۵ ارشوال ۶۷۹ھ میں بمقام کرمان پیدا ہوئے پہلے اپنے وطن ہی میں علوم و فضائل کی تحصیل کی پھر سفر اختیار کیا مختلف ملکوں اور مختلف گروہوں سے آشنائی پیدا کی اور دنیا اور اہل دنیا کو خوب آزمایا خود کہتے ہیں ؎

من کہ گل از باغ فلک چیدہ ام　　　چار حد ملک و ملک دیدہ ام

اس سفر کے ضمن میں خواجو کی ملاقات اپنے زمانے کے ایک مشہور صوفی بزرگ علاؤ الدولہ سمنانی (متوفی ۷۳۶ھ) سے ہوئی خواجو نے ان سے کسب فیض کیا اور ان کے ارادتمندوں میں شامل ہو گئے اپنے روحانی مرشد کے بارے میں کہتے ہیں ؎

ہر کو برہ علی عمرانی شد　　　چوں خضر بسر چشمہ حیوانی شد

از وسوسہ و غارت شیطان وارست　　　مانند علاء الدولہ سمنانی شد

خواجو سلطان ابوسعید بہادر (۷۱۶ھ / ۷۳۶ھ) کے ہمعصر تھے انہوں نے اپنے قصیدوں میں اس سلطان کی اور اس کے وزیر غیاث الدین محمود کی مدح کی ہے اسی طرح خواجو نے آل مظفر کے بعض بادشاہوں کی مدح بھی کی ہے اور شیراز کے دوران قیام میں اس شہر کے تمام اکابر، علماء اور فضلاء سے شناسائی پیدا کی تھی ان میں خواجہ حافظ بھی شامل تھے شیخ ابو اسحاق اینجو (۷۴۲ھ - ۷۵۸ھ) نے خواجو کی سرپرستی کی اور خواجو نے اپنے قصیدوں میں اس کی مدح کی ہے۔

خواجو کے دوسرے ممدوحوں میں شمس الدین محمود صاین بھی تھا یہ امیر پہلے چوپانی امرا کی خدمت میں منسلک تھا پھر آل مظفر کے امیر مبارز الدین محمد (۱۳ھ-۷۵۹ھ) کی خدمت اختیار کر لی پھر شیخ ابو اسحاق اینجو کی ملازمت اختیار کی اور اس کی وزارت پر مامور کیا گیا یہ امیر ۷۴۶ھ میں امیر مبارز الدین محمد کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

خواجو کے دوسرے قصیدے عرفانی ہیں یہ شاعر کے صوفیانہ ذوق و مشرب کا نمونہ ہیں اور سنائی کے قصائد کے ہم رتبہ ہیں، قصائد اور مدائح کے سوا خواجو نے نہایت دلکش غزلیں بھی لکھی ہیں اس صنف میں انہوں نے شیخ سعدی کے سبک کی پیروی کی ہے ان غزلوں میں شاعرانہ بلندی اور پیچ پائی جاتی ہے اس لئے وہ اپنے زمانے میں غزل گو شاعر کی حیثیت سے مشہور رہے ہیں اس عہد کے زبردست شاعر حافظ ان کے شعر پسند کرتے تھے حافظ نے ان کی پیروی بھی کی ہے چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

استاد غزل سعدی است پیش ہمہ کس اما دارد سخن حافظ طرز سخن خواجو

دیوان اشعار کے سوا خواجو نے استاد نظامی کی طرز پر مثنویاں بھی لکھی ہیں اور خمسہ کی تکمیل کی ہے ان کے خمسہ کی مثنویوں کے نام یہ ہیں۔

۱۔ **ہمای و ہمایوں** — یہ عاشقانہ داستان ہے بحر متقارب میں کہی گئی ہے اور ذیل کے شعر سے شروع ہوتی ہے ؎

بنام خداوند بالا و پست کہ از ہستش ہست شد ہر چہ ہست

یہ مثنوی بمقام بغداد ۷۳۲ھ میں ختم ہوئی اور شاعر نے اس کے مقدمہ میں سلطان ابو سعید اور اس کے وزیر غیاث الدین محمد (مقتول ۷۳۶ھ) کی مدح کی ہے شاعر نے اس مثنوی کی تالیف کی تاریخ "بذل" سے نکالی ہے کہتے ہیں

؎ کنم بذل بر ہر کہ دارد ہوی کہ تاریخ آں نامہ بذل است و بس

اس مثنوی میں نظامی کے اثر کے سوا شاہنامہ کا سبک بھی نمایاں طور پر محسوس

کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ گل و نوروز :۔ یہ مثنوی بھی عاشقانہ ہے یہ نظامی کی مثنوی خسرو شیریں کے وزن پر لکھی گئی ہے اور بے شبہ یہی خواجو کی بہترین مثنوی ہے اس مثنوی کا پہلا شعر ہے ؎

بنام نقش بند صفحہ خاک　　　عذار افروز مہرویاں افلاک

یہ مثنوی تاج الدین عراقی کے نام معنون کی گئی ہے اور ۷۴۲ھ میں اختتام کو پہنچی ہے

دو شش بر ہفت صد بسی گشتہ فزوں　　　بپایاں آمد ایں نظم ہمایوں

۳۔ کمال نامہ :۔ یہ عرفانی مثنوی ہے ہفت پیکر کے مقابل اس کا آغاز ہوتا ہے "لبسم من لا الہ الا اللہ" اس مثنوی کی ابتدا میں شاعر نے پیروان طریقت اور مراحل معرفت سے بحث کی ہے اور اسے ابو اسحاق اینجو کے نام معنون کیا ہے۔ اس مثنوی کے نظم کی تاریخ کہی ہے ؎

شد بتاریخ ہفت صد و چہل و چار　　　کار ایں نقش آذری چو نگار

۴۔ روضۃ الانوار :۔ خواجو نے یہ مثنوی نظامی کی مخزن الاسرار کے جواب میں لکھی اور اسے ابو اسحاق کے وزیر شمش الدین محمود صاین کے نام معنون کیا ہے۔ روضۃ الانوار کی نظم کی تاریخ ۷۴۳ھ ہے اس میں بیس مقالے ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں۔

حقیقت سخن، مقامات اولیاء، مراتب انسانی۔ تنبیہ و تہدید۔ انقلاب امور عقل و خرد، انتباہ اور انسان شناسی۔ احوالِ نفس متکلم یا حقیقت نفس۔ شرح آیت عشق اعراض عالم ظاہر در رجوع بباطن، صفت پیری و غنیمتِ جوانی مادہ پرستی و شہوت شعاری، عفل و حیا، مذمت کبر، ستائش جود و سخا، صفت توحید موحد۔ صفتِ انسان۔

۵۔ گوہر نامہ :۔ یہ خسرو شیریں کے جواب میں لکھی گئی ہے اس کا موضوع

اخلاق و تصوف ہے اخلاق و تصوف ہے اس کے مقدمہ میں خواجو نے امیر مبارز الدین محمد مظفر فاتح کرمان اور اس کے وزیر بہاؤ الدین محمود کی مدح کی ہے یہ بہاؤ الدین وہی ہے جس کا سلسلۂ نسب چھ واسطوں سے خواجہ نظام الدین طوسی سے جا ملتا ہے اس مثنوی کا مطلع ہے سے

بنام نامدارِ نامداراں گدای درگہ او شہر یاراں

خواجو نے ۷۵۳ھ میں وفات پائی۔

(تاریخ ادبیات ایران رضا زادہ شفق)

خواجو کرمانی کے نام کے بارے میں تذکرہ نویسوں میں اختلاف پایا جاتا ہے مگر صحیح نام جو خواجو کے شعروں سے بھی ظاہر ہوتا ہے کمال الدین خواجو ہے دولت شاہ سمرقندی نے خواجو کو "نخل بند شعرا" کے لقب سے نوازا ہے۔

سال ولادت کے متعلق بھی تذکرہ نویس متفق نہیں خواجو نے اپنی مثنوی "گل و نوروز" میں اپنی تاریخ ولادت ۲۰ ذی الحج ۶۷۹ھ ہجری لکھی ہے اس لئے یہی تاریخ درست سمجھنی چاہیئے خواجو ابھی عمر کے ابتدائی مراحل ہی طے کر رہا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا باپ کی وفات کے بعد تنگدستی اور افلاس سے سابقہ پڑا جس نے عالم شباب میں اسے بے چین کیا۔

خواجو کو عربی اور فارسی دونوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی چنانچہ ان کی غزلوں میں بعض اشعار ایسے بھی ملتے ہیں جن کے دوسرے مصرعے عربی کے ہیں۔ حافظ ایک مدت تک خواجو سے متاثر تھے اس لئے انہوں نے بھی بعض غزلیں خواجو کی تقلید میں لکھتے ہوئے کئی مصرعے عربی میں لکھے ہیں۔

خواجو نے قرآن پاک کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا چنانچہ ان کے کلام میں اسلامی اصطلاحات اور قرآنی تلمیحات اکثر دیکھنے میں آتی ہیں۔

علوم ظاہری کے ساتھ ساتھ علوم باطنی کی تعلیم ایک برگزیدہ شیخ طریقت

علاؤالدولہ سمنانی سے حاصل کی تھی۔

کلام خواجو کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ موسیقی میں بھی اسے دسترس حاصل ہے، موسیقی کے مختلف پردوں، مقاموں اور دستگاہوں کے نام اسے یاد ہیں اور وہ ان کے محل استعمال سے بھی آشنا ہے خواجو نے اپنے وطن میں گوناگوں فضائل حاصل کر لینے کے بعد سفر اختیار کیا مسافرت میں اسے قسم قسم کے انسانوں سے واسطہ پڑا چنانچہ وہ خود کہتا ہے ؎

من کہ گل از باغ فلک چیدہ ام　　　چار حد ملک ملک دیدہ ام

خواجو نے زندگی کا بیشتر حصہ بغداد اور شیراز میں بسر کیا بغداد میں سلطان ابوسعید کے وزیر غیاث الدین محمد کی شان میں قصائد کہے شیراز میں حافظ شیرازی سے بھی ملاقات ہوئی۔

خواجو نے ایک دیوان اور پانچ مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں۔ دیوان غزلیات قصائد، قطعات اور رباعیات وغیرہ پر مشتمل ہے مثنویاں نظامی گنجوی کی تقلید میں لکھی گئی ہیں۔

(۱) مثنوی ہما و ہمایوں:۔ ہما اور ہمایوں کی ایک عشقیہ داستان ہے جس کا پس منظر تاریخی ہے اس مثنوی میں فردوسی اور نظامی کا اثر نمایاں ہے۔

(۲) گل و نوروز:۔ یہ بھی ایک عشقیہ داستان ہے جو تاج الدین عراقی کے نام منسوب ہے اس کی بحر وہی ہے جو نظامی کی "خسرو شیریں" کی ہے روانی اور شیرینی کے اعتبار سے یہ مثنوی خواجو کا شاہکار سمجھی جاتی ہے اس کا سال تکمیل ۷۴۲ ہجری ہے

۳۔ روضۃ الانوار:۔ یہ مثنوی نظامی کی مثنوی "مخزن الاسرار" کی تقلید میں لکھی گئی ہے اور ابو اسحاق اینجو کے وزیر شمس الدین محمود کے نام منسوب ہے سال تالیف ۷۴۳ ہجری ہے۔

۴۔ کمال نامہ:۔ اس مثنوی کا موضوع تصوف و عرفان ہے اس کا سال

تکمیل ۷۴۴ ہجری ہے۔

۵۔ گوہر نامہ :۔ یہ اخلاق و تصوف کے بیان میں ہے خسرو شیریں کی بحر میں ہے۔ان کے علاوہ کہا جاتا ہے کہ خواجو نے شاہنامہ فردوسی کی تقلید میں ایک تاریخی مثنوی "شاہنامہ" کے عنوان سے لکھی اور نثر میں چند رسائل بھی تصنیف کئے۔

طرز سخن :۔ خواجو نے مثنوی "قصیدہ غزل غرضیکہ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی مثنوی میں اس نے نظامی گنجوی کی پیروی کی اور قصیدے خاقانی ' انوری اور ظہیر فاریابی کی تقلید میں لکھے قصیدہ اور مثنوی میں خواجو تقلید کے روایتی حلقے سے باہر نہ نکل سکا اس لئے اپنے فن کے اظہار کے لئے اس نے غزل کو ذریعہ بنایا۔

غزل گوئی :۔ سعدی کی کوششوں سے غزل وجود میں آچکی تھی غزل میں جذبات کی شدت اور گہرائی تو تھی لیکن اس میں فکر کی کمی تھی غزل میں جذبہ کے ساتھ ساتھ فکر کو نمایاں مقام دینے والا شاعر خواجو ہے خواجو کے ذہن کی افتاد فلسفیانہ تھی چنانچہ اس نے فکر اور جذبے کو سمجھ کر غزل میں جدت پیدا کی یہی فکر اور جذبے کا امتزاج ہے جس پر حافظ نے اپنی شاعری کی بنیاد رکھی خواجو نے فقر و عرفان کو غزل کا موضوع بنایا ذیل میں جس غزل کا مطلع دیا گیا ہے حکیم سنائی شیخ عطار اور مولانا روم کا سا فکر و ذکر اپنے اندر سموئے ہوئے ہے ؎

بانوائی خویش را در بی نوائی یافتیم   فخر بر شاہاں عالم در گدائی یافتیم

خواجو کی غزلیات کی زبان میں وہ لطافت نہیں جو سعدی اور حافظ کی غزلیات میں ہے اس کی غالباً وجہ یہ ہے کہ خواجو شیراز سے بہت دور کرمان کا رہنے والا تھا جہاں کی بولی ٹکسالی نہیں سمجھی جاتی تھی فصاحت زبان شیراز کا خاصا تھا جو اہل شیراز کے حصہ میں آئی تھی اس جغرافیائی

بعد کی وجہ سے خواجو زبان کی لطافت اور فصاحت سے محروم رہا۔

خواجو کی اس کمزوری سے حافظ شیرازی آگاہ تھے چنانچہ انہوں نے فکر و جذبہ میں بھی گہرائی پیدا کی اور ساتھ ہی بیان و اظہار کے لئے زبان ایسی لطیف شیریں اور فصیح اختیار کی کہ خواجو کو انہوں نے بہت پیچھے چھوڑ دیا۔

خواجو کی وفات کرمان میں ۷۴۲ھ ہجری میں ہوئی۔

(ادب نامہ ایران مقبول بیگ بدخشانی)

ابن یمین

امیر محمود بن امیر یمین الدین طغرائی سنہ ۶۸۵ھ کے قریب قصبہ فرلوید میں جو خراسان کی ولایت جوین میں واقع ہے، پیدا ہوئے۔

امیر محمود کے والد امیر یمین الدین طغرائی خود بھی شاعر تھے اور اپنے بیٹے کے ساتھ شعر میں مراسلت کرتے تھے سلطان ابوسعید بہادر کی طرف سے خراسان پر خواجہ علاؤ الدین محمد مستوفی (والی) مقرر کیا گیا طغرائی اسی کی دیوانی کے عہدے پر فائز تھے ایران کے شاعروں میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہوگا جسے ابن یمین کی طرح اتنے انقلابات زمانہ سے گزرنا حوادث دوراں سے دوچار ہونا اور ملک ملک اور دربدر کی ٹھوکریں کھانی پڑی ہوں ابوسعید کی وفات اور خراسان میں سربداریوں، ہرات میں آل کرت، گرگاں میں طغا تیموریوں کے ظہور ان کی اور دوسرے امیروں اور سرداروں کی آپس کی لڑائیوں اور شورشوں کی وجہ سے ایران کا ایک بڑا حصہ اور نواح خراساں خاص طور پر قتل و غارتگری اور تباہ کاریوں کا شکار بنا رہا ابن یمین کو ان تمام حادثوں سے دوچار ہونا پڑا اور وہ ایک دربار سے دوسرے دربار میں پناہ ڈھونڈھتا پھرتا رہا۔

شاعر کی زندگی کا ایک اہم حادثہ یہ ہے کہ سنہ ۷۴۳ھ میں امیر وجیہ الدین مسعود سربداری سنہ ۷۳۸، ۷۴۴ھ اور ملک معز الدین حسن کرت (۷۳۲، ۷۷۱) کے درمیان خاف۔ ۔ ۔ کے قریب زادہ میں جو جنگ ہوئی اس میں شاعر کے اشعار کا دیوان گم ہوگیا اور خود اسے گرفتار کر کے ہرات لایا گیا لیکن یہاں امیر حسین کے حکم پر اسے رہا کیا گیا اس امیر نے اس سے بڑی مہربانی اور لطف و کرم کا برتاؤ کیا۔

شاعر کی عمر کا آخری زمانہ اپنی زادگاہ فریومد میں بسر ہوا اس نے ۷۶۹ھ میں وفات پائی اور اپنے باپ کے مقبرہ میں دفن ہوا۔

ابن یمین علمی فضائل اور بڑے اچھے اخلاق کا حامل تھا نہایت متقی اور پرہیزگار تھا خود کہتا ہے :-

من اندر کسب اسباب فضائل! نکردم ہیچ تقصیر و توانی!
ہنر پروردہ ام زینساں کہ بینی بیا انکار کن گر میتوانی

شاعر نے اپنے واقعات اور مختلف تجربوں کو نہایت پرمعنی قطعات میں نظم کیا ہے ان کے سوا اس کے قصیدے بھی ہیں جو بادشاہوں کی مدح میں لکھے گئے ہیں اخلاقی اور اجتماعی مسائل پر قطعے لکھے اور بہترین غزلیں بھی اس کی یادگار باقی ہیں اس کے اشعار کا مجموعہ پندرہ ہزار اشعار کے قریب پہنچتا ہے

ابن یمین کے قطعات کی نظیر ایرانی ادب میں بہت کم ملتی ہے ان قطعات میں شاعر نے سعی و عمل، اپنے دست و بازو اور اپنے عرق جبیں سے روزی کمانے کی ستائش کی ہے اور مستقل مزاجی کی تشویق و تحریص دلائی ہے وہ خود بھی زمین اور جائداد رکھتا تھا ہنگامے فرو ہونے کے بعد اس نے اپنی جائداد بیچی اور زمینداری اور زراعت کا پیشہ اختیار کرلیا جو کچھ اس کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آخری عمر میں اس نے دنیا اور دنیا والوں سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی حتیٰ کہ اپنے دوستوں تک سے دور ہو گیا تھا چنانچہ وہ خود کہتا ہے۔

گوشہ ای گیر و کناری از ہمہ خلق جہاں تا میاں تو و غیری نہ بود جادہ رستہ
بگذر از صحبت ہمدم کہ تو راحت دلی ہمچو آئینہ ز آئینہ ز دم تیرہ شو۔

ابن یمین شیعی مذہب کا پیرو تھا اور صوفیانہ ذوق رکھتا تھا اس ذوق کے مطابق اس نے اشعار کہے ہیں اور ان قدیم ترین شاعروں میں اس کا شمار

ہوتا ہے جنہوں نے تصریح کے ساتھ ائمہ اور شہیدانِ کربلا کا ذکر کیا ہے یہ واقعہ ہے کہ ابن یمین کو اول تو قطعہ میں، پھر قصیدہ اور غزل میں کمال حاصل تھا ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے کہ فن شاعری کے علاوہ دوسرے فنون میں بھی اسے درک حاصل تھا

سہ خداوندا مرا در علم منقول | زبان و دیدہ گو یا گشت و بینا
بمعقولات نیزم دسترس ہست | اگرچہ نیستم چوں ابن سینا!

ابن یمین کا شمار نامی ترین قطعہ گو شاعروں میں کیا جاتا ہے اس سے پہلے یہ فن اس قدر مورد توجہ نہ تھا شاعر نے ہر قطعہ میں فکر و نظر کا اظہار کیا ہے ابن یمین کے بعض قطعات عرفانی ہیں اور ان میں ایمانی نکات بیان کئے گئے ہیں ایسا ہی ذیل کا قطعہ ہے اس میں عرفانی ذوق کے مطابق روحانی ترقی کے مراحل اور مقام وحدت تک رسائی کی منزلیں بیان کی گئی ہیں۔

زدم از کتم عدم خیمہ بہ صحرای وجود | وز جمادی بنباتی سفری کردم و رفت
بعد از آنم کشش طبع بحیوانی بود | چوں رسیدم بوی از وی گذری کردم و رفت
با ملائک پس از آں صومعہ قدسی را | گرد بر گشتم و نیکو نظری کردم و رفت
بعد از آں در صدف سینہ انسان بصفا | قطرۂ ہستی خود را گہری کردم و رفت
بعد از آں رہ سوی او بردم و بی ابن یمین | ہمہ او گشتم و ترک دگری کردم و رفت

ابن یمین کے بعض قطعات میں مطائبات کی جھلک بھی نظر آتی ہے ان قطعات میں شاعر نے مطالب کو ہزل کے رنگ میں ادا کیا! اس کے سوا بعض قطعات میں اس نے مشہور شعرا جیسے فردوسی، عنصری، انوری، معزی، سعدی اور مجیر وغیرہ کا نام لیا ہے اور ان سے تمثیل کیا ہے۔

بعض قطعات شاعر کی ادبی اور فلسفیانہ معلومات پر دلالت کرتے ہیں مثلاً ذیل کے قطعہ میں الفاظ کے آخر میں آنے والے دال یا ذال کے تلفظ کا قاعدہ بیان کیا ہے۔

تعین دال و ذال کہ در مفردی فتد | زالفاظ فارسی بشنو تا نکہ بہم ست
حرف صحیح ساکن اگر پیش او بود | دانست ورنہ ہرچہ جزایں دال معجمست

ابن یمین کے بعض قطعات بزرگوں کے مرثیہ اور تاریخ وفات پر ہیں اور غالباً اس مضمون کے بعض قطعات جن میں بعد میں مادۂ تاریخ بھی نکالا گیا ہے ابن یمین ہی کے قطعات ہوں گے۔

(تاریخ ادبیات ایران رضا زادہ شفق)

باپ کا نام محمود ہے قوم کے ترک تھے اور ترکستان وطن سے سلطان محمد خدا بندہ کے زمانہ میں خراسان میں آئے اور فرلوید میں جو ایک قدیم کا نام ہے قیام اختیار کیا یہاں زمینیں اور جائدادیں خریدیں یہ الجائتو سلطان کا کا عہد حکومت تھا اور علاؤ الدین محمد وزیر السلطنت تھے علاؤ الدین نے ان کی نہایت قدردانی کی شعر کہتے تھے یہ رباعی ان کے انداز کلام کا نمونہ ہے ؎

دارم ز عتاب فلک بوقلموں | وز گردش روزگار حس پر دروں
چشمے چو کنارۂ صراحی ہمہ اشک | جانے چو میانۂ پیالہ ہمہ خوں

ابن یمین فرلوید میں پیدا ہوئے باپ نے شاعری کی تعلیم دی اکثر جن طرحوں پر خود کہتے تھے بیٹے سے بھی کہلاتے تھے چنانچہ اوپر کی رباعی پر ان کی رباعی بھی ہے ؎

دارم ز جفائے فلک آئینہ گوں | پر آہ دلے کہ سنگ ازو گردد خوں
روزے بہ ہزار غم بہ شب رزآورم | تا خود فلک از پردہ چہ آید بیروں

ابتدا میں سربداروں کی مداحی کرتے تھے۔

بالآخر فقر و قناعت اختیار کی اور شاہی تعلقات سے کنارہ کش ہوئے تھوڑی سی زمین قبضہ میں تھی اس کی کاشتکاری سے زندگی بسر کرتے تھے ۸ ر جمادی الثانی ۷۶۹ھ میں وفات پائی، مرتے وقت یہ رباعی لکھی تھی ؎

مگر کہ دل ابن یمین پر خون شد — مگر کہ ازیں سرائے فانی چوں شد
مصحف بہ کف و چشم بہ روی بہ درست — با پیک اجل غمزہ زناں بیروں شد

ان کا دیوان سربداروں کے ہنگامہ میں ضائع ہو گیا غلام علی آزاد "ید بیضا" میں لکھتے ہیں کہ میں نے ان کا دیوان دال کی ردیف تک دیکھا ہے لیکن یہ غالباً قطعات کا دیوان ہوگا تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں وہ غزل اور قصائد سب کچھ کہتے تھے ید بیضا میں ان کی غزل کے بعض اشعار نقل کئے ہیں سے

ہر بدہ ای دیدہ ہر دم اشک غماز مرا — تا نسازد فاش پیش مردماں راز مرا
زخود بیگانہ بودن در رہ عشق! — بہ آں معشوق عادت آشنائی است

ان اشعار سے اگرچہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ غزل میں کم مایہ نہیں لیکن ان کا خاص رنگ اخلاقی شاعری اور اس میں بھی قناعت اور خودداری ان کا خاص حصہ ہے ان مضامین کو ان سے بہتر آج تک کوئی ادا نہ کر سکا اور چونکہ ان قال حال کی تصویر ہے اس لئے ایک خاص اثر رکھتا ہے جو ہر شخص کے کلام میں پیدا نہیں ہو سکتا ہے

اگر دو گاو بدست آوری و مزرعہ — یکی امیر و یکی را وزیر نام کنی
بداں قدر چو کفاف معاش تو نشود — روی و ناں جوی از یہود وام کنی

قناعت اور توکل کے ساتھ یہ نکتہ بھی ابن یمین کے ذہن نشین ہے کہ زر کے بغیر اطمینان حاصل نہیں ہوتا چنانچہ فرماتے ہیں

لالہ را گفتم ای پری پیکر — سیرتت خوب و صورتت نیکوست
راست گو ایں سیہ دلی از چیست — مگرت زحمتی رسید از دوست
گفت زیرا کہ من ندارم زر — زر کہ اسباب شادکامی اندوست
غنچہ را بیں کہ خردہ دارد — می نہ گنجد خرمی در پوست

(شعر العجم شبلی نعمانی)

امیر فخر الدین محمود بن یمین الدین طغرائی آٹھویں صدی ہجری کے ایک مشہور شاعر تھے آپ کے والد یمین الدین بھی شعر کہتے تھے اور طغرائی تخلص کرتے تھے ابن یمین کے سوانح حیات جدید و قدیم تذکروں میں بہت کم ملتے ہیں مصنف تذکرۃ الشعرا لکھتا ہے کہ آپ کے والد امیر یمین الدین ترکی النسل تھے انہیں جوین کے علاقے کے قصبہ میں کچھ جاگیر ملی تھی جوان کی گزر اوقات کے لئے کافی تھی۔

ابن یمین کی شاعری کی شہرت اس وقت ہوئی جب ایران میں ملوک الطوائفی کا دور دورہ تھا تیموری سلطان ابو سعید فوت ہوا تو ہر طرف سے حکومت پر قبضہ جمانے کی کوشش ہونے لگیں یہ حکمران ایک دوسرے سے برسرپیکار تھے خراسان کا علاقہ خاص طور سے قتل و غارت کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اسی سبب سے ابن یمین کو بھی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا کبھی انقلاب کا ریلا ایک دربار میں پہنچا دیتا کبھی کسی دوسرے دربار میں پناہ لینے پر مجبور ہوتے شروع شروع میں آپ نے خواجہ علاؤالدین محمد کی مدح سرائی کی جو سلطان ابوسعید کے دربار میں مستوفی کے عہدہ پر فائز تھا علاؤالدین سربداروں کے ہاتھوں قتل ہوا تو ابن یمین نے اس کے بھائی غیاث الدین کی قصیدہ خوانی کی - سربداروں کی حکومت خراسان میں قائم ہوئی تو ابن یمین گرگان آ گئے اور یہاں کے حکمران طغا تیمور کے قصیدے لکھے اس کے بعد پھر خراسان آ گئے اور سربدار حکمران وجیہ الدین مسعود کی مدحت سرائی کی پھر آپ کو ہرات جانے کا اتفاق ہوا یہاں آل کرت کے امرا خصوصاً معز الدین کے قصیدے کہے اور بڑے بڑے صلے پائے اس عرصہ میں آپ اپنے قصائد اور غزلیات کا دیوان مرتب کر چکے تھے لیکن ۷۴۲ ہجری میں جب وجیہ الدین اور اور ملک معز الدین کرت کے مابین جنگ چھڑی تو یہ دیوان بھی اس کشمکش کی نذر ہو گیا اس بے چینی میں ابن یمین اسیر بھی ہوا لیکن کچھ عرصہ بعد رہائی مل گئی بقیہ زندگی اس نے اپنے آبائی قصبے میں گزاری اور یہیں ۷۶۹ ہجری میں وفات پائی۔

آجکل جو قطعات کا دیوان ملتا ہے اس میں اسیری کے بعد کا کلام ملتا ہے

شروع شروع میں آپ نے بھی امرا کی قصیدہ خوانی کو اپنا شعار بنایا لیکن امیری کے بعد زاویہ نگاہ بدل گیا اور قصیدہ خوانی چھوڑ پند و موعظت پر توجہ دی دیوان کے قطعات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ قناعت پسند پارسا اور گوشہ نشین بزرگ تھے آپ کے دیوان میں پندرہ ہزار اشعار ہیں ان میں تین ہزار اشعار کا موضوع اخلاق اور پند و موعظت ہے۔

ابن یمین تلقین کرتے ہیں کہ انسان کو ناامید نہیں ہونا چاہیئے اگر زمانہ آج موافق نہیں تو کبھی موافق ہو جائے گا اگرچہ ان کی نگاہ میں عجز و انکساری کی بڑی اہمیت ہے لیکن اکثر وہ ہمت اور ارادے کو بلند رکھنے کی ہدایت کرتے ہیں قناعت اور گوشہ نشینی کی ان کی نگاہ میں بڑی اہمیت ہے ؎

برائے نعمتِ دنیا مکش خدمتِ خلق　　که نزدِ اہل خرد زیں سبب خجل باشی

ابن یمین کا عقیدہ ہے کہ اطمینان قلب اور آسائش خاطر بہت بڑی نعمتیں ہیں آپ نے گوشہ نشینی کی حالت میں ۷۶۹ھ ہجری میں وفات پائی

(ادب نامہ ایران مقبول بیگ بدخشانی)

عبید زاکانی

عبید زاکانی ایران کا مشہور ترین ہزل گو اور طنز نگار تھا اس فن کا مظاہرہ اس نے کچھ ایسی بے باکی سے کیا کہ سننے اور پڑھنے والے شرمسار ہو جاتے غالباً اسی وجہ سے ایران کے کسی تذکرہ نویس نے اسے درخور اعتنا نہیں سمجھا پروفیسر براؤن نے اس کے حالات بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں۔

عبید علاقہ قزوین کے قصبہ زاکان میں پیدا ہوا لیکن اپنا وطن اسے سخت ناپسند تھا اسی لئے وطن کو خیرباد کہہ کر شیراز آگیا یہاں اس وقت شیخ اسحاق اینجو کی حکومت تھی۔

عبید نے شیراز میں رہ کر درسی علوم کی تعلیم حاصل کی اور اپنی فطری ذہانت کی بدولت بہت جلد مشہور ہوگیا لیکن نہ کوئی معقول ذریعہ معاش ہی تھا اس لئے بہت پریشان حال رہا۔

عبید نے علم معانی پر ایک کتاب تالیف کی اور اسے دربار شاہی میں رسائی پانے کا وسیلہ بنانا چاہا لیکن اس کی یہ کتاب دیکھ کر بادشاہ کے مصاحبوں نے کہا بادشاہ کو اتنی فرصت نہیں کہ اس بے معنی کتاب کا مطالعہ کرے دوسری مرتبہ عبید بادشاہ کا ایک قصیدہ لکھ کر لے گیا لیکن مقربین نے جو دربار شاہی کے مسخرے تھے یہ کہہ کر اسے لوٹا دیا کہ بادشاہ شاعروں کے جھوٹ اور مبالغوں کو پسند نہیں کرتا عبید پریشان حال تو تھا ہی یہ سن کر اور بھی مایوس ہوا اور خیال کیا کہ جب بادشاہوں کے درباروں میں علم و فضل کی یہ ناقدری ہے تو پھر راتوں کو جاگنے اور خون جگر پینے سے کیا حاصل وہاں سے ناامید ہوکر لوٹ آیا۔

اب اس کی فطری ذہانت نے ایک اور رخ بدلا اور اس نے ہزل گوئی

کی طرف رجوع کیا تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی ہجوؤں کا چرچا طول و عرض ملک میں ہونے لگا امراء رؤسا اکثر اس کی ہجووں سے خائف رہتے اور اس کا منہ بند کرنے کے لئے تحفے تحائف بھی بھیجنے لگے کسی نے عبید سے کہا کہ علم و فضل کو خیر باد کہہ کر ہجو گوئی اختیار کرنا آپ کو زیب نہیں دیتا عبید نے جواب میں فی البدیہہ یہ قطعہ کہا ؎

ای خواجہ مکن تا بتوانی طلب علم   کاندر طلب راتب ہر روزہ بمانی
رو مسخرگی پیشہ کن و مطربی آموز   تا داد خود از کہتر و مہتر بستانی

عبید کی ہجویں دفعتاً آگ کی طرح پھیل جاتی تھیں خواجہ سلمان ساوجی نے عبید کی ہجووں کا ذکر سُنا تو ذیل کے اشعار اس کی ہجو میں کہے ؎

جہنمی ہجاگو عبید زاکانی   مقرر است بہ بیدولتی و بیدینی
اگرچہ نیست ز قزوین و روستازادہ ست   ولیک می شود اندر حدیث قزوینی

سلمان کا یہ قطعہ عبید نے سُنا تو شیراز سے چل کر بغداد آیا اتفاق سے سلمان دجلہ کے کنارے امراء و شعراء کی محفل میں بیٹھا تھا عبید آگے بڑھ کر آداب بجالایا سلمان نے پوچھا تم کون ہو اور وطن کہاں ہے عبید نے جواب دیا کہ ایک مسکین شخص ہوں اور قزوین کا رہنے والا ہوں سلمان نے پوچھا وہاں کوئی سلمان کو بھی جانتا ہے عبید نے جواب دیا بے شک سلمان کہنے لگا اگر اس کا کوئی شعر یاد ہو تو سناؤ عبید نے یہ دو بیت پڑھے

؎ من خراباتیم و بادہ پرست   در خرابات مغاں عاشق و مست
می کشندم چو سبو دوش بدوش   می برندم چو قدح دست بدست

پھر کہا کہ یہ شعر مشہور تو سلمان ہی کے نام سے ہیں لیکن سلمان تو عالم شخص ہے وہ ایسے شعر کیسے کہہ سکتا ہے یہ شعر اس کی بیوی نے اپنے حسب حال کہے ہونگے سلمان بھری محفل میں عبید کا یہ جواب سُن کر سخت افروختہ ہوا اور نادم بھی ہوا قیاس سے پہچانا کہ عبید زاکانی ہے پوچھا کیا تم

عبید زاکانی ہو اس نے کہا " ہاں " پھر اس نے سلمان سے گلہ کیا کہ تم نے ایک ایسے شخص کی ہجو کہی جس کو تم نے کبھی دیکھا بھی نہ تھا میں اس ہجو کا جواب بادشاہ کی محفل میں دینا چاہتا تھا لیکن نصیبہ یاور تھا کہ دجلہ کے کنارے ہی ہاتھ آ گئے۔

شیخ اسحاق اینجو کے عہد میں ترک رؤسا ہر قسم کی بے قاعدگی اپنے لئے جائز سمجھتے تھے ایرانی امراء کی حالت نہایت پست تھی عبید اس صورت حال سے سخت متاثر ہوا چنانچہ طنز نگاری کو معاشرے کی اصلاح کا ذریعہ بنایا اس کی بیشتر تصانیف نظم و نثر اسی رنگ میں ہیں

ذیل کی چھ کتابیں عبید زاکانی کی یادگار ہیں۔

(۱) اخلاق الاشراف :- نثر کی یہ کتاب ۷۰۵ ہجری میں لکھی گئی اس زمانے کے اخلاق و آداب پر یہ تلخ ترین طنز ہے جو ایک دیباچہ اور سات مقالوں پر مشتمل ہے ہر مقالے میں مصنف نے پہلے اخلاق کے متعلق قدیم نظریہ بیان کیا ہے پھر بتایا ہے کہ اس فرسودہ نظریے کو اب منسوخ سمجھنا چاہیئے اصل اخلاق یہ ہے جس سے آجکل کے امراء متصف ہیں۔

(۲) ریش نامہ :- نظم و نثر کی یہ مخلوط کتاب ہے جس میں عبید اور داڑھی کے مابین ایک طویل اور دلچسپ مکالمہ لکھا گیا ہے۔

(۳) صد پند :- یہ کتاب ۷۵۰ ہجری میں لکھی گئی اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ایک سو نصیحتوں پر مشتمل ہے۔

۴- دہ فصل :- یہ کتاب نثر میں ہے اور اس میں مختلف تعریفیں ہیں جو کہ طنزیہ رنگ میں کی گئی ہیں مثلاً "جہاں کسی کو سکون میسر نہیں"

عالم :- "وہ شخص جسے روزی کمانے کا ڈھنگ نہ آئے"

۵- رسالہ دلکشائی :- یہ چند ہزلیہ حکایات کا مجموعہ ہے۔

ان کے علاوہ بعض سنجیدہ کتابیں بھی اس کی یادگار ہیں مثلاً عشاق نامہ

اور فال نامہ ۔۔ عبید نے شیخ اسحاق اینجو۔ سلطان اویس اور بعض دوسرے حکمرانوں کے قصیدے بھی کہے کچھ غزلیات بھی لکھیں

موش وگربہ" عبید زاکانی کی ایک مشہور و معروف نظم ہے ۔

اشعار ذیل سے پتہ چلتا ہے کہ عبید کو عافیت نصیب نہ ہو سکی قرض اور مفلسی سے اس کا زندگی بھر ساتھ رہا ہے

مردم بہ عیش خوشدل و من مبتلائے قرض ہر کس بکار و باری و من در بلائے قرض

قرض خدا و قرض خلائق بہ گردنم آیا اداے قرض کنم یا اداۓ قرض

انہیں پریشانیوں میں عبید نے ۷۷۲ ہجری میں وفات پائی

(ادب نامہ ایران مقبول بیگ بدخشانی)

خواجہ حافظ شیرازی

شمس الدین محمد حافظ جنہیں لسان الغیب کا لقب دیا گیا ہے آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں ۷۲۶ھ کے قریب شیراز میں پیدا ہوئے تذکروں میں ان کے والد کا نام بہاؤالدین لکھا ہے جو فارس کے سلغری اتابکوں کے عہد میں اصفہان سے ہجرت کر کے شیراز چلے آئے تھے خواجہ حافظ کی والدہ کازرون کی رہنے والی تھیں۔

حافظ نے متداولہ علوم کی تحصیل اپنے وطن ہی میں کی اپنے زمانہ کے بڑے بڑے علماء کی مجلس درس سے استفادہ کیا اور ان علوم میں ایک بلند مقام پر پہنچ گئے ان علماء میں ایک قوام الدین عبداللہ (متوفی ۷۷۲ھ) بھی تھے محمد گل اندام جو حافظ کے ہم عصر اہل فضل اور متذکرہ . . . قوام الدین عبداللہ کے حلقہ درس میں ہمیشہ شریک رہنے والوں میں تھے ان کی شہادت موجود ہے کہ "ارجمند پایہ شاعر "بحث بہ کشاف و مصباح، و مطالعہ مطالع و مفتاح، و تحصیل قوانین ادب و تجسس دواوین عرب" پر قدرت رکھتا تھا۔ ظاہر ہے کشاف سے مراد تفسیر زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) کی کشاف، نحو میں مطرزی (متوفی ۶۱۰) کی مصباح، حکمت میں بیضاوی (وفات در آخر قرن ہفتم) کی طوالع الانوار من مطالع الانظار یا منطق میں قطب الدین رازی کی شرح مطالع اور ادب میں سکاکی (متوفی ۶۲۶ھ) کی مفتاح العلوم ہے۔

حافظ نے قرآن شریف کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اسے حفظ کر لیا تھا انہوں نے تخلص بھی اسی رعایت سے اختیار کیا تھا ان کے بعض اشعار سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے چنانچہ کہتے ہیں ؎

ندیدم خوشتر از شعر تو حافظ بقرآنی کہ تو در سینہ داری!

اور عرفانی کے لطیف ذوق کے ساتھ وہ حکمت کی تعلیم قرآنی آیات کے ساتھ دیتے ہیں خود فرماتے ہیں ؎

زحافظانِ جہاں کس چو بندہ جمع نکرد   لطائف حکماء با کتاب قرآنی!

حافظ کی جوانی کے زمانے میں فارس کے سلغری اتابکوں کے دورِ حکومت کو ختم ہوئے عرصہ ہو چکا تھا اور فارس مستقل طور پر مغلوں کے ماتحتوں کے تحت آ گیا تھا اس زمانے میں چوپانیوں کے آخری فرمانروا امیر پیر حسین کے مغلوب ہونے کے بعد اینجو خاندان کا محمود شاہ فارس کی حکومت پر فائز کیا گیا تھا ۷۴۲ھ کا سال تھا کہ محمود شاہ کے بیٹے شاہ شیخ جمال الدین ابو اسحاق اینجو نے جو بڑا لائق اور قابل تھا پیر حسین اور ملک اشرف چوپانی کو شیراز سے نکال دیا فارس کی حکومت خود اپنے ہاتھ میں لے لی اور ۷۵۴ھ تک نہایت خوبی کے ساتھ اس صوبہ پر حکومت کرتا رہا ابو اسحاق نہایت عدل پرور اور داد رس تھا اس نے شیراز کو آباد اور پر رونق بنایا وہ خود بھی پاکیزہ ادبی ذوق رکھتا تھا اس لئے وہ حافظ کی بڑی عزت کرتا تھا اور اس کے پاس ان کی بڑی قدر و منزلت تھی امراء میں یہ پہلا امیر تھا جس نے شاعرِ شیراز کی نظر اپنی طرف پھیر لی تھی حافظ نے بھی کئی جگہ اس کی مدح کی ہے اور اسے "جمال چہرۂ اسلام اور "سپہر علم و حیا" اور ایسے ہی دوسرے القاب کے ساتھ یاد کیا ہے۔

حافظ کا زمانہ بڑے انقلاب اور خونریزی کا زمانہ تھا لیکن اس کے باوجود اس زمانے میں علمائ و فضلاء صوفیاء و اولیاء اور شعراء و ادیب فارس میں بکثرت موجود تھے اسی وجہ سے حافظ کی سخن فہمی کا دائرہ کافی وسیع تھا حافظ نے ابو اسحاق کی حکومت کے زوال پر بہت سے دردناک شعر کہے ہیں شیخ ابو اسحاق کی سلطنت کا خاتمہ آلِ مظفر کے بانی محمد مبارز الدین کے ہاتھوں ہوا تھا پھر اس کے بیٹوں نے یعنی شاہ محمود اور شاہ شجاع نے اس کے خلاف بغاوت کر کے اسے مغلوب کر لیا اور شاہ شجاع کے حکم سے اس کی آنکھوں میں نیل کی سلائی

پیر دی گئی حافظ نے اپنے ایک قصیدہ میں جس کا مطلع ہے

ے دل منہ بروینی واسباب او — تاکہ از او کس وفاداری ندید

اس کی ستمگاری کی طرف اشارہ کیاہے اور اس کے مظالم کا حال یوں بیان کیاہے ے

آنکہ روشن شد جہاں بینش بدو — میل در چشم جہاں بینش کشید

آل مظفر میں مبارزالدین کا بیٹا شاہ شجاع (۷۵۹ ، ۷۸۶) اور اس خاندان کا آخری حکمراں شاہ منصور (۷۸۹ ، ۷۹۵) خاص طور پر حافظ کے ممدوح رہے ہیں اسی بادشاہ کے زمانے میں ایران کو ظاہر پرست خشک متعصبوں کے پنجہ سے رہائی ملی حافظ نے کئی جگہ اپنے اشعار میں اس بادشاہ کا نام لیاہے۔

شاعر کے کلام کے انداز سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاہ منصور بن مظفر نے حافظ کی خاص طور پر سرپرستی کی اور اسی کے زمانے میں شاعر اور اس کے کلام کی شہرت اپنے انتہائی عروج کو پہنچ چکی تھی فرماتے ہیں۔

بیمن دولت منصور شاہی — علم شد حافظ اندر نظم اشعار

ایران کے باہر کے جن بادشاہوں کا نام حافظ نے اپنے کلام میں لیاہے ان میں ایک جلایریوں یا ایل خانی سلاطین کے پانچویں حکمراں سلطان احمد بن شیخ اویس بن حسن (۷۸۴ - ۸۱۳) کا نام بھی شامل ہے یہ خاندان ۷۳۶ھ سے لے کر ۸۱۴ھ تک ایران کے مغرب میں بغداد سے لے کر آذربائیجان تک کے علاقہ پر حکومت کرتا تھا حافظ کے سوا سلمان ساوجی عبید زاکانی اور دوسرے شاعروں نے بھی ان کی مدح کی ہے

مشہور ہے کہ سلطان احمد نے خواجہ کو شیراز سے بغداد آنے کی دعوت دی تھی لیکن شاعر نے کسی وجہ سے یہ دعوت قبول نہیں کی اور ایک غزل لکھ کر اس کے پاس بھیج دی جس کا مطلع ہے ے

احمد اللہ علی معدلۃ السلطان — احمد شیخ اویس حسن ایل کانی

تاریخ فرشتہ کے مصنف کی روایت ہے کہ دکن کے بہمنی سلاطین کے پانچویں حکمران محمود شاہ بن حسن (۷۶۹ ، ۷۸۰) نے جو علم دوست اور ادب پرور تھا حافظ کو اپنے ملک میں بلانا چاہا محمود شاہ نے اس کی دعوت دیتے ہوئے زادِ راہ بھی روانہ کیا حافظ دکن کے ارادے سے کشتی میں سوار ہوئے مگر کشتی طوفان میں پھنس گئی شاعر شیراز نے دریا کی بلا میں مبتلا ہونے سے احتراز کیا اور واپس ہو کر ساحل پہ اُتر گئے اس مسافرت پر پشیمان ہوئے اور ایک غزل لکھ کر بادشاہ کے پاس بھیج دی جس کا مطلع یہ ہے :-

دمی با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد   بمی بفروش دلق ما کزیں بہتر حی دارد

شعر العجم کے مصنف مولانا شبلی کا بیان ہے کہ بنگالہ کے بادشاہ غیاث الدین بن اسکندر نے بھی خواجہ صاحب کو بنگالہ آنے کی دعوت دی تھی - لیکن غیاث الدین کی ... ش کا سال ۷۹۲ ھ لکھا ہے اس لئے اگر یہ دعوت خواجہ صاحب کو دی گئی ہوگی تو اس کے جلوس سے پہلے کی بات ہوگی کیونکہ اس تاریخ تک حافظ کا انتقال ہو چکا تھا -

سعدی کے برخلاف حافظ نے لمبے لمبے سفر نہیں کئے عمر بھر میں ایک مختصر سا سفر تو انہوں نے بندر ہرمز تک اور ایک سفر یزد تک کیا تھا باقی عمر شیراز ہی میں مقیم رہے اور اس شہر کی صفائی ، حسن و زیبائی اور اس شہر کے مقام گلگشت اور دریائے رکنا باد کے ساحل سے ہمیشہ لطف اندوز ہوتے رہے -

خواجہ حافظ نے سنہ ۷۹۱ھ میں شیراز میں وفات پائی -

حافظ کے اشعار ان کے احساس کی لطافت اور تاثیر پذیری کے گواہ ہیں دریا دل شاعر نے اپنے زمانے کے ایسے خونی واقعات میں زندگی بسر کی ہے جب ایران کا پورا ملک انتشار اور ان کی ہنگامہ آرائیوں سے دوچار تھا -

اور خود صوبہ فارس اور شہر شیراز بھی ان سے اپنا دامن نہ بچا سکا تھا خود حافظ نے اپنی آنکھوں سے بادشاہوں کو قتل اور خاندانوں کے افراد میں کش مکش ہوتے دیکھی چنانچہ انہیں حوادث سے متاثر ہو کر کہا ہے ؎

این چہ شوریست کہ در دور قمری بینم　　　ہمہ آفاق پر از فتنہ و شری بینم

حافظ کی روح بزرگ اور فکر توانا وہی عرفانی ذوق تھا جو اُن کی ذات میں کمال کو پہنچا وہ مسلک جسے سنائی، شیخ عطار مولانا جلال الدین رومی اور سعدی نے اپنی زبان اور اپنے بیان میں مختلف طریقوں پر تعبیر کیا تھا حافظ کی ذات میں اپنی انتہائی گہرائی اور تعبیر کے اوج کمال پہ پہنچا وہ مطالب جو مطالب جو شاعروں نے تفصیل کے ساتھ ادا کئے تھے حافظ نے انہیں مختصر سی لیکن بہترین اور شیریں تر غزلوں میں ادا کر دیا وہ توحید اور تصوف میں ایسے ڈوبے کہ ہر قصیدے اور ہر غزل میں ہر عنوان سے اسی ایک مطلب اور اسی ایک مقصود بلند کو ادا کیا شاید شعر حافظ کی سب سے بڑی خصوصیت بھی یہی ہے وحدت میں یہی استغراق ہے جس کی وجہ سے وہ کثرت عالم، اختلاف ادیان، جنگ و جدل اور بیہودہ بحثوں کے قائل نہ ہو سکے اسی لئے کہتے ہیں ؎

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ　　　چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

حافظ کی ساری استادی غزل کی استادی ہے عارفانہ غزل نے حافظ کے ہاتھوں میں پہونچ کر ایک طرف فصاحت اور ملاحت کا درجہ کمال حاصل کیا تو دوسری طرف ایک مخصوص سادگی اختیار کی حافظ نے اپنے اشعار میں مختصر سے الفاظ میں بڑے بڑے مطالب اور لطیف ترین معانی ادا کر دیئے ہیں شیرینی، سادگی اور ایجاز حافظ کی غزل کی امتیازی خصوصیات ہیں اور ان کی روح کی پاکیزگی اور حکمت ان کے ہر شعر سے ہویدا ہے اس سے ظاہر ہے کہ استاد کی غزلیں دل سے نکلی ہیں اور ہر غزل ان

کے کہتے والے کے ضمیر کی لطیف تعبیر ہے یہ تو بالکل ہی واضح ہے کہ شاعر نے ہر طرح کی ظاہر پرستی سے اعراض کیا ہے جبہ و تندیہ کے دام کو پارہ پارہ کر دیا ہے مذاہب اور فرقوں کی ظاہری باتوں کو رد کر دیا ہے اور اپنے اشعار میں شیخ، زاہد اور صوفی جیسے ریا کار عناصر کی خوب خبر لی ہے

حافظ نے غزل میں ایک طرف شیخ عطار اور مولانا روم کی آتش نوائیوں سے استفادہ کیا ہے تو دوسری طرف وہ خود اپنے ہم عصروں کے سبک سے بھی متاثر ہوئے ہیں بنیادی طور پر متقدمین کی پیروی کرتے ہوئے انہوں نے اپنے معاصرین میں خاص کر سعدی، خواجو، سلمان ساوجی، اوحدی اور عماد فقیہ کے سبک کی پیروی کی ہے

اس کے باوجود حافظ نے صرف تقلید پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ وہ خود اپنا ایک مستقل رنگ رکھتے ہیں اور اسی رنگ سے انہوں نے بزم سخن کو ایک رونق تازہ بخشی ہے ان کے اشعار خواجو اور سلمان کے اشعار سے زیادہ لوگوں کے ورد زبان ہیں اس کی وجہ صرف ان کا معنوی مقام، ان کی عظمت اور عرفان ذوق ہی نہیں بلکہ اس میں ان کے شیریں لحن، متانت اور کلام کی روانی کا بھی بہت بڑا حصہ ہے خود شاعر بھی اپنی طبیعت کے حسن، ذوق کی لطافت اور عطیۂ کشف سے واقف ہے اور اسے اپنی نظم کے مقام کی بلندی کا اندازہ ہے اسی لئے تو نہایت اعتماد اور اعتقاد کے ساتھ کہتے ہیں ؎

ندیدم خوش تر از شعر تو حافظ بقرآنی کہ در سینہ داری

یہ واقعہ ہے کہ حافظ نے اپنی طبع عالی روح لطیف، طبع گویا، فکر دقیق ذوق عارفانہ اور عرفان عاشقانہ کے ذریعہ ایسی طرح سخن ڈالی اور مختلف عبارتوں اور مطالب کو آپس میں اس طرح ملایا ہے کہ ان کی وجہ سے عرفانی غزل میں ایک مستقل سبک اور خاص طرز ہی وجود میں آگیا چنانچہ جو لوگ

فارسی ادبیات سے واقف ہیں وہ بے تامل ان کے شعر کو پہچان اور ان کے فکر کو پا لیتے ہیں۔

اچھوتے تخیل کے سوا حافظ نے الفاظ کے استعمال اور معنی کی تعبیر کے سلسلہ میں مخصوص الفاظ اور اصطلاحات بھی وضع کی ہیں یہ خود ہی ان اصطلاحوں کے موجد ہیں یا اگر ان اصطلاحوں سے پہلے کسی نے کام بھی لیا تھا تو بہت کم لیکن حافظ نے ان کو اپنے کلام میں کثرت کے ساتھ استعمال کیا ہے مثلاً مطاعات "خرابات" مغاں، مغبچہ، خرقہ، سالوس، پیر، ہاتف، پیر مغاں وغیرہ

حافظ نے اپنے اشعار میں صنائع و بدائع سے بھی کام لیا ہے مثلاً ایہام، مراعات النظیر، تجنیس وغیرہ مثلاً ذیل کے اشعار ہے

شراب خوردہ و خوی کردہ می روی بچمن | کہ آب روی تو آتش در ارغواں انداخت
(ایہام)

خرقہ زہد آب خرابات ببرد | خانۂ عقل مرا آتش میخانہ بسوخت
(مراعات النظیر)

دلم ز پردہ بروں شد کجائی ای مطرب | خیال ہاں کہ ازیں پردہ کار ما بنواست
(تجنیس کامل)

لعل سیراب بخوں تشنہ لب یار من است | وزپی دیدن او دادن جاں کار من است

شعر حافظ کی ایک معنوی خصوصیت یہ ہے کہ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک غزل کے اشعار میں مطلب کے لحاظ سے تنوع اور اختلاف دیکھنے میں آتا ہے اور اس اختلاف کا ایک بڑا سبب وہی قافیہ کا التزام ہے مثلاً اس نفیس و زیبا غزل یعنی :-

ساقی بنور بادہ بر افروز جام ما | مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکام ما

میں یکایک حاجی قوام کا نام محض قافیہ پیمائی کی وجہ سے آجاتا ہے۔

خواجہ کی نظر میں ہستی کی حقیقت ایک ہے اور وہ خدا کی ذات ہے جو اس

دنیا میں ہر طرف جلوہ گر ہے عالم طبیعی کے بدائع، معنوی عشق اور آدمی کا دل اس کے مظہر ہیں اور واقعتہً یہ اسی کی ذات ہے جو ہر جگہ بلکہ خود آدمی کے ساتھ موجود ہے اگرچہ وہ اسے نہیں پہچانتا اس کے سرِ وجود کی یافت کے لئے رجوع بباطن، حقیقت نفس کا درک، پیر کی رہبری اور حق کی تائید لازمی ہے

بارہا دل طلب جامِ جم از ما می کرد   آنچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا می کرد
گفتمش این جامِ جہاں بین بتو کی داد حکیم   گفت آن روز کہ این گنبد مینا می کرد

خدا کے ساتھ اس وسیع تعلق کے نتیجہ کے طور پر حافظ کی فکر وسیع، نظر جہاں بیں، آنکھ دقیقہ رس، ہمت عالی اور فکر بلند ہے وہ معاملات عالم میں آسان گیر، اسرار کے آشنا، حوادث سے بے غم، حریم عشق میں خاموش اور اس کے محرم ہیں:-

گوش کن پند اے پسر از بہر دنیا غم مخور   گفتمت چون در حدیثی گر توانی دار گوش

(تاریخ ادبیات ایران رضا زادہ شفق)

خواجہ صاحب کے دادا اصفہان کے مضافات کے رہنے والے تھے آتابکان شیراز کے زمانے میں شیراز میں آئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی خواجہ صاحب کے والد کا نام بہاؤالدین تھا انہوں نے یہاں تجارت شروع کی اور کاروبار کو اس قدر ترقی دی کہ دولت مندوں میں ان کا شمار ہونے لگا بہاؤالدین نے جب انتقال کیا تو تین بیٹے چھوڑے ان کو اگرچہ باپ سے بہت بڑا ترکہ ملا تھا لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ نہ تھا چند روز میں باپ کی کمائی سب اڑ گئی بیٹے پریشان ہو کر کہیں کے کہیں نکل گئے لیکن خواجہ صاحب کمسنی کی وجہ سے اپنی ماں کے ساتھ شیراز ہی میں رہ گئے گھر میں فاقے ہونے لگے تو ماں نے ان کو محلہ کے ایک آدمی کے حوالے کر دیا کہ اپنی خدمت میں رکھے اور کھانا دے بیٹے کی کفالت کرے لیکن یہ شخص بد اطوار تھا خواجہ سن شعور کو پہنچے تو اس کی صحبت ناگوار ہوئی چنانچہ اس سے قطع تعلق کر کے خمیر بنانے کا

پیشہ اختیار کیا آدھی رات سے اٹھ کر صبح تک خمیر گوندھتے گھر کے پاس ایک ہی مکتب خانہ تھا محلے کے سب لڑکے اس میں پڑھتے تھے خواجہ صاحب اکثر ادھر سے نکلتے تو دل میں تعلیم کی تحریک پیدا ہوتی رفتہ رفتہ شوق اس قدر بڑھا کہ مکتب میں داخل ہو گئے خمیر سے جو کچھ حاصل ہوتا اس میں سے ایک تہائی ماں کو اور ایک معلم کو دے دیتے بقیہ خیرات کرتے مکتب میں قرآن مجید حفظ کیا معمولی سواد خوانی کی بھی لیاقت حاصل کی اس زمانے میں شعروشاعری کا گھر گھر چرچا تھا محلے میں ایک بزاز رہتا تھا وہ سخن سنج اور موزون طبع تھا اس مناسبت سے اور ارباب ذوق بھی اس کی دکان پر آبیٹھتے تھے اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے خواجہ صاحب پر بھی اس مجمع کا اثر ہوا چنانچہ شاعری شروع کی لیکن طبیعت موزون نہ تھی بے تکے شعر کہتے اور لوگوں کو تفریح طبع کا سامان ہاتھ آتا رفتہ رفتہ ان کی لغو گوئی کی شہرت تمام شہر میں پھیل گئی لوگ تفریح کے لئے ان کو صحبتوں میں بلاتے اور لطف اٹھاتے دو سال تک یہی حالت رہی لوگوں کا استہزا حد سے بڑھا تو ان کو بھی احساس ہوا ایک دن نہایت رنجیدہ ہوئے اور بابا کوہی کے مزار پر جا کر پھوٹ پھوٹ کر روئے رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ ان کو لقمہ کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جا اب تجھ پر تمام علوم کے دروازے کھل گئے نام دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ جناب امیر علیہ السلام ہیں صبح کو اٹھے تو یہ غزل لکھی ؎

دوش وقتِ سحر از غصّہ نجاتم دادند　　　وندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

شہر میں آئے تو لوگوں نے حسب معمول شعر پڑھنے کی فرمائش کی انہوں نے وہی غزل پڑھی سب کو حیرت ہوئی اور سمجھے کہ کسی سے یہ غزل لکھوالی ہے امتحان کے لئے طرح دی انہوں نے طرح میں بھی عمدہ غزل لکھی اسی وقت گھر گھر چرچا ہو گیا ۔

یہ تمام واقعات عبدالنبی نے میخانہ میں لکھے ہیں ان میں اگرچہ خوش اعتقادی

اور وہم پرستی نے بعض باتیں بڑھا دی ہیں یا اصل واقعات کی صورت بدل دی ہے تاہم بہت کچھ اصلی واقعات بھی ہیں

خواجہ صاحب کے کمالات اور شاعری کا چرچا عام ہُوا تو دور دور سے سلاطین اور امراو نے ان کے بلانے کے لئے خطوط بھیجے خواجہ صاحب کے زمانے میں شیراز میں متعدد حکومتیں قائم ہوئیں اور حسنِ اتفاق یہ کہ فرمانروا عموماً خود صاحب علم وفضل اور علماء و شعراء کے نہایت قدردان تھے۔

غازاں خاں (چنگیز خاں کا پوتا) کے زمانے میں غازاں خاں کی طرف سے محمد شاہ فارس اور شیراز کا حکمران مقرر ہو کر آیا اس کے خاندان میں سے شاہ ابو اسحاق اینجو خواجہ حافظ کے زمانے میں تھا وہ نہایت قابل اور فاضل تھا خود شاعر اور شاعروں کا مربی اور قدردان تھا اس کے ساتھ نہایت عیش پسند اور لہو ولعب کا دلدادہ تھا اس بنا پر اگرچہ ملکی انتظامات بے اصول تھے لیکن گھر گھر عیش ونشاط کے چرچے تھے اور شیراز باغ ارم بن گیا تھا خواجہ حافظ کی مستانہ غزلوں میں اس دور کا اثر شامل ہے۔

شاہ ابو اسحاق کی عیش پسندی حد سے بڑھ گئی تو ۷۴۷ھ میں محمد مظفر نے اس پر . . . . مظفر نے شیراز فتح کر لیا اور شاہ اسحاق اینجو کو قتل کر دیا گیا خواجہ صاحب کو سخت رنج ہوا چنانچہ ایک قطعہ لکھا جس میں اس عہد کے تمام ارباب کمال کا تذکرہ ہے۔ شاہ ابو اسحاق کے مرنے کا صدمہ خواجہ صاحب کو مدت تک رہا غزلوں میں بھی بے اختیار ابو اسحاق کا نام زبان پر آجاتا ہے ؎

راستی خاتم فیروزۂ بواسحاقی　　خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

محمد بن مظفر مبارز الدین نہایت متشقف تھا تخت نشین ہونے کے ساتھ ساتھ ہر جگہ محتسب مقرر کئے اور تمام میخانے بند کرا دیئے تذکرہ تقی الدین حسینی میں لکھا ہے کہ خواجہ صاحب نے اسی واقعہ پر ایک غزل لکھی ہے ؎

اگرچہ بادہ فرح بخش و باد گلبیز است　　　بہ بانگ چنگ مخور مے کہ محتسب تیز است
در آستین مرقع پیالہ پنہاں کن　　　کہ ہمچو چشم صراحی زمانہ خونریز است

محمد بن مظفر مبارز الدین کے بعد اس کا بیٹا شاہ شجاع فرمانروا ہوا تو اس نے آزادی تجارت کے لحاظ سے میخانوں کی روک ٹوک اٹھا دی خواجہ صاحب کے دیوان میں ایک غزل ہے وہ اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے ؎

سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بگوش　　　کہ دور شاہ شجاع است مے دلیر بنوش

شاہ شجاع نے ۷۸۶ھ میں انتقال کیا اس کے بعد شاہ منصور بن محمد مظفر بادشاہ ہوا وہ بھی بڑی شوکت شان کا بادشاہ تھا خواجہ صاحب نے اس کی مبارکباد میں غزل لکھی ؎

بیا کہ رایت منصور بادشاہ رسید　　　نوید فتح و ظفر تا بہ مہر و ماہ رسید

منصور کے عین عروج اقبال کا زمانہ تھا کہ تیمور نے شیراز پر حملہ کر دیا منصور نہایت دلیر اور صاحب عزم تھا دو ہزار فوج سے تیمور پر حملہ آور ہوا اور پے در پے تیمور کی فوجوں کو شکست دیتا ہوا قلب فوج تک پہنچ گیا تیمور پر تلوار کا وار کیا قماری ایتاق نامی ایک افسر نے بڑھ کر تلوار کو سپر پہ روکا چار دفعہ پے در پے تلوار ماری لیکن ہر دفعہ قماری ایتاق سینہ سپر ہو جاتا تھا اور تیمور کو بچا لیتا تھا بالآخر فوجوں نے چاروں طرف سے ہجوم کر کے منصور کو قتل کر دیا جس کا خود تیمور کو افسوس رہا وہ کہا کرتا تھا کہ آج تک معرکوں میں کسی کو منصور کا ہمسر نہیں دیکھا۔

تیمور نے خواجہ صاحب کو طلب کیا اور کہا کہ میں نے تمام عالم کو اس لئے ویران کیا کہ سمرقند و بخارا کو کہ میرا وطن ہے آباد کروں تم ان کو ایک تل کے عوض دئے ڈالتے ہو ؎

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا　　　بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

خواجہ صاحب نے کہا انہی فضول خرچیوں کی بدولت تو فقر و فاقہ تک

نوبت پہنچی ہے

اس زمانہ میں جس قدر سلاطین تھے سب آرزو رکھتے تھے کہ خواجہ صاحب کے کلام سے لطف اٹھائیں چنانچہ عراق، عرب، ہندوستان ہر جگہ سے شوقیہ خطوط آئے بغداد کا فرمانروا سلطان احمد بن اویس تھا جو تمام کمالات کا مجموعہ تھا اس نے خواجہ صاحب کو بار بار بلایا خواجہ صاحب بھی للچائے چنانچہ بعض غزلوں میں اس کے اشارے بھی ہیں لیکن پھر بھی "رکنا باد" کی خاک دامن نہیں چھوڑتی تھی چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

نمی دہند اجازت مرا بہ سیر و سفر　　نسیم باد مصلے و آب رکنا باد

دکن میں سلاطین بہمنیہ کا دور تھا اور سلطان شاہ محمود بہمنی مسند آرا تھا وہ نہایت قابل اور صاحب کمال تھا عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں نہایت فصاحت اور روانی کے ساتھ شعر کہہ سکتا تھا عام حکم تھا کہ عرب و عجم سے جو شاعر آئے اسے پہلے قصیدے پر ایک ہزار ٹنکہ جو ہزار تولہ سونے کے برابر ہوتے ہیں انعام میں دئے جائیں

اس کی قدر دانیوں کا شہرہ سنکر خواجہ صاحب کو دکن کے سفر کا خیال ہوا لیکن خیال ہی خیال تھا یہ خبر میر فضل اللہ کو پہنچی جو محمود کے دربار میں صدارت کے منصب پر ممتاز تھے انہوں نے زادِ راہ بھیج کر بلانے کا خط لکھا چنانچہ خواجہ صاحب زادِ سفر کا سامان لے کر شیراز سے روانہ ہوئے اور جہاز پر سوار ہوگئے سوئے اتفاق کہ جہاز نے ابھی لنگر بھی نہ اٹھایا تھا کہ ہوا کا طوفان اٹھا خواجہ صاحب فوراً جہاز سے اترے اور یہ غزل لکھ کر فضل اللہ کو بھیج دی جس کے دو شعر ہیں ؎

دمی با غم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد　　بمی بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد

بس آساں می نمود اول غم دریا بہ بوئے در　　غلط کردم کہ یک موجش بصد من زر نمی ارزد

خواجہ صاحب نے ۷۹۲ھ میں وفات پائی "خاک مصلےٰ" تاریخ ہے۔

ان کے اشعار اور جستہ جستہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت سادگی اور آزادی سے بسر کرتے تھے حافظ قرآن تھے قرآن مجید کے نکات اور حقائق پر درس دیتے تھے لیکن باایں ہمہ اظہار تقدس سے نہایت نفرت رکھتے تھے صاف دل اور بے تکلف تھے۔

خواجہ صاحب اگرچہ اس رتبہ کے شخص تھے کہ ان کے تمام ہم عصر شعرائِ غزل گوئی میں ان کے سامنے ہیچ تھے تاہم وہ سب کو نہایت ادب سے یاد کرتے ہیں بلکہ اپنے آپ کو ان کا پیرو کہتے ہیں خواجو کرمانی کی نسبت کہتے ہیں ؎

استاد غزل سعدی است پیش ہمہ کس اما　　دارد غزل حافظ طرز و روش خواجو

خواجہ صاحب کی شہرت اگرچہ صرف غزل میں ہے لیکن انہوں نے قصائد اور مثنویاں بھی لکھی ہیں اور گو وہ تعداد میں کم ہیں لیکن ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری کے تمام اصناف پر ان کو قدرت حاصل تھی عام خیال ہے کہ جو لوگ غزل اچھی کہتے ہیں قصیدہ اور مثنوی اچھی نہیں لکھتے لیکن خواجہ صاحب کے قصیدے بھی کچھ کم نہیں اور مثنوی میں تو وہ صفائی لطافت اور زور ہے کہ نظامی اور سعدی کا دھوکہ ہوتا ہے۔

خواجہ صاحب اگرچہ قصیدہ اور مثنوی میں بھی اساتذہ سے پیچھے نہیں لیکن ان کا اصلی اعجاز غزل گوئی ہے یہ عموماً مسلّم ہے کہ عالم وجود میں آج تک کوئی شخص غزل میں ان کا ہمسر نہ ہو سکا متوسطین اور متاخرین غزل کے بزم آرا ہیں لیکن ان کو تسلیم ہے کہ خواجہ صاحب کا انداز کسی کو نصیب نہیں ہوا۔

غزل کی بنیاد سعدی نے ڈالی اور امیر خسرو اور حسن نے اس کو ترقی دی ساتویں صدی کا چمن انہی بلبلوں کے زمزموں سے گونج رہا تھا کہ سلمان ساوجی اور خواجو کرمانی نے نغمہ سنجی شروع کی۔ سعدی اور خسرو کے آگے اگرچہ ان کو فروغ نہیں ہو سکتا تھا لیکن یہ دونوں اور اصناف سخن قصیدہ اور مثنوی

میں اسقدر ممتاز اور نام آور تھے کہ اس اثر نے منزل میں کام دیا اس کے ساتھ ان لوگوں نے غزل میں کچھ جدتیں پیدا کیں جو زمانہ کے مذاق کے موافق تھیں اس لئے اور بھی مدد ملی اس سے بڑھ کر یہ کہ سلطنت نے بھی ساتھ دیا سلمان بغداد کے ملک الشعراء اور خواجو ابواسحاق انجو فرمانروائے شیراز کے دربار میں سب سے ممتاز تھے۔

غرض خواجہ حافظ نے آنکھیں کھولیں تو سلمان اور خواجو کا رنگ ملک پر چھایا ہوا تھا خواجہ صاحب نے دونوں کا زمانہ پایا تھا اور اتفاق یہ کہ خواجو نے جب ۷۴۲ھ میں شیراز میں وفات پائی تو دفن اسی مقام یعنی اللہ اکبر میں ہوئے جو حافظ کی خاص سیرگاہ تھی۔ خواجہ صاحب نے غزل گوئی شروع کی تو خواجو کے کلام کو سامنے رکھ کر کہنا شروع کیا چنانچہ خود فرماتے ہیں

ع : دارد سخن حافظ طرز روش خواجو

جو غزلیں ہم طرح ہیں ان میں جا بجا مصرعے تک لڑ گئے ہیں اور مضامین اور ترکیبیں تو کثرت سے متوارد ہیں۔ سلمان کی غزلوں پر بھی اکثر غزلیں ہیں اور ان میں سے بھی اس قدر جا بجا توارد ہے کہ لوگوں کو دونوں کے کلام میں اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے۔

سعدی، خسرو اور حسن تک غزل میں زیادہ تر عشق و عاشقی کے جذبات اور معاملات بیان کرتے تھے خواجو نے دنیا کی بے ثباتی وسعت مشرب اور رندی و مستی پر زیادہ زور دیا خواجہ صاحب نے بھی انہی مضامین پر شاعری کی بنیاد رکھی ہے

سلمان کا خاص مذاق مضمون آفرینی، جدت، تشبیہ اور صنائع لفظی ہے خواجہ صاحب بھی ان چیزوں کو لیتے ہیں لیکن یہ ان کا خاص انداز نہیں سعدی، خسرو اور حسن کا کلام ہمہ تن عشق، سوز و گداز، بیان شوق نا امیدی اور حسرت ہے خواجہ صاحب سعدی کی بھی تقلید کرتے ہیں چنانچہ اکثر غزلیں ان

کی غزلوں پر لکھی ہیں لیکن وہ فطرتاً شگفتہ مزاج اور ولولہ خیز طبیعت رکھتے تھے اس لئے درد و غم کے نوحے ان سے اچھی طرح ادا نہیں ہوتے ۔

خواجہ صاحب اپنے اساتذہ یا حریفوں سے طرحی غزلوں میں چنداں بلند مرتبہ نہیں ہیں ان کی شاعری کے مہمات مضامین بھی ان کا ذاتی سرمایہ نہیں بلکہ خیام کے ابر قلم کے رشحات ہیں با ایں ہمہ ان کی غزلوں نے دنیا میں جو غلغلہ برپا کر دیا اس کے آگے سعدی، خسرو، خواجو اور سلمان کی آوازیں بالکل پست ہو گئیں

حقیقت یہ ہے کہ خواجہ صاحب کی شاعری میں متعدد ایسی باتیں جمع ہو گئی ہیں جن کا مجموعہ اعجاز بن گیا ممکن ہے کہ ان میں سے ایک ایک چیز کو الگ الگ لیں تو اوروں کے ہاں نکل آئے لیکن خواجہ صاحب کا کلام ......

"آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" کے مصداق ہے ۔

ان میں بعض اوصاف وہ بھی ہیں جو اوروں کے کلام میں اس درجہ نہیں پائے جاتے مثلاً روانی، برجستگی اور صفائی یہ وصف سعدی اور خسرو کا بھی مایہ الامتیاز ہے لیکن یہ ایسی چیز ہے جس کے مدارج کی حد نہیں ممکن ہے کہ ایک شعر خود نہایت رواں، صاف اور شستہ ہو لیکن ایک اور شعر اس سے بھی بڑھ کر کوئی ہو جس طرح نغمہ اور حسن کہ ان کے مدارج ترقی کی کوئی حد نہیں

ایک اور چیز جو خواجہ صاحب کی شاعری کا نہایت نمایاں وصف ہے جوش بیان ہے فارسی شاعری باوجود ہزاروں گوناگوں اوصاف اور خیالات کے جوش بیان سے خالی ہے فردوسی اور نظامی کے ہاں خاص خاص موقعوں پر جوش بیان کا پورا زور ہے لیکن وہ اوروں کے خیالات اور واردات ہیں خود شاعر کے حالات اور جذبات نہیں بخلاف اس کے خواجہ حافظ کے کلام میں جو جذبات ہیں وہ خود ان کے واردات اور حالات ہیں اس لئے ان کو وہ اس جوش کے ساتھ ادا کرتے ہیں کہ ایک عالم چھا جاتا ہے خواجہ صاحب نے سینکڑوں گوناگوں خیالات ادا کئے ہیں اور جس خیال کو ادا کیا ہے اس جوش کے ساتھ کیا ہے کہ سننے والے پر

وہی اثر طاری ہو جاتا ہے جو خود خواجہ صاحب کے دل میں ہوتا ہے

؎ اعتمادی نیست بر دورِ جہاں! — بلکہ بر گردونِ گرداں نیز ہم

؎ ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم — از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

؎ گرچہ پیرم تو شبی تنگ مرا آغوش گیر — تا سحر گہ ز کنار تو جواں خیزم

اکثر مضامین ایسے ہیں جو مدتوں سے بندھے آتے ہیں یا بندھے نہ تھے لیکن بجائے خود معمولی مضمون تھے جن میں کوئی دلفریبی نہ تھی خواجہ صاحب کے حسن اسلوب اور جدت ادا نے اس کو نہایت دِلآویز اور لطیف کر دیا ہے مثلاً معشوق کی آنکھ کو سب مخمور، سرشار اور مست کہتے آئے ہیں خواجہ صاحب اسی بات کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں

؎ ہر کس کہ بدید چشم او گفت — کو محتسبی کہ مست گیرد

اسی طرح معشوق کی زلف کو بنفشہ پر ترجیح دینا معمولی بات ہے خواجہ صاحب اس کو اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

بنفشہ طرۂ مفتول خود گرہ میزد — صبا حکایت زلف تو در میان انداخت

خواجہ صاحب نے شاعری کی مختلف انواع کو لیا ہے اور ہر نوع کو اعلےٰ رتبہ پر پہنچایا ہے لیکن ان کی اصلی شاعری عشق و عاشقی اور رند و سرمستی ہے رندانہ مضامین، وہ جس آزادی، رنگینی اور جوش کے ساتھ ادا کرتے ہیں عشقیہ مضامین سے ان کا دیوان بھرا پڑا ہے۔ عشق و محبت میں جو جو واردات گزرتی ہیں ایک ایک سے باخبر ہیں اور ان سب جذبات کو اسی سچائی، اسی واقفیت اور اسی جوش کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں جس طرح دل میں آتے ہیں اور یہی اصل شاعری ہے وہ کوئی بات نہیں کہتے جب تک کوئی جذبہ دل میں نہیں پیدا ہوتا معشوق کی تعریف بھی جو شاعروں کا دن رات کا وظیفہ ہے کرنا چاہتے ہیں تو اسی وقت کرتے ہیں جب معشوق کی نئی ادا سے دل پر نئی چوٹ پڑتی ہے ورنہ یوں کچھ کہہ جاتے ہیں تو اس کو بیکار سمجھتے ہیں خود فرماتے ہیں ؎

نکتہ ناسنجیدہ گفتم دلبرا معذور دار　　عشوہ فرمائی تا من طبع را موزوں کنم

خواجہ صاحب اس نکتہ سے خوب واقف ہیں کہ عشق محض ظاہری حسن و جمال سے نہیں پیدا ہوتا اور ہوتا ہے تو وہ عشق نہیں ہوتا بلکہ ہوس پرستی ہے عشق کے لئے معشوق میں حسن و جمال کے سوا اور بہت سی ادائیں ہونی چاہئیں خواجہ صاحب فرماتے ہیں ؎

شاہد آں نیست کہ موی و میانی دارد　　بندہ طلعت آں باش کہ آنی دارد

لیکن یہیں تک بس نہیں کرتے بلکہ آگے بڑھتے ہیں ؎

ہزار نکتہ دریں کار و بار دلداری است　　کہ نام آں نہ لب لعل و خط زنگاری است

عاشق جب عشق سے لطف اٹھاتا ہے تو عام فطرت انسانی کے لحاظ سے اوروں کو بھی اس مزہ کے اٹھانے کی ترغیب دیتا ہے اس جذبہ کو عجیب لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے ؎

مصلحت دید من است کہ یاراں ہمہ کار　　بگذارند و سر زلف نگاری گیرند

... کبھی عاشق کے دل میں یہ جذبہ اٹھتا ہے کہ معشوق کو اور لوگ بھی چاہتے ہوں گے لیکن میری سی جانبازی کون کر سکتا ہے اس خیال کو محبت کے انداز سے معشوق کے سامنے بھی ظاہر کر دیتا ہے۔

خواجہ صاحب اس جذبہ کو اس پیرایہ میں ادا کرتے ہیں ؎

شبی مجنوں بہ لیلیٰ گفت کای معشوق بے ہمتا　　ترا عاشق شود پیدا ولی مجنوں نخواہد شد

خواجہ صاحب کا فلسفہ قریباً وہی ہے جو خیام کا ہے خواجہ صاحب نے انہی مسائل کو زیادہ تفصیل زیادہ توضیح اور زیادہ جوش کے ساتھ ادا کیا ہے چنانچہ ہم ان کو بدفعات بیان کرتے ہیں۔

(۱) ان کا فلسفہ اس مسئلہ سے شروع ہوتا ہے کہ انسان کو کائنات کے اسرار اور ان کی حقیقت کچھ معلوم نہیں اور نہ ہو سکتی ہے اس مضمون کو سقراط، فارابی ابن سینا، خیام سب نے بیان کیا تھا لیکن خواجہ صاحب جس بلند آہنگی اور جوش

واد عا کے ساتھ کہتے ہیں وہ ان کا خاص حصّہ ہے ؎

بروای زاہد خود بیں کہ زچشم من و تو! | راز ایں پردہ نہاں است و نہاں خواہد بود
حدیث از مطرب و می گو و راز دہر کمتر جو | کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمارا

(۲) شاہد مطلق کا ظہور اگرچہ اس جگہ ہے اور ذرّہ ذرّہ میں اس کی چمک موجود ہے لیکن کوئی شخص اس کو پہچان نہیں سکتا

؎ سِر خدا کہ عارف و سالک بہ کس نگفت | در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

(۳) اسرار کائنات اگرچہ حقیقت میں معلوم نہیں ہو سکتے لیکن جو کچھ بھی معلوم ہو سکتا ہے وہ علوم درسیہ کی تحصیل اور بحث و مباحثہ سے نہیں معلوم ہو سکتا بلکہ مجاہدہ، ریاضت، وجدان اور کشف سے معلوم ہو سکتا ہے خواجہ صاحب نے ارباب ذوق اور مشاہدہ کا نام ساقی، بادہ فروش، رند رکھا ہے اور اسی بنا پر ہر جگہ پیر مغاں اور بادہ فروش کی حلقہ بگوشی کا دعویٰ کرتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں زہاد یعنی علماء ظاہری کو بے حقیقت سمجھتے ہیں۔

؎ راز درون پردہ ز رندان مست پرس
کیں حال نیست صوفی عالی مقام را

(۴) صوفیا کے نزدیک علم حاصل ہونے کا ذریعہ بیرونی چیزوں کا مطالعہ نہیں ہے ان کے نزدیک دل پر جب ایک خاص طریقہ سے توجہ اور مدت تک اس پر مواظبت کی جاتی ہے تو دل خود ادراکات اور معلومات کا سرچشمہ بن جاتا ہے جس طرح انبیاء کا علم باہر سے نہیں آتا بلکہ فوارہ کی طرح اندر سے اچھلتا ہے۔ خواجہ صاحب نے اس مسئلہ کو نہایت پرجوش اور بلیغ طریقے سے ادا کیا ہے ؎

گفتم ایں جام جہاں بیں تو کی داد حکیم | گفت آں روز کہ ایں گنبد مینائی کرد

(۵) خواجہ صاحب کا میلان زیادہ جبر کی طرف معلوم ہوتا ہے یعنی انسان خود مختار نہیں ہے کوئی اور قوت ہے جو اس سے کام لے رہی ہے۔

سہ مرا مرد زازل کاری بجز رندی نفرمودند — بر آں قسمت کہ آنجا شد کم و افزوں نخواہد شد

(۶) کمال اور ترقی کسی زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں سہ

فیض روح القدس ار باز مدد فرمائید — دیگراں ہم بکنند آں چہ مسیحا می کرد

(۷) بندگان خاص کی فطرت ہی جدا ہوتی ہے وہ بات ہر شخص کو نصیب نہیں ہو سکتی

خواجہ صاحب کی اخلاقی تعلیم اعلیٰ درجہ کے فلسفۂ انسانیت کی تصویر ہے۔

خواجہ صاحب کے فصاحتِ کلام کا بڑا سبب یہ ہے کہ ان کے ہاں روزمرہ اور محاورے کا استعمال، شوخی و ظرافت، موسیقی اور خوش نوائی پائی جاتی ہیں

(شعر العجم شبلی نعمانی)

محمد حافظ شیرازی

محمد نام، شمس الدین لقب اور حافظ تخلص تھا آپ شیراز میں پیدا ہوئے سال پیدائش کسی تذکرے میں نہیں ملتا انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں لکھا ہے کہ حافظ آٹھویں صدی ہجری کے آغاز میں پیدا ہوئے آقائے نفیسی نے بھی اس موضوع پر تحقیق کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ آپ کی ولادت ۷۲۶ سے ۷۲۹ تک کے عرصہ میں ہوئی آپ کے والد بہاؤ الدین اصفہان کے تاجر تھے تجارت کی غرض سے اصفہان چھوڑا اور شیراز میں آ بسے یہ وہ زمانہ ہے جب صوبہ فارس میں اتابکان فارس کی حکومت تھی حافظ ابھی عالم طفلی میں تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا آپ کے دو بھائی اور تھے جو آپ سے بڑے تھے یہ سب شیراز ہی میں رہتے تھے لیکن باہمی ناچاقی کی وجہ سے حافظ کے بھائی کسی دوسری جگہ چلے گئے اور آپ اپنی والدہ کے ہمراہ شیراز ہی میں رہے بچپن میں ہی کسب معاش کا بوجھ آ پڑا چنانچہ مؤلف میخانہ لکھتا ہے کہ آپ نے ایک خمیر ساز کے ہاں آٹا گوندھنے کا مشغلہ اختیار کیا اور اس سے گزر اوقات ہوتی تھی۔

خواجہ حافظ اگرچہ کسب معاش میں بہت معروف رہتے تھے لیکن علم حاصل کرنے کا آپ کو بہت شوق تھا دکان کے پاس ایک مکتب تھا جہاں ایک مشہور عالم قوام الدین عبداللہ درس دیتے تھے حافظ کو کام سے کچھ فراغت ہوتی تو مکتب میں آ جاتے یہاں کلام مجید حفظ کیا اور تفسیر اور حکمت کی تعلیم پائی حافظ قرآن ہونے کی نسبت سے ہی آپ نے حافظ تخلص کیا آپ کے کلام میں جو تاثیر پائی جاتی ہے وہ اسے قرآن خوانی ہی کا فیض بتاتے ہیں سے

ندیدم خوشتر از شعر تو حافظ — بقرآنی کہ اندر سینہ داری

حافظ کو شیراز سے بہت محبت تھی اس محبت کی وجہ سے وہ شیراز کو چھوڑ کر کہیں جانا نہ چاہتے تھے یہاں تک کہ عراق کے حکمران احمد جلایر نے بغداد آنے کی دعوت دی لیکن حافظ نے معذرت کی کہیں نکلے بھی تو یزد تک کا سفر کر کے واپس شیراز آگئے سلطان محمود شاہ بہمنی والئ دکن (۷۸۰ تا ۷۹۹) نے آپ کو دکن آنے کی دعوت دی اور زادِ راہ بھیجا حافظ نے ہندوستان آنے کے لئے تیاری کی چنانچہ بندر ہرمز میں جہاز پر سوار بھی ہوئے لیکن سمندر میں تلاطم دیکھا تو جہاز سے اتر آئے اور سفر کا ارادہ ترک کر دیا ایک غزل لکھ کر محمود کی خدمت میں بھیج دی ؎

دمی با غم بسر بردن جہان یکسر نمی ارزد   بمی بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد

حافظ نے ساری عمر شیراز میں بسر کی اور "مصلیٰ" کی بادِ نسیم اور "رکن آباد" کے چشمے کی سیر کو زندگی کا بہترین مصرف سمجھا ؎

نمی دہند اجازت مرا بہ سیر و سفر   نسیم بادِ مصلیٰ و آب رکنا باد

حافظ شیرازی کی وفات ۷۹۱ ہجری میں ہوئی اور اپنی محبوب سیر گاہ مصلیٰ میں دفن ہوئے کسی خوش فکر شاعر نے تاریخ وفات "خاکِ مصلیٰ" سے نکالی ہے اسی نسبت سے اہل ایران اب مصلیٰ کو خاکِ مصلیٰ کہنے لگے ہیں

حافظ کی زندہ جاوید یادگار آپ کا دیوان ہے جو ان کے ایک شاگرد اور دوست محمد گل اندام نے مرتب کیا تھا، دیوان، غزلیات، قصائد، قطعات اور چند رباعیوں پر مشتمل ہے

خواجو کرمانی نے جذبہ اور فکر کے امتزاج سے جو جدت غزل میں پیدا کی اور اس پر حافظ نے کلام کی بنیاد رکھی اس لحاظ سے گویا حافظ نے بھی "سبک عراقی" کی پیروی کی صنائع بدائع جنہیں محسنات شعری کہا جاتا ہے سبک عراقی کا خاصہ ہے حافظ نے بھی اپنے کلام کو محسناتِ شعری سے زینت دی ہے لیکن آپ نے صنائع بدائع سے کچھ اس انداز میں کام لیا کہ جذبات و واردات

کے اظہار کو اس سے اور زیادہ مدد ملی اس وجہ سے ایران کے جدید محققین نے حافظ کے سبک شعری کے لئے "سبک فارسی" کی نئی اصطلاح وضع کی ہے جو صرف انہیں کے لئے مخصوص ہے۔

آپ کے تغزل کی سب سے بڑی خوبی امید پسندی ہے ایران کے اکثر بڑے شعرا کے کلام میں جا بجا حزنیت نظر آتی ہے یہ شعرا زمانہ حال سے غیر مطمئن اور مستقبل سے مایوس ہیں لیکن اس کے برعکس حافظ عموماً ناموافق حالات میں بھی ہمت نہیں ہارتے انہیں بھی دوسرے شعرا کی طرح ہجر کی تاریک طویل رات کا سامنا تو ہے لیکن وہ یقین رکھتے ہیں کہ یہ رات ختم ہوگی اور صبح درخشاں اس کی جگہ لے لے گی جو پیام مسرت لائے گی اور غمکدہ گلستاں طرب بن جائے گا چنانچہ ایک غزل جس کا مطلع ذیل میں درج ہے اسی انداز کی ہے ؎

یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور کلبہ احزاں شود روزی گلستاں غم مخور

اس کے علاوہ اور بھی کئی غزلیں ہیں جن میں امید پسندی کی تلقین کی گئی ہے ایک غزل کا مطلع درج ذیل ہے ؎

رسید مژدہ کہ ایام غم نخواہد ماند چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

حافظ کے تغزل کی ایک دوسری امتیازی خصوصیت بلند ہمتی کی تلقین ہے ان کا خیال ہے کہ انسان کو یہ ہرگز نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ گردش افلاک کا اسیر ہے بلکہ ناموافق گردش کرنے والے افلاک کو ایک مجاہد برہم بھی کر سکتا ہے اور ایک ذرہ بے مقدار ہمت عالی سے ہی چشمہ خورشید کا طالب ہو سکتا ہے۔

ذرہ را تا نبود ہمت عالی حافظ طالب چشمہ خورشید درخشاں نشود

حافظ کے نزدیک فضیلت اور کمال حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان ہنرمند اور علم و دانش سے آراستہ ہو یہ چیزیں سعی و کوشش کے بغیر حاصل نہیں ہو تیں ؎

~ رندگان طریقت بہ نیم جو نخرند   قبای اطلس آں کس کہ از ہنر عاریست

حافظ علائق دنیا سے آزاد نہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے حکمرانوں کے قصیدے بہت کم کہے ہیں اور اگر کہے ہیں تو ان میں بے جا خوشامد نہیں وہ ایسے انسان کو قابل قدر سمجھتے ہیں جو علائق دنیا سے آزاد ہو ~

غلام ہمت آنم کہ زیر چرخ کبود   ز ہر چہ رنگ تعلق پذیرد آزاد است

حافظ کی غزلیات میں ترنم اور نغمے کا پہلو بھی بہت نمایاں ہے ترنم عموماً حروف علت کی تکرار سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن حروف علت کے ساتھ جب حروف کی ہم آہنگی شامل ہو جاتی ہے تو نغمہ کی سی شان پیدا ہو جاتی ہے صوت و نغمہ کا حسین امتزاج حافظ کی غزلوں میں اکثر نظر آتا ہے ~

کلبہ احزاں شود روزی گلستاں غم مخور   یوسف گمگشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور

بعزم توبہ سحر گفتم استخارہ کنم   بہار توبہ شکن می رسد چہ چارہ کنم

حافظ کے اشعار میں جہاں کہیں لفظ صوفی آیا ہے اس کا مفہوم بہت مختلف ہے کیونکہ اس زمانے میں صوفیا مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے تھے اور ایک دوسرے کو برا کہتے تاکہ حکمران کا زیادہ سے زیادہ قرب حاصل کر سکیں حافظ کو ان لوگوں کے کردار کا علم تھا اور ان کی منافقت سے انہیں خود بھی کئی تکالیف اٹھانی پڑی تھیں اس لئے جہاں وہ صوفی و واعظ کا ذکر کرتے ہیں ان میں کچھ انتقامی جذبے کا بھی رنگ ہوتا ہے اور جہاں کہیں رندوں کا ذکر آتا ہے اس سے عارف اور صوفی صافی مراد لیتے ہیں ~

صوفی نہاد دام و سر حقہ باز کرد   بنیاد مکر با فلک حقہ باز کرد

ای کبک خوش خرام کجا می روی بناز   غرہ مشو کہ گربہ زاہد نماز کرد

(ادب نامہ ایران مقبول بیگ بدخشانی)

جامی

نورالدین عبدالرحمٰن جامی ۸۱۷ھ میں صوبہ خراساں کی ولایت جام کے ایک قصبہ خرجرد میں پیدا ہوئے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

بسال ہشت صد و ہفدہ ز ہجرت نبوی — کہ زد ز مکہ بہ یثرب سرادقات جلال
ز اوج قلہ پرواز گاہ عز و قدم — بدیں حضیض ہوا کست کردہ ام پر و بال

آپ کے والد کا نام نظام الدین دشتی اور دادا کا نام شمس الدین دشتی تھا دشتی کی نسبت اصفہان کے محلہ دشت سے ہے جہاں وہ جام سے ہجرت کر کے آئے تھے جامی نے اپنا تخلص ایک تو ولایت جام کی نسبت سے اور دوسرے شیخ الاسلام احمد جامی (متوفی ۵۳۶ ھ) ہجری کی جناب میں ارادت کی وجہ سے جامی اختیار کیا تھا چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

مولدم جام و رشحۂ قلمم — جرعۂ جام شیخ الاسلامیست
لاجرم در جریدۂ اشعار — بدو معنی تخلصم جامیست!

بچپن میں جامی اپنے والد کے ساتھ ہرات آئے اس کے بعد سمرقند تشریف لے گئے یہ مقامات اس زمانہ میں اسلامی علوم اور ایرانی ادب کے مرکز بنے ہوئے تھے آپ نے یہاں علم و ادب کی تحصیل کی اور دینی علوم اور ادب و تاریخ میں کمال حاصل کیا اس کے بعد آپ نے عالم عرفاں میں قدم رکھا اور سیر و سلوک کی دنیا میں پہنچ گئے سعدالدین محمد کاشغری، خواجہ علی سمرقندی اور قاضی زادہ رومی جیسے استادوں اور مرشدوں کی پیروی شروع کی اسی طرح آپ نے ریاضت کے راستے پر قدم رکھا روز بروز معنوی مقامات میں ترقی کرتے گئے یہاں تک کہ طریقہ نقشبندیہ کے مرشدانِ کامل میں شمار کئے جانے لگے چنانچہ نقشبندی خلیفہ سعدالدین کاشغری کی وفات کے بعد اس طریقہ کی خلافت آپ کو ملی آپ اپنے زمانے ہی میں مشہور

عوام و خواص ہو چکے تھے ہر چھوٹا بڑا آپ کو جانتا اور آپ کا احترام کرتا تھا آپ نے امراء اور عمائدین سلطنت کی کبھی مدح نہ کی اس کے باوجود یہ لوگ آپ کے بڑے معتقد تھے اپنی مجلس میں صدر میں جگہ دیتے تھے اور آپ کی ذات گرامی کا بڑا ادب اور احترام کرتے تھے۔

اس کے بعد جامی نے پھر سفر اختیار کیا حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے دمشق کے راستے تبریز واپس ہوئے اور ۸۷۸ ہجری میں ہرات آئے اس سفر میں بغداد والوں نے آپ کے ساتھ برا سلوک کیا ہمارا شاعر اس شہر سے دل شکستہ لوٹا اور ایک قصیدہ میں ان کی نادانی کی شکایت کی ہے اس قصیدے کا مطلع ہے ؎

بکشا ساقیا بلب شط سر سبوی — وز خاطرم کدورت بغدادیاں بشوی

جامی کے معاصر دولت شاہ سمرقندی کی روایت کے مطابق جامی نے آخری عمر میں شاعری ترک کر دی تھی اس کے بعد انہوں نے شاذ و نادر ہی شعر کہا وہ دینی مسائل کی تحقیق میں ہمہ تن مصروف ہو گئے چنانچہ کہتے ہیں ؎

جامی دم گفتگو فرو بند دگر — دل شیفتہ خیال مپسند دگر

در شعر مدہ عمر گراں مایہ بباد — انگار سیہ شد ورقی چند دگر

جامی کے زمانہ کے مشہور و معروف سلاطین میں ابوالغازی سلطان حسین بالیقرا بھی تھا اس نے ۸۷۳ھ ہجری میں سلطان ابوسعید تیموری کو شکست دی ہرات میں جلوس کیا اور ۹۱۲ھ ہجری تک حکومت کی یہ سلطان نہ صرف خود ادبی ذوق رکھتا تھا اور ادیبوں کی سرپرستی کرتا تھا بلکہ اس کا دانشمند وزیر میر علی شیر نوائی اپنے زمانے کے اہل علم و فضل میں شمار کیا جاتا تھا اس نے فارسی اور ترکی زبان کی نظم و نثر دونوں میں اپنی تصانیف یادگار چھوڑی

اس صاحب دل وزیر کی جامی کے ساتھ بڑی گہری دوستی تھی علی شیر نے اپنی کتاب "خمسۃ المتحیرین" میں جامی کا حال تفصیل کے ساتھ لکھا ہے جامی نے دوسرے سلاطین میں سلطان ابوسعید تیموری (۸۵۵ - ۸۷۳ھ) سلطان یعقوب

آق قوینلو (۸۸۴ - ۸۹۶ھ) جہاں شاہ قرا قوینلو (۸۴۱ - ۸۷۲ھ) اور عثمانی ترک سلطان محمد فاتح (۸۵۵ - ۸۸۶ھ) کے نام پنے قصائد اور دوسرے اشعار میں لئے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جامی نویں صدی کے سب سے بڑے ادیب اور شاعر اور ایران کے وہ آخری بڑے صوفی شاعر ہیں جن کا نام انوری، سعدی مولانا روم، حافظ، خیام اور فردوسی کے ساتھ لیا جاسکتا ہے جامی کے بعد ندرت اور جدت رکھنے والے بڑے شاعر سرزمین ایران میں پیدا نہیں ہوئے جامی نے نہ صرف شاعری کی ہے بلکہ وہ دینی علوم اور ادب و تاریخ میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے امیر علی شیر نوائی جو خود بھی اپنے زمانے کا بڑا زبردست ادیب اور عالم تھا جامی کے کمالات کی تعریف میں کہتا ہے

عاجز از تعداد اوصاف کمال دست عقل انجم گردوں شمردن کی طریق اعور است

جامی کے اشعار میں شعرائے سلف کا رنگ جھلکتا نظر آتا ہے انہوں نے صوفی شاعروں سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے اور ان کے سبک کی پیروی کی ہے لیکن اس کے باوجود "ہفت اورنگ" نظم میں جامی کے مقتدائے خاص نظامی ہیں غزلیات میں انہوں نے سعدی، حافظ، خاقانی اور امیر خسرو کی بھی پیروی کی ہے۔

امیر خسرو کی طرح جامی بھی اپنی بداعت اور تصانیف کی کثرت کے لئے مشہور ہیں بعض مصنفوں کے قول کے مطابق ان کی نظم و نثر کی تعداد ان کے تخلص . جامی کے حروف کے تعداد کے مساوی ہے یعنی جملہ (۵۴) دفتر اور رسالے ہیں ان کی منظوم تصانیف میں ایک ان کا دیوان اشعار بھی ہے اس میں قصیدے، غزلیں مرثیے، ترجیع بند، ترکیب بند، مثنویاں اور رباعیاں ہیں خود جامی نے اپنے دیوان کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ان کا نام " فاتحۃ الشباب" "واسطۃ العقد" اور خاتمۃ الحیات" رکھا ہے اس تقسیم میں عجب نہیں کہ انہوں نے امیر خسرو کی پیروی کی ہو ان اشعار میں ملمعات بھی ہیں یہ عربی زبان پر جامی کے کامل عبور کے

شاہد ہیں یہ قطعی طور پر کہا جا سکتا ہے جامی کے قصیدے متعین ۔ ان کی غزلیں عرفانی، شیریں اور دلکش اوزان کی حامل ہیں ۔ شاعر کے قصیدوں میں روحانی اور اسلامی عقائد کے حامل اشعار کی کمی نہیں اور ان کا ہر شعر ان کے ایمان اور ان کی ذہانت کی دلیل ہے ان کی شاعرانہ اور عارفانہ دونوں قسم کی غزلیں نہایت پر مغز اور بامعنی ہوتی ہیں ان کے اشعار ایک حساس اور پر سوز قلب آتشیں کی ترجمانی کرتے ہیں مثلاً ان کی یہ غزل جس کا مطلع ہے

ریزم ز مژہ کوکب بی ماہ رخت شبہا ۔۔۔ تاریک شبی دارم با این ہمہ کوکبہا

غزل میں جامی نے متقدمین عارفوں کی پیروی کی اور خاص کر حافظ کو اپنے پیش نظر رکھا ہے اور کبھی ان کی غزلوں پر غزل کہی ہے مثال کے طور پر یہ غزل حافظ کو سامنے رکھ کر لکھی ہے ؎

ساقیا بیا کہ دور فلک شد بکام ما ۔۔۔ خورشید را فروغ دہ از عکس جام ما

جامی کی ایسی غزلیں جن میں انہوں نے وحدت کا نغمہ الاپا ہے ان میں ذیل کی غزل جس کا مطلع درج ذیل ہے پیش کی جاتی ہے

؎ موثر در وجود الا یکی نیست ۔۔۔ دریں حرف شگرف اصلا شکی نیست

مثنویات میں جامی نے نظامی کو اپنا استاد قرار دیا ہے اور خمسہ نظامی کے جواب میں سات مثنویاں "ہفت اورنگ" کے نام سے لکھی ہیں جن کے نام یہ ہیں سلسلۃ الذہب ۔ سلامان و ابسال ، تحفۃ الاحرار ، سبحۃ الابرار ، یوسف زلیخا ، خرد نامہ سکندری ، لیلیٰ مجنوں ۔ (تاریخ ادبیات ایران شفق)

نورالدین عبدالرحمٰن جامی

سرزمین ایران نے جو مشہور ترین دانشمند پیدا کیے ان میں نورالدین عبدالرحمان جامی بڑی امتیازی حیثیت رکھتے ہیں جامی بلند مرتبہ شاعر، مستند عالم اور نامور صوفی صافی تھے۔

آپ خراسان کے علاقہ جام کے قصبہ خرجرد میں ۲۳ شعبان ۸۱۷ھ ہجری کو پیدا ہوئے آپ کو اپنے والد کے ہمراہ سیر و سیاحت کے اکثر مواقع ملتے تھے ایران کے محقق علی اصغر حکمت لکھتے ہیں کہ عالم طفولیت میں جب والد کے ہمراہ آپ ہرات آئے تو یہاں مدرسہ نظامیہ میں اقامت اختیار کی اور مولانا جنید اصولی کے درس میں شامل ہو گئے جو عربی زبان کے مستند استاد تھے یہاں انہوں نے علوم دینی کی تعلیم حاصل کی آپ کے ایک بزرگ سعدالدین تفتازانی جو بہاؤالدین نقشبند کے خلیفہ تھے کی صحبت میسر آئی جس کی وجہ سے وہ سلسلہ نقشبندیہ میں شامل ہوئے اور باطنی تعلیم کے مختلف مدارج طے کیے۔

۸۷۷ ہجری آپ حج کو گئے اور مختلف علاقوں سے ہوتے ہوئے واپس خراسان آ گئے ان کا یہ سفر خاصہ طویل تھا اس سفر کا ذکر انہوں نے "رشحات عین الحیات" میں کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس سفر میں اہل بغداد نے آپ کے شایانِ شان سلوک نہ کیا چنانچہ ایک قصیدے میں اس امر کی شکایت کی ہے ؎

بکشای ساقیا بلب شط سر سبوی   در خاطرم کدورت بغدادیان بشوی

جامی کے زمانے میں سرزمین ایران دو حکومتوں میں بٹی ہوئی تھی مشرق میں تیموری بادشاہوں کی حکومت تھی ان کے پائے تخت سمرقند اور ہرات تھے ایران کے جنوب مغرب میں ترکمان سلاطین کی حکومت تھی جن کا دار السلطنت تبریز تھا

امیر تیمور کے بعد تیموری تخت وتاج کا وارث شاہ رخ مرزا ہوا جس نے ۸۱۷ ہجری سے ۸۵۰ھ ہجری تک حکومت کی اس زمانے کا بیشتر حصہ جامی نے تعلیم حاصل کرنے میں بسر کیا شاہ رخ مرزا کے بعد ابو القاسم تخت نشین ہوا جس نے ۸۵۰ھ ہجری سے ۸۶۱ھ ہجری تک حکومت کی جب شاہ رخ مرزا نے وفات پائی تو اس وقت ماوراء النہر کے علاقے میں ابو سعید گرگانی کی حکومت تھی وہ چاہتا تھا کہ خراسان کا علاقہ فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کرے چنانچہ جب مرزا ابو القاسم فوت ہوا تو اس کی دیرینہ خواہش پوری ہو گئی اور ۸۶۱ھ ہجری سے ۸۶۳ھ ہجری تک بڑی کامیابی سے حکومت کی ابو سعید گرگانی کے زمانے میں جامی نے اپنا پہلا دیوان مرتب کیا۔

۸۷۳ھ ہجری میں سلطان ابو سعید گرگانی سلطان حسین بالقیرا کے ہاتھوں لڑائی میں مارا گیا اور سلطان بالقیراط کی حکومت قائم ہو گئی یہ آخری تیموری بادشاہ تھا جس نے ۸۷۳ھ ہجری سے ۹۱۱ھ ہجری تک حکومت کی یہ علماء کا بہت بڑا مربی و محسن تھا اور خود بھی ایک عالم شخص تھا اس کا بچپن کا رفیق میر علی شیر نوائی تھا جس کو اس نے وزارت کے منصب جلیلہ پہ فائز کیا چنانچہ نویں ہجری کے آخر میں علم و ادب کو جو فروغ ہوا اس میں میر علی شیر نوائی کی علم دوستی اور ادب پروری کو بہت دخل ہے میر علی شیر نوائی کو جامی سے خاص طور پر بڑی عقیدت تھی آپ نے اکثر کتابیں میر علی شیر ہی کی خواہش پر تصنیف کی تھیں جامی نے ۸۹۸ھ ہجری میں وفات پائی تو اس نے آپ کا مرثیہ ترکیب بند کی صورت میں لکھا اس کے سات بند ہیں۔

جس زمانے میں مشرقی ایران کے لوگ سلطان ابو سعید اور سلطان حسین بالقیرا کے پرچم تلے امن وامان کی زندگی بسر کرتے تھے مغرب میں ترکمان سلاطین بڑے جاہ و جلال سے حکومت کرتے تھے ان کی مدت حکومت ۸۷۱ تا ۸۹۶ ہجری ہے جامی کو ان حکمرانوں سے بھی بہت قرب تھا۔ چنانچہ آپ نے ایک مثنوی "سلمان وابسال" آخری حکمران یعقوب بیگ کے نام منسوب کی ہے۔

نویں صدی ہجری کے آخری نصف حصے میں جب جامی کی شہرت کا آفتاب پوری تابانی سے چمک رہا تھا اس وقت ایشیائے کوچک اور جزیرہ بالکان میں ترکوں کی حکومت تھی جامی کے مراسلات میں سلطان محمد فاتح ۸۵۵ ہجری تا ۹۱۱ھ کا ذکر آتا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جامی کے علم و فضل کا شہرہ مشرقی ایران سے نکل کر استنبول تک جا پہنچا تھا یہ سلاطین جامی کو انعام و اکرام بھی بھیجتے تھے اور ان سے خط و کتابت بھی کرتے تھے

جامی کا شمار اہل سنت کے مشہور علماء میں ہوتا تھا سلاطین صفویہ شیعہ تھے اس لئے وہ انہیں اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے علی اصغر حکمت مجمع الفصحا کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ جب شاہ اسماعیل صفوی نے ہرات کو مسخر کر لیا تو حکم دیا کہ کتابوں میں جہاں جہاں جامی کا نام لکھا گیا ہے نقطہ بدل کر خامی کی صورت میں بدل دیا جائے جامی کے خواہر زادہ ہاتفی نے اس واقعہ سے متاثر ہو کر ذیل کا قطعہ لکھا ہے ؎

آنکہ عمری بدرش گردون غلامی کردہ است	بس عجب دارم زانصاف شہ کشور کشا
نقطہ جامی تراشیدہ و خامی کردہ است	کز برای خاطر جمعی لوند نا تراش

مولانا عبدالغفور لاری نے جو آپ کے شاگردان خاص میں سے ہیں آپ کی کتابوں کی تعداد ۴۸ بتائی ہے۔ امیر شیر علی خاں مؤلف "تذکرہ "مرأۃ الخیال" نے جامی کی تصنیفات ۹۹ بتائی ہیں لیکن کسی اور تذکرہ نویس نے اس کی تائید نہیں کی چند اہم نثری کتابیں درج ذیل ہیں۔

(۱) نفحات الانس

یہ کتاب بعض صوفیاء کرام کے سوانح حیات پر مشتمل ہے سال تالیف ۸۸۲ ہجری ہے اس میں پانچ سو بیاسی صوفیا کرام کا حال درج ہے پہلے ایک مقدمہ لکھا ہے پھر صوفیا کی اصطلاحات اور معرفت و حقیقت کا بیان ہے بعد میں صوفیا کے معجزات و خوارق عادات کا ذکر ہے یہ سادہ رواں اور

فصیح فارسی میں لکھی گئی ہے۔

(۲) اشعۃ اللمعات!

جامی کی یہ کتاب شیخ فخر الدین ابراہیم عراقی کی تصنیف "لمعات" کی تشریح ہے جو میر شیر علی نوائی کی خواہش پر ۸۸۶ ہجری میں لکھی گئی آغاز کتاب "مقدمہ" سے ہوتا ہے جس میں تصوف کی بعض اصطلاحات کا ذکر ہے بعد میں "لمعات" کی تشریح، دو رباعیوں اور ایک قطعہ پر ختم ہو جاتی ہے۔

(۳) بہارستان :۔

یہ سعدی کی تصنیف "گلستان" کی تقلید میں لکھی گئی ہے اس کا سال تالیف ۸۹۲ ہجری ہے یہ بھی گلستان کی طرح آٹھ ابواب پر مشتمل ہے ہر باب میں چند حکایات ہیں اس کی حکایات کو مناسب مقامات پر اشعار سے مزین کیا گیا ہے بہارستان بھی اگرچہ فصیح فارسی میں لکھی گئی ہے لیکن اس میں وہ رنگ و بو نہیں جو سعدی کی گلستاں میں ہے۔

۴۔ مثنویات ہفت رنگ :۔

جامی کی سات مختلف مثنویوں کا مجموعہ "ہفت رنگ" یا سبعہ کے نام سے موسوم ہے ہفت رنگ کے مقدمے سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا نے پہلے نظامی اور امیر خسرو کی تقلید میں پانچ مثنویاں لکھی تھیں بعد میں دو اور کا اضافہ کر دیا اور اس طرح خمسہ نے سبعہ کی شکل اختیار کر لی۔

۵۔ سلسلۃ الذہب :۔ اس مثنوی میں فلسفیانہ، اخلاقی اور دینی مسائل بیان کئے گئے ہیں اور موضوع کے متعلق دلچسپ حکایات بھی لکھی ہیں۔ مثنوی کا انداز حکیم سنائی اور جام جم اوحدی کا سا ہے اور سلطان حسین بایقرا کے نام منسوب یہ کتاب تین حصوں میں ہے ہر حصہ کو دفتر لکھا ہے

سلامان و ابسال :۔ یہ ایک مثالیہ داستان ہے جو عشقیہ مثنوی کی صورت میں پیش کی گئی ہے

تحفۃ الاحرار:۔ یہ مثنوی مخزن الاسرار اور مطلع الانوار کے وزن میں لکھی گئی ہے مثنوی کا دیباچہ نثر میں ہے دیباچے میں نظامی اور امیر خسرو کو بڑے احترام سے خطاب کیا گیا ہے مقدمہ کے بعد چار مناجاتیں پانچ نعتیں اور نقشبندی سلسلے کے بانی بہاؤالدین کی منقبت لکھی ہے پھر اصل مثنوی شروع ہوتی ہے جو بیس مقالوں پر مشتمل ہے۔

یوسف زلیخا:۔ یہ مثنوی مولانا جامی کا اصل سرمایہ شہرت ہے مثنوی کا آغاز ذیل کے شعر سے ہوتا ہے ؎

الٰہی غنچہ امید بکشا گلی از روضۂ جاوید بنما

اس مثنوی کے شروع میں خطبہ ہے پھر نعت پیغمبر اور بیان معراج ہے اس کے بعد پیر طریقت خواجہ عبداللہ نقشبند سے خطاب کیا ہے بعد میں... سلطان حسین بالیقرا کی مدح میں ذیل کا شعر کہا ہے ؎

دریں مین آنکہ چوں انسان عین است جہاں مردی سلطان حسین است

مثنوی کا ماخذ کلام مجید کی بارھویں سورہ ہے اس داستان کا موضوع ایران اور ترکیہ میں بہت مقبول رہا ہے چنانچہ یہ داستان فارسی اور ترکی میں متعدد قالب اختیار کر چکی تھی، جامی کی مثنوی کو ان سب میں امتیازی خصوصیت حاصل ہے۔

لیلیٰ مجنون! یہ پرشور اور عشق انگیز داستان بھی اور امیر خسرو کی تقلید میں لکھی گئی ہے حسب معمول مثنوی کا آغاز خطبہ سے ہوتا ہے پھر نعت نبی اور بیان معراج ہے پھر عبداللہ نقشبند سے خطاب کیا ہے پھر اصل داستان کی طرف رجوع ہوا ہے اس میں خاص طور سے یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ ماحول عربی ہے۔

جامی نے اپنی مثنویاں نظامی سے متاثر ہو کر لکھی ہیں۔ جامی اپنے پیشرو نظامی کا محض مقلد نہیں بلکہ اس کا ایک کامیاب حریف ہے جامی کی خصوصیت

یہ ہے کہ اس میں سادگی روانی اور شیرینی ہے کہیں تصنع اور تکلف نام کو نہیں اس لحاظ سے جامی کو نظامی سے کہیں زیادہ مقبولیت حاصل ہے ہر وہ شخص جسے فارسی زبان سے تھوڑا بہت علاقہ ہے وہ آپ کے کلام سے لطف اندوز ہوتا ہے لیکن نظامی ہمہ گیر صلاحیتوں کا مالک ہے اسے تاریخ ایران اور علوم حکمت و ریاضی میں پوری پوری آگہی ہے اس کے کلام میں تخیل، گہرائی اور متانت بدرجہ کمال پائی جاتی ہے اس لئے نظامی کے کلام سے وہی لوگ بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں جن کو فارسی زبان پر اور رموز شعر و حکمت میں کامل دستگاہ ہو

جامی نے خود اپنے دیوان کی تین مرتبہ ترتیب و تدوین کی پہلی مرتبہ ۸۸۴ ہجری میں دیوان مرتب کیا۔ دیوان کا آپ نے فصیح و بلیغ فارسی میں مقدمہ لکھا جس میں شعر و شاعری کے محاسن بیان کئے ہیں اور آیات قرآنی اور احادیث سے مقدمہ کو زینت دی ہے جناب نبی کریم کی چند روایات بھی نقل کی ہیں جن سے آنحضرت کی شعر دوستی کا پتہ چلتا ہے آنحضرت کے بعد ان مشائخ کا ذکر کیا ہے جن کو شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔

سنہ [illegible]ھ ہجری میں آپ نے کچھ اور اشعار جمع کرکے پہلے دیوان کے ساتھ شامل کئے پھر آخری مرتبہ سنہ ۸۹۶ھ ہجری میں یعنی وفات سے ایک سال پہلے اپنے دیوان کی تدوین کی نئے اشعار کو اس شامل کرکے سارے دیوان کو تین حصوں میں تقسیم کیا پہلے حصے کا نام فاتحۃ الشباب۔ دوسرے کا نام واسطۃ العقد اور تیسرے کا نام خاتمۃ الحیوٰۃ ہے۔

جامی کے دیوان میں قصائد، غزلیات، قطعات اور رباعیات غرض سبھی کچھ موجود ہے لیکن قصائد میں آپ انوری اور ظہیر فاریابی کے مرتبے کو نہیں نہ غزلیات میں سعدی و حافظ کا مقام حاصل کیا ہے قطعات میں سنائی و ابن یمین کی برابری نہیں کر سکے نہ رباعیات میں عمر خیام و ابو الخیر کا درجہ پا سکے۔ بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ عارفانہ مطالب کو جامی نے غزل کے

پیکر میں اس خوبی سے پیش کیا ہے کہ یہ انہیں کا حصہ ہے

(ادب نامہ ایران مقبول بیگ بدخشانی)

فیضی

ہندوستان کے مشہور ترین فارسی گو شاعروں میں امیر خسرو دہلوی، عرفی شیرازی اور فیضی قابل ذکر ہیں اگرچہ فیضی نے ہندوستان میں اپنی زندگی بسر کی لیکن اس نے متانت سخن اور استحکام شعر میں وہ مقام حاصل کیا ہے کہ ایرانی شاعروں میں اور اس میں آسانی کے ساتھ تمیز نہیں کیا جاسکتا اس کا اثر ہندوستان اور عثمانی ممالک میں بہت زیادہ رہا ہے۔

فیضی ابن مبارک شاہ ۹۵۴ھ میں ہندوستان کے پایہ تخت آگرہ میں پیدا ہوا اس کا بھائی شیخ ابوالفضل اکبر کے دربار کے مورخوں اور عالموں میں شامل تھا اور اس نے اکبری دور سے متعلق بہت سی کتابیں لکھی ہیں فیضی نے فارسی شعر وسخن میں مہارت تامہ حاصل کی تھی اور اکبر کے دربار کا ملک الشعراء بن گیا تھا اس نے قصیدے اور غزل دونوں میں بلند مقام حاصل کیا ہے اور قدما کے سبک کی بہت اچھی تقلید کی ہے اس نے ہندوستان میں فارسی کی ترویج میں نہ صرف بہت بڑا حصہ لیا ہے اور ایران سے ہندوستان آنے والے شاعروں کی سرپرستی کی ہے بلکہ عثمانی ممالک میں بھی اس کے اثر سے فارسی ادبیات کی ترویج میں کافی وسعت پیدا ہوئی اس کے دیوان میں قصیدے مرثیے۔ ترکیب بند، قطعات اور غزلیں ہیں۔ اس شاعر نے بھی اور شاعروں کی طرح نظامی کی تقلید میں خمسہ کہنے کی کوشش کی ہے چنانچہ اس سلسلہ میں میں اس نے نظامی کی مثنوی شیریں خسرو کے جواب میں نل دمن کے نام سے ایک مثنوی لکھی ہے اس مثنوی کے مطالب ہندی حکایات سے لئے گئے ہیں فیضی نے ہندی علوم اور ہندی ادب کی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے چنانچہ فارسی زبان میں مہابھارت کا ترجمہ اسی کا کیا ہوا ہے فیضی کے پر اثر اشعار میں وہ مرثیہ

بھی شامل ہے جو اس نے اپنے بیٹے کی موت پر کہا ہے

ای روشنیٔ دیدۂ روشن چگونہ‌ای　　من بے تو تیرہ روزم و تو بے من چگونہ‌ای
ماتم سراست خانۂ من در فراق تو　　تو زیر خاک ساختہ مسکن چگونہ‌ای

فیضی کا یہ مرثیہ بے اختیار جامی کے اس مرثیہ کی یاد دلاتا ہے جو جامی نے اپنے بیٹے کی وفات پر لکھا تھا۔

فیضی نے سنہ ۱۰۰۴ھ میں وفات پائی۔

(تاریخ ادبیاتِ ایران۔ رضازادہ شفق)

فیضی عربی النسل ہے اسلاف یمن میں رہتے تھے شیخ موسیٰ جو فیضی کی پانچویں پشت میں ہیں وطن سے ترک تعلق کر کے سیاحت کو اٹھے چلتے پھرتے سندھ کے علاقے میں آئے ریل ایک قصبہ ہے یہاں قیام کیا اور شادی کر لی دسویں صدی ہجری میں شیخ خضر فیضی کے دادا کو وطن چھوڑنا پڑا انہوں نے ناگوری میں آکر ایک عربی خاندان میں شادی کر لی جس سے شیخ مبارک پیدا ہوئے۔ شیخ مبارک ناگور سے گجرات اور گجرات سے آگرہ میں آئے اور یہیں ایک معزز خاندان میں شادی کی خدا نے کثرت سے اولاد دی سب سے پہلا فیضی تھا۔

فیضی نے ابتدائی اور انتہائی تعلیم باپ سے پائی خواجہ حسین مروی نے بھی غالباً فن شاعری میں اس کی تربیت کی اکبر کے ابتدائی دور میں دو شخص مذہبی حیثیت سے نہائت جاہ و اقتدار رکھتے تھے مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی یہ دونوں بزرگ جس قدر دیندار تھے اسی قدر جاہلانہ تعصب بھی رکھتے تھے جیسا کہ عام طور پر دینداری کا مقتضے سمجھا جاتا ہے ان لوگوں نے اکبر کو آمادہ کیا کہ ملک میں جو بد عقیدہ لوگ ہیں ان کا استیصال کر دیا جائے چنانچہ عام دار و گیر شروع ہوئی بہت سے لوگ قتل اور قید کئے گئے

شیخ مبارک کو وسعت نظر اور ہمہ دان ہونے نے تقلید اور تعصب کی بندشوں

سے آزاد کر دیا تھا۔ خود حنفی تھا لیکن شیعی، سنی مسلمان کا فرسب سے ملتا تھا اس زمانہ میں مہدوی فرقہ نہائت مطعون خلائق تھا شیخ کو ان سے ملنے میں بھی دریغ نہ تھا عوام میں شہرت پھیلی کہ شیخ رافضی ہے مہدوی ہے لہذا مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی نے اکبر سے کہا کہ شیخ مبارک بھی بدعتی ہے اس کو سزا ملنی چاہیئے چنانچہ اسی وقت محتسب متعین ہوئے کہ شیخ مبارک کا سارا خاندان دربار میں حاضر کیا جائے شیخ کو قبل از وقت خبر مل گئی فیضی اور ابوالفضل کو ساتھ لے کر راتوں رات نکل کھڑا ہوا۔

شیخ کے دشمنوں نے اب یہ اڑائی کہ فیضی اور شیخ مبارک معتوبان بارگاہ ہیں۔ اس افواہ کی بنا پر میزبان نے بے اعتنائی شروع کی شیخ کو کھٹکا ہوا کہ خود صاحب خانہ کہیں پکڑوا نہ دے شب کو بے سروسامانی کے ساتھ وہاں سے نکل کھڑے ہوئے ایک مدت تک مارے مارے پھرتے رہے سخت مصائب کا سامنا ہوا غرض پھر پھرا کر آگرہ آئے اور ایک دوست کے یہاں قیام کیا اور چند لوگ بھی شیخ کے طرفدار پیدا ہو گئے مرزا عزیز جو اکبر کا رضاعی بھائی اور بہت منہ چڑھا تھا اس نے بھی بادشاہ سے ان لوگوں کی نہایت سفارش کی دربار شاہی میں تقریب ہوئی ۹۷۴ھ ہجری میں اکبر نے بڑے احترام سے بلایا۔ ابوالفضل کی طبیعت میں نہایت آزادی اور استغنا تھا دربار میں جانے سے قطعی انکار کر دیا فیضی گئے اور شاہانہ نوازش سے بہرہ یاب ہوئے

فیضی کا تقرب روز بروز بڑھتا گیا لیکن اس نے دربار کی کوئی خدمت اختیار نہ کی طبیب تھا مصنف تھا شاعر تھا اور انہیں شغلوں میں زندگی بسر کرتا تھا شہزادوں کی تعلیم و تربیت کا کام بھی اس سے متعلق تھا ۲۴ھ جلوس میں شہزادہ دانیال کی تعلیم و تربیت سپرد ہوئی اسی سنہ میں اکبر نے اجتہاد و امامت کے دعوے سے جا کر خطبہ پڑھا یہ خطبہ فیضی ہی کا لکھا ہوا تھا۔

بنام آں کہ ما را خسروی داد — دل دانا و بازوئے قوی داد

بود وصفش ز حدِ فہم دیر تر   تعالےٰ شانہٗ، اللہ اکبر

اکبر نے شیخ عبدالنبی کا زور توڑ کر صدارت کے ٹکڑے کر دیئے تھے چنانچہ سنہ ۹۹۰ ہجری میں آگرہ، کالنجر اور کالپی کی صدارت فیضی کو دی گئی سنہ ۹۹۳ ہجری میں جب یوسف زئی پٹھانوں پہ اکبر نے فوجیں بھیجیں تو فیضی بھی اس مہم میں مامور کیا گیا سنہ ۹۹۶ ہجری کو اکبر نے ملک الشعرا کا خطاب دیا سنہ ۱۰۰۴ ہجری میں انتقال کیا۔

فیضی پر بظاہر شاعری کا احسان ہے کہ آج اس کو جو شہرت ہے اسی نام سے ہے لیکن درحقیقت شاعری ہی نے اس کے تمام کمالات کو مٹا دیا ایشیائی درباروں میں خوشامد اور تملق کے بغیر کوئی شخص فروغ نہیں پا سکتا لیکن فیضی نے علم کی آبرو باقی رکھ لی اوروں کی طرح عزت نفس کو برباد نہیں کیا اسی بنا پہ باوجود اس تقرب اور ہمنشینی کے اس کا منصب چار صدی سے نہ بڑھا۔

نہایت فیاض اور سخی تھا اہل کمال کے لئے اس کا گھر مہمان سرائے عام تھا عرفی ایران سے آیا تو اول اسی کا مہمان ہوا حیدر معمائی نے سورہ قل ھو اللہ سے اس کی تفسیر کی تاریخ نکالی تو دس ہزار روپیہ صلہ میں دیا۔

وہ ریاکار مولویوں سے جلتا تھا لیکن فقرا اور اہل دل کا نہایت گرویدہ تھا اور اصلی مقدس بزرگوں سے نہایت عقیدت رکھتا تھا۔ شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی سے اس کو نہایت خلوص تھا مدتوں فتح پور میں بلا کر مہمان رکھا اکثر بزرگوں کے مزار پہ حاضر ہوتا تھا خواجہ فریدالدین شکر گنج کی خدمت میں خاص ارادت تھی۔

رشک و حسد اور ناتواں بینی شعرا کا عام خاصا ہے لیکن فیضی تمام معاصرین کا نام نہایت عزت اور محبت سے لیتا تھا اور دربار شاہی میں ان کی سفارش کرتا تھا

تصنیفات :۔ صاحب "مآثر الامرا" نے لکھا ہے کہ فیضی نے ایک سو ایک ۔۔۔۔ کتابیں تصنیف کیں ان میں جن کا پتہ چلتا ہے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) خمسہ یعنی نظامی کی پانچوں مثنویوں کا جواب ۔ مرکز ادوار۔ سلیمان بلقیس نلدمن ۔ ہفت کشور اور اکبر نامہ ہیں ۔ ان میں دو کتابیں مرکز ادوار اور نلدمن انجام کو پہنچیں نلدمن چار مہینے میں تمام ہوئی اس میں چار ہزار شعر ہیں ملا عبدالقادر بدایونی ہر جگہ جہاں فیضی کا ذکر آتا ہے بے نقط سناتے ہیں لیکن یہاں مجبور ہو کر ان کو بھی تعریف کرنا ہی پڑتی ہے چنانچہ فرماتے ہیں :۔

" والحق مثنوی است کہ دریں سہ صد سال مثل آں بعد از امیر خسرو شاید در ہند کسے دیگر گفتہ باشد "

(۲) موارد الکلم :۔ تفسیر غیر منقوطہ لکھنے کا جب ارادہ کیا تو مشق کے طور پر پہلے یہ کتاب لکھی اور بلاد عرب میں بھیجی لوگوں نے اس کی بہت داد دی

(۳) سواطع الالہام :۔ یعنی تفسیر غیر منقوطہ ۱۰۰۲ھ میں تمام ہوئی کل مدت تصنیف دو اڑھائی برس ہے فیضی کے مخالفین نے اس موقعہ پہ بھی اعتراض کیا تو یہ کیا کہ آج تک کسی نے بے نقط تفسیر نہیں لکھی اس لئے یہ بدعت ہے لہذا خلاف شریعت ہے فیضی نے برجستہ جواب دیا کہ خود کلمہ توحید سرتاپا غیر منقوط ہے

(۴) انشائے فیضی :۔ نورالدین محمد عبداللہ بن حکیم عین الملک جو نسلاً ایرانی اور ہندوستان زاد تھے فیضی کے بھانجے اور شاگرد تھے انہوں نے فیضی کے تمام مکاتیب اور خطوط مہیا کر کے ایک مجموعہ مرتب کیا اور لطیفۂ فیضی نام رکھا اس وقت تک خطوط اور مراسلات سے بیان واقعہ کے بجائے زیادہ تر اظہار انشا پردازی مقصود ہوتا تھا فیضی پہلا شخص ہے جس نے سادہ نگاری کی ابتدا کی اس طرز میں اس کا کوئی نظیر نہیں۔

دیوان غزلیات: اس میں کچھ اوپر نو ہزار شعر ہیں خود دیباچہ لکھا ہے خاتمہ پر چند رباعیاں بھی لکھی ہیں دیوان کا نام طباشیر الصبح رکھا دیوان جب مرتب ہوا تو فیضی کی عمر ۴۰ سے کچھ اوپر تھی۔

قصائد: ۔ مختصر سا مجموعہ ہے حمد و نعت، مدح، فخر اور تصوف اخلاق وغیرہ مضامین پر الگ الگ قصیدے لکھے ہیں تعداد کم ہے لیکن کئی کئی سو شعر کے ہیں طرحیں بھی اپنے معاصرین سے جدا اختیار کی ہیں بیٹے کا ایک مرثیہ بھی ہے اور نہایت پر درد ہے خاتمہ پر قطعات بھی ہیں۔

ابوالفضل کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ فیضی کے کل کلام کی تعداد پچاس ہزار شعر ہے۔

مہابھارت: ۔ ۹۹۰ھ میں اکبر نے مہابھارت کا ترجمہ کرنے کا حکم دیا لوگوں کو الگ الگ ٹکڑے سپرد ہوئے دو فن فیضی کے حصے میں آئے

تذکرہ شعرا کا تذکرہ لکھنا شروع کیا لیکن اس کے سوا کہیں پتہ نہیں کہ ایک دوست کے خط میں اس کا کچھ ذکر آیا ہے۔

لیلاوتی: یہ حساب میں ہے فیضی نے سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا اتھروں وید کا ترجمہ بھی فیضی کی طرف منسوب ہے لیکن صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ اس کے ترجمہ کا کام پہلے بدایونی، پھر فیضی اور بعد ازاں ابراہیم سرہندی کے سپرد ہوا۔

فارسی رامائن کو بھی عام لوگ فیضی کی طرف منسوب کرتے ہیں لیکن دراصل اس کا ترجمہ بدایونی نے چار برس میں کیا تھا فیضی فطرتاً شاعر تھا اس کا خاندان شاعری سے کچھ تعلق نہ رکھتا تھا تعلیم و تربیت بھی شاعر کی حیثیت سے نہیں ہوئی تھی تاہم وہ بچپن سے شعر کہتا تھا لیکن چونکہ طبیعت مشکل پسند تھی اور عربیت کا زور تھا اس لئے زیادہ تر صنائع کی طرف مائل رہا۔ ابتدائی قصائد میں نامانوس عربی الفاظ بکثرت آتے ہیں اور یہ وہی ملائیت کا زور ہے جو

یکی معلمی شاہزادہ ہای عظام — کہ بر نہال میکنند اعضانی

ایک قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالفرج رونی کا تتبع کرتا تھا چنانچہ کہتا ہے

ذوقی کہ تواں گرفت از شعر — از شعر ابوالفرج گرفتم

لیکن جس قدر اہل زبان سے اختلاط بڑھتا گیا زبان سادہ اور صاف ہوتی گئی۔ عرفی، ظہوری، ملک قمی سے صحبتیں رہتی تھیں خصوصاً عرفی کے زور طبع اور چاشنیٔ سخن کا نہایت معترف ہے محتشم کاشی کی بھی تعریف کرتا ہے۔

فیضی نے قصیدہ، مثنوی غزل سب کچھ کہا ہے لیکن قصیدے بے مزہ ہیں ابتدا کے کلام ایک طرف اخیر کے قصائد سے بھی ملائیت کی بو آتی ہے البتہ مثنوی اور غزل لاجواب ہے

فیضی کی خصوصیات میں سب سے بڑھ کر جوش بیان ہے جس کا وہ موجد بھی ہے اور خاتم بھی جوش بیان خواجہ حافظ میں بھی ہے اور اعلیٰ درجہ پر ہے لیکن انداز مضامین اور دنیا کی بے ثباتی کے ساتھ مخصوص ہے فیضی کے ہاں فخریہ، عشقیہ، فلسفیانہ ہر قسم کے مضامین میں وہی جوش پایا جاتا ہے یہ جوش بیان اس کے ذاتی حالات کا خاص اثر ہے جو کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکتا ہے

شدیم خاک و لیکن ببوئی تربت ما — تواں شناخت کزیں خاک مردمی خیزد

فیضی کی ممتاز خصوصیات شاعری میں سے شوخیٔ استعارات اور ندرت تشبیہات ہے فیضی اکثر فلسفیانہ مضامین باندھتا ہے ساتھ ہی ادعا اور غرور کی جھلک بھی ہوتی ہے

عجب تر از دل فیضی ندیدہ ایم طلسم — کہ گوہر بود و ہم محیط و ہم غواص

(شعر العجم شبلی نعمانی)

فیضی

امیر خسرو کے بعد پاک و ہند کا دوسرا بڑا فارسی زبان کا شاعر فیضی ہے اکبر اعظم کے دربار کا ملک الشعراء تھا وہ نہ صرف عظیم شاعر تھا بلکہ عربی اور سنسکرت کا بہت بڑا عالم بھی تھا فیضی کو اگرچہ ایران سے کوئی نسبت نہیں لیکن وہ سبک ہندی کے موجدوں میں سے ہے جس نے بعد کے ایرانی شعرائ کو متاثر کیا۔

فیضی عربی النسل ہے اس کے آبا و اجداد یمن سے ترک ۔ ۔ ۔ ۔ وطن کر کے ہندوستان آئے اور سندھ کے علاقے میں سکونت اختیار کر لی آپ کے دادا خضر اجمیر کے قریب قصبہ ناگور میں آباد ہو گئے آپ کے والد شیخ مبارک ناگور سے آگرہ آئے اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی یہیں شادی کی اور ابوالفضل اور فیضی پیدا ہوئے۔

آگرہ میں انہوں نے اپنا مکتب کھولا اور علم کے تشنہ جوق در جوق آپ کے پاس آتے لگے شیخ مبارک آزادانہ خیال سے عقائد دین پہ غور کرنے کی تلقین کرتے تھے اس سے ظاہر پرست علماء ان کے خلاف ہو گئے۔ اس زمانے میں عبداللہ سلطان پوری اور شیخ عبدالنبی اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے مغلوں کے دربار میں بڑا اثر رکھتے تھے یہ علماء شیخ مبارک سے جلنے لگے اور انہوں نے شیخ مبارک اور اس کے آزاد خیال بیٹوں پہ کفر کے فتوے لگائے اور طرح طرح سے سازشیں کیں آخر اکبر نے سارے خاندان کو دربار میں طلب کیا شیخ مبارک عتاب شاہی سے ڈر کر گھر چھوڑ کر مختصر سے قافلہ کو لے کر اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے رہے اس عرصہ میں شیخ مبارک مرزا کوکہ سے ملے انہوں نے شیخ کی مصیبتوں کا حال بادشاہ سے بیان کیا، اکبر بادشاہ کے دل

پر اثر ہوا اور علماء کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انہیں بلا بھیجا
شیخ مبارک آگرہ گئے وہی مدرسہ جاری کیا اور اکبر کے دربار میں آنے جانے لگے فیضی اس عرصہ میں تعلیم سے فارغ التحصیل ہو چکا تھا عربی اور سنسکرت میں اس نے انتہائی تعلیم حاصل کی تھی اس کے علم کی شہرت دربار تک پہنچی، ۹۷۵ھ ہجری میں بادشاہی لشکر جب چتوڑ پر حملہ آور ہوا تو کسی تقریب سے فیضی کا ذکر بھی آیا چنانچہ بادشاہ نے حاضری کے لئے شاہی فرمان جاری کیا فیضی آستانہ عالیہ پر پہنچا بادشاہ اس وقت کٹہرے میں کھڑا تھا فیضی آداب بجالایا اور یہ قطعہ کہا ؎

بادشاہا درون پنجرہ ام   از مہر لطف خود مرا جا دہ
زاں کہ من طوطی شکر خانم   جای طوطی درونِ پنجرہ بہ

اکبر فیضی کی بدیہہ گوئی پر بہت خوش ہوا اور اپنے حضور میں بلا لیا چنانچہ ۹۹۶ھ میں جب اکبر اعظم نے تاجپوشی کی تینتیویں سالگرہ منائی تو فیض کو ملک الشعراء کے خطاب سے نوازا ایک غزل کے مطلع میں اس کی طرف اشارہ ہے ؎

آں روز کہ فیض عام کردند   مارا ملک الکلام کردند

فیضی نے کلام مجید کی ایک تفسیر لکھی اس ضخیم تفسیر میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ اس میں نقطے والا کوئی حرف نہ آئے اس کا نام "سواطع الالہام" ہے۔ اکبر کی تاجپوشی کی سالگرہ پر فیضی نے نظامی کے جواب میں خمسہ لکھنا شروع کیا جن کے نام یہ ہیں

مخزن الادوار۔ نل دمنی۔ مرکز ادوار، سلیمان و بلقیس، ہفت کشور ان کے علاوہ طباشیر الصبح، لیلاوتی، لطیفۂ غیبی۔ موارد الکلم اور مہابھارت کا ترجمہ۔

فیضی فلسفی تو نہیں لیکن اس کے ذہن کی افتاد فلسفیانہ ضرور ہے اکثر

فلسفیانہ مضمون باندھتا ہے اپنے اس انداز بیان کا اسے احساس بھی ہے چنانچہ وہ خود کہتا ہے ؎

امروز نہ شاعرم حکیم   دانندۂ حادثِ قدیم

یہ شاعر اور حکیم اس پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ محسوس کرتا ہے کہ اگرچہ وہ خاک ہند سے پیدا ہوا ہے لیکن اس کے ہر بن مو میں ہزاروں یونان سمائے ہوئے ہیں ؎

ایں کالبد ز خاک ہند است ولیک   در ہر بن مو ہزار یونان دارم

فیضی کی اکثر غزلوں میں عشق و محبت کی کیفیات کے ساتھ ساتھ فلسفۂ عمل بھی پایا جاتا ہے ؎

باز باران طریقت سفری در پیش است   رہ نوردان بلا را خطرے در پیش است

فیضی کی مثنویوں میں انوری کے قصائد کا سا شکوہِ لفظی اور جوشِ بیان پایا جاتا ہے جوش بیان جو قصائد کا خاصا ہو سکتا ہے وہ فیضی کی غزلیات میں بھی نظر آتا ہے اس قادر الکلام شاعر کا قلم اس کے علم و فضل کے دباؤ سے مجبور ہوتا ہے تو غزل کی سادگی اور روانی کو چھوڑ کر قصائد کا پرشکوہ انداز اختیار کر لیتا ہے یہی وجہ ہے کہ فیضی کی غزلیات زیادہ مقبول نہ ہو سکیں۔

فیضی کو نئی نئی تشبیہیں اور استعارات لانے میں خاص ملکہ حاصل ہے مثلاً ؎

گر عشق چنیں سبو زدم پاک   مہتاب بروں آرم از خاک

فیضی اکثر اشعار میں اپنے علم و فضل کی برتری کا اظہار کرتا ہے اسے محض خود ستائی نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ یہ حقیقت کا اظہار ہے جو شاعر علم و فضل کی دولت سے مالا مال ہو اپنے فکر و خیال کی وسعتوں سے آگاہ ہو بادشاہ وقت کا قرب اسے حاصل ہو ایوان شاہی کا ملک الشعرا ہو وہ اپنی

فوقیت کا اظہار کرے تو بے شک اسے زیب دیتا ہے ؎

وگر از شعر من اثر خواہی — از حدیثم ہزار انجمن است

فیضی بہت بلند نگاہ شاعر ہے فیضی سمجھتا ہے کہ اس کا کلام فیضان الٰہی ہے اس کے نوک قلم سے جو کچھ نکلتا ہے اگرچہ اس کی عبارت کا تعلق تو فیضی سے ہے لیکن معنی اور خیال عطیۂ خداوندی ہے ؎

ہر نکتہ کہ می ریخت ز نوک قلمم — معنی ز خدا بود عبارت از من

(ادب نامہ ایران مقبول بیگ بدخشانی)

عرفی شیرازی

جمال الدین محمد عرفی ابن بدرالدین صفوی دور کا مشہور شاعر ہے اس نے ہندوستان میں زیادہ شہرت پائی ہے عرفی شیراز میں پیدا ہوا۔ یہیں تعلیم کی تکمیل کی اور جوانی میں ہندوستان کا سفر کیا اور یہاں فارسی گو شاعروں اور ادیبوں سے میل جول بڑھایا اس دوران میں اس کی شاعری کی شہرت شہنشاہ اکبر کے دربار میں پہنچی، اکبر کا دربار اس وقت شاعروں، ادیبوں اور عالموں کا ملجا و ماوا بنا ہوا تھا عرفی کو بھی اس دربار میں بار حاصل ہو گیا عرفی نے.. قصیدے غزلیں اور قطعے لکھے ہیں اور انہیں خاص طور پہ ہندوستان اور ترکی میں بڑی شہرت اور حسن قبول حاصل ہوا۔ ان ملکوں میں اس کی کافی تقلید ہوئی۔ عرفی کے مشہور قصیدوں میں ایک قصیدہ وہ ہے جو حضرت علی کی شان میں لکھا گیا ہے اس قصیدہ کا مطلع ہے ؎

جہاں بگشتم و دردا کہ ہیچ در شہر و دیار　　ندیدہ ام کہ فروشند بخت در بازار

عرفی نے نظامی کی تقلید میں خمسہ لکھنا شروع کیا تھا لیکن مخزن الاسرار اور خسرو شیریں کے جواب میں دو مثنویوں سے زیادہ نہ لکھ سکا عرفی کی شاعری ایک مخصوص رنگ رکھتی ہے اور اسے ہندوستانی فارسی کا رنگ کہا جا سکتا ہے اس کا طرز شاعری کا رنگ امیر خسرو اور فیضی کے سبک سے مشابہت رکھتا ہے یہ طرز بجائے خود شیریں اور دلنشین ہے شاید بیان کی یہی دلآویزی ہے کہ جس کی وجہ سے خود اپنے زمانے میں عرفی کو اپنے کلام کی داد مل گئی تھی اور خود اسے اپنی شہرت کا اندازہ ہو گیا تھا، چنانچہ اس نے کئی جگہ اپنی تعریف آپ کی ہے مثلاً ایک جگہ

کہتا ہے ؎

نارش سعدی بہشت خاک شیراز چہ کرد　　گر نمی دانست باشد مولا و ماوائے من

عرفی نے دیوان اشعار کے سوا گلشن راز کے نام سے ایک ترجیع بند اور نفیسہ کے نام سے نثر کی ایک صوفیانہ کتاب یادگار چھوڑی ہے عرفی نے عین عالم شباب میں بمقام لاہور ۹۹۹ ہجری میں وفات پائی۔ وفات کے وقت اس کی عمر چھتیس سال سے زیادہ نہ تھی

(تاریخ ادبیات ایران رضا زادہ شفق)

عُرفی

محمدؐ نام جمال الدین لقب عرفی تخلص باپ کا نام زین الدین ملوی اور دادا کا نام جمال الدین چادرباف ایران میں ان عدالتوں اور محکمہ جات کو جو مذہبی صیغہ سے تعلق نہیں رکھتی تھیں عرف کہتے ہیں عرفی کا باپ شیراز کی دار الحکومت میں ایک معزز عہدہ پر ممتاز تھا عرفی نے اسی مناسبت سے اپنا تخلص عرفی رکھا تھا۔

اس تخلص کے اختیار کرنے کے متعلق اس قدر اور کہنا ضرور ہے کہ عرفی فطرتاً مغرور اور خود ستا تھا چونکہ ایران کے اکثر شعراء معمولی خاندانوں سے تھے مثلاً خاقانی بڑھئی تھا، فردوسی باغبانی کرتا تھا باقر کاشانی خردہ فروش تھا برخلاف اس کے عرفی ایک معزز خاندان کا آدمی تھا اور اس کا باپ سرکاری محکمہ سے بھی تعلق رکھتا تھا اس لئے تخلص میں بھی فخر کی ادا قائم رکھی عرفی نے نام ونسب پر اکثر فخر کیا اور یہی اس کے خصوصیات میں ہے ورنہ ایرانی شعرا میں نسب کا فخر بہت ہی کم ہے۔

عرفی کی تعلیم وتربیت شیراز میں ہوئی اس نے علاوہ معمولی علوم کے مصوری اور نقاشی کی بھی تعلیم پائی تھی اس نے جب ہوش سنبھالا تو سلطنت صفویہ کا شباب تھا طہماسپ اور عباس کی علم پروری نے تمام ایران کو علم وہنر کی نمائش گاہ بنا دیا تھا بالخصوص شاعری بڑے زوروں پر تھی محتشم کاشی، وحشی یزدی، غیرتی وغیرہ نے فنائی کی طرز کو اور زیادہ شوخ کر دیا تھا عرفی نے بھی اپنے اظہار کمال کے لئے یہی میدان پسند کیا اور باوجود کمسنی کے بڑے بڑے پرانے استادوں کے ساتھ معرکہ آرائی

شروع کردی اور عام مشاعروں میں بے باکانہ غزلیں پڑھتا تھا۔

عرفی کی قدر دانی کے لئے اگرچہ ایران میں بھی کچھ کم سامان موجود تھا تاہم ہندوستان کی سی بات کہاں نصیب ہو سکتی تھی جس کی بدولت ایران کے ہر ہر گوشہ سے اہل فن کھینچ چلے آتے تھے۔

بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ عرفی شہزادہ سلیم کے حسن پر غائبانہ عاشق ہو کر ہندوستان آیا راستہ میں ڈاکہ پڑا اور اس کی کل کائنات جاتی رہی ہندوستان میں اگرچہ سینکڑوں امراء اور اہل دول تھے لیکن عرفی نے ان سب میں فیضی کو انتخاب کیا جس کی وجہ یا تو یہ تھی کہ اس کے دربار تک پہنچنا آسان تھا یا یہ کہ سخن شناسی کی توقع جو فیضی سے ہو سکتی تھی اور کسی سے ممکن نہ تھی عرفی فتح پور سیکری میں فیضی سے ملا۔ فیضی نے اس کی پوری قدردانی کی لیکن عرفی کی نخوت پرستی کی وجہ سے صحبت برقرار نہ رہ سکی اور بالآخر اس دربار سے قطع تعلق کرنا پڑا۔

اس زمانے میں اکبری دربار کے نورتن سب موجود تھے ان میں حکیم ابوالفتح گیلانی اگرچہ ظاہری منصب و اقتدار کے لحاظ سے سب سے کم پایہ تھا لیکن بہت بڑا عالم اور علم و فضل کا بڑا قدرداں تھا معہذا عرفی کا ہم وطن اور ہم مذہب تھا ان خصوصیات کی بناء پر اس نے اسی کو ترجیح دی اور مدحیہ قصیدہ لکھ کر پیش کیا یہ پہلا دن تھا کہ عرفی کے غرور کی آن ٹوٹی غالباً عرفی کو بھی اس کا صدمہ ہوا حکیم ابوالفتح چونکہ بڑا نکتہ شناس اور نقاد فن تھا عرفی نے اس کے فیض صحبت سے بہت ترقی کی۔ عرفی نے بھی حکیم ابوالفتح کی احسان مندی کا پورا حق ادا کیا جس زور کے قصیدے حکیم صاحب کی شان میں لکھے اکبر و خانخاناں کی مدح میں نہیں لکھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب تک ابوالفتح زندہ رہا خود اپنی خواہش سے کسی دربار کی طرف رُخ نہیں کیا۔

حکیم ابوالفتح کے مرنے کے بعد عرفی خانخاناں کے درباریوں میں داخل ہوا اور پھر خاندان شاہی کے سوا اور کسی آستانہ پر کبھی سر نہیں جھکایا چنانچہ خود فخریہ کہتا ہے ؎

یک منعم و یک نعمت و یک منت و یک شکر
صد شکر کہ تقدیر چنیں راندہ قلم را

چونکہ خانخاناں کے دربار میں بڑے بڑے نامور شعراء مثلاً نظیری، شکیبی، اُنیسی اور ظہوری وغیرہ سے مقابلہ رہتا تھا۔

عرفی کا کلام روز بروز ترقی کرتا گیا یہاں تک کہ تقرب اور اختصاص میں بھی وہ حریفوں کی صفوں کو چیرتا ہوا آگے نکل گیا یہ بات اسی کو نصیب ہوئی کہ دربار میں جاتا تو عام طریقہ پر آداب و کورنش نہیں بجالاتا تھا جس طرح چاہتا بیٹھ جاتا تھا۔

عرفی نے اگرچہ خانخاناں کے سوا امرا اور اہل دربار میں سے کسی کی مدح سرائی نہیں کی لیکن فرمانروائے وقت سے بے نیازی ممکن نہ تھی اس لئے خود اپنی خواہش سے یا خانخاناں کی فرمائش سے اکبر کی مدح میں اس نے متعدد قصائد لکھے۔

خانخاناں اور اکبر کے سوا عرفی نے کسی اور آستانہ کی ناصیہ فرسائی کی تو وہ شہزادہ سلیم تھا اور عرفی کی تاریخ زندگی میں یہ واقعہ ایک خاص حیثیت رکھتا ہے تمام تذکرے متفق ہیں کہ عرفی شہزادہ سلیم مذکور کا جان نثار تھا یہ امر اگرچہ بظاہر بالکل خلاف قیاس ہے لیکن عرفی کے قصائد میں بے شبہ یہ جھلک ہے۔

عرفی کے اخلاق و عادات میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ فخر، غرور، کم بینی، اور خودستائی ہے اس کے معتقدین خاص تک اس کے غرور سے نالاں ہیں اور اس کے ہم عصر بھی اس کے فخر و غرور سے بیزار ہیں

عرفی چونکہ حد سے زیادہ مغرور اور خودستا تھا اساتذہ سلف کا نام اپنے مقابلہ میں تحقیر سے لیتا ہے ؎

دم عیسیٰ تمنا داشت خاقانی کہ برخیزد   بامداد صبا اینک فرستادم بشر دانش

اکبر نے کسی موقعہ پر ایک گھوڑا انعام میں دیا تھا شکریہ کے بجائے اس کی ہجو لکھ ڈالی

شہنشاہ حقیقت اسپے کہ دادہ   بشنو ز لطف تا برسانم بعرض
ہستم برو سوار و لیکن پیادہ ام   گامے بطول میزدم اکنون زنم بعرض

نہائت حاضر جواب اور ظریف الطبع تھا ایک دفعہ ابوالفضل کے گھر پہ اس سے ملنے گیا دیکھا تو ابوالفضل قلم دانتوں میں دابے ہوئے کچھ سوچ رہا ہے سبب پوچھا ابوالفضل نے کہا بھائی صاحب کی تفسیر بے نقط کا دیباچہ اسی صنعت میں لکھ رہا ہوں ایک موقعہ پہ والد کا نام آگیا ہے چاہتا ہوں کہ نام بھی آئے اور صنعت کا التزام بھی ہاتھ سے نہ جائے عرفی نے کہا تردد کی کیا بات ہے اپنے لہجہ میں ممارک لکھ دیجئے (گنوار مبارک کو ممارک کہتے ہیں)

ایک دفعہ فیضی بیمار تھا عرفی عیادت کو گیا فیضی کو کتوں سے بہت شوق تھا چند سگ بچے گلے میں سونے کے پٹے ڈالے پھر رہے تھے عرفی نے کہا "مخدوم زادہ ہا بچہ اسم موسوم اند" فیضی نے کہا "باسم عرفی" یعنی معمولی نام ہیں عرفی نے کہا "مبارک باشد" (مبارک فیضی کے والد کا نام تھا)

عرفی کی بد اخلاقی کے سب شاکی ہیں لیکن تعجب ہے کہ فیضی نے جو اس کا سب سے بڑا حریف کہا جاتا ہے عرفی کی شریف النفسی کو بہت سراہا ہے اور اس کے کمالات کی اس قدر تعریف کی ہے کہ اس سے زائد نہیں ہو سکتی۔

معلوم ہوتا ہے کہ عرفی بخلاف اور شعرائ کے رند اور اوباش نہ تھا کسی نے اس کو فسق کا الزام دیا تھا اس پر اس کو سخت صدمہ ہوا ایک قطعہ میں اس کا اظہار کیا ہے اور اپنے دل کو اس طرح تسلی دی ہے ؎

اہل دنیا ہمگی ہمت گبرند وفساد   عیلیٰ ایں راعقل شد ومریم برداشت

تذکرہ داغستانی وغیرہ میں لکھا ہے کہ حاسدوں نے اس کو زہر دیدیا انتقال کے وقت اس کی عمر ۳۶ برس تھی سنہ ۹۹۹ھ میں وفات پائی۔ لاہور میں مدفون ہُوا۔ "مآثر رحیمی" میں عبدالباقی نے لکھا ہے کہ میر صابر اصفہانی نے جو اعتماد الدولہ غیاث بیگ کا درباری تھا۔ ایک قلندر کو رقم کثیر دی کہ عرفی کی ہڈیاں لاہور سے نجف لے جائے۔ بہرحال عرفی کی یہ پیشنگوئی پوری ہوئی ؎

بکاوش مژہ از گور تانجف روم   اگر بہند ہلاکم کنی وگر بہ تتار

تصنیفات: "نفسیہ" تصوف میں ہے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ نفس کے متعلق کوئی رسالہ ہے

مثنوی — بجواب "مخزن اسرار" دیوان کے ساتھ چھپی ہے۔

مثنوی بجواب "شیریں خسرو" دمجمع الفصحا اور آتشکدہ میں اس کے اشعار نقل ہیں)

کلیات قصائد وغزلیات: سنہ ۹۹۶ھ ہجری میں ایک دیوان ترتیب دیا تھا جس میں ۲۶ قصیدے ۲۷۰ غزلیں اور سات سو شعر کے قطعات اور رباعیاں ہیں یہ اخیر کا کلام ہے اس سے پہلے چھ ہزار شعر کہے تھے وہ ضائع ہو گئے۔

اس قدر مسلّم ہے کہ اصناف سخن میں سے عرفی مثنوی اچھی نہیں کہتا تھا چنانچہ اس کے ایک معتقد خاص نے بھی اقرار کیا ہے ؎

مشوش رنگ فصاحت ندا شت   کان نمک بود و ملاحت نداشت

اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے کلام میں جا بجا خامیاں پائی جاتی ہیں لیکن بایں ہمہ وہ ایک طرز خاص کا موجد ہے اور آج تک تمام شعرا اس کی تقلید کرتے ہیں۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس کی شاعری کی شہرت قصیدے میں ہے
لیکن وہ خود کہتا ہے کہ ؎

قصیدہ کار ہوس پیشگاں بود عرفی | تو از قبیلۂ عشقی وظیفہ ات غزل است

خصوصیات کلام

زور کلام جس کی ابتدا نظامی نے کی تھی اس کو عرفی نے کمال تک پہنچا دیا زور کلام ایک وجدانی چیز ہے جس کا اظہار صرف مثالوں سے ہو سکتا ہے۔ عملاً یہ کہہ سکتے ہیں کہ شوکت الفاظ، رفعت خیالات، بندش کی چستی، فقروں کا دروبست اس کے ضروری عناصر ہیں عرفی کے کلام میں یہ سب باتیں موجود ہیں مثلاً ؎

آہنیں پنجہ تیغش بہ اجل گفت کہ من | موج بر موج شکستم چو بہ عمان رفتم
چمن آید بچمن بہر تماشائے جمال | بلبل آید بہ بلبل بہ تماشائے غزال

۲۔ عرفی نے سیکڑوں نئی نئی ترکیبیں اور استعارے پیدا کئے ہیں جن سے جدت اور طرفگی کے علاوہ نفس مضمون پہ خاص اثر پڑتا ہے مثلاً

بہ روش مہر فزا او بہ نگہ صبر گداز | مرحبا اے زعنایات ازل رمز فروش
کہ گر شورہ کوئے تو حملۂ نشتر خیز | کنم بہ مردمک دیدہ طے نشتر نار
گل اندیشۂ من سحر غلط معجزہ رنگ | بلبل نطق من الہام غلط وحی سرا

یہ مسلم ہے کہ انشا و پردازی اسی قدر لطیف اور پر زور ہوگی جس قدر استعارات پر زور اور لطیف ہونگے عرفی نے استعارات کی جدت اور تنوع سے ایک گوناگوں عالم پیدا کر دیا ہے ان میں بعض بے مزہ اور دور از کار ہیں لیکن زیادہ تر ایسے ہیں جو ایوان شاعری کے نقش و نگار ہیں مثلاً

؎ میر ابو الفتح کو سیاست او | غمزۂ زہرہ خنجر اندازد
بزم گاہ تو جملہ یوسف | رزم گاہ تو شانہ ضحاک

۴۔ عرفی کا زور طبع اور فصاحت و بلاغت کا زور شور وہاں نظر آتا ہے

جہاں وہ قصائد میں کوئی مسلسل مضمون ادا کرتا ہے اور یہ اس کا خاص انداز ہے مثلاً جب شہزادہ سلیم نے دربار میں بلا کر قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی ہے تو مدحیہ قصیدے کی ابتدا یوں کی ہے ؎

صباح عید کہ در تکیہ گاہ ناز و نعیم — گدا کلاہ نمد کج نہاد و شہ دیہیم
جہاں چنیں خوش من و خوشتر انجمان بہ ثنای — قشستہ با خرد اندر تعلم و تعلیم
کہ ناگہاں ز درم در رسید مژدہ دہی — چنانکہ از چمن طالعم ز مغز شمیم
چہ گفت؟ گفت کہ ای مخزن جواہر اقدس — چہ گفت کہ ای مطلب بہشت نعیم
بیا کہ از گہرت یاد میکند دریا — بیا کہ تشنہ طبیعت را طلب کند تسلیم

۵۔ قصائد میں شعرا کی مجال نہ تھی کہ بادشاہ کی مدح و ثنا کے سوا اپنا ذکر کر سکیں اور کبھی ایسا کرتے تھے تو صرف اپنی بیچارگی اور بے کسی کا اظہار کرتے تھے زیادہ سے زیادہ یہ کہ حضور اور شعرا کی زیادہ قدر کرتے ہیں حالانکہ میں ان سے بڑھ کر ہوں عرفی چونکہ بالطبع نہایت غیور اور خود دار تھا اس لئے مجبوراً اور ضرورتاً امراء و سلاطین کی مداحی کرتا تھا لیکن ساتھ ہی اپنے فضائل اور اوصاف اس قدر جی کھول کر بیان کرتا اور مزے لے لے کر کہتا تھا۔ شاید ہی کوئی ایسا قصیدہ ہو جس میں ایک دو شعر فخریہ نہ ہوں

شہزادہ سلیم کی مدح میں خودستائی کا بالکل موقع نہ تھا تاہم کہتا ہے ؎

خدایگانہ گویم بمدح خویش دو بیت — کز آں نیارد پہ ہیز کرد طبع سلیم

اس کے بعد دو شعر فخریہ لکھے ہیں اکبر کے دربار میں خودستائی کی کس کو جرأت ہو سکتی تھی تاہم کہتا ہے ؎

شہا بہ بزم تو چوں ایں قصیدہ برخوانم — کہ ملک نظم ز فیضش گرفتہ است نظام
سزد بجائزہ یا جیب پر گہر گردوں — بدوشم افگند ایں جامۂ زمرد فام

اہل ادب نے فخریہ کو انواع شاعری میں ایک خاص صنف قرار دیا ہے فارسی میں اس صنفِ خاص میں عرفی کا کوئی ہمسر نہیں عجب نئے نئے اسلوب سے

کہتا ہے اور اس جوش سے کہ آپے سے باہر ہوا جاتا ہے

۶۔ عرفی کی مضمون آفرینی اور نازک خیالی کا دوست اور دشمن دونوں نے اعتراف کیا ہے اس کی قوت تخیل نہایت زیر دست تھی لیکن اس زمانہ کے حسب مذاق یہ قوت صرف مبالغہ، جدت، تشبیہ اور حسن تعلیل وغیرہ پر صرف ہوئی ورنہ اگر اس سے بجا طور پر کام لیا جاتا تو شاعری کی سرحد کہیں سے کہیں جا پڑتی (گھوڑے کی تعریف میں کہتا ہے)

وحش اللہ زشبگیر سمند تو کہ ہست — دندماں کسل از شوخی او متاصل
آں سبک سیر کہ گرم عنانش سازی — از ازل سوی ابد و زابد آید بہ ازل

۷۔ عرفی جدت ادا کا گویا موجد ہے اس کا ہر شعر جدت کی ایک نئی مثال ہے۔

۸۔ عرفی ایک طرف تو نکتہ سنج، نکتہ شناس اور ذوق عرفاں سے آشنا تھا دوسری طرف شباب میں نہایت خوش رو اور حسین اور لوگوں کا منظور نظر رہ چکا تھا ہندوستان میں آیا تو شہزادہ جہانگیر پر عاشق ہوا ان اسباب کی بنا پر وہ عشق و محبت ایک ایک ادا سے واقف تھا کہیں وہ عشق حقیقی کے اسرار و دقائق بیان کرتا ہے اور کہیں عشق مجازی میں جو واردات اور معاملات پیش آتے ہیں ان کو ظاہر کرتا ہے لیکن اس عالم میں بھی وہ اپنے تمام ہمعصروں سے اس بات میں ممتاز ہے کہ وہ سطحی اور سرسری واردا تیں نہیں بیان کرتا بلکہ گہرے اور دقیق معاملات پر اس کی نظر پڑتی ہے اور انہیں کو وہ شاعرانہ انداز میں بیان کرتا ہے۔

ع فغاں ز غمزہ شوخی کہ وقت تنہائی — بہانۂ بخود آغاز کردہ در جنگ است
دہن خویش ببوسد و لب خویش مکند — چوں در آئینہ بہ بیند تباں صورت خویش

۹۔ عرفی نے غزل میں جس قدر فلسفیانہ خیالات ادا کئے کسی شاعر نے ادا نہیں کئے اس کے ساتھ خصوصیت ہے کہ شاعرانہ طرز ادا ہاتھ سے نہیں جاتا سبحانی اور

ناصر خسرو وغیرہ نے بھی دقیق فلسفی مسائل بیان کئے ہیں لیکن وہ محض فلسفہ ہے جو نظم میں ادا کر دیا گیا ہے شاعری نہیں۔ بخلاف اس کے عرفی اس انداز سے ان باتوں کو ادا کرتا ہے کہ اگر کوئی شخص فلسفہ کی حیثیت سے اس سے لطف نہ اٹھائے تاہم شاعرانہ ذوق سے محروم نہ رہے گا

فقیہاں دفتری را می پرستند　　حرم جویاں دری را می پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد　　کہ یاراں دیگری را می پرستند

(۱۰) عرفی نے اخلاق کے اکثر مسائل بیان کئے ہیں لیکن وہ صرف ان اخلاق اور صفات کو لیتا ہے جو عزتِ نفس اور علو حوصلہ سے تعلق رکھتے ہیں یہاں تک کہ یہ اوصاف اگر غرور و نخوت کی حد تک بھی پہنچ جائیں تو اس کے نزدیک ان اوصاف سے بہتر ہیں جن کی سرحد پست ہمتی سے مل جاتی ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

کفرانِ نعمت گلہ مندان بی ادب　　در کیش من ز شکر گدایانہ بہتر است

علو نفس، بلند ہمتی اور حوصلہ مندی کے خیالات جو عموماً شاعری میں نہایت کم تھے عرفی نے کثرت سے ادا کئے

(شعر العجم شبلی نعمانی)

عُرفی شیرازی

جمال الدین محمد نام، عرفی تخلص اور والد کا نام بدرالدین ہے جو شیراز میں ایک ممتاز سرکاری عہدے پر فائز تھے عرفی یہیں ۹۶۳ ہجری میں پیدا ہوا عالم شباب کو پہنچا تو اس وقت سلطنتِ صفویہ اپنے پورے عروج پر تھی اس زمانے میں علم و ہنر کی تو بہت حوصلہ افزائی ہوتی تھی لیکن شاعری کی طرف بادشاہوں کا اعتنا بہت کم تھا ان کا میلان مذہبیات کی طرف تھا اس لئے وہ شعرا کو تلقین کرتے تھے کہ اہل بیت کے مرثیے لکھیں اس لئے قصیدہ گوئی کی طرف میلان کم ہوتا گیا ساتھ ہی غزل گوئی بھی بے اعتنائی کا شکار ہوگئی۔

عرفی نے جب شعر کہنے شروع کئے تو اس وقت محتشم کاشی، وحشی یزدی عارف لاہجی اور غیرتی تھے وہ ان کہنہ مشق شاعروں کی موجودگی میں شعر و فکر میں اپنے لئے کوئی مقام نہ پیدا کر سکا ادھر ہندوستان میں شعر و شاعری کے بڑے چرچے تھے عرفی قسمت آزمائی کے لئے ہندوستان آیا ۹۹۴ھ ہجری میں سمندر کے راستے احمد نگر پہنچا اور وہاں سے فتح پور سیکری پہنچا یہاں اس کی ملاقات فیضی سے ہوئی عرفی کچھ عرصہ فیضی کا مہمان رہا مگر عرفی نخوت پسند تھا فیضی سے زیادہ دیر نباہ نہ ہو سکا اکبر کے نورتنوں میں ابو الفتح گیلانی بھی تھا جو خود ایک عالم اور نقاد ہونے کے ساتھ علماء کا مربی و محسن بھی تھا عرفی اس کے پاس پہنچا اور ایک قصیدہ کہہ کر دربار میں رسائی حاصل کی۔

حکیم ابو الفتح ایسے نقاد اور مربی کے دربار میں رہ کر جہاں شعر و سخن پر داد ملتی تھی وہاں نکتہ چینی بھی ہوتی تھی اس لئے عرفی کی شاعرانہ صلاحیتوں کی بہت نشو و نما ہوئی ۔ عرفی نے بھی حکیم ابو الفتح کی کرمفرمائیوں کا پورا پورا

حق ادا کیا اپنے محسن کی شان میں اس نوع کے قصیدے کہے کہ اکبر کی مدح میں نہ کہے اور نہ خان خاناں کی تعریف میں اور جب تک ابوالفتح زندہ رہا کسی اور کے دربار کا رخ نہ کیا۔

ابوالفتح فوت ہوا تو عرفی کو بہت رنج ہوا اب وہ خانخاناں کے دربار میں آگیا اور ذیل کا قصیدہ کہا ؎

ز آسماں و زمین مژدہ ناگہاں آمد   کہ آفتاب زمین و تاج آسماں آمد

خانخاناں کے دربار میں نظیری نیشاپوری، شکیبی، اصفہانی، ظہوری اور انیس ایسے شاعر موجود تھے ان سے حریفانہ نوک جھوک رہی عرفی چونکہ نخوت پسند اور خودستا تھا اس لئے سب اس پر طنز کرتے عرفی ضیق النفس کے مرض میں مبتلا تھا ایک دفعہ تکلیف حد سے بڑھ گئی تو عیادت کو آئے دل صاف نہ تھے اس موقعہ پر بھی طنز آمیز باتیں کرتے رہے عرفی سب کچھ سنتا اور پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا تھا اس کیفیت کو ایک قطعہ کی صورت میں لکھا ہے ؎

خدای عزوجل صحتم دہد بینی   کہ ایں منافقگاں را چہ آورم بر سر

عرفی کو امید تھی کہ صحت ہوگی تو ان سے نپٹوں گا لیکن موت نے مہلت نہ دی اور اس مرض سے ۹۹۹ھ ہجری میں وفات پائی لاہور میں مدفون ہوا

عرفی نے اپنا دیوان خود مرتب کیا یہ دیوان قطعات، غزلیات اور رباعیات پر مشتمل ہے ایک رسالہ نثر میں لکھا جو صوفیوں اور درویشوں کے لئے رہنمائی کا کام دیتا ہے۔

عرفی کے کلام کی نمایاں خصوصیت خیال بندی ہے کسی سادہ خیال کو تشبیہ تخیل کے زور سے وسعت دے کر حد ادراک تک بڑھا لے جانا خیال بندی ہے۔ یہ خیال بندی "سبک ہندی" کا خاصا ہے یہ خصوصیت عرفی کے کلام میں انتہائی صورت میں دکھائی دیتی ہے ؎

شست سوزن بدلم زاں مژہ تا ریختہ اند   گریہ از پارۂ دل دوختہ پیراہن چشم

صنعت شعر کے اعتبار سے زور کلام کی تعریف معین الفاظ میں نہیں کی جا سکتی البتہ جب شعر میں، الفاظ کی شوکت، بندش کی چستی، مضمون کا زور، تشبیہات کی اثر آفرینی خیال کی بلندی پائی جائے تو ہم سمجھتے ہیں کہ شاعر کے کلام میں زور ہے عرفی کے کلام میں یہ ساری خوبیاں بدرجہ احسن پائی جاتی ہیں ؎

من قیامت زار عشقم دیدہ کوتاہ بنگرد صد بہشت و دوزخ از ہر گوشۂ صحرائی من

————— ؎

من آں دریای آشوبم کہ از تاثیر خاصیت کہ تسکین است موج انگیز و آلام آشوب نش

الفاظ کے نئے مفہوم اور نئی تراکیب وضع کرکے عرفی نے فارسی ادب میں اضافہ کیا ہے

عرفی قصیدے کو ممدوح کی تعریف تک محدود نہیں رکھتا بلکہ زندگی کے فلسفیانہ اسرار و رموز بھی بیان کرتا ہے

خان خاناں کی مدح میں اپنے ایک مشہور قصیدے میں کہتا ہے ؎

سر بر دعانیاں داری ولی خود را ندیدستی بخواب خود در آتا قبلہ روحانیاں بینی

انسان خود اپنی تقدیر کا معمار ہے ؎

در ترتیب نظام آفرینش چوں نہ آگاہ حوادث را ز تاثیر نجوم آسماں بینی

عرفی اپنے اشعار میں خود آگاہی کا احساس دلاکر جد و جہد کا درس دیتا ہے

؎ گر جوید غواصان فطرت در تہہ دریا
تو در فکر ہمیں دائم کہ از دریا کراں بینی

———

(ادب نامہ ایران مقبول بیگ بدخشانی)

نظیری نیشاپوری

محمد حسین نام، نظیری تخلص اور نیشاپور وطن تھا شاعری کا ابتدا سے شوق تھا اور ابتدائے مشق سے ہی سے شہرت ہو چکی تھی خراسان میں جب اس کی شاعری مسلم ہو چکی تھی تو کاشان میں آیا یہاں حاتم مقصود خردہ شجاع رضائی شاعری میں استاد تسلیم کئے جاتے تھے ان کے مشاعروں میں جو طرحیں ہوتی تھیں نظیری بھی ان میں طبع آزمائی کرتا تھا

عبد الرحیم خانخاناں کی فیاضیوں کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا نظیری نے اس کے دربار کا قصد لیا اور آگرہ میں خانخاناں سے ملا غالباً یہ سنہ ۹۹۲ ہجری ہوگا کیونکہ اس سن میں خانخاناں گجرات سے آگرہ گیا تھا اور خانخاناں ہی کی تقریب کرتے سے اکبر کے دربار تک اس کی رسائی ہوئی ایک قصیدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت نظیری کے بہت سے حاسد پیدا ہو گئے تھے جو اس کی رسائی میں خلل انداز ہوتے تھے۔

اکبر کی مدح میں اس نے وقتاً فوقتاً اکثر قصیدے لکھے اور غالباً مقبول بھی ہوئے لیکن اس کو دربار میں کوئی خاص امتیاز حاصل نہیں ہوا اس لئے اس نے اپنا مستقل تعلق خانخاناں کے دربار سے لکھا اور احمد آباد گجرات میں سکونت اختیار کی چند برس کے بعد حج کا ارادہ کیا اور اس تقریب پر ایک قصیدہ لکھ کر خانخاناں کی خدمت میں پیش کیا اور شاعرانہ انداز سے مصارف سفر کی درخواست کی ؎

همه عیش ایں جهانی بعنایت تو دیدم   چه عجب اگر بیابم زتو دار آں جهانی

حج سے سنہ ۱۰۰۲ ہجری میں واپس آکر اس نے مراد کے دربار میں رسائی حاصل

حصہ اول

کی اکبر نے شہزادہ مراد کو دکن کی مہم پر بھیجا تھا نظیری چلتا پھرتا اس طرف جا نکلا ایک قدر دان سخن کی وساطت سے دربار میں پہنچا دربار میں سجدہ بجا لانے کا دستور تھا لیکن دربار کی شان و شوکت دیکھ کر نظیری کے حواس جاتے رہے اس لئے آداب و آئین سب بھول گیا۔

۱۰۱۴ھ ہجری میں اکبر نے وفات پائی اور جہانگیر تخت پر بیٹھا وہ نہایت سخن شناس اور صاحب ذوق تھا نظیری کا شہرہ سن کر دربار میں طلب کیا ۱۰۱۹ھ میں نظیری دربار میں حاضر ہوا جہانگیر کے فرمان طلبی کے بعد تین مہینے نظیری کی دوڑ دھوپ میں گزرے گو وہ تارک الدنیا ہو چکا تھا لیکن غلامی اور طماعی کی جو عادت راسخ ہو چکی تھی اس کا اقتضا یہ تھا کہ تین مہینے تک خاک چھانتا پھرا اور شاہی فرمان کو قرآن سے تشبیہہ دی گلزار ابرار میں لکھا ہے کہ نظیری نے مرنے سے بارہ برس پہلے ترک دنیا کر کے گوشہ عزلت اختیار کیا لیکن امراء کی مداحی اس حالت میں بھی جاری تھی۔

اخیر عمر میں اس کو علوم دینیہ کا شوق ہوا ۱۰۱۲ھ ہجری میں جب وہ خانخاناں کے ہمراہ دکن گیا ہے تو راہ میں مندو سے گزرا یہاں شیخ غوثی مندوی سے ملاقات ہوئی نظیری نے انہیں پہلے عربیت کی تحصیل کی پھر مولانا حسین جوہری سے تفسیر اور حدیث پڑھی۔ ۱۰۲۰ھ ہجری میں گجرات سے سے آگرہ آیا اور خانخاناں کو اپنا دیوان حوالہ کر کے پھر گجرات واپس آگیا۔

سن وفات علی الاختلاف الروایات ۱۰۲۰ھ، ۱۰۲۱ھ، ۱۰۲۲ھ، ۱۰۲۳ھ ہے مکان کے قریب ایک مسجد بنوائی تھی اسی میں دفن ہوا جس محلہ میں قبر ہے اس کا نام تاجپورہ ہے قبر پر ایک گنبد بھی ہے۔

نظیری نے اگرچہ بہت سے درباروں کی آستاں بوسی کی لیکن اس کا اصلی تعلق خانخاناں کے دربار سے تھا خانخاناں کو خانِ اعظم کوکہ کی بہن بیاہی تھی اس تعلق سے خانِ اعظم کی مداحی بھی کی ہے اور باقی اکبر اور جہانگیر

اور مراد تو حکمران وقت تھے ان کی مداحی نہ کرتا تو کیا کرتا معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ مراد سے اس کو دلی محبت تھی شہزادہ موصوف کا جو مرثیہ لکھا ہے اس میں دلی جذبات نظر آتے ہیں۔

نظیری کو زرگری میں کمال تھا ساتھ ہی تجارت بھی کرتا تھا شاعری کی فتوحات الگ تھیں بنا بریں امیرانہ زندگی بسر کرتا تھا اور امراء میں اس کا شمار ہوتا تھا لیکن مزاج میں عرفی کی سی آن بان نہ تھی مرتے مرتے بھی مداحی کا شغل نہ چھوڑا بخلاف اور شعراء کے مذہب میں سخت تھا اکبر کے دربار میں جن آزادانہ خیالات کے چرچے رہتے تھے ان سے بہت جلتا تھا سفر حج جس ذوق وشوق سے کیا ہے اس سے بھی اس کے مذہبی جوش کا پتہ چلتا ہے۔

جہانگیر اور شاہ عباس صفوی دونوں نے تمباکو کے استعمال کی ممانعت کر دی تھی نظیری بھی اس کا دلدادہ تھا چنانچہ تمباکو کی تعریف میں ایک غزل لکھی جس کا مطلع یہ ہے ؎

نی سنبل تمباکو نی آتش رخسارہ دل بوی خامی میبرد ہر بیدرنگ آتشپارہ

اس زمانہ میں نظیر نام ایک شاعر تھا نظیری نے اس کو لکھا کہ اپنا تخلص بدل دو تاکہ دونوں تخلصوں میں اشتباہ نہ رہے چونکہ نظیری دراصل نظیر سے ماخوذ ہے صرف ایک حرف زائد ہے لہٰذا سرقہ کا الزام نظیری ہی پر عاید ہو سکتا ہے پس نظیری نے دس ہزار روپیہ دے کر یہ حرف زائد (ی) خریدا اور نظیر نے اپنا تخلص بدل ڈالا۔ شعراء میں سے خاص جن لوگوں سے نظیری کے معرکے رہتے تھے عرفی ظہوری اور ملک قمی تھے عرفی نے تو نظیری کو قابل خطاب نہیں سمجھا لیکن نظیری نے اس کے مرے پیچھے قصیدہ میں اس کو گالیاں سنائیں ظہوری اور ملک قمی نے ۱۰۲۰ھ میں نظیری کے پاس اپنے دیوان بھیجے اور نظیری نے ایک ایک غزل کا جواب لکھا۔ یہ اوحدی کا بیان ہے لیکن اس میں مبالغہ معلوم ہوتا ہے نظیری اس زمانے کے دو ہی ایک سال بعد مرا ہے اس

لیئے اتنی قلیل مدت میں ظہوری اور قمی کی ہزاروں غزلوں کا کیونکر جواب لکھ سکتا تھا۔

<u>خصوصیات کلام</u> نظیری ابداع الفاظ، جدت ترکیب اور ندرت بندش کی شریعت کا اولوالعزم پیغمبر ہے اس نے سینکڑوں نئے الفاظ اور نئی ترکیبیں ایجاد کیں الفاظ پہلے سے موجود تھے لیکن جس موقعہ پر اس نے کام لیا جس انداز سے اس کو برتا شاید پہلے اس طرح برتے نہیں گئے تھے مثلاً ؂

از کف نمی دہد دل آسماں ربودہ را دیدیم زور بازوے ناآزمودہ را

آسمان ربودہ کی ترکیب بالکل نئی ہے اور اس سے ایک وسیع خیال ادا ہو گیا دوسرے مصرعہ میں زور، بازو، ناآزمودہ سب مستعمل الفاظ ہیں لیکن ان سے نئی طرح سے کام لیا ہے کہنا یہ تھا کہ معشوق کمسن تھا اور اس کو کسی طرح کا تجربہ نہیں تاکہ جس شخص کا دل ایک دفعہ اس پر آجاتا ہے پھر اس کے پنجہ سے چھوٹ نہیں سکتا اس مضمون کو یوں ادا کرتا ہے کہ میں نے دیکھا ہے کہ ایک ناآزمودہ بازو میں کس قدر زور ہے

۲۔ وہ اکثر وجدانی باتوں کو ایسے طریقے سے ادا کرتا ہے کہ مجسم بن کر سامنے آجاتی ہیں اور اس سے عجیب خاص لطف پیدا ہوتا ہے مثلاً یہ امر کہ معشوق کا ایک ایک عضو یا ایک ایک ادا دلربا ہوتی ہے یعنی ہر ادا اور ہر عضو کی طرف دل کھنچتا ہے۔ اس طرح ادا کرتا ہے کہ ؂

زپای تا بسرش ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است

اس شعر سے یہ تصویر پیش نظر ہوتی ہے کہ معشوق کا سراپا ایک مجلس ہے جس میں بہت سے تماشائی جمع ہیں انہیں میں دل بھی ہے کرشمہ معشوق کے پیش خدمتوں میں ہے دل اس مجلس میں جب آتا ہے تو جدھر اس کا گزر ہوتا ہے کرشمہ دامن پکڑ کر کھینچتا ہے کہ یہیں بیٹھ جاؤ

۳۔ اسی خصوصیت کے سلسلہ میں یہ بھی داخل ہے کہ نظیری اکثر حالات

اور کیفیات کی تشبیہ مادیات اور محسوسات سے دیتا ہے اس لئے اس سے ایک خاص استعجاب کا اثر پڑتا ہے کیونکہ جب دو مختلف چیزوں میں تناسب وتشابہ نظر آتا ہے تو طبیعت میں استعجاب پیدا ہوتا ہے مثلاً ؎

ہمہ شب برلب ورخسار وگیسو بیزنم بوسہ — گل ونسرین وسنبل راصبا درخرمن آتش

تا اظہار محبت بر زبان خلق افتادم — چو محتاجی کہ گنجی یابد و ظاہر کند زود ش

۴-وہ اکثر عشق وعاشقی کی سچی اور صحیح واردا تیں بیان کرتا ہے اس لئے دل پر خاص اثر ہوتا ہے مثلاً ؎

مردم از شرمندگی تا چند باہر ناکسی — مردمت از دور بنایند و گویم یار نیست

ایک خاص واقعہ کی تصویر کھینچ دی ہے حالت یہ ہے کہ معشوق اکثر کمینوں اور ہوس پرستوں کے ساتھ رہتا ہے لوگ جو اس کو کہیں راستہ میں کمینوں کے ساتھ جاتا ہوا دیکھتے ہیں تو دور سے عاشق کو دکھا کر کہتے ہیں کہ دیکھو تمہارا یار جاتا ہے عاشق غیرت کے مارے کہتا ہے کہ نہیں میرا معشوق نہیں کوئی اور ہوگا

(۵) نظیری کے کلام میں فلسفہ کم ہے لیکن جس قدر ہے نہایت خوبی سے ادا ہوا ہے مثلاً ؎

چند از مؤذن بشنوم توحید شرک آمیز را — کو عشق تا گیسو نہم شرع خلاف انگیز را

حور جنت جلوہ بر زاہد دہد در راہ دوست — اندک اندک عشق بسراہ آورد بیگانہ را

تعجب یہ ہے کہ نظیری اگرچہ نہایت مذہبی آدمی تھا اور اکبر اور ابوالفضل کی لا مذہبی پر نہایت لعن طعن کرتا ہے لیکن خود وہی خیالات ظاہر کرتا ہے جو اس زمانہ میں ابوالفضل وغیرہ کی طرف منسوب تھے ؎

بوالبشر را قوای ملائکہ اند — جنبش کل است در بحور این جا

تنزد تو جبرئیل وحی آورد — عقل بر رقع زرسح کشود این جا

۶۔ اس زمانے کے تمام نامور شعرا کا اصلی جوہر طرزادا کی جدت ہے نظیری اس میدان میں اکثر حریفوں کے آگے ہیں ؂

گرچہ میدانم قسم خوردن بجانت خوب نیست — ہم بجان تو کہ یادم نیست سوگندِ دگر

اس شوخی کو دیکھو کہتا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ تمہاری جان کی قسم کھانا اچھی بات نہیں لیکن تیری جان ہی کی قسم کہ مجھ کو اور کوئی قسم یاد ہی نہیں شوخی اور بلاغت یہ ہے کہ قسم نہ کھانے پر بھی قسم کھائے جاتا ہے اور اس لطف سے کہ گویا اس کو خبر نہیں کہ اس نے قسم کھالی اب یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ اس کو اور کوئی قسم یاد ہی نہیں ۔

۷۔ وہ اکثر غزلوں میں کسی خاص حالت کو مسلسل لکھا جاتا ہے اور غزل کی غزل اسی ایک حالت کے بیان میں تمام ہو جاتی ہے ان موقعوں پر اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ ایک مضمون کی تمام جزئیات کو کس طرح احاطہ کرتا ہے اور تسلسل بیان کو کس خوبی سے قائم رکھتا ہے۔

۸۔ نظیری نے روز مرہ اور محاورات نہایت کثرت سے برتے ہیں جس سے زباندانی میں بہت مدد ملتی ہے معہذا وہ اکثر محاورات ایسے استعمال کرتا ہے کہ جس مطلب کو ادا کرنا چاہتا ہے بغیر اس محاورہ کے وہ مطلب اس خوبی کے ساتھ ادا نہیں ہوسکتا ہے۔ مثالوں سے اس کا اندازہ ہوگا۔

طفل بودیم کہ باز از شکر و شیر شدیم —	از شیر باز شدن	دودھ چھڑایا جانا
شبنم بردے بستر نرگس بخواب گیر	بخواب گرفتن	سوتے میں جالینا
نیم بسمل شدۂ بر سر پروازی ہست	بر سر پرواز	اڑنے کو ہے
شرح سودای ترا نسخہ زیبا برداشت	نسخہ برداشتن	کتاب کا نقل کرنا
شب آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ می خیزد ۔	افسانہ از افسانہ می خیزد	بات میں سے بات نکلتی ہے

(شعر العجم شبلی نعمانی)

نظیری نیشاپوری

محمد حسین نام ، نظیری تخلص اور وطن نیشاپور تھا نظیری ان ایرانی شعراء میں سے ہے جنہوں نے برصغیر پاک و ہند آکر شعر و سخن کی بدولت ناموری حاصل کی نظیری چند سال نیشاپور رہ کر کاشان آ گیا یہاں ایران کے اکثر شاعروں کی محفلیں گرم ہوتی تھیں ان میں نظیری بھی حصہ لینے لگا ۔ یہ وہ زمانہ ہے جب عبدالرحمٰن خاں خاناں کی علم دوستی اور فیاضی کے چرچے ایران تک پہنچے تھے اور نظیری کے وطن میں قصیدے اور شاعری کا کوئی پرسان حال نہ تھا اس لئے نظیری نے بھی وطن کو خیر باد کہہ کر ہندوستان کا رُخ کیا اور ۹۹۱ھ ہجری میں خانخاناں سے آ ملا ایک قصیدہ جو خانخاناں کی مدح میں کہا تھا سنایا خان خاناں قصیدہ سنکر بہت خوش ہوا اور شعرائے دربار کی صف میں جگہ دی نظیری نے خانخاناں کی وساطت سے شہنشاہ اکبر کے حضور میں بھی قصیدے پڑھے لیکن وہاں فیضی کا رنگ جما ہوا تھا اس لئے نظیری پہ زیادہ توجہ نہ ہوئی چنانچہ دربار میں جانا بند کر دیا اور خانخاناں کی مداحی کرتا رہا ۔ نظیری محض شاعری کو وسیلہ معاش نہیں بنانا چاہتا تھا اس لئے تجارتی کاروبار کے سلسلے میں مستقل سکونت گجرات (احمد آباد) میں اختیار کی اور خانخاناں کے دربار سے تعلق قائم رکھا تھا اسی دربار کے وسیلہ سے وہ حج کی سعادت سے بھی مشرف یاب ہُوا ۔۔۔
شہنشاہ اکبر کی وفات کے بعد جب شہزادہ سلیم تخت نشین ہوا تو نظیری کو ایک دفعہ پھر دربار مغلیہ میں عزت پانے کا موقعہ ملا اس موقعہ پہ ایک قصیدہ لکھ کر بادشاہ کے حضور میں پیش کیا ۔ جہانگیر نے ایک ہزار روپیہ ، ایک خلعت اور ایک گھوڑا عطا کیا جہانگیر نے نظیری کی بہت قدر دانی کی " مرد آنداد"

اور ید بیضا کے مؤلف لکھتے ہیں کہ جہانگیر نے ایک مرتبہ اس کی غزل سنکر تین ہزار بیگھے زمین نظیری کو عطا کی تھی۔

نظیری کی قدر و منزلت جو خانخاناں نے کی وہ ان انعامات سے ظاہر ہے جو وقتاً فوقتاً نظیری کو ملے مآثر الامراد کے حوالے سے شبلی نعمانی لکھتے ہیں "ایک دفعہ باتوں ہی باتوں میں نظیری نے خانخاناں سے کہا کہ لاکھ روپے کا ڈھیر لگایا جائے تو کس قدر ہوگا خانخاناں نے لاکھ روپے منگوا کر سامنے رکھوا دئے کہا خوب آپ کی بدولت میں نے لاکھ روپے تو دیکھ لئے" خانخاناں نے یہ روپے نظیری کے گھر بھجوا دئے۔

ایرانی نقاد عملی تنقید کے معاملے میں کچھ بخل سے کام لیتے ہیں پاک و ہند کے فارسی شعرا کو تو وہ شاعر نہیں سمجھتے یہاں تک کہ امیر خسرو کو بھی دبی زبان سے ہی شاعر مانتے ہیں لیکن ستم یہ ہے کہ ایران کا کوئی شاعر وطن کو چھوڑ جائے اس کا نام بھی شعرا کی فہرست سے خارج کر دیا جاتا ہے البتہ نظیری وہ خوش نصیب ایرانی شاعر ہے جس کا ذکر لطف اللہ آذر کے "آتشکدے" اور رضا قلی ہدایت کی تصنیف "مجمع الفصحا" میں آیا ہے اور اس کی سخنوری کی داد دی ہے لیکن جدید نقاد رضا زادہ شفق نے نظیری کو "تاریخ ادبیات ایران" میں صاف نظر انداز کر دیا ہے۔

نظیری نے اکبر، جہانگیر، شاہزادہ مراد اور خان اعظم کے پر جوش قصیدے کہے ہیں شاہزادہ مراد سے اسے دلی محبت تھی اس کی بے وقت موت پر مرثیہ لکھا ہے معلوم ہوتا ہے سچ مچ چوٹ کھائی ہے ؎

آفاق پر دریغ و جہاں پر ندامت است　　　　این روز مرگ نیست کہ روز قیامت است

نظیری کی عمر اگرچہ مدحت سرائی میں گزری لیکن اس کی شہرت کا اصل سرمایہ اس کی غزلیات ہیں نظیری نے ۱۰۲۱ھ ہجری میں وفات پائی۔

نظیری کے کلام کی خصوصیات :۔ سبک ہندی کو جو صفوی عہد بالخصوص

عہد مغلیہ کے شعرار کا خاصلیت نظیری نے کمال کی حد تک پہنچا دیا ہے ۔

ا۔ غزل کا تعلق عموماً داخلی شاعری سے ہوتا ہے داخلی شاعری میں شاعر خود اپنے نفس کا تجزیہ کرتا ہے یعنی قلبی احساسات کی عکاسی کرتا ہے لیکن انسانی قلب ایک وسیع طلسم خانہ ہے اس کی وسعتوں میں کئی عالم پوشیدہ ہیں انسان ان کی وسعتوں کا صحیح اور صاف صاف جائزہ نہیں لے سکتا اور نہ زبان و بیان قلبی واردات و تجربات کا ساتھ دے سکتے ہیں اس لئے مجبوراً شاعر ایمائی اور رمزیہ قوتوں سے کام لے کر اس کوتاہی کو دور کرتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ ان رمزیہ علامات ہی سے ایک طلسماتی کیفیت پیدا کرتا ہے نظیری اپنے خیال اور جذبے کے حسین امتزاج کے لئے انہی ایمائی اور رمزیہ علامات سے کام لیتا ہے ؎

زپای تا بسرش ہر کجا کہ می نگرم　　　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

ب ۔ نظیری اکثر خیالی اور وہمی باتوں کی تشبیہ مادیات یا محسوسات سے دیتے ہیں نظیری کا دیوان اس قسم کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے ؎

یکی مگو بغریبان عزیزان شہر سیری کن　　　بہ بیں کہ نقش دل ما چہ باطل افتادہ است

محبت درد دل غم دیدہ الفت بیشتر گیرد　　　چراغی را کہ دودی ہست در سر زود در گیرد

ج ۔ نظیری نے نغمہ اور شعر کے لطیف امتزاج سے فارسی شاعری میں ایک نئی روح پھونکی نظیری کے اشعار میں ایسے ہم آہنگ الفاظ آتے ہیں کہ اشعار میں زیر و بم کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ؎

بزیر شاخ گل رفعی گزیدہ بلبل را　　　نواگران نخوردہ گزند را چہ خبر

"نوگراں نخوردہ" میں سروں کے پورے ٹھاٹھ کی کیفیات پنہاں ہے یہ پوری غزل سرود و نغمہ کی صدری بازگشت معلوم ہوتی ہے۔

جن اشعار میں کہیں رنج دلشاد کا ذکر آتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ باتیں نظیری کے دل پر وارد ہو رہی ہیں۔

پردہ برداشتہ ام از غم پنہانی چند　　بر زباں می رود ام ذکر بیانی چند
زاں ضعیفاں کہ وفاداشت دریں شہر سپہر　　نفسی چند بجا ماندہ و زندانی چند

ہے۔ حافظ اور خسرو کی طرح نظیری کی بھی بعض غزلیں ایسی ہیں جو ایک ہی جذبے کے ہمہ گیر اثر کے تحت لکھی گئی ہیں مثلاً ایک غزل جس کا مطلع و مقطع درج ذیل ہے ؎

چشمش براہی می رود مژگاں تماشا کش نگر　　در سینہ دارد آتشی پیراہن چاکش نگر
وحشی غزالی کز صبا رم در بیاباں می خورد　　رام نظیری می شود در ہوش و ادراکش نگر

ص۔ نظیری نے اظہار خیالات کے لئے بعض نئی ترکیبیں وضع کی ہیں اور بعض عام الفاظ کو اس انداز خاص میں پیش کیا ہے کہ ان کا مفہوم ہی مختلف ہو گیا ہے ؎

از کف نمی دہد دل آساں ربودہ را　　دیدیم زور بازوی ناآزمودہ را

"دل آساں ربودہ" بالکل نئی ترکیب ہے زور بازو، ناآزمودہ ایسی ترکیبیں استعمال ہوتی ہیں لیکن نظیری نے بالکل نئے انداز میں پیش کیا ہے
(ادب نامہ ایران مقبول بیگ بدخشانی)

قاآنی

مرزا حبیب تخلص بہ قاآنی ۱۲۲۲ھ ہجری کے قریب یعنی فتح علی شاہ کے عہد میں بمقام شیراز پیدا ہوئے ان کے والد مرزا محمد علی خود بھی شاعر تھے اور گلشن تخلص کرتے تھے ۔ مرزا حبیب نے جوانی میں خراسان کا سفر کیا اور یہاں علوم اور ادبیات کی تعلیم حاصل کی اور یہیں سے ان کی شعر گوئی کا آغاز ہوا اس وقت وہ حبیب تخلص کرتے تھے ان کی شعر گوئی کی شہرت بڑھی تو مرزا حسن علی میرزا شجاع السلطنت جو اس زمانہ میں صوبہ خراسان کا حاکم تھا انہیں اپنے دربار میں بلایا اور اپنا مقرب بارگاہ بنایا اسی کے حکم پر مرزا حبیب قاآنی تخلص اختیار کیا یہ تخلص شجاع السلطنت کے بیٹے اوکتا قاآن سے نسبت رکھتا تھا ایک مدت تک قاآنی خراسان اور کرمان میں شجاع السلطنت کے حضور میں حاضر رہے پھر اسی شہزادے نے قاآنی کو فتح علی شاہ قاچار کے دربار میں پیش کیا قاآنی خراسان ، شیراز اور کرمان میں ایک عرصہ تک رہنے کے بعد طہران آیا اور یہاں اس کی شہرت اور بڑھی اور محمد شاہ اور خاص کر ناصر الدین شاہ قاچار کے دربار میں اس کا رسوخ بہت بڑھ گیا ۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے قاآنی پہلا ایرانی شاعر ہے جس نے فرانسیسی سیکھنی شروع کی تھی ۔

صائب کے بعد قاآنی صفوی اور قاچاری دور کا سب سے بڑا ایرانی شاعر ہے طرز سخن ، کلام کی خوبی اور صفائی الفاظ کے حسن انتخاب ، بندش اور قدماء کی طرز کے اتباع میں اس دور کا شاید ہی کوئی شاعر قاآنی کی برابری کر سکے قاآنی نے خاص طور پر قصیدہ میں بڑی ہنرمندی اور کمال کا ثبوت دیا ہے اس کی غزلوں سے بھی استادانہ شان ٹپکی پڑتی ہے ۔

قاآنی نے مسمط اور ترجیع بند میں بھی بڑی استادی کا ثبوت دیا ہے اور اسے بڑے اونچے درجے پر پہنچایا ہے لیکن قاآنی کے کلام میں عبارت کی حلاوت زیادہ اور فلسفیانہ اور اخلاقی معنی کم ہیں اس کے مدحیہ قصیدے بہت ہیں اور یہی اس کے کلام کا شاہکار ہے اس کے کلام کی طرز خراسانی شاعروں کی طرز ہے اور خاص طور پر منوچہری کی طرز سے بہت مشابہ ہے قاآنی کے اکثر قصیدے ناصر الدین شاہ کی مدح میں ہیں ان میں سے بہت سے قصیدے بڑی حلاوت اور بڑی شیرینی کے حامل ہیں ان قصیدوں کو وہ قدرتی مناظر سے شروع کرتا ہے ایسے ہی ایک مسمط کا یہ بند ملاحظہ ہو:

بنفشہ رستہ از زمیں بطرف جویبارہا | دیا گسستہ حور عین ز زلف خویش تارہا
ز سنگ اگر ندیدہ سیاں جہد شرارہا | بہ برگہائے لالہ بیں میان لالہ زارہا

کہ چوں شرارہ می جہد ز سنگ کوہسارہا

قاآنی نے جو قصیدے نو روز کی آمد۔ بہار کی تعریف اور بادشاہ کی مدح میں لکھے ہیں ان میں شاعر کا تغزل اپنے پورے کمال پر ہے اور حق یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک قصیدہ اچھوتے لطف ضمیر اور طبع منیر کا نمونہ ہے۔ قاآنی نے اپنے تمام قصیدوں میں پچھلے استادوں کی پیروی کی ہے اور بڑے سلیقہ اور ہنر مندی کے ساتھ ان کی پیروی کی ہے لیکن وہ خود بھی سخن پردازی کے تمام مراحل طے کر چکا تھا اور اس طرح کے اشعار کہنے میں قدرت نے بڑی فیاضی کے ساتھ اسے نوازا تھا قاآنی کے اکثر قصیدوں سے پچھلے استادوں کے استفادہ کا رنگ جھلکا پڑتا ہے مثلاً یہ قصیدہ ملاحظہ ہو:

اگر نظام امور جہاں بدست قضاست | چرا بہر چہ کند امر شہر یار رضاست

یہ قصیدہ استاد انوری کا وہ قصیدہ یاد دلاتا ہے جو ذیل کے مطلع سے شروع ہوتا ہے،

اگر محل حال جہانیاں نہ قضاست　　چرا مجاری احوال بر خلاف رضاست

قاآنی کے دیوان میں ایسے اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے جو قدیم استادوں کی سبک سے نمایاں طور پر متاثر ہیں، ذیل کے دو قصیدوں میں جن کے مطالع درج ذیل ہیں، شاعر نے بہار کی قدرتی دلفریب روح کو اپنے کلام میں جلوہ گر کیا ہے اور ان قصیدوں پر منوچہری کے سبک کا اثر نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے ۔

کار طرب، روز می در فصل بہار ست　　جاں خرم و دل فارغ و شاہد بکنار ست

ـــــــــــ

بہار آمد کہ از گلبن ہمی بانگ ہزار آید　　بہر ساعت خروش مرغ زار از مرغزار آید

یہ پر بہار اشعار جن میں بہار کی ساری رعنائی اور زیبائی کی تصویر الفاظ میں اُتر آئی ہے ان سے ظاہر ہے کہ خود شاعر بھی صبح کے دلفریب منظر سے متاثر ہوا تھا اس تاثر کو اس نے نہائت جوش وخروش اور روانی کے ساتھ الفاظ میں بیان کر دیا ہے ذیل کے قصیدے میں بھی (جس کا مطلع درج ہے) شاعر کی اسی بہار پرستی کا جذبہ نمایاں ہے قدرت کے فسوں ساز قلم کے نقوش کی مدح میں اس پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔

ما ستی راکس نمی داند کہ در فصل بہار

از کجا گردد پدیدار ایں ہمہ نقش و نگار

قاآنی نے دیوان اشعار کے سوا پریشاں کے نام سے ایک کتاب نثر میں لکھی تھی یہ کتاب سعدی کی گلستان کی طرز پر لکھی گئی ہے اور اس میں استاد شیراز کے سبک کی پوری پوری پیروی کی گئی ہے اس کتاب میں چند اشعار کے سوا جتنے شعر آئے ہیں وہ سب کے سب اسی کے کہے ہوئے ہیں چنانچہ خاتمہ پر کہتا ہے

نیست در رو عاریت ہیچ کس خاص منت در دہست وبس
جز دو سہ بیتے زعرب زعجم کامدہ جاری بزبان قلم

"گلستاں کی طرح "پریشان" کی حکایتیں بھی آداب، سیرت، نصیحت آپ بیتی، لطائف اور ایسی ہی دوسری باتوں پر مشتمل ہیں۔

قاآنی نے ۱۲۷۰ھ میں بمقام طہران وفات پائی۔

(تاریخ ادبیات ایران رضازادہ شفق)

مرزا حبیب اللہ قاآنی

قاآنی عہد قاچار کے وہ مشہور ترین شاعر ہیں جنہیں بیک وقت متقدمین میں بھی شامل کیا جا سکتا ہے اور متجددین میں بھی زبان اور انداز بیان کے اعتبار سے وہ متقدمین کی صفِ اول میں شمار ہوتے ہیں اور اندازِ فکر میں وہ جدید شاعری کے پیش رو ہیں۔

مرزا حبیب قاآنی ۱۲۲۲ھ ہجری میں شیراز میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم یہیں پائی آپ کے والد ابوالحسن بھی شاعر تھے اور گلشن تخلص کرتے تھے شعر کا ذوق گویا انہیں ورثے میں ملا تھا قاآنی گیارہ سال کے ہوئے تو والد فوت ہو گئے کوئی بڑا اثاثہ نہ تھا اس لئے بچپن عسرت اور تنگدستی میں گزرا۔ چودہ سال کی عمر میں شیراز کے تاجروں کے ساتھ مشہد آ گئے اور مزید مہارت حاصل کی اوائل عمر میں شعر بھی کہنے لگے آخر شعر ہی کی بدولت انہوں نے ناموری حاصل کی۔

فتح علی شاہ کا بیٹا شجاع السلطنت شعر و سخن کا دلدادہ تھا اس نے قاآنی کی شہرت سُنی تو اپنے دربار میں بلا لیا یہاں آپ اس کے ندیمان خاص میں داخل ہو گئے۔ مرزا حبیب شروع شروع میں حبیب تخلص کرتے تھے لیکن یہاں شجاع السلطنت کے بیٹے اوکتائی قاآن سے بہت مانوس ہوئے وہ بھی انہیں بہت محبت کرتا تھا اس لئے اس کے نام کی نسبت سے قاآنی تخلص کیا اس دربار سے آپ دس سال تک وابستہ رہے آخر شجاع السلطنت کی وساطت سے فتح علی شاہ قاچار کے دربار میں رسائی حاصل کی اور ایک قصیدہ پیش کر کے انعام و اکرام کے علاوہ " مجتہد الشعرا " کے خطاب سے سرفراز کیا۔ فتح علی شاہ کی وفات کے بعد قاآنی محمد شاہ کے دربار سے وابستہ ہوا یہاں بھی اس کی بڑی

قدر و منزلت ہوئی اور آپ کو "حسان العجم" کا خطاب ملا۔

قاآنی جب تک مشہد میں رہے بڑی پاکیزگی کی زندگی گزاری مشہد کو خیرباد کہہ کر تہران آگئے تو وہاں پایہ تخت کے حسن و جمال نے آپ کے زہد و تقویٰ کا دامن چاک کر دیا چنانچہ ابراہیم صفائی لکھتے ہیں: "زمام خویش را بدست دل داد و عمر عشق پرستی و ہنر شیدائی را پیشہ نمود ہر روز بہ یارے دل بست وہر دم با دلدارے نشست دوران ایں عشقبازی و شیدائی قریب دہ سال طول کشید" آخر یہ صلاح ٹھہری کہ شادی کر کے متاہل زندگی بسر کریں شادی کے لئے سرمائے کی ضرورت تھی چنانچہ رات بھر جاگ کر ایک قصیدہ کہا اور صبح کو شاہ کے حضور میں پڑھ کر سنایا اس قصیدہ کو سن کر جس میں قاآنی نے داستانِ دل بیان کی تھی بادشاہ بہت متاثر ہوا اور شادی کا خرچ بطور انعام دیا وظیفہ میں بھی اضافہ کر دیا شادی کرنے کے بعد قاآنی کے عشق و عاشقی کا زمانہ ختم ہو گیا۔

شہزادوں کے فرانسیسی اتالیق سے قاآنی کو ملنے جلنے کے اکثر مواقع ملتے تھے چنانچہ اس سے فرانسیسی زبان بھی سیکھی اور اس زبان میں مہارت بھی حاصل کی اور گیاہ شناسی (BOTANY) پر فرانسیسی کی ایک کتاب کا ترجمہ بھی کیا لیکن یہ ترجمہ اب ناپید ہے۔

ایک طویل عرصہ تہران میں گزار کر قاآنی شیراز آگئے یہاں انہوں نے کچھ وقت بڑے اطمینان سے گزارا یہاں آپ نے تین سال قیام کیا مگر اہل شیراز نے خاطر خواہ قدر نہ کی فارس کا حکمران منوچہر خاں شعر و ادب کا ذوق نہیں رکھتا تھا چنانچہ سرکاری خزانے سے جو رقم بطور وظیفہ ملتی تھی بند ہو گئی۔ غرض یہ زمانہ ان کے لئے بڑی پریشانی اور ابتلا کا زمانہ تھا آخر شیراز سے چل کر پھر تہران آگئے تہران میں بھی پہلے سے حالات نہ رہے تھے دربار قاچار جہاں پہلے انہیں بڑی عزت سے دیکھا جاتا تھا اب ان کے لئے بالکل اجنبی

تھا آخر قاآنی شہزادہ اعتضاد السلطنت کے دربار سے وابستہ ہو گئے یہاں ان کے لئے وظیفہ مقرر ہو گیا اور کچھ عرصہ کے لئے فکر معاش سے آزاد ہو گئے اعتضاد السلطنت کی وساطت سے قاآنی کی رسائی ناصر الدین کی والدہ مہد علیہ کی خدمت میں ایک مسمط لکھ کر پیش کیا جس کا ایک بند درج ذیل ہے ؎

بنفشہ رستہ از زمین بطرف جو ئبارہا | و یا گسستہ حور عین ز زلف خویش تارہا
ز سنگ اگر ندیدہ چساں جہد شرارہا | بہ برگ ہای لالہ بیں میان لالہ زارہا
کہ چوں شرارہ می جہد ز سنگ کوہسارہا

اعتضاد السلطنت نے آپ کی کچھ اور دستگیری کی اور ناصر الدین کے دربار میں پہنچا دیا یہاں انہیں پھر ایک مرتبہ شاعر دربار ہونے کی عزت حاصل ہو گئی ۔

قاچاری دربار میں اگرچہ قاآنی کی عزت بھی بہت ہوئی لیکن ذلت بھی کچھ کم نہ ہوئی قاآنی کو امن و سکون میسر ہوا ہی تھا کہ مرزا تقی خاں صدر اعظم "امیر کبیر" کے نام سے مشہور تھا قاآنی پر کسی وجہ سے ناراض ہو گیا اس نے پہلے تو قاآنی کا وظیفہ نصف کر دیا آخر بالکل ہی ختم کرا دیا قاآنی نے امیر کبیر کی مدح میں قصیدے بھی کہے مگر وہ شعر کا ذوق نہیں رکھتا تھا اس لئے اس پر کچھ اثر نہ ہوا قاآنی نے وظیفے کی بحالی کے لئے کوشش کی لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی آخر مایوس ہو کر آپ نے امیر کبیر کی شان میں سخت سست باتیں کہہ دیں چنانچہ اس نے آپ کو چوب و فلک کی رسوائے عالم سزا دی اور اس طرح حکومت قاچار کے دامن پر ایک ایسا دھبہ ہے جو شاید کبھی نہ دھل سکے ۔

آخر وہ وقت آ گیا کہ امیر کبیر شاہی عتاب کا شکار ہوا اور اسے وزارت کے منصب سے معزول کر دیا گیا قاآنی نے ایک قصیدہ ناصر الدین شاہ کی مدح میں لکھا جس میں امیر کبیر کی معزولی اور نئے صدر اعظم کے تقرر پر خوشی کا اظہار کیا ہے ۔

۱۲۶۸ھ ہجری میں بابیوں نے فتنہ کھڑا کر دیا کسی بابی نے مذہبی جنون میں آکر ناصر الدین شاہ کو گولی کا نشانہ بنانا چاہا گولی خطا ہوئی تو خنجر سے شاہ پر حملہ کر دیا بادشاہ زخمی ہوا لیکن بچ گیا آخر بادشاہ نے اس باغیانہ حرکت پر بابیوں کے قتل عام کا حکم دیا۔

بادشاہ کی صحت یابی پر گھر گھر چراغاں ہوئے قاآنی نے شکرانۂ سلامت کے طور پر ایک قصیدہ کہا جس کا پہلا شعر ہے؎

ساقی امشب می بپیالی دہ کہ من بر جائے آب
نذر کر دستم ازیں پس می ننوشم جز شراب

قاآنی نے ایک مختصر سی علالت کے بعد ۱۲۷۲ھ میں وفات پائی۔

اسلوب بیان: ایران جدید کی شاعری میں قاآنی کی حیثیت منفرد ہے جن شعرا نے سبک قدیم کی طرف رجوع کرنے کی ادبی تحریک چلائی ان میں قاآنی کا مقام بہت بلند ہے انہوں نے اگرچہ متقدمین کی پیروی کی ہے لیکن ان کے کلام میں انفرادیت پورے طور پر نظر آتی ہے پروفیسر براؤن نے آپ کو مشہور انگریز شاعر شیلی سے تشبیہ دی ہے۔

خصوصیات: تشبیہ و استعارہ محسنات شعری کا ضروری حصہ ہے شعرا عموماً کبھی کوئی لطیف اور نازک مضمون باندھتے ہیں یا بیان میں زور اور وسعت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو تشبیہیں لاتے ہیں لیکن تشبیہات کا دائرہ رفتہ رفتہ کچھ تنگ ہوتا گیا اس لئے شعرا مجبوراً حقیقی چیزوں کی تشبیہ غیر حقیقی چیزوں سے دینے لگے لیکن قاآنی کی تشبیہات عموماً قدرتی ہوتی ہیں اور ان میں تازگی اور ندرت بھی ہوتی ہے ذیل کے اشعار تشبیہات کی زندگی اور ندرت کی عمدہ مثالیں ہیں۔

؎ دو زلفِ تابدار او بچشم اشکبار من — چو چشمۂ کہ اندر و شنا کنند مارہا
؎ فراز سرو بوستاں نشستہ اند قمریاں — چوں مقریاں نغز خواں بزمر دیں منارہا

؎ ساقی بالا نند اندر خم آب کلنگ ۔۔۔ ہمچو بلقیس کہ بر صرح سلیماں گذرد

۲- قاآنی کا اندازِ بیان نیا اور طبع نژاد ہے پرانا اور پامال مضمون بھی اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ وہ بالکل انوکھا اور طبع زاد معلوم ہوتا ہے باغ کا سہانا منظر اکثر شعرا پیش کرتے ہیں لیکن قاآنی کے ہاں اس منظر کی تصویر کشی بالکل انوکھی اور نرالی ہے ؎

بہار آمد کہ از گلبن ہمیں بانگ ہزار آید ۔۔۔ بہر ساعت خروش مرغ زار از مرغزار آید

۳- ایرانی شاعری مبالغے کے لئے بہت بدنام ہے لیکن قاآنی نے کوشش کی ہے کہ شاعری کے دامن کو مبالغے سے پاک رکھا جائے ؎

بداں فتراک گیسو نرم نرمک پای دل بستی ۔۔۔ وزاں شمشیر ابرو اندک اندک قصد جاں کردی

زغم چوں شام تاریک است روز روشنم بی تو ۔۔۔ شب تاریک را بر روز روشن سائیاں کردی

۴- قاآنی نے عموماً بحریں ایسی استعمال کی ہیں جن میں نغمے کی سی کیفیت ہے الفاظ بھی ایسے ہم آہنگ لاتے ہیں کہ ان کے صوتی اثرات موسیقی کی شان پیدا کر دیتے ہیں۔

۵- منظر کشی میں قاآنی کو کمال حاصل ہے معلوم ہوتا ہے کہ کسی منظر کی تصویر کشی آپ اس وقت کرتے ہیں جب ان کا دل اور دماغ اس سے متاثر ہوتا ہے

؎ بگردوں تیرہ ابری بامداداں بر شد از دریا
جواہر ریز و گوہر خیز و گوہر بیز و گوہر زا

۶- واقعہ نگاری سے کسی شاعر کی قوتِ مشاہدہ کا اندازہ ہوتا ہے قاآنی طویل واقعات نظم کرتے ہوئے کچھ اس طرح جزئیات بیان کرتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ہر ہر بات پر آپ کی نظر ہے۔

؎ ماہ رمضاں آمد ای ترک سمن بر ۔۔۔ برخیز و مرا سبحہ و سجادہ بیاور

؎ اسباب طرب را ببر از مجلس بیرون ۔۔۔ زاں پیش کہ ناگاہ نقیبی رسد از در

۷- اشعار میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے قاآنی بعض زائد الفاظ بھی لاتے

ہیں ایک زائد لفظ "بر" کو ردیف بنا کر پورا قصیدہ لکھ ڈالا ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

آمد بہ بزم دوش بچۂ سادہ لیسر بر — وز مشکِ تر دو ہشتہ دو گیسو بہ کمر بر

قاآنی کی یادگار اس کا دیوان ہے اس کے علاوہ آپ نے گلستان سعدی کی طرز پر نثر میں بھی ایک کتاب لکھی ہے جو "پریشان قاآنی" کے نام سے موسوم ہے گلستان کی طرح "پریشان" کی حکایات بھی پند و موعظت اور آداب دیگر پر مشتمل ہیں اندازِ بیان میں بھی قاآنی نے سعدی کی تقلید کی ہے لیکن اس میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکی جو گلستان کا خاصہ ہے۔

(ادب نامہ ایران مقبول بیگ)

مرزا اسد اللہ خاں غالب

مرزا اسد اللہ خاں غالب المعروف بہ مرزا نوشہ المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالب در فارسی اسد در ریختہ بہ شب ہشتم ماہ رجب ۱۲۱۲ھ ہجری کو شہر آگرہ میں پیدا ہوئے مرزا کے خاندان اور اصل و گوہر کا حال یہ ہے کہ ان کے آباؤ اجداد ایبک قوم کے ترک تھے اور ان کا سلسلہ نسب تور ابن فریدوں تک پہنچتا ہے مرزا کے دادا کی زبان بالکل ترکی تھی اور ہندوستان کی زبان بہت کم سمجھتے تھے اس زمانے میں ذوالفقار الدولہ مرزا نجف خاں شاہ عالم کے دربار میں دخل کلی رکھتے تھے نجف خاں نے مرزا کے دادا کو سلطنت کی حیثیت کے موافق ایک عمدہ منصب دلوایا اور پہاسو کا سیر حاصل پرگنہ ذات اور رسالے کی تنخواہ میں مقرر کر دیا ان کے کئی بیٹے تھے جن میں سے دو کے نام معلوم ہیں ایک مرزا کے باپ عبد اللہ بیگ خاں عرف مرزا دولہا اور دوسرے نصر اللہ بیگ خاں۔ عبد اللہ بیگ خاں کی شادی خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی بیٹی سے ہوئی تھی جو کہ سرکار میرٹھ کے ایک معزز فوجی افسر اور عمائد آگرہ میں سے تھے مرزا عبد اللہ بیگ خاں نے بطور خانہ داماد کے اپنی تمام عمر سسرال میں بسر کی اور ان کی اولاد نے بھی وہیں پرورش پائی مرزا عبد اللہ بیگ خاں کے دو بیٹے ہوئے ایک مرزا اسد اللہ خاں اور دوسرے مرزا یوسف خاں جو ایام شباب میں مجنوں ہو گئے تھے اور اسی حالت میں ۱۸۵۷ھ میں انتقال کیا۔

مرزا کے والد جیسا کہ مرزا نے خود ایک خط میں لکھا ہے اول لکھنؤ میں

جاکر نواب آصف الدولہ کے یہاں نوکر ہوئے اور چند روز بعد وہاں سے حیدر آباد پہنچے اور سرکار آصفی میں تین سو سوار کی جمعیت سے کئی برس تک ملازم رہے مگر وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی اور واپس آگرہ میں چلے آئے یہاں آکر انہوں نے الور کا قصد کیا راجہ بختاور سنگھ نے ابھی ان کو کوئی خاطر خواہ نوکری نہیں دی تھی کہ اتفاق سے انہیں دنوں میں ایک گڑھی کے زمیندار راج سے پھر گئے تو فوج گڑھی پر سرکوبی کے لئے بھیجی گئی اس کے ساتھ مرزا عبداللہ بیگ خاں کو بھی بھیجا گیا تھا وہاں پہنچتے ہی ان کے گولی لگی اور وہیں ان کا انتقال ہوگیا اور راج گڑھ میں دفن ہوئے۔ مرزا کے والد کی وفات کے بعد ان کے چچا نصراللہ بیگ خاں نے ان کی پرورش کی۔

جب سرکار انگریزی کی عملداری ہندوستان میں اچھی طرح قائم ہوگئی اور نواب فخر الدولہ احمد بخش لارڈ لیک کے لشکر میں شامل ہوئے تو انہوں نے مرزا غالب کے چچا نصراللہ بیگ خاں کو جن سے نواب موصوف کی ہمشیرہ منسوب تھیں سرکاری فوج میں بعہدہ رسالداری ملازم کرادیا ان کی ذات اور رسالے کی تنخواہ میں دو پرگنے یعنی سونک اور سونسا جو نواح آگرہ میں واقع ہیں سرکار سے ان کے نام پر مقرر ہوگئے جب تک وہ زندہ رہے دونوں پرگنے ان کے نامزد رہے اور ان کی وفات کے بعد ان کے وارثوں اور متعلقوں کی پنشنیں سرکار نے فیروز پور جھرکہ ریاست سے مقرر کرادیں۔ جن میں سے سات سو روپیہ سالانہ مرزا کو آخر اپریل ۱۸۵۷ء تک برابر ملتا رہا مگر فتح دہلی کے بعد تین برس تک قلعے کے تعلقات کے سبب یہ پنشن بند رہی آخر جب مرزا کی ہر طرح سے برأت ہوگئی تو پنشن پھر جاری ہوگئی اور تین برس کی واصلات بھی سرکار نے عنایت کی۔

مرزا نے اپنے علو خاندان پر جا بجا فارسی اشعار میں فخر کیا ہے چونکہ

ان میں سے بعض اشعار لطف سے خالی نہیں اس لئے اس مقام پر نقل کئے جاتے ہیں :-

غالب از خاک پاک تورانیم لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمہ بہ سترگاں قوم پیوندیم

مرزا غالب مع اپنے چھوٹے بھائی کے سن شعور تک آگرہ ہی میں رہے اگرچہ سات برس کی عمر میں وہ دلی میں آنے جانے لگے تھے لیکن شادی کے بعد تک ان کی مستقل سکونت آگرہ ہی میں رہی اور شیخ معظم جو اس زمانے میں آگرہ کے نامی معلموں میں سے تھے ان سے تعلیم پاتے رہے اس کے بعد ایک شخص پارسی نژاد جس کا نام آتش پرستی کے زمانہ میں ہرمزد تھا اور بعد مسلمان ہونے کے عبدالصمد رکھا گیا غالباً آگرہ میں سیاحانہ وارد ہوا جو کہ دو برس تک مرزا کے پاس اول آگرہ میں اور پھر دلی میں مقیم رہا مرزا نے اس سے فارسی زبان میں کسی قدر بصیرت پیدا کی اگرچہ مرزا کی زبان سے کبھی کبھی یہ بھی سنا گیا ہے کہ " مجھ کو مبدأ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے اور عبدالصمد محض ایک فرضی نام ہے چونکہ مجھ کو لوگ بے استاد کہتے تھے ان کا منہ بند کرنے کو میں نے ایک فرضی استاد گھڑ لیا ہے " مگر اس میں شک نہیں کہ عبدالصمد فی الواقع ایک فارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے کم و بیش فارسی زبان سیکھی چنانچہ مرزا نے جا بجا اس کے تلمذ پر اپنی تحریروں میں فخر کیا ہے۔

مرزا کے چچا کا رشتہ نواب فخرالدولہ کے خاندان میں ہو چکا تھا اسلئے ان کے خاندان سے ایک نوع کا تعلق پیدا ہو گیا تھا مرزا کی شادی نواب فخرالدولہ کے چھوٹے بھائی مرزا الٰہی بخش خاں معروف کے ہاں قرار پائی اور جیسا کہ مرزا نے ایک رقعے میں اشارہ کیا ہے تیرہ برس کی عمر میں ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو ان کا عقد ہو گیا اس تقریب سے ان کی آمد و رفت دلی میں زیادہ

ہوگئی اور آخر کار یہیں سکونت اختیار کرلی اور آخیر عمر تک دلی ہی میں رہے

بظاہر مرزا نے کوئی لمبا سفر کلکتہ کے سوا نہیں کیا اسی سفر کی آمد و رفت میں وہ چند ماہ لکھنو اور بنارس میں بھی ٹھہرے تھے۔ مرزا کی عمر کچھ چالیس برس کی تھی جبکہ وہ لکھنو ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے کلکتہ میں لوگوں نے ان کی بہت خاطر مدارات کی اور ان کو کامیابی کی اُمید دلائی۔ کلکتہ کے قیام کے زمانے میں کچھ لوگوں نے مرزا کے کلام پر اعتراض کئے تھے اور اپنے اعتراضوں پر قتیل کا قول سنداً پیش کیا تھا مگر مرزا ہندوستان کے فارسی گو شاعروں میں خسرو کے سوا کسی کو نہیں مانتے تھے انہوں نے قتیل کا نام سنکر ناک بھوں چڑھائی اور کہا کہ "میں دلوالی سنگھ فرید آباد کے کھتری کے قول کو نہیں مانتا اور اہل زبان کے سوا کسی کے قول کو قابل استناد نہیں سمجھتا اور اپنے کلام کی سند میں اہل زبان کے اقوال پیش کئے اس پر معترضین میں زیادہ جوش و خروش پیدا ہوا اور مرزا پر اعتراض اور مخالفت سے بہت جز بز ہوتے تھے ان کے گھبرا دینے کو ایک معترض بھی کافی تھا انہوں نے تنگ آکر مثنوی موسوم بر باد مخالف جس میں اپنی غریب الوطنی کا ذکر اور اہل کلکتہ کی نامہربانی کی شکایت اور ان کے اعتراضات اور اپنے جواب نہایت عمدگی اور صفائی اور درد انگیز طریقے سے بیان کئے ہیں لکھی۔

مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کی بہت عادت تھی اور چوسر جب کبھی کھیلتے تھے برائے نام کچھ بازی بدکر کھیلا کرتے تھے اسی چوسر کی بدولت ۱۲۶۴ھ میں مرزا پر ایک سخت ناگوار واقعہ گذرا (یعنی وہ قید ہوگئے)

۱۲۶۶ھ میں مرحوم بہادر شاہ ظفر نے مرزا کو خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ اور چھ پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر یعنی جیغہ و سرپیچ و حمائل مروارید کے دربار عام میں مرحمت فرمایا اور خاندان تیمور کی تاریخ نویسی کی خدمت پر بمشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار مامور کیا مرزا نے اس کے پہلے حصے

کا نام مہر نیمروز اور دوسرے کا نام "ماہ نیم ماہ" تجویز کیا تھا مگر صرف پہلا ہی مکمل کرنے پائے، سنہ ۱۲۷۱ ہجری میں جبکہ شیخ ابراہیم ذوق کا انتقال ہوگیا بادشاہ کے اشعار کی اصلاح بھی مرزا سے متعلق ہوگئی۔ غدر کے زمانے میں مرزا دلی سے بلکہ گھر سے باہر نہیں نکلے جونہی بغاوت کا فتنہ اٹھا انہوں نے گھر کا دروازہ بند کرلیا اور گوشہ تنہائی میں غدر کے حالات لکھنے شروع کئے "دستنبو" کے نام سے موسوم ہیں، اس کے علاوہ قاطع برہان درفش کاویانی، برہان قاطع - دیوان اردو فارسی، مکاتیب اردو فارسی، ان کی معنوی یادگاریں ہیں مرزا صاحب نے ذلیقعدہ ۲۸۵ ھ کی دوسری اور فروری سنہ ۱۸۶۹ء کی پندرھویں کو تہتر برس اور چار مہینے کی عمر میں رحلت کی اور درگاہ حضرت نظام الدین قدس سرہٗ میں اپنے خسر کے پائین مزار دفن کئے گئے۔

فارسی لٹریچر میں ایشیائی مذاق کے موافق جو دستگاہ مرزا نے بہم پہنچائی تھی اور فارسی نظم اور فارسی نثر دونوں میں جو بلند پایہ انہوں نے حاصل کیا تھا اس کو کما حقہٗ لوگوں کے ذہن نشین کرنا ہماری قدرت سے باہر ہے جبکہ اس زمانے میں بہت سخن سنج اور نکتہ پرور موجود تھے مرزا ہمیشہ زمانے کی ناقدردانی کی شکایت کرتے تھے اگرچہ مرزا کو فارسی زبان میں ہر قسم کے مضامین بیان کرنے پر ایسی ہی قدرت حاصل تھی جیسی کہ ایران کے ایک بڑے سے بڑے مشتاق، ماہر اور مسلم الثبوت استاد کو ہونی چاہیئے لیکن جس طرح تمام ممتاز اور نامور شعرا میں خاص خاص مضامین کے ساتھ زیادہ مناسبت دیکھی گئی ہے اسی طرح مرزا بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھے تصوف، حب اہل بیت، فخر، شوخی و ظرافت، رندی و بیباکی، بیان رنج و مصیبت، اظہار محبت و ہمدردی، حسن طلب یہ چند میدان ایسے تھے جن کا بیان مرزا کے تمام اصناف سخن میں اکثر نہایت لطیف و ملیح و پرقوت واقع ہوا ہے بے شک یہ بات ان کے عشقیہ مضامین و اخلاق و موعظت کے بیان میں عام طور پر نہیں پائی جاتی کیونکہ عشق و محبت اور تمام

تعلقات و معاملات عاشق و معشوق کا بیان جیسا کہ ظاہر ہے محض نیچرل سادگی اور بے تکلفی چاہتا ہے اور شاعرانہ صنعت سے جس کو مرزا نے جا بجا شاعری کے لفظ سے تعبیر کیا ہے ابا کرتا ہے برخلاف اس کے مرزا اصناف کلام میں اپنی مصطلح شاعری کا سررشتہ ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اسی لئے ان کے عاشقانہ اشعار میں باوجود کمال جزالت اور متانت کے وہ گرمی اور تاثیر جو شعر کی جان اور غزل کا ایمان ہے عام طور پر نہیں پائی جاتی اخلاق و موعظت کا بیان بھی اس لئے موثر اور دلآویز نہیں ہے کہ وہ جب تک نہایت سادہ اور صاف شاعرانہ تکلفات سے پاک نہ ہو دلوں میں گھر نہیں کرسکتا مگر اس سے مرزا کی اُستادی میں کچھ فرق نہیں آتا جب سعدی کی رزم کی نسبت کہا جاتا تھا "کہ ایں شیوۂ ختم ست بر دیگراں" اور اس کا قصیدہ بھی بہت پست سمجھا جاتا تھا اور باایں ہمہ سعدی کی استادی کو سب نے تسلیم کیا تو مرزا کے خاص قسم کے بیانات کی نسبت ایسا کہنے سے مرزا کی.. استادی میں کیونکر فرق آسکتا ہے یہ میزان جو ہمنے مرزا کے کلام کی نسبت بتائی ہے اس کو ان کے کلیات نظم و نثر میں جانچنا چاہیئے۔

مرزا کی فارسی شاعری اور فارسی انشا پردازی کے متعلق یہ بات قابل غور ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جنہوں نے پچاس برس تک مرزا کو ایک ایسے فن کی تکمیل اور اس میں ترقی کرنے پر مستعد و سرگرم رکھا جس کا زمانے میں کوئی قدرداں نہ تھا ان کے ممدوح زیادہ تر انگلش گورنمنٹ کے ارکان و اعیان تھے جو فارسی زبان اور خاص کر فارسی شاعری سے محض اجنبی تھے یا بادشاہ اور سلاطین و امرا و رؤسا تھے جن کو مرزا کے فارسی قصیدے پڑھنے اور سمجھنے کی نہ فرصت تھی نہ ضرورت وہ شخص جس کا قصیدہ انوری و خاقانی کے قصیدوں سے ٹکر کھا جائے جس کی غزل عرفی و طالب کی غزل سے سبقت لے جائے جو رباعی میں عمر خیام کی آواز میں آواز ملائے اور

جن کی نثر کے آگے ابوالفضل اور ظہوری کی نثر میں پھیکی اور بے مزہ معلوم ہوں اس کو بہادر شاہ کی سرکار سے صرف پچاس روپیہ ماہوار ملتا تھا۔

مرزا کے ماننے والے اور ان کے فارسی کلام پہ ایمان بالغیب رکھنے والے بلا شبہ ملک میں بیشمار تھے مگر ایسے خوش اعتقادوں کی کثرت اور ان کی تحسین وآفرین سے شاعر کا دل ہرگز نہیں بڑھ سکتا تو پھر وہ کیا چیز تھی جس کو مرزا کی اصلی اور حقیقی ترقی کا باعث قرار دیا جائے بات یہ ہے کہ شاعر کے دل میں اصلی ترقی کا ولولہ نہ سلاطین و امرا کی داد و دہش سے پیدا ہو سکتا ہے اور نہ خوش اعتقاد شاگردوں اور ماننے والوں کی کثرت سے بلکہ اس کا دل بڑھانے والی صرف دو چیزیں ہیں جو خواہی نخواہی اس کو ترقی کرنے پر مجبور کرتی ہیں اولاً سبق استعداد اور فطری قابلیت جس کا اقتضار یہ ہے کہ اگر تمام عالم میں ایک قدرداں یا مخاطب صحیح نہ ہو تو بھی وہ اپنے جوہر ظاہر کئے بغیر نہیں رہتی جس طرح مور خواہ ویرانے میں ہو خواہ آبادی میں اس کو مستی اور نشاط کے عالم میں ناچنے سے گریز نہیں اسی طرح شاعر جو ماں کے پیٹ سے شاعر ہی پیدا ہوا ہے بغیر اس کے کہ ملک میں کوئی اس کی قدر کرے یا اس کے کمال کی داد دے اپنے ہنر کی تکمیل میں ہاتھ پاؤں مارے بغیر نہیں رہ سکتا دوسرے اس فطری ملکہ کا تحریک دینے والا اور اس آگ کا پتھر سے نکالنے والا اس بات کا یقین ہے کہ سوسائٹی میں کچھ لوگ فی الحقیقت سخن فہم اور سخن سنج موجود ہیں۔

اگرچہ ہندوستان میں فارسی زبان کا چراغ مدت سے ٹمٹما رہا تھا اور فارسی شاعری کی عمر طبیعی اختتام کے قریب پہنچ گئی تھی مگر حسن اتفاق سے اس اخیر دور میں چند صاحبان فضل و کمال خاص دارالخلافہ دہلی میں ایسے پیدا ہوگئے تھے جو علم و فضل کے علاوہ شعر و سخن کا مذاق بھی اعلیٰ درجے کا رکھتے تھے ان چند صاحبوں سے میری مراد مولانا فضل حق خیرآبادی..

مولانا مفتی صدرالدین آزردہ مولوی عبداللہ خاں علوی ، مولوی امام بخش صہبائی حکیم مومن خاں مومن وغیرہ وغیرہ۔ درحقیقت ان لوگوں کا مرزا کے عصر میں موجود ہونا ان کی شاعری کے حق میں بعینہٖ ایسا تھا جیسا کہ عرفی و نظیری کے حق میں خان خاناں ، ابوالفتح ، فیضی اور ابوالفضل کا ان کے زمانے میں ہونا۔

اگرچہ ان بزرگوں میں بعض اصحاب ایسے بھی تھے جو بظاہر مرزا کی شاعری کا تسلیم نہیں کرتے تھے لیکن چونکہ یہ سب لوگ سخن فہم اور سخن سنج تھے اس لئے جس طرح قدر دانوں کی تحسین و آفرین سے مرزا کا دل بڑھتا تھا اسی طرح نکتہ چینیوں کے خیال سے ان کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا تھا اور ان کے دل پر اپنا نقش بٹھانے کے لئے اظہار کمال میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی اور اس طرح قدردان اور نکتہ چین دونوں ان کی ترقی کا باعث تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرزا نے فارسی غزل اول مرزا بیدل وغیرہ کی طرز میں کہنی شروع کی تھی چنانچہ اس قسم کی بہت سی غزلیں ان کے دیوان میں موجود ہیں مگر رفتہ رفتہ یہ طرز بدلتی گئی اور آخر کار عرفی ، ظہوری ، نظیری اور طالب آملی وغیرہ کی غزل کا رنگ مرزا کی غزل میں پیدا ہو گیا۔ اگرچہ مرزا نے بے دل اور ان کے متبعین کی زبان اور ان کے انداز بیان میں شعر کہنا بالکل ترک کر دیا تھا اور اس خصوص میں وہ اہل زبان کے طریقے سے سر مو تجاوز نہیں کرتے تھے مگر خیالات میں یہ کیفیت مدت تک باقی رہی لیکن آخر کار تغزل میں بے انتہا گھلاوٹ اور صفائی پیدا ہو گئی تھی۔ ان کی غزل میں زیادہ تر ایسے اچھوتے مضامین پائے جاتے ہیں جن کو اور شعرا کی فکر نے بالکل مس نہیں کیا اور معمولی مضامین ایسے طریقے میں ادا کئے گئے ہیں جو سب سے نرالا ہے اور ان میں ایسی نزاکتیں رکھی گئی ہیں جن سے اکثر اساتذہ کا کلام خالی معلوم ہوتا ہے

(یادگار غالب رزحالی)

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

غالب ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ ریاست الور میں فوجی عہدہ پر مامور تھے پانچ برس کے تھے کہ ان کے باپ کا انتقال ہوگیا اور ان کی پرورش کے ذمہ دار ان کے حقیقی چچا نصر اللہ بیگ خاں قرار پائے جو مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کے صوبہ دار تھے لیکن دراصل غالب کا بچپن اور لڑکپن اپنے ننہال میں گزرا یوں کہنا چاہیے کہ ان کے چچا محض مالی طور پر ان کے کفیل تھے اور ان کی ذہنی اور اخلاقی تربیت ان کی ماں اور ننہال کے زیر سایہ ہوئی۔

غالب کے اجداد اس زمانہ میں ہندوستان آئے جب مغلوں کا زوال شباب پر تھا یوں تو زوال کے اسباب و آثار کا سلسلہ بعض مورخین نے جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد سے جا ملایا ہے اور اس میں ایک سچائی بھی ہے لیکن حقیقی معنی میں زوال کی ابتدا اورنگ زیب کے عہد سے ہوتی ہے اور اس کے عہد کے نصف آخر میں زوال اس منزل تک پہنچ جاتا ہے جہاں مغلوں کی قسمت کے بارے میں ایک حکم لگایا جاسکتا ہے اورنگ زیب نے زندگی کے آخری سالوں میں مرہٹوں کے خلاف جو بیکار اور مسلسل جنگ جاری رکھی اس کا خاص طور سے حکومت کے خزانہ پر جو اثر پڑا اور عام طور سے رعایا کو جو بوجھ اٹھانا پڑا وہ ایک ایسی کہانی ہے جسے دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں اورنگ زیب کے انتقال کے تیرہ سال بعد یعنی ۱۷۲۰ کے قریب مرہٹوں نے دکن میں مغلوں کے اقتدار کو توڑ دیا اس کے بعد وہ شمالی ہندوستان کی طرف متوجہ ہوئے یہانتک کہ مغل بادشاہ کی حیثیت محض شطرنج کے مہرہ کی رہ گئی۔

غالب نے جس خاندان میں آنکھ کھولی وہ دلی اور آگرہ کے چند معزز خاندانوں میں سے تھے یہ خاندان عام انسانوں کے مقابلہ میں بادشاہوں اور ان کے خاندانی معاملوں منصب داروں اور ان کی سازشوں، مرہٹوں اور روہیلوں نوابوں اودھ اور انگریزوں کی ریشہ دوانیوں اور ان کی باہمی رقابتوں یعنی شیطان کے غموں سے زیادہ آشنا تھا اس کے افراد بھی مختلف موقعوں پر ان ہی طاقتوں میں سے کسی ایک سے وابستہ رہے خواجہ غلام حسین کمیدان شاہی خاندان کے پروردہ تھے۔

غالب کے باپ الور کی ریاست سے تعلق رکھتے تھے ان کے چچا مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے صوبہ دار تھے بعد میں وہ لارڈ لیک کی سرکردگی میں لڑے اور ان کی اولاد کمپنی بہادر کے وظیفہ کی مستحق سمجھی گئی۔ غالب کے ایک اور بزرگ نواب احمد بخش تھے جن کی بھتیجی سے غالب کی شادی ہوئی یہ انگریزوں کے بہت بڑے دوست اور دہلی کے شاہی خاندان سے منسلک تھے گویا بچپن میں غالب، مغلوں، مرہٹوں اور انگریزوں کی مربیانہ توجہ سے بالواسطہ فیضیاب ہے

غالب نے جو فضا اپنے خاندانی ماحول سے باہر دیکھی اور پائی وہ بھی حرکت اور قوت سے محروم تھی آگرہ کے اونچے گھرانوں کی زندگی ایک ایسے احاطہ میں بند تھی جس میں دو بہت اونچی حویلیاں تھیں ان میں سے ایک میں طوائفوں کی بود و باش تھی اور دوسری میں صوفیوں کا ڈیرہ تھا ان کے ملاقاتی اور مرید ایک تھے وہی گنے چنے شرفا جو اپنی بیویوں اور لڑائیوں کے میدان سے بھاگ کر یہاں آتے تھے سہولت کی خاطر ان حویلیوں کی بیچ کی دیوار میں ایک دروازہ نکال لیا تھا اور یہاں سے وہاں اور وہاں سے آنے جانے میں کسی قسم کی روک ٹوک نہیں تھی۔

آگرہ کا ایک نقش تو یہ ہے جس میں اونچے خاندانوں کی زندگی نظر آتی ہے دوسری تصویر ایک عام ویرانی کی ہے جس کا بیان نظیر اکبرآبادی نے اپنی شاعری

اور میر صاحب نے "ذکر میر" میں کیا ہے۔

تیسری تصویر اس بے چینی کی ہے جو کاریگروں، معمولی دکانداروں، ادنیٰ متوسط درجہ کے لوگوں اور سوجھ بوجھ رکھنے والوں کے دلوں میں رہ رہ کر ابھرتی۔ جو بالآخر غدر کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ پہلی دو تصویریں تو غالب کی نظر میں تھیں لیکن تیسری تصویر غالب اس عمر میں اور اس تجربہ کے ساتھ واضح طور پر دیکھنے سے قاصر رہے۔

غالب نے اپنے خاندانی ماحول سے باہر بچپن اور لڑکپن میں بس یہی فضا دیکھی تھی۔ آخر یہ سب کچھ اس طرح کیوں ہے؟ یہ سوال بار بار ان کے دماغ میں پیدا ہوتا تھا اور یہ ان کے کلام سے ظاہر ہے لیکن انہیں اس کا کوئی جواب نہیں ملتا اور ان کا بے پناہ سوچنے والا دماغ سخت الجھن میں گرفتار دکھائی دیتا ہے ایک عمر کے بعد وہ اس پیچیدگی سے باہر نکل آتے ہیں لیکن ان کی شاعری کا آغاز اسی سے ہوتا ہے۔

ان کی ابتدائی علمی فتوحات میں سب سے اہم فارسی دانی ہے انہوں نے اس زبان پر جو قدرت حاصل کی اور فارسی ادب سے جو گہری واقفیت بہم پہنچائی وہ یقیناً حیرت انگیز ہے یہ خاص طور سے ان حالات کے پیش نظر اور بھی حیرت انگیز ہو جاتی ہے جس میں غالب کا لڑکپن گزرا، ہمیں معلوم ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی معقول انتظام نہیں کیا گیا تھا۔

اس سلسلے میں حالی نے جو کہانی بیان کی ہے اس سے غالب کے ابتدائی مطالعہ پر دلچسپ روشنی پڑتی ہے وہ لکھتے ہیں "غالب نے گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا اسی زمانے میں انہوں نے فارسی میں کچھ اشعار بطور غزل کے موزون کئے تھے جن کی ردیف میں "یعنی چہ" کے بجائے "کہ چہ" استعمال کیا تھا جب انہوں نے وہ اشعار اپنے استاد شیخ معظم کو سنائے تو انہوں نے کہا "کہ یہ کیا مہمل ردیف اختیار کی ہے ایسے بے معنی شعر کہنے سے کچھ فائدہ

نہیں مرزا یہ سن کر خاموش ہو رہے ایک روز ملا ظہوری کے کلام میں ایک شعر ان کی نظر پڑ گیا جس کے آخر میں لفظ "گرچہ" یعنی پر" کے معنی میں آیا تھا وہ کتاب لے کر دوڑتے ہوئے استاد کے پاس گئے اور وہ شعر دکھایا شیخ معظم اس کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور مرزا سے کہا کہ تم کو فارسی زبان سے خداداد مناسبت ہے تم ضرور فکر شعر کیا کرو اور کسی کے اعتراض کی کچھ پرواہ نہ کرو۔"

ظہوری کے علاوہ غالب نے نظیری اور عرفی وغیرہ کا مطالعہ بھی کیا تھا ان شعرا کے اثرات ان کی ابتدائی شاعری میں نظر آتے ہیں غالب نے اس بات کی شہادت دی ہے کہ وہ فارسی شاعر جو پچیس برس تک ان کے دماغ پر حاوی اور ان کے فن میں جاری و ساری رہا بیدل تھا۔ غالب کی ذہنی ترقی کی رفتار ان کی عمر کے مقابلہ میں ضرورت سے زیادہ تیز تھی اگرچہ ان کی تعلیم باقاعدہ طور پر نہیں ہوئی تھی تاہم ان کے مضامین شعری سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کی نظر سے وہ سب کچھ گزر چکا ہوگا جو ان کے مشغلہ کے لئے ضروری تھا ان کے مضامین غیر معمولی غور و خوض کا پتہ دیتے ہیں ان کی بعض پیچیدہ اور فنی اعتبار سے ناقص غزلوں میں بھی کہیں کہیں ایک آدھ مصرع ایسا نکل جاتا ہے جس میں آسمان کی سی پہنائی نظر آتی ہے۔

شعر و ادب کے ساتھ ساتھ غالب نے ایرانی مذاہب کا مطالعہ بھی کیا تھا اور انہیں اپنے ماحول کے اثر سے وحدت الوجود کے مسئلہ سے بھی لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔

اس مطالعہ کی بنا پر غالب کو استدلال سے غیر معمولی شغف پیدا ہو گیا اور وہ شعر و شاعری میں بھی اس کی تلاش کرنے اور اس کے مظاہرہ کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

بدقسمتی سے ابتدائی زمانہ میں انہوں نے اپنی زبان و ادب کا مطالعہ کم

کیا تھا اسی لئے وہ چار و ناچار لیکن سنجیدگی کے ساتھ ان فارسی گو شعرا کی
طرف متوجہ ہوئے جن کے یہاں انہیں زندگی کی دیواریں گرتی ہوئی نظر آئیں
اور جن کی شاعری میں انہوں نے انسانوں کو اپنے اندر گم اور دنیا کی بندشوں
سے آزاد پایا اور نفسیاتی عمل کی ایسی پیچیدگیاں دیکھیں جو دور از کار استعاروں
اور نادر ترکیبوں کی مدد سے پیش کی گئی تھیں ان سب میں بیدل نمایاں تھے
بیدل کے علاوہ جن شاعروں کا اثر غالب نے قبول کیا اس میں شوکت
بخاری اور جلال اسیر زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، شوکت بخاری کو اگر غالب
کا ابتدائی نمونہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا غالب کے کلام کی بیشتر خصوصیات
ان کے یہاں پائی جاتی ہیں غالب کی نوحہ داری، مشکل پسندی، خطرہ آزمائی
عام انداز فکر سے انحراف، مبالغہ، منطق اور استدلال یہ سب شوکت بخاری
کے یہاں دبے پاؤں چلتے نظر آتے ہیں اور اسے تسلیم کرتے میں ذرا بھی پس و پیش
نہ ہونا چاہیئے۔ کہ غالب نے نہ صرف ابتدائی شاعری میں شوکت کا تتبع کیا بلکہ
آئندہ کی تنظیم شاعری کے لئے ان سے خام سواد حاصل کیا ہے غالب کے
لہجہ اور اسلوب میں جو ایک طرح کی غرابت پائی جاتی ہے وہ بغیر بیدل کی
پیدا وار نہیں کہی جا سکتی غالب اور شوکت کے یہاں بہت سی ذہنی کیفیتیں
مشترک ہیں اور غالبا دونوں نے ایک ہی ترتیب سے اپنے فنی اور ارتقائی
منزلیں طے کی ہیں لیکن غالب کی یہ عظمت ہے کہ ان کی نظر تمام کیفیتوں پر
محیط ہے اور ان میں تنظیم قائم کئے ہوئے ہے برخلاف اس کے شوکت
خالص کیفیتوں کے شاعر ہیں ان کی ایک کیفیت کو دوسری کیفیت کی خبر نہیں
اس لئے ان کا شاعرانہ تفکر کسی خاص نتیجہ پر نہیں پہنچتا غالب نے شوکت کی
مشکل پسندی، جدت طبع اور تجسس کو اپنے فن میں نہ صرف ایک اعلیٰ معیار
دیا بلکہ ان کی باہمی آمیزش سے ایک وسیع گذرگاہ خیال تیار کی غالب کے
یہاں جو مذہبی تشکیک، زندگی کی بصیرت اور عمل کے آداب و اخلاق ملتے ہیں

ان سے شوکت بخاری محروم ہے انسانی نفسیات کی جو پیچ در پیچ گرہیں غالب کے یہاں کھلتی ہیں ان سے بھی شوکت نا آشنا ہیں لیکن ان میں وہ تمام کیفیتیں اور خوبیاں موجود تھیں جن سے فن کے یہ عظیم عناصر وجود میں آ سکتے تھے۔

مرزا جلال اسیر ایک اوسط درجے کے روایتی شاعر ہیں جن میں ایک عام شاعر کی بیشتر خوبیاں موجود ہیں ان کے کلام میں سب سے نمایاں عنصر حسن پرستی کا ہے محبوب کے حسن سے لے کر مناظر فطرت کے حسن تک وہ یکساں متاثر ہوتے ہیں۔ حسن پرستی کے اس جذبہ نے ان کی مذہبی رجائیت کو اور فروغ دیا ورنہ شاید رجائیت محض مذہب کی بنیاد پہ اس دور میں ممکن نہ تھی اس زمانہ کے شاعروں میں جو سب کے سب مذہب پرستی سے کار بند تھے ایک قسم کا قنوطی تصوف پایا جاتا ہے ان کا سارا فلسفہ وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت پر مبنی تھا جس کا انکشاف حقائق سے دور ہو کر مراقبہ اور مجاہدہ کی صورت ہی میں ہوا کرتا تھا اسیر چونکہ حسن کے سچے پرستار تھے اس لئے وہ زندگی سے آزردہ اور زخم خوردہ ہونے کے بعد بھی اس کے حسن سے نگاہیں نہ پھیر سکے اور اسی لئے وہ عام قنوطیت کی زد سے بچے رہے ان کی زندہ دلی اور تخیل کی آب و تاب بھی مشاہدۂ حسن پر مبنی ہے یہی وہ مقام ہے جہاں ان میں اور غالب میں مماثلت شروع ہو جاتی ہے ان کے استعاروں میں جو غالب جیسی وسعت اور لچک ہے وہ ان کے مشاہدہ کے خلوص اور شدت احساس کا ثبوت دیتی ہے۔

بیدل کی ہیئت شعری کا جو اثر غالب کی شاعری پر ہوا اس سے غالب کے پڑھنے والے بخوبی واقف ہیں اس لئے یہاں یہ زیادہ مفید معلوم ہوتا ہے کہ بیدل کے خیالات اور مضامین کا تعارف کرا دیا جائے جو ان کی شاعری کا سرچشمہ ہیں۔

بیدل کے نکات اور رقعات میں ان کے سماجی شعور کی ایک روشن تصویر

ملتی ہے۔ بیدل شریعت کے آداب کا اثبات کرتے اور تصوف کی منطق سے
سے زندگی کی گتھیوں کو سلجھاتے ہیں ان کے نظام میں روحانی ریاضتوں پر
خاصہ قرار دیا گیا ہے دراصل بیدل کے یہاں ایک صوفی کا تجربہ نہیں بلکہ ایک
فلسفی کا تصوف ہے ان کی شاعری میں انسان اور اخلاق و اعمال کی ایک
مخصوص تعبیر ملتی ہے اس تعبیر کے متوسلے میں ان کا سب سے بڑا ہتھیار ان کی
منطق ہے جو چند مفروضوں پر مبنی ہے یہ منطق اس وقت تک پیدا ہوتی
ہے جب عقل اور جذبہ میں اور عمل اور نصب العین میں ربط باقی نہیں رہتا
اور یہی وہ منطق ہے جو بیدل کو دوسرے صوفی شعرا سے ممتاز کرتی ہے
بیدل کا کہنا یہ ہے کہ جو شخص امتیاز چاہے یا سکون کا متلاشی ہو اسے اپنے
ہم جنسوں سے الگ ہو جانا چاہیئے یعنی وہ صرف ذات پر زور دیتے ہیں۔

بیدل کا فن انسانی جذبات پر مبنی نہیں ہے بلکہ خالص ذاتی اور ذہنی
اور غریب واردات پر مبنی ہے جس کا اثر انسان کی فکری اور عملی صلاحیتوں
پر خوشگوار نہیں پڑتا بیدل زمانہ سے مایوس اور انسانی معاملات سے بیزار
ہیں جس کا سبب یہ ہے کہ وہ نظری اور عملی طور پر اپنے دور کی زوال آمادہ
قوتوں کے ہمنوا ہیں اسی لئے بیدل اپنے تاریخی ماحول میں کوئی روشن پہلو دیکھنے
سے معذور ہیں ؎

نہ شام ما را سحر نویدی، نہ صبح ما را دم سپیدی
چوں حاصل ماست نا امیدی غبار دنیا بفرق عقبیٰ

؎ سلامت نمی زیبد از ساز موج — شکست است انجام و آغاز موج

؎ ز خود گم شدم جستجو ہم نماند — چو من از میاں رفت او ہم نماند

بیدل کی شاعری اسی کشمکش کی داستان ہے جو ان کے نفس اور خدا کے
مابین جاری رہی اور جس میں فتح کسی کو بھی نصیب نہیں ہوئی اور یہی سبب
ہے کہ ان کے یہاں بے چینی کی وہ کیفیت ملتی ہے جو بڑے صوفی شاعروں کے

یہاں نہیں پائی جاتی۔

قلبی واردات کے بجائے ذہنی استدلال

بہجت کے بجائے افسردگی

اور روحانی سکون کے بجائے بے چینی

ان کے یہاں عمل جس نوعیت اور جس صورت میں پایا جاتا ہے اس کی سب سے اچھی مثال وہاں ملتی ہے جہاں بیدل نے اپنے خیال انسان کی تصویر پیش کی ہے یہ اور بات ہے کہ یہ عمل سارے اعمال کی نفی کرتا ہے ؎

یک نفس پروازِ آہنگش زہستی تا عدم
یک قدم جولانِ عزمش بے نشان تا بانشان

ان شعراء کے مضامین میں اخلاق خاص طور سے نمایاں ہے اخلاق جب زندگی میں جاری وساری ہوتا ہے تو پہلی نظر میں دکھائی نہیں دیتا لیکن جب یہ زندگی سے علیحدہ ہو جاتا ہے تو روزمرہ کی گفتگو، مذہبی مباحثوں اور شعروشاعری میں صاف طور سے دیکھا جا سکتا ہے ایک اخلاق وہ ہوتا ہے جو عمل سے ٹپکتا ہے اور اس کی قدروقیمت عمل کے تاثر سے از خود ظاہر ہو جاتی ہے دوسرا اخلاق وہ ہوتا ہے جو الفاظ سے ٹپکتا ہے اور اس کی قدروقیمت الفاظ کے دروبست، پامال محاوروں، ضرب الامثال، اساتذہ کی تضمینوں اور خدا کی آیتوں سے ثابت کی جاتی ہے ایک تمثیلی رنگ کی بنیاد ہے۔

دراصل شاعری استدلال نہیں ہوتی انکشاف ہوتی ہے مگر زوال کے زمانے میں جب زندگی کی کوئی واضح تصویر اور حیات وکائنات کا کوئی مجموعی تصور باقی نہیں رہتا تو زندگی اور اس کی سچائی ذاتی یا کسی محدود طبقہ کی سچائی میں تبدیل ہو جاتی ہے زوال پسند ادیب اپنے ذاتی نقطۂ نظر

سے یا اپنے طبقہ کے معیاروں سے پوری زندگی کو جانچنے اور ادھوری زندگی کو پوری زندگی اور اپنی سچائی کو سب کی سچائی مان کر برتنے لگتے ہیں جسے منوا لینے کے لئے ناگزیر ہو جاتا ہے ایسے شعراء کو زندگی پر خود پر اور سامعین پر اعتماد نہیں ہوتا اور وہ اس بے اعتمادی کی تلافی بھی استدلال ہی سے کرتے ہیں۔ یہ تمثیلی رنگ بیدل، شوکت، اسیر، غنی، ناصر علی شاہ نصیر، ناسخ ذوق اور نوجوان غالب سبھی کے یہاں پایا جاتا ہے البتہ بیدل، غالب اور اسیر کے یہاں بہ نسبتاً کم ہے غالب کا اردو شعر ہے

ہوا جب حسن کم، خط بر عذار سادہ آتا ہے

کہ بعد از صاف ہے ساغر میں درد بادہ آتا ہے

ان شعرا کے یہاں خیال بندی بھی کم و بیش پائی جاتی ہے۔ غالب کے یہاں خیال بندی "زود حسی" کے تابع ہے کم یا زیادہ دوسرے الفاظ میں ان کے یہاں زندگی کی کوئی مخصوص تنظیم نظر نہیں آتی یہ امتیاز صرف بیدل کو ہے۔ یہ بات ہمیں ان نتیجوں تک پہنچنے میں مدد دیتی ہے کہ:-

(۱) صائب سے شعر و سخن میں زوال کی ابتدا ہوتی ہے اور فن کا مقصد پرانی، سماجی اور ادبی روایتوں کا تحفظ ان کا بچاؤ اور الٹ پھیر ہو جاتا ہے جس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ شاہ جہاں اور عباس ثانی کے عہد میں ایران اور ہندوستان کا تہذیبی اور اقتصادی نظام ایک ایسی منزل پہ آکر ٹھہر جاتا ہے جہاں اس میں مزید نشو و نما کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔

۲۔ اس جمود سے شعر و شاعری میں تین خاص رجحانات پیدا ہوتے ہیں

ا۔ مناسبات لفظی کا التزام

ب۔ تمثیل نگاری

ج۔ خیال بندی

جو صائب سے لے کر ناسخ تک ان تمام شعراء کے یہاں پائے جاتے ہیں جنہوں نے زوال پذیر تہذیب سے اپنی محبت کو برقرار رکھا

۳۔ یہ رجحانات زوال کی رفتار کے ساتھ ساتھ مختلف شعرا کے طبائع سے آمیز ہو کر چند تبدیلیوں سے گزرتے ہیں لیکن بنیادی طور پر ان میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا

غالب زندگی کے ابتدائی حصہ میں زوال کے چند اثرات کو خاندانی ماحول کی بنا پر قبول کر لیتے ہیں اور فارسی کے ذوق کی بنا پر وہ ان شعرا کی طرف مائل ہو جاتے ہیں جو ان کے محدود ماحول میں اپنی انحطاط پسندی کے باعث قدر و منزلت کے تخت بٹھا دیئے گئے تھے غالب متحرک ہونے کے باوجود اپنے ذاتی حالات کی بنا پر ایک مدت تک اسی حصار میں گردش کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں جو ان کے خاندانی اور ذاتی حالات اور ابتدائی مطالعہ نے ان کے چاروں طرف کھینچ دیا تھا اور وہ بڑی حد تک زندگی کے ان پہلوؤں کو دیکھنے سے قاصر رہتے ہیں جن میں کشمکش تبدیلی اور قوت کے آثار موجود تھے چنانچہ ان کے فنی اظہار میں بھی ہی رجحانات حاوی نظر آتے ہیں جو انحطاط سے پیدا ہوئے تھے یعنی ان کے یہاں بھی مجموعی اعتبار سے مواد اور ہیئت میں وہی تعلق موجود ہے جو ان دوسرے فارسی اور اردو شعرا کو ایک لڑی میں پرو دیتا ہے

ان شاعروں کے ذہنی عمل میں یہ چیز خاص طور سے نمایاں ہے کہ یہ الفاظ کی مدد سے خیال کا شکار کرتے ہیں چشم کے ساتھ سرمہ، میل اور اسی قبیل کے دوسرے الفاظ ان کے دماغ میں ہجوم کر لیتے ہیں اور ان کی ترکیب سے خود بخود کوئی خیال ابھرتا ہے ان کے نزدیک معانی الفاظ کی زمین کے خود رو پودے ہیں اور "لفظی مناسبات" انسانی زندگی کے علاقوں کا بدل ہیں۔ ان شعراء نے الفاظ میں لذت پسندی کا ایک

پہلو دریافت کر لیا ہے اور ان کو یکجا کر دینے سے انہیں جمالیاتی تسکین حاصل ہو جاتی ہے مثلاً غالب کے اس اردو شعر سے ......

نمود آمادِ وحشت چشمِ پری سے شب وہ بدخو تھا
کہ موم آمیزۂ تمثال کو تعویذ بازو تھا

میں وحشت، چشم، پری، موم، تعویذ اور بازو

غالب کی ابتدائی شاعری میں یہ رجحانات کارفرما نظر آتے ہیں لیکن غالب اس زمانہ میں دوسرے اثرات بھی قبول کر رہے تھے اور غیر معمولی ذہنی کاوش کے ساتھ ایک آزاد اور پائیدار حکومت کی بنیاد رکھنے میں مصروف تھے۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ غالب کی شاعری یا محبت اس میں کن منزلوں سے گزرتی ہے اور ان کا مجازی محبوب ان کے ماورائی محبوب سے کتنا مختلف ہے غالب اپنی محبت کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے ہیں اور زمانہ انہیں اس محبت کا کیا صلہ دیتا ہے۔

لیکن ہمیں سب سے پہلے اس سوال کا جواب دینا چاہیئے کہ آیا غالب کے یہاں تصوف ہے اس کے بعد ہمیں یہ دریافت کرنا چاہیے کہ ابتدائی دور میں ان کے یہاں تصوف کے علاوہ کوئی اور ذہنی لہر بھی ملتی ہے یا وہ مستقل طور پر بالِ عنقا کے غبار میں ملفوف رہتے ہیں تیسرے یہ کہ غالب "عدم علدم علدی علدم نہ عدم چہ پردہ زری عبث" کی منزل تک پہنچے یا نہیں اگر ان سوالوں کا جواب ہاں یا نہیں میں دیا جائے تو وہ غالباً یوں ہو گا کہ:-

۱- غالب کی ابتدائی شاعری میں تصوف ہے اور خاصا نمایاں ہے۔

۲- لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں مادیت یا حقیقت پسندی کا بھی ایک رجحان ملتا ہے جو تصوف کے مقابلہ میں زیادہ قوی ہے۔

۲۔ غالب کی رسائی "وحدت الوجود" کے اس قلعہ تک نہیں جسے بیدل نے بے خودی کے زور سے اپنے لئے مخصوص کرلیا ہے۔

دوسرے الفاظ میں غالب کے یہاں تصوّف کا آئینہ خانہ ہے لیکن مادیت کی چمن آرائی بھی ہے ان کی ابتدائی شاعری میں وہ بھی ہے جو لازوال ہے اور وہ بھی ہے جو اگرچہ عارضی ہے لیکن لازوال سے زیادہ موثر ہے نوجوان غالب کے یہاں جو چیز ہمیں فوراً اپنی طرف کھینچتی ہے وہ ان کے سوچنے کا آفاقی انداز ہے۔ غالب کے ذاتی حالات اور اس دور کی تاریخی فضا میں ایک گونہ مشابہت ہے جو نوجوان غالب کو افسردہ کردیتی ہے وہ جہاں اپنی ماں کی اداس کلائیاں دیکھتے ہیں وہاں انہیں اکبرآباد کا سنگھار بھی لٹا ہوا نظر آتا ہے ان کے نجی حالات کا دائرہ پھیلتا ہے۔ تو ان کا تاریخی ماحول پیدا ہوتا ہے اور جب یہ دائرہ ان کے تخیل کی مدد سے وسعت پاتا ہے تو پوری کائنات اکبرآباد کے مرجھائے ہوئے کوچہ و بازار میں سمٹ آتی ہے اور وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کائنات زوال پہ ہے انسان کی شخصیت بکھر رہی ہے اور دنیا کا کوئی منظر ایسا نہیں جس کو ثبات ہو ان کی روح چیخ اٹھتی ہے ؎

مستعد قتل یک عالم ہے جلاد فلک — کہکشاں موج شفق میں تیغ خوں آشام ہے

از خرابی شد فنا حاصل خوشم زیں اتفاق — بود مقصودم محیط و سیل رہبر داشتم

غالب زمانہ کے زوال اور اس کے برتاؤ سے افسردہ ہو جاتے ہیں لیکن غالب اور بیدل کی افسردگی میں دو بنیادی فرق ہیں جنہیں صاف طور پر سمجھ لینا چاہیئے۔

۱۔ بیدل خود زوال میں مبتلا ہیں اس لئے وہ خالص روحانی نقطہ نظر سے انسان اور انسانی اعمال کو جانچتے ہیں اور یہ دیکھ کر افسردہ ہو جاتے ہیں کہ بنی نوع انسان مادی دنیا کی تلاش میں سرگرداں ہیں یہ نہ حواس کی لذتوں سے انکار کرتے ہیں اور نہ زندگی کو غیر سمجھتے ہیں بیدل کی خواہش یہ ہے کہ مقید مطلق

ہو جائے۔

اس کے برعکس غالب خارجی دنیا کو مادی زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ خود مادی دنیا کی تلاش میں ہیں انسانی خواہشات کا اثبات کرتے ہیں اور جب دنیا کو اتنا وسیع نہیں پاتے کہ ان کے حوصلے اس میں تسکین پائیں اور انہیں جو کچھ نظر آتا ہے وہ بے ربطی "پیچ وخم" "گرداب" "طوفان خزاں" "سیلاب" یا "تیغ خوں آشام" ہے تو وہ افسردہ ہو جاتے ہیں ان کی خواہش یہ ہے کہ مقید آزاد ہو جائے۔ یعنی اس افسردگی کے پیچھے جو ذہنی عمل ہے وہ نہ صرف یہ کہ ایک جیسا نہیں بلکہ قطعی طور پر ایک دوسرے کے متضاد ہے۔

۲۔ بیدل کی ذہنی افسردگی اور ان کے تصوف کی بنیاد میں زمانہ اور انسان کی تحقیر اور ان سے بیزاری کا احساس بھی موجود ہے لیکن غالب کی افسردگی یا ان کے تصوف میں اس قسم کا احساس موجود نہیں ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ اپنے ماحول کی شکایت کرتے ہیں اور زندگی کے تجربہ کی کمی کے باعث آسانی سے آزردہ بھی ہو جاتے ہیں اور یہی آزردگی جب وسیع خارجی ماحول کی اداسی اور نابخت لیکن آفاقی انداز فکر سے سیراب ہوتی ہے تو چار و ناچار تصوف کی پناہ لیتے ہیں اس میں شک نہیں کہ غالب نے نہ مراقبہ کیا اور نہ "اسمائے الٰہی" کے ذکر سے دل پہ ضرب لگائی لیکن اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنے ذاتی تجربوں کی مار دسے تصوف کی طرف مائل ہوئے اور یہ رجحان ان کی شاعری میں آخر تک قائم رہا اس لیے ان کا تصوف قابل توجہ ہے۔

یہ صحیح ہے کہ:۔

۱۔ غالب کے یہاں واردات نہیں ہے لیکن یہ بیدل کی شاعری میں بھی خال خال ہی ہے اور اگر واردات کے بیان ہی پہ صوفیانہ شاعری کا دارو مدار ہے تو بیدل کسی پہلو سے بھی صوفی شاعر کہلائے جانے کے مستحق نہیں۔

۲۔ غالب کے یہاں عشق مجازی کا بیان تصوف کے مقابلے میں زیادہ مؤثر

اور قوی ہے۔

۳- ان کا تصوف مابعد الطبیعات، اخلاق اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں پہ محیط نہیں ہے وہ بہت محدود ہے

۴- ان کا تصوف تزکیہ نفس یا دوسروں کی تلقین کے لئے کم اور اپنے تحفظ کے لئے زیادہ ہے۔

۵- ان کے تصوف میں وہ عنصر بیدلؔ کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہے جو کائنات کی حرکت اور اس کے جمال پہ زور دیتا ہے۔

۶- غالبؔ بیدلؔ کے برعکس مذہب کے رسمی اور رواجی پہلو سے بے تعلق نظر آتے ہیں لیکن زمانہ کے زیر اثر ان کی شاعری میں تصوف کا منفی رجحان بھی ملتا ہے۔

غالب خود کو ایک صوفی کی نظر سے دیکھتے ہیں لیکن یہ بتانا مشکل ہے کہ روحانیت کہاں ختم ہوتی ہے اور مادیت کہاں سے شروع ہوتی ہے بہر حال وہ قدر کو اس کے ذوق سے پہچانتے ہیں یعنی

۱- کائنات کا ذرہ ذرہ آفتاب کے پرتو سے تڑپتا ہے گویا وہ حرکت جو کائنات کے ذرہ ذرہ میں ہے وہی خدا ہے۔

۲- یہی قوت ہے جو مظاہر کی شیرازہ بندی ہے ان میں شامل بھی ہے اور ان سے جدا بھی ہے۔

۳- اس کے تعلق سے شخصیت منور ہوتی ہے۔

۴- شرط یہ ہے کہ ہم اسے کارزار حیات میں دیکھیں خیر اور شر کا تصور اسی کے عدل سے قائم ہے

غالب نے محبوب حقیقی کے متضاد عمل کا جو جواز دریافت کیا تھا ؎

لالہ و گل بہم آئینہ اخلاق بہار ہوں میں وہ داغ کہ پھولوں میں بسایا ہے مجھے

لیکن آخر میں وہ یہاں پہنچے کہ "بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں"۔

یہ وہ نقطہ ہے جہاں تصوف تشکیک میں اور "ادراک معنی" تماشائے صورت" ماورائیت مادیت میں اور خدا اس شخص میں تبدیل ہو جاتا ہے جس سے سعدی نے یہ کہا تھا کہ ؎

بہ تیزو در سرائے بہ بند   بنشین و قبائے بستہ واکن

اب غالب کے مجازی محبوب کو دیکھئے ہمیں اس کے تین روپ نظر آتے ہیں۔

۱۔ ایک غزل کا روایتی محبوب ہے جس میں وہ ساری خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ہندوستانی اور ایرانی غزل گو شعرا کے محبوبوں میں مشترک ہیں لیکن وہ کسی ایسی صنعت سے یکسر محروم ہیں جو ان خصوصیات کو کسی نئی سطح پر ترتیب دے کر ایک وحدت میں منتقل کر دے ؎

رخسار یار کی جو ہوئی جلوہ گستری   زلف سیاہ بھی شب مہتاب ہوگئی

۲۔ دوسرا محبوب بھی روایتی ہے لیکن اس کے چہرہ پر اکبر شاہ ثانی کے دور کا غازہ چڑھا ہوا ہے اور اگر اس میں کوئی انفرادیت ہے بھی تو وہ شاعر کے مصنوعی میلان سے پیدا ہوئی ہے۔ اس ضمن میں غنی کاشمیری اور ناصر علی کے اثرات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے جن کی خصوصیات یہ ہے کہ خیالی محبوب کی رسمی صفات کو عالمانہ اور کتابی لہجہ اور اصطلاحات کی مدد سے بیان کرتے ہیں۔

۳۔ اب تیسرا روپ غالب کے اپنے محبوب کا ہے جو ان دونوں سے مختلف ہے اس کی شخصیت رسمی نہیں ہے غزل میں محبوب کی سیرت آزاد نہیں ہوتی ان معنی میں کہ غزل بنیادی طور پر عاشق کی داستان ہوتی ہے اور وہ جو کچھ دیکھتا ہے اس میں اس کی ذہنی افتاد اور وقتی جذبات کو دخل ہوتا ہے اس لئے ہم بڑی حد تک اس کی رائے کے پابند ہوتے ہیں یہ عاشق پر موقوف ہے کہ وہ محبوب کو جس رنگ میں چاہے دیکھے اور دکھائے غالب محبوب کو ایک شخص

کے طور پہ پیش کرنا چاہتے ہیں اور ان کی نیت یہ ہے کہ یہ شخص مثالی پیکر میں تبدیل ہو جائے۔

غالب نے اول اول بیدل کی تقلید میں ایک مفروضے کو اپنا محبوب قرار دیا لیکن رفتہ رفتہ وہ اس کے تصور سے بددل ہو گئے غنی اور ناصر علی کے اثر سے وہ ایک واہمہ کی طرف مائل ہوئے لیکن چند ہی روز میں ان کی طبیعت اس سے بھی سیر ہو گئی پھر ناسخ کی پیروی میں انہیں محبوب محض ایک آلۂ کار کی صورت میں دکھائی دیا اور انہوں نے اس کے لئے اپنا آغوش وا کر دیا لیکن وہ بہت جلد ہی اس کے بناؤ سنگھار سے بیزار ہو گئے اور چار و ناچار کسی انسان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے جو خود ان سے مشابہ ہوا اور جس میں انہیں انسانی حسن و اخلاق کی حقیقی تصویر دکھائی دے جس کی پرورش آسمانوں کی بجائے زمین کی آغوش میں ہوئی ہو ایسے محبوب کو تخلیق کرنے کے دوران میں شاعر خیال حسن سے حسن عمل کی منزل تک پہنچ گیا ہے

غالب کے محبوب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کی شخصیت وسیع ہے وہ عاشق کے چند حواس ہی کو بار بار نہیں چھیڑتا بلکہ اس کے دل میں نت نئے احساس بیدار کر دیتا ہے یہی سبب ہے کہ اس کا تصور باغ در یا اور سبزہ سے میل رکھتا ہے ؎

باغ شگفتہ تیرا بساط ہوائے دل

۲۔ یہ محبوب عاشق کی ساری ذہنی اور جذباتی صلاحیتوں کو اپنے صرف میں لا سکتا ہے ؎

نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں   جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلنار

۳۔ اس کی موجودگی میں اور اس کی توجہ سے عاشق کو نہ صرف اپنی روح میں بلکہ دنیا میں ہر کہیں بالیدگی اور نمو کا احساس ہوتا ہے اس خصوصیت کا کوئی نام نہ ہو لیکن یہ ایک چھپا ہوا تصرف ہے جو اپنی قوت سے خود کو

کو منوا لیتا ہے ع:۔ دیدن ہمہ بالیدن، گردن ہمہ افسردن

۴۔ غالب کے محبوب کی ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ اس کی عقل توانا ہے یعنی وہ معاملہ فہم بھی ہے مردم شناس بھی اور موقع و محل کے مطابق عمل کرتا ہے یعنی وہ بلا ضرورت نہ ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور نہ تغافل برتتا ہے۔

۵۔ وہ خود پرست ہے اور اگرچہ یہ صفت ہر محبوب میں پائی جاتی ہے لیکن غالب کے محبوب میں یہ دوسروں سے کسی قدر زیادہ ہے۔

ع: خود پرستی سے رہے باہم دگر ناآشنا

۶۔ لیکن اس کا سب سے ممتاز وصف یہ ہے کہ اس کو فتح کرنا دشوار ہے یہ خوبی اپنی جداگانہ انفرادیت کے ساتھ ہر قابل ذکر محبوب میں پائی جاتی ہے۔ غالب کے محبوب میں یہ تین عناصر سے مل کر پیدا ہوئی ہے یعنی وسیع شخصیت تیز عقل اور خود پرستی چنانچہ ان کی ابتدائی شاعری کے ابتدائی دور میں بھی اس کا بیان جابجا ملتا ہے۔

غالب صرف عاشق، پیشہ ور عاشق نہیں ہیں وہ عشق کے طوفان میں بھی اپنے حواس کو برقرار رکھتے ہیں اور یہ نہیں بھول جاتے کہ ان کے چاروں طرف ایک وسیع دنیا پھیلی ہوئی ہے یہی سبب ہے کہ ان کے اشعار میں ہم عاشق سے زیادہ ایک باعمل انسان کی تصویر دیکھتے ہیں جو زندگی سے نگاہیں چار رکھتا اور حسن و عشق کو خارجی دنیا کے پس منظر میں دیکھتا ہے یہ ایک غیر معمولی بات ہے غالب نے عبوری دور میں آنکھ کھولی تھی ایسے زمانے میں آدمی پرانی دیواروں کو گرتے ہوئے تو آسانی سے دیکھ سکتا ہے ان سے محبت ہوتی ہے تو ان کا ماتم بھی کر لیتا ہے لیکن ان کی تہہ میں سے کسی نئی دیوار کو اٹھتے ہوئے دیکھنا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا اس کو دیکھ کر اس سے محبت کرنا اور بھی دشوار ہوتا ہے یہ اس لئے کہ دیکھنے والے میں خود بھی شکست و ریخت

جاری رہتی ہے اس کے اپنے اغراض اور اس کا اپنا ماضی ہوتا ہے جس سے قطع تعلق معمولی بات نہیں۔

بہر حال چند مخصوص اسباب کی بنا پر عالمگیری شعرا کی طرف متوجہ ہوئے جن میں سے ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ ان کا خاندان زوال پذیر طبقہ کا ایک حصہ تھا اور نتیجہ کے طور پر ان تمام روایتوں کا حامل تھا جو اس طبقہ کا اوڑھنا بچھونا تھیں تصوف اس کی نجات کا سامان، غرض پرستی، اس کا فلسفہ زندگی اور ہیئت پرستی اس کا آخری ادبی معیار تھا اور ان سب کا خلاصہ ایک پیچیدہ اور مجہول روحانیت تھی جس میں غالب کا مبتلا ہو جانا ایک قدرتی سی بات تھی۔

اس ماحول میں ہندوستان کے متاخرین شعرائے فارسی کی دھوم تھی یا ان کے ایرانی ہمزاد اور صائب وغیرہ کا غلغلہ بلند تھا اس لئے غالب از خود ان کی پیروی پر مائل ہو گئے ان شعرا میں صائب اور بیدل کو نمایاں حیثیت حاصل تھی چنانچہ جو شعرا بھی زوال سے متاثر ہوئے انھوں نے یا تو ان میں سے کسی ایک کی تقلید کی ورنہ انہیں اپنی عقیدت کا خراج پیش کرتے رہے ان میں غالب بھی شامل ہیں

غالب اپنے مضامین میں بڑی حد تک بیدل کے اثر سے آزاد ہیں اور ابتدا ہی سے غالب کی شاعری کا رُخ بیدل اور ان کے معاصرین سے کسی قدر بدلا ہوا نظر آتا ہے یعنی اس میں زوال کے اثر کے باوجود اک ایسے نئے پن کا احساس ہوتا ہے جو بیدل سے قطعاً مختلف ہے جس کا سبب یہ ہے کہ

۱۔ غالب ایک فعال شخصیت رکھتے ہیں۔

۲۔ وہ زندگی اور انسان کو ایک "زندہ کل" کے طور پر دیکھتے اور ان کی مصوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں

۳- جس میں ان کا سب سے بڑا سہارا ان کی عقل اور ان کے مزاج کا کفر ہے۔

۴- ان کی عقل اس لئے روحانی تعبیر سے مادی تعبیر کی طرف بڑھتی جاتی ہے گویا ابتدائی دور میں بھی ان کا ذہنی عمل دوسروں سے مختلف اور تیزی سے ساخت بدلتا ہوا نظر آتا ہے یہاں تک کہ ایک منزل پر پہنچ کر وہ اس ادبی اور سماجی خول کو توڑ کر باہر نکل آتے ہیں جس میں صائب، بیدل اور غنی وغیرہ نے اپنی عمر بسر کی تھی اور جس میں خود غالب کے بعض معاصرین زمانہ اور انسان کے تقاضوں سے گھبرا کر پناہ گزیں ہو گئے تھے۔

(غالب از خورشید الاسلام)

غالب آگرہ میں ایک مہم آزما خاندان میں پیدا ہوئے یہ ایک ترکوں کا ایک کھاتا پیتا خاندان تھا جو ابھی نصف صدی پہلے سمرقند سے ہندوستان آیا تھا اور یہاں اسے اعزاز حاصل ہو گیا تھا غالب کا ننھیال بھی بے حد متمول تھا یہاں بھی امیرانہ اور رنگینانہ زندگی کی جھلک ملتی ہے باپ اور چچا کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا اور مرزا غالب نے اپنی ابتدائی جوانی آزادانہ بسر کی جس کا ذکر ان کے خطوں میں پایا جاتا ہے اور جس کی طرف مہر نیمروز کے دیباچے اور بعض فخریہ قصائد سے ملتے ہیں بے فکری اور آرام کی اس زندگی نے غالب کو اپنے طبقے کے باہر نکلنے یا بڑے پیمانے پر بدلتی ہوئی زندگی کا تجربہ کرنے کا موقعہ نہیں دیا پھر ان کی تعلیم بھی انہیں لوگوں کے درمیان اور انہیں نظریات کے ماتحت ہوئی جو اس وقت کے شرفا کا دستور تھا اس تعلیم کے متعلق کچھ زیادہ مواد نہیں ملتا لیکن خود غالب کی تصانیف سے ان کی معلومات اور مطالعہ کا پتہ چلتا ہے وہ متداول علوم سے اچھی طرح باخبر معلوم ہوتے ہیں یہ علوم مذہبی تھے جو صدیوں سے ایک مقدس روایت

کی طرح اسلامی مکاتب میں پڑھائے جاتے تھے اگر ان کے سلسلہ میں کبھی بحث و مباحثہ ہوتا بھی تو اس کی حیثیت زیادہ تر لفظی ہوتی تھی تجربہ گاہیں مدت سے بند تھیں اور فلسفہ، منطق، طب، ہیئت عروض، تصوف ہر ایک میں بندھے ٹکے اصول چل رہے تھے شاہ ولی اللہ کے انقلاب انگیز خیالات اور ان کے شاگردوں اور ماننے والوں کے بعض کارنامے بھی علم الکلام کی موشگافیوں میں اسیر ہوکر رہ گئے تھے وہابی تحریک معمولی طور پر بعض حلقوں میں عوامی تحریک کی شکل اختیار کرنے کے بعد ایک مذہبی گروہ میں مقید ہوگئی تھی اس کی عوامی حیثیت مخصوص سیاسی اور معاشی اسباب کی بنا پر بنگال اور بہار میں نمایاں ہوئی تھی، دہلی تک پہنچتے پہنچتے وہ ایک مذہبی عقیدے سے آگے نہ بڑھ سکی اور غالب کے زمانے میں وہاں غیر وہابی مقلد غیر مقلد کی جو بحثیں ہوئیں اور جن میں غالب نے بھی دوستوں کی وجہ سے عملی نہیں علمی حصہ لیا مذہبی مناظرہ بازی سے زیادہ کچھ نہ تھیں مطلب یہ ہے کہ ان کی طبقاتی شکل نمایاں نہ ہوسکی اس طرح غالب کی ابتدائی تعلیم بالکل رسمی ہوکر رہ جاتی اگر ملا عبدالصمد نے غالب کو کچھ راہیں نہ دکھائی ہوتیں ہرمز جو اصلاً ایران کا زرتشتی تھا مسلمان ہو گیا اور غالب کی خوش قسمتی سے آگرہ پہنچ کر ان کا استاد بن گیا۔ غالب نے اس سے فارسی زبان اور پارسی مذہب کے متعلق فیض اٹھانے کا تذکرہ بڑی محبت اور گرم جوشی سے کیا ہے غالب کا ذاتی مطالعہ بھی وسیع معلوم ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس وقت مطالعہ میں مذہب، اخلاق، تصوف طب، ہیئت، منطق اور قصص وغیرہ کی وہی کتابیں ہوسکتی تھیں جو عرب ایران اور ہندوستان میں پانچ چھ سو برس سے رائج تھیں یہ جو اکثر آج کے محققانہ معیار سے غالب کو کم پڑھا لکھا آدمی ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ اس وقت بالکل معمولی نظر آنے لگتی ہے جب ہم

غالب کو مولانا فضل خیرآبادی، مفتی صدرالدین آزردہ حکیم احسن اللہ خاں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ حکیم مومن خاں مومن اور صہبائی وغیرہ کی صحبتوں میں دیکھتے ہیں یہی اس عہد کے بڑے عالم اور دانشور تھے غالب ان سے بہتر نہ سہی ان کے ہم محفل اور باعزت دوست ضرور تھے۔

آگرہ کی آزاد زندگی میں پہلی رکاوٹ ان کی شادی سے پڑی جو ایک تعلیم یافتہ، شریف اور متمول گھرانے میں تیرہ سال کی عمر میں یعنی ۱۸۱۰ء میں ہوگئی غالب کو شعر و شاعری سے دلچسپی تو آگرہ ہی میں شروع ہو چکی تھی لیکن اب وہ دہلی چلے آئے جو اپنی مٹتی ہوئی بہار دکھا رہی تھی وہاں عالموں کا مجمع تھا سخن فہموں اور شاعروں کی بھیڑ تھی اور تباہی و بربادی کے باوجود ایک عظمت تھی جو قدیم جاگیردارانہ تصور حیات اور امیرانہ کلچر کو اپنے دامن میں پناہ دئے ہوئے پڑی تھی ہر نظام اپنے زوال کے زمانے میں زبردست تضاد کا شکار ہو جاتا ہے حقیقت اور ...خیال، ماضی اور حال، وضعداری اور اصلیت میں جنگ جاری رہتی ہے دہلی کا مرکز صدیوں سے جاگیردارانہ تمدن کا گہوارہ رہ چکا تھا اس نے بہت سے انقلابات دیکھے تھے لیکن ہر انقلاب کسی نہ کسی شکل میں اسے جاگیرداری اور شاہی عمل کے اندر ہی رکھتا تھا طبقوں کی حالت میں کوئی خاص فرق نہیں پیدا ہوتا تھا اٹھارھویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی میں البتہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی بڑھتی ہوئی قوت نے اس نظام کی بنیادیں بدلنا شروع کر دی تھیں ہندوستان کی دیہی معیشت اور صنعت کا خاتمہ ہو رہا تھا کچا مال باہر جاتا تھا دولت باہر جا رہی تھی افلاس بڑھ رہا تھا لیکن اس کے واضح اثرات بنگال اور بہار تک موجود تھے مغل حکومت کے اندرونی نظام میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں ہو رہی تھی جو تصور زندگی کو بدل دیتی جو تبدیلیاں بھی ہو رہی تھیں وہ زوال اور انحطاط ہی کی

داخلی کیفیتیں پیدا کرتی تھیں اور تاریخی شعور نہ ہونے کی وجہ سے ان تبدیلیوں کی واضح تصویر نگاہوں کے سامنے نہ آتی تھی یہاں تک کہ غدر ہوگیا اور اس میں بھی ہندوستان کے کمزور جاگیردارانہ نظام کو شکست ہوئی ۔

اس درمیان میں غالب نے دنیا کے بڑے تجربے حاصل کر لئے تھے چچا کی جاگیر کے صلہ میں انہیں جو پنشن ملتی تھی اس کے سلسلہ میں انہیں کلکتہ جانا پڑا اس وقت اس کی عمر تقریباً تیس سال کی تھی یہ سفر کئی حیثیتوں سے غالب کی ذہنی تشکیل میں ایک اہم جگہ رکھتا ہے اول تو پنشن کا یعنی روزی اور بے فکری سے زندگی گزارنے ہی کا معاملہ تھا جس نے تقریباً ساری عمر ایک عجیب طرح کی امید وبیم کی دنیا میں رکھا غالب کے فارسی اردو خطوط اسی کشمکش سے بھرے پڑے ہیں جو اس پنشن کے قضیہ کے سلسلہ میں رونما ہوئی ۔ انگریزوں سے ان کی تھوڑی بہت ملاقات یوں بھی تھی لیکن اس مقدمہ کے تعلق سے انگریزی عدالتوں کے ساتھ انگریزی طرز حکومت کا اندازہ بھی غالب کو ہوا لکھنو، بنارس اور دوسرے مقامات اور حالات سے غالب کی واقفیت بڑھی اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں بنگال میں نشاۃ ثانیہ کی پھوٹتی ہوئی کرنیں نئی زندگی کے ہلکے ہلکے ابھرتے ہوئے نقوش دیکھنے کا موقعہ مل گیا اس بات کو نہ بھولنا چاہئے کہ غالب سر سے پاؤں تک جاگیردارانہ تصور تہذیب میں غرق تھے لیکن یہ تجربے ایک ایسے ذہن پر اپنا نقش چھوڑ رہے تھے جو چیزوں کی حقیقت جاننے، مشاہدے سے کام لینے اور نئے تصورات کا خیر مقدم کرنے میں بے باک تھا

کلکتہ نئے سرمایہ دارانہ تصورات کا منبع تھا غالب نے وہاں جو چہل پہل دیکھی جو عمارتیں دیکھیں جو حسین جمیل عورتیں دیکھیں جو ایک نیا بنتا ہوا تمدن دیکھا اس نے ان کا دل موہ لیا بنارس میں مناظر فطرت اور حسن

انسان نے دل کے جوان حسن پرست دل پر گہرا اثر ڈالا تھا کلکتہ نے "تو وہ ترتم کش" بن کر وہ خلش پیدا کر دی کہ بعد میں بھی جب کلکتہ کا ذکر آتا تھا تو انہیں وہاں کے "سبزہ زارہائے معطر" اور "نازنین بتاں خود آرا" یاد آتے اور سینے پہ تیر لگتا تھا۔

غالب نے اس کلکتہ کو دیکھا جس میں انگریزی سرمایہ داری اپنے قدم جما رہی تھی اور اس بنگال کو نہ دیکھ سکے جس میں اس کے خلاف طوفان اٹھ رہے تھے لیکن انہوں نے جو کچھ دیکھا وہ رائگاں نہیں گیا مولانا ابوالکلام آزاد نے غالب کے قیام کلکتہ کو ان کی زندگی کا بڑا اہم موڑ قرار دیا ہے اور اس کا اثر یہ ہوا کہ گو غالب بنیادی طور پر بدل نہ سکے لیکن کلکتہ سے وہ ایسے خیالات اور تصورات ضرور لائے جوان کے دہلی کے حریفوں اور ہم عصروں کے "سرحد ادراک" سے بھی باہر تھے کوئی قطعی ثبوت تو نہیں دیا جا سکتا لیکن غالب کے اردو خطوط میں فورٹ ولیم کالج کی اردو نثر کی سادگی دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ غالب نے کلکتہ کے دو سالہ قیام میں اس جدید نثر کا مطالعہ کیا اور اس سے فائدہ اٹھایا جس کے حسن اور اثر سے اردو کے نثر نگار اس وقت ناواقف تھے۔

کلکتہ میں غالب نے جو چیزیں دیکھی تھیں ان کا اثر بہت بعد تک رہا بیس سال بعد جب سرسید نے ابوالفضل کی مشہور کتاب آئین اکبری کی کی تصحیح کی اور غالب سے اس پہ تقریظ لکھنے کی فرمائش کی تو غالب نے ایک ایسی نظم لکھ کر سرسید کے پاس بھیج دی جس کی ان سے توقع نہیں نہیں کی جا سکتی تھی آئین اکبری مغل جاہ وجلال حکومت وتمکنت کا منشور تھا اور مغلوں نے اس کے مطابق خوب حکومت کی لیکن انیسویں صدی کے وسط میں دنیا بدل چکی تھی غالب ایک نئے نظام حکومت اور طرز سلطنت سے کسی حد تک واقف ہو چکے تھے سائنس کی حیرت زائیوں اور برکتوں

کا اندازہ کر چکے تھے اس لئے غالب کا نیا شعور جو جاگیر دارانہ ہونے کے باوجود بدل رہا تھا دونوں عہدوں کا تقابل کرنے لگا غالب کی عظمت اس میں ہے کہ انہوں نے ترقی کی علامتوں کو اور سائنس کے امکانات کو اپنے دائرۂ تخیل میں جگہ دی غالب نے آئین اکبری کے مقابلہ میں اس نظام کو سراہا جو سائنس کی ان برکتوں سے زندگی کو مالا مال کر سکتا تھا اس میں شک نہیں کہ غالب اس استحصال اور اقتصادی تاراجی سے بے خبر تھے جو ان برکتوں کے پردے میں چھپی بیٹھی تھی اس لئے ان کا شعور ایک ناقص سی تصویر بنانے میں کامیاب ہوتا ہے بہر حال جب غالب نے سب سے زیادہ ترقی یافتہ جاگیر دارانہ دستور حکومت کا ضابطہ اس سے کہا تو اس حقیقت کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے ؎

گر ز آئین می رود با ما سخن — چشم بکشا و اندریں دیر کہن
صاحبان انگلستاں را نگر — شیوہ و انداز اینان را نگر
او بہ لندن کاندراں رخشندہ باغ — شہر از وش گشتہ روشن بے چراغ
پیش ایں آئین کہ دارد روزگار — گشتہ آئین دگر تقویم پار

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ جب نئی زندگی سے خوشہ چینی کا موقع مل رہا ہو تو پھر کوئی اس خرمن (آئین اکبری) سے خوشہ چینی کیوں کرے ہاں ابوالفضل کی طرز تحریر خوب ہے لیکن ؎

ہر خوشے را خوشترے ہم بودہ است — گر سرے ہست افسرے ہم بودہ است
مبداء فیاض را مشمر بخیل — نور میریزد ز رطب بازاں نخیل!
مردہ پروردن مبارک کار نیست — خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

غالب اس سلسلہ میں مردہ پرستی پر بھی چوٹ کرتے ہیں اور مستقبل کی طرف پر امید ہیں کیونکہ زندگی کے سوتے کبھی خشک نہیں ہوتے۔

غالب کا دور تاریخ ہند میں ایک عبوری دور کی حیثیت رکھتا تھا جس کے پیچ و خم کا سمجھنا آسان نہیں ہوتا اس میں ایسی گتھیاں پڑتی ہیں جنہیں صرف

منتقبل محسوس کر سکتا ہے لیکن تغیر کا عکس دیکھنا اور نئے تجربات کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار رہنا ظاہر کرتا ہے کہ غالب کے لئے زندگی کوئی بنی بنائی مختتم اور مکمل حقیقت نہیں ہے ہر دور اپنے لئے راستہ تلاش کر لیتا ہے فطرت بخیل نہیں فیاض ہے زمانہ بہتر سے بہتر بنتا رہے گا۔

کلکتہ کا سفر پنشن حاصل کرنے کی حیثیت سے مایوسی اور ناکامی کا سفر تھا لیکن نئے تجربے اور نئے شعور کی دولت اکٹھا کرنے کے لحاظ سے بہت اہم نکلا اسی سفر نے انہیں اس نظام کی بربادی کا یقین دلایا جو بہت دنوں سے انحطاط اور تباہی کی طرف نہایت سرعت کے ساتھ چلا جا رہا تھا لیکن اصل چیز جو غالب کے شعور کو پرکھنے کی کسوٹی بن سکتی ہے ۱۸۵۷ء کا غدر ہے کیونکہ غدر نے ہندوستان کو قدیم اور جدید میں تقسیم کر دیا ایک طاقت کی جگہ دوسری طاقت کو لا بٹھایا جو نئے تصورات زندگی اور نئے معاشی نظام کی علمبردار تھی ۔

اپنے خطوط میں غالب نے غدر کا تذکرہ کثرت سے کیا ہے۔ یہی نہیں ایک مختصر سی کتاب جو روزنامچے کی حیثیت رکھتی ہے دوران غدر ہی میں دستنبو کے نام سے لکھی یہ کتاب ایک ذاتی یادداشت ہونے اور تاثرات سے لبریز ہونے کے باوجود بہت کچھ نہیں بتاتی۔ غالب کے خطوط اور دستنبو کے مطالعہ سے اگر غالب کے رجحان کا اندازہ لگایا جائے تو واضح ہوگا کہ غدر کے متعلق غالب کوئی گہری سیاسی رائے نہیں رکھتے تھے اس کے علاوہ وہ پہلے ہی اس نظام کی تباہی کا اتنا احساس رکھتے تھے کہ جب حکومت بدلی تو انہیں حیرت نہ ہوئی بلکہ ان کے لئے یہ کوئی ایسی بات ہوئی جس کا انہیں پہلے سے یقین تھا۔ غالب کا ادراک غدر کے معاملہ میں ایک حقیقت نگر کا ادراک تھا جو تصور پرست ہونے کے باوجود حالات کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا بعض منطقی نگاہ رکھنے والوں کو یہ بات تضاد کی حامل نظر آئے گی لیکن تھوڑے سے

غور سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ غالب کا خلوص اور نظریہ فن تھا جو انہیں عقائد میں عینیت پسند اور صوفی بنانے کے باوجود حقیقت پسندی کی طرف مائل کرتا تھا ان کے یہاں شعر اس طرح ڈھلتے تھے ؎

بلبلم از گداز دل   در جگر آتشی چوں سیل
غالب اگر دم سخن رہ   بہ ضمیر من بری

دستنبو اور مہر نیمروز کے دیکھنے کے بعد یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ غالب کے پیش نظر کوئی فلسفۂ تاریخ بھی تھا یا نہیں اگر اس کا اندازہ ہو سکے تو غالب کے شعور کا بھی اندازہ لگایا جا سکے گا کیونکہ ایک شخص کا تاریخی شعور ہی زندگی اور اس کے مظاہر کے متعلق اس کا رویہ متعین کرتا ہے۔ "مہر نیمروز" آغاز آفرینش سے لے کر ہمایوں کے وقت تک کی مختصر تاریخ ہے یہ اس مجوزہ پرتوستان کا پہلا حصہ ہے جس میں تیموری بادشاہوں کی تاریخ بہادر شاہ ظفر تک لکھنے کا کام غالب کے سپرد ہوا تھا غالب اس کا پہلا حصہ ہی لکھ سکے کہ دنیا بدل گئی اور دوسرا حصہ "ماہ نیم ماہ" وجود ہی میں نہ آیا۔ مہر نیمروز ایک تحقیقی کتاب کی حیثیت سے اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ تقریباً سو صفحوں میں ہزاروں سال کی تاریخ لکھنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ دستنبو اور مہر نیمروز کی بنیاد پر غالب کو مؤرخ نہیں کہا جا سکتا تاہم ان کی واقفیت، وسعت مطالعہ اور نکتہ رسی کا پتہ ان سے ضرور چلتا ہے۔ مہر نیمروز کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ زندگی کے تسلسل کے قائل ہیں یہاں تک کہ وہ قیامت کے بعد نئے آدم کے ظہور پر عقیدہ بھی رکھتے ہیں اور حضرت علی رض کا ایک قول پیش کر کے لکھتے ہیں کہ دنیا یونہی چلتی رہے گی آدم کے بعد آدم آتے رہیں گے یہاں سے غالب نے فلسفۂ وحدت الوجود کا سہارا لے کر حقیقت کا وہی تصور پیش کیا جس میں مادہ اور روح کا امتزاج ہو جاتا ہے اس میں شک نہیں رہ جاتا کہ غالب کے دل میں وحدت الوجود کا عقیدہ گھر کئے ہوئے تھا اور کائنات کی بہار اور اس کے تغیرات کو وہ فارسی

کی روشنی میں دیکھتے تھے غالب نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ اس کتاب میں وہ لکھ رہا ہوں جو مجھے مختلف ذرائع سے ملا ہے کہیں کہیں اپنی "دید و دریافت" سے بھی کام لیا ہے یہاں غالب کا وسیع مطالعہ کام آیا ہے انہوں نے تاریخی تحقیق کا فرض انجام نہیں دیا ہے لیکن آغاز آفرینش کے ان دو عقیدوں کو بڑی دلکشی سے پیش کیا ہے جس سے ہندوستان کے علماء واقف تھے پہلے ہندو مذہب کے نقطۂ نظر سے اور پھر اسلام کے مطابق دنیا اور انسان کی پیدائش ابتدا اور ارتقاء کا ذکر کیا ہے آگے چل کر پارسیوں کے خیالات بھی پیش کئے ہیں غالب نے کہیں کہیں اپنے مآخذ کے حوالے بھی دیئے ہیں لیکن یہ بات واضح ہے کہ غالب نے ابن خلدون کے اس خیال کو سامنے نہیں رکھا کہ تاریخ کا موضوع انسان کی معاشرتی زندگی ہے حالانکہ دستنبو اور خطوط میں معاشرتی پس منظر کہیں کہیں ابھر آیا ہے۔

غالب کی عملی زندگی محدود تھی انفرادی اور ذاتی تجربات کا لازوال خزانہ ان کے پاس تھا لیکن اسے اجتماعی زندگی کے ڈھانچے میں بٹھانا آسان نہ تھا لامحالہ انہوں نے اسی مواد پر عمارت کھڑی کی جو انہیں ذہنی طور پر ورثہ میں ملا تھا بس انہوں نے یہ کیا کہ بدلتے ہوئے حالات اور ذاتی تجربات سے مدد لے کر اس عمارت میں چند ایسے گوشے بھی تعمیر کر دیئے جو ان کے پیش رؤوں سے نہ تو ممکن تھے نہ جن کے نقشے ذہن میں تعمیر ہوئے تھے ان ذاتی تجربات کے علاوہ غالب کا وسیع مطالعہ تھا جو ان کے ذہن کے لئے غذا فراہم کرتا تھا۔ اور وہ قدیم علوم کے ذریعے سے نئے تجربوں کے سمجھنے کی کوشش میں انہیں ایک نیا رنگ دینے میں کامیاب ہو جاتے تھے اسی چیز کو ان کے نقادوں نے جدت تازگی، اور طرفگیٔ مضامین سے تعبیر کیا ہے

غالب صوفی مشرب ہونے اور وحدت الوجود میں عقیدہ رکھنے کے باوجود تصوف کے سارے اصولوں کو عملی صوفیوں کی طرح نہیں مانتے تھے وحدت الوجود

کی طرف ان کا میلان کچھ تو مسائل کائنات کے سمجھنے کے سلسلے میں پیدا ہوا تھا اور کچھ مذہب کی ان ظاہر داریوں سے بچ نکلنے کا ایک بہانہ تھا جو ان کی آزادی پسند طبیعت پر بار تھیں غالب جس سماج کے فرد تھے اس سماج میں باغیانہ میلان اور آزادی کا جذبہ داد کے طور پر تصوف ہی میں نمایاں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ غالب کو کوئی واضح خارجی سہارا آزادی کے لئے حاصل نہ تھا کوئی علمی یا ادبی تحریک جس سے وابستہ ہو کر وہ اپنے طبقے کے ماحول میں گھرے ہوئے ہونے کے باوجود آگے بڑھ جاتے موجود نہ تھی وہ زمانہ کچھ دن بعد آیا جب سرسید اور حالی اور آزاد نے وقت کے تقاضوں کو سمجھا اور زندگی کے نئے مطالبات کی روشنی میں ایک ادبی تحریک کی بنیاد ڈال دی غالب کی ذہنی ترقی کا دور غدر تک ختم ہو چکا تھا گو وہ اس کے بعد بھی بارہ سال تک زندہ رہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ غدر کے بعد غالب کی شاعری تقریباً ختم ہو چکی تھی۔

غالب نے عملی زندگی کی جگہ فکری زندگی میں آسودگی حاصل کرنے کی کوشش کی اور اسی کے اندر انسان اور کائنات، فنا اور بقا، خوشی اور غم، عشق اور آلام روزگار، مقصد حیات اور جستجوئے مسرت آرزوئے زیست اور تمنائے مرگ، کثافت اور لطافت، روایت اور بغاوت، جبر و اختیار، عبادت اور ریاکاری غرضیکہ ہر ایسے مسئلہ پر اظہار کیا جو ایک متجسس ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔

غالب کی شاعری کا وہ حصہ جو ان کی عظمت کا حامل ہے زیادہ تر ان کی فارسی اردو غزلوں میں ملتا ہے اچھا ہو یا برا لیکن غزل کی شاعری داخلی اور شخصی حیثیت اختیار کر لیتی ہے داخلی کیفیات بھی خارجی ماحول اور اثرات کا نتیجہ ہوتی ہیں لیکن ان میں اتنی عمومیت پیدا کر دی جاتی ہے کہ داخلیت جن خارجی حقائق کا نتیجہ ہوتی ہے ان کا پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے اس میں شک نہیں کہ

غزل کے اشعار میں پیش کئے جانے والے خیالات بھی حقیقتوں کا عکس ہوتے ہیں لیکن اس مخصوص حقیقت کو ڈھونڈ نکالنا بعض اوقات تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے جو اس جذبہ اور خیال کی محرک رہی ہوگی اس لئے غالب کے بہترین خیالات کی بنیادوں کا یقینی علم اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کوئی واضح اشارہ اس کے متعلق نہ پایا جائے۔ داخلیت اور اشاریت سے حقائق کی شکل بدلی جاتی ہے اور یہ چیزیں شاعر کے نظریہ فن کا جزو بن کر اصل خیال کو انداز بیان کے پردوں میں چھپا دیتی ہیں غالب نے تو اسے کھول کر کہہ بھی دیا ہے

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
مطلب ہے ناز و غمزہ وبے گفتگو میں کام چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

غالب نے نظم و نثر میں جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی معلومات محض کتابی نہیں تھی بلکہ اپنی ذہانت اور ذاتی تجربہ کی وجہ سے وہ قدیم تصورات سے آگے جانا چاہتے تھے نئی باتوں کو سمجھنا اور نئی انجمنوں سے دلچسپی لینا چاہتے تھے آخری عمر میں دہلی سوسائٹی قائم ہوئی تو اپنی ضعیفی اور معذوری کے باوجود انہوں نے اس سے دلچسپی لی اور کوشش کی کہ لاہور کی انجمنوں کے متعلق معلومات فراہم کریں وہ اخبارات پڑھتے اور دنیا کے حالات سے باخبر رہنا چاہتے تھے اسی وجہ سے وہ اس بات سے واقف تھے کہ اگر بے عملی کی زندگی ختم ہو جائے تو کچھ نہ کچھ ہو رہے گا دنیا امکانات سے بھری ہوئی ہے ؎

ہمت اگر بال کشائی کند صعوہ تواند کہ ہمائی کند
نیر توفیق اگر بر دمد لالہ عجب نیست اگر اخگر دمد

لیکن وہ جن زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے وہ انہیں وقت کی حدوں سے باہر نکلنے سے روکتی تھیں اس وجہ سے ان کا احساس غم شدید ہے اور انفرادی صلاحیتیں رکھنے کے باوجود وہ مستقبل کی طرف کوئی اشارہ کرنے سے معذور ہیں

غالب شاہی اور جاگیردارانہ نظام کو اپنی نگاہوں کے سامنے مٹتے ہوئے دیکھ کر طرح طرح سے متاثر ضرور ہوتے ہیں لیکن نہ تو اس کے اسباب کا اندازہ لگا سکتے تھے اور نہ نتائج کا۔ ان کا ذہن فضا کی ساری مایوسی اور بیدل کو اپنے اندر جذب کر رہا تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اس بیدل سے باہر نکلنے کا بھی کوئی راستہ ہے یا نہیں انسان کی عظمت اور انسان سے محبت زندگی کے تسلسل اور زندگی سے محبت کے جذبات نے اس زوال پذیر سماج نے انہیں بڑی الجھنوں میں مبتلا کر دیا اور ان کی شاعری کا بڑا حصہ اس غم کا تجزیہ کرنے اسے بہلانے اور اس کی شاعرانہ توجیہیں پیش کرنے میں صرف ہو گیا ورنہ وہ جانتے تھے کہ منزل یہی نہیں ہے ؎

درسلوک از ہر چہ پیش آمد گذشتن داشتم　　کعبہ دیدم نقش پائے رہرواں نامیدمش

اور اس آسودگی خیال کی منزل تک پہنچنے کے لئے مسلسل راستہ تلاش کرتے رہتے تھے ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک رہرو کے ساتھ　　پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

جس فلسفہ حیات اور نظام اخلاق سے وہ واقف تھے اس میں یہ جرأت بھی بغاوت کے مترادف تھی کہ کوئی شخص بندھے ٹکے راستوں سے ناآسودہ ہو کر اپنے لئے نیا مسلک تلاش کرے اور عقل سے کام لے کر اچھائی برائی کا فیصلہ کرے اگر غالب نے بھی آنکھیں بند کر کے وہی راہ اختیار کر لی ہوتی جو روایتی شاعری پیش کرتی ہے تو انہیں کشمکش کا سامنا کرنا پڑتا لیکن ان کے اندر جو انفرادی کرید تھی جو کبھی انہیں تشکیک، مزاج اور لاشیئت کے قریب پہنچا دیتی تھی وہ انہیں روایتوں کے توڑنے پر اکساتی رہتی تھی یہاں تک کہ رسم پرستوں اور روایت دوستوں کی دنیا میں وہ اپنے کو تنہا محسوس کرنے لگتے تھے اور وہ لوگ جو ان کے گردوپیش تھے ان کے دل کی واردات کو سمجھنے کے ناقابل نظر آنے لگتے تھے اور ان کے لئے زبان کھولتے اور ان سے ہمدردی

کرنے کو بھی جی نہ چاہتا تھا ؎

چہ ازیں فرقہ را دانا شناس　　　　خویشتن را ہلاک یاس کنم

غالب اخلاقی معاملات میں اپنے طبقہ کی پوری نمائندگی کرتے ہیں لیکن ان کی تخلیقی ذکاوت اور فطری شگفتگی اخلاقی قدروں میں عمومی رنگ پیدا کردیتی ہیں پھر ان سب پر بالا ہیں ان کی دلسوزی مدا داری، بے تکلفی اور اور انسان دوستی۔

غالب عالم خیال کے بسنے والے تھے اور حکومت کو انجمن بنانے کی صلاحیت رکھتے تھے لیکن انہوں نے کاروبار زندگی کی طرف سے اپنی آنکھیں بند نہیں رکھی تھیں غم روزگار کی اس حقیقت سے نا قفیت تھے جو غم عشق کو دبا کے رکھ دیتا وہ تجربہ گاہ عالم کو نظر انداز نہیں کرتے تھے ؎

اہل بینش کو ہے طوفان حوادث مکتب　　　لطمۂ موج کم از سیلی استاد نہیں

لیکن دشواری یہ تھی کہ آگے کی راہ غالب کے لئے روشن نہ تھی اور خیالوں ہی میں ساری راہیں طے کرنا پڑتی تھیں اس سعیٔ بے حاصل کا احساس کبھی انہیں شدت کے ساتھ تھا ؎

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہ دیدہ تصویر نہیں

غالب کا مطالعہ جتنا کیا جائے یہ حقیقت راسخ ہوتی جاتی ہے کہ وہ اپنے دور سے غیر آسودہ تھے اس کی تباہی اور بربادی کو یقینی جانتے تھے لیکن تاریخی اور معاشی شعور کے فقدان کی وجہ سے نہ تو وہ اس انحطاط کے اسباب سے واقف تھے اور نہ آگے کی راہ سے اس لئے ماضی کا ذکر کبھی کبھی انہیں تسکین دیتا تھا وہ غزل جس کا مطلع ہے ؎

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

نہ پوری ہونے والی آرزوؤں کی آخری ہچکی اور بیتے دنوں کی آخری یاد معلوم ہوتی ہے جب مسلسل غم ہی غم ہو تو بجلی سے چراغ نہیں جلتے گھر میں آگ لگ جاتی ہے اور انسان "نومیدیٔ جاوید" کا شکار ہو جاتا ہے یہی سبب ہے کہ غیر معمولی جد و جہد اور ذہنی کشمکش کے باوجود غالب کو یہ کہنا پڑا کہ

صد قیامت در نورد دیں نفس خوں گشتہ است
من ز خامی در فشار بیم فردایم ہنوز

ـــ شد روز رستخیز و بہ یاد شب وصال
محو ہماں بہ لذت بیم سحر ہنوز

بہر حال غالب کی شاعری اپنے سارے غم و اندوہ کے باوجود ہمارا قیمتی تہذیبی سرمایہ ہے جس میں غالب کی شخصیت کی رعنائی نے اور زندگی سے اس بھرپور آلام روزگار سے ٹکر لینے کی مسلسل کوشش نے توانائی پیدا کر دی ہے گویہ شاعری ایک تہذیب کے عالم نزع میں پیدا ہوئی لیکن اس ولولے اور حوصلے سے حسین اور جاندار بن گئی ہے

بیا کہ قاعدہ آسماں بگردانیم — قضا بہ گردش رطل گراں بگردانیم
بگوشہ بنشینیم و در فراز کنیم — بہ کوچہ بر سرہ پاسباں بگردانیم
اگر ز شحنہ بود گیر و دار نندیشیم — وگر ز شاہ رسد ارمغاں بگردانیم
اگر کلیم شود ہم زباں سخن نکنیم — دگر خلیل شود میہماں بگردانیم
گل افگنیم و گلابے بہ رہگذر پاشیم — مے آوریم و قدح درمیاں بگردانیم
ز جوش سینہ سحر را نفس فرو بندیم — بلائے گرمی روز از جہاں بگردانیم
بہ جنگ باج ستاناں شاخساری را — تہی سبد ز در گلستاں بگردانیم
بہ صلح بال فشاناں صبحگاہی را — ز شاخسار سوئے آشیاں بگردانیم

سب کے ساتھ مل کر کائنات بدل دینے کی یہ خواہش زندگی کی یہ تڑپ اور یہ حسن یہ خوبصورت ارادے اور یہ منصفانہ عزائم کسی کو زندۂ جاوید بنا لینے کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ [غالب کا تفکر، احتشام حسین]

فارسی سبک پر ایک اجمالی نظر

فارسی زبان دنیا کی اہم زبانوں میں شمار ہوتی ہے یہ زبان ہند و ایرانی اصل کی قدیم زبان کی ایک شاخ ہے اس زبان میں جو ادب ملتا ہے اس کی تاریخ کم از کم ڈھائی ہزار سال تک پیچھے جاتی ہے۔

قدیم یونانی تاریخوں، یہودیوں کی مذہبی کتابوں، اوستا کی داستانوں اور عربی تاریخوں کی مدد سے ایران میں مادیوں اور ہخامنشیوں کے عہد میں ادب، اخلاقی قوانین اور احکام پر کتابیں موجود تھیں لیکن ہخامنشی کتبوں کے سوا اس عہد کی اور کوئی چیز ہم تک نہیں پہنچی ہے۔

ایران قدیم میں دو زبانیں رائج تھیں ایک اوستائی زبان جس میں اوستا لکھی گئی ہے دوسری زبان "قدیم فارسی" یا پارسی باستان" یہی زبان ہخامنشی دور کی عام زبان تھی اور اس دور کے سارے کتبے اسی زبان میں لکھے گئے ہیں پارسی باستان اور اوستا کے الفاظ بالکل سیدھے سادے بامعنی اور بے تکلف ہیں صرف اوستا میں جیسی کہ مذہبی کتابوں کی عام طرز ہے تکرارات زیادہ آئے ہیں اوستائی ادب یا ادبیات مزدیسنا میں اوستا کے سوا اور بھی چیزیں دستیاب ہیں اور صدیاں گزر جانے کے باوجود نظم اور نثر کے تھوڑے بہت نمونے ابھی تک باقی چلے آرہے ہیں۔

پارسی باستان میں زبان کے ساتھ ساتھ بہت سی تبدیلیاں ہوئیں ان تبدیلیوں کی وجہ سے اس کی قواعد اور اس کے الفاظ کا تلفظ سادہ سے سادہ تر ہوتا گیا یہی زبان اشکانیوں اور ساسانیوں کے دور میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی اسی زبان کو پہلوی زبان کہا جاتا تھا اس زبان میں ادب پر بہت

سی کتابیں اور اشعار لکھے گئے تھے ساسانی کتبوں کے سوا ساسانی دور [illegible] سے لے کر ابتدائے اسلام تک پہلوی زبان کی سو کتابیں ہم تک پہنچی ہیں۔

ایران قدیم کے اشعار کا وزن حروف یا کا وزن ہوتا تھا اور تاریخ سے ایسا معلوم ہوتا تھا ______ رسمی جشنوں [illegible] پر سرود خواں بادشاہوں کے درباروں میں اپنے منظومے پڑھا کرتے تھے گویا اس زمانے میں منظوم کلام کا رواج ہو چکا تھا۔

آج کل کی فارسی زبان صرف اپنی ترکیب کے لحاظ سے پہلوی زبان سے قریب تر ہے اس میں الفاظ، قواعد اور تلفظ کی بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اس کی ابجد اس کے بہت سے الفاظ اور اس کے لکھنے کی طرز عربی زبان سے لی گئی ہے۔

پہلوی زبان کی جو تھوڑی بہت کتابیں باقی رہ گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلوی زبان کی نظم و نثر دونوں نہایت سادہ اور رواں تھے سادے سیدھے جملوں میں اپنا مطلب ادا کیا جاتا تھا اس میں تعقید، طول بیانی تفصیل، استعارے اور مجاز سے کام نہیں لیا جاتا تھا اور لیا بھی جاتا تھا تو بہت کم۔

ایران پر عربوں کے قبضہ کے دو سو سال بعد تیسری صدی ہجری کی ابتدا میں سیاسی بیداری کے ساتھ ساتھ ادبی بیداری بھی ایران میں شروع ہوئی فارسی زبان کے بہت سے بڑے بڑے شاعر ایسے شعر کہنے لگے جو عروض کے وزن کے مطابق تھے اور نثر میں کتابیں بھی لکھی ہیں عربوں کے قبضہ کے دوران میں بھی فارسی زبان ناپید نہیں ہونے پائی بلکہ ایران میں ہجائی وزن فارسی اشعار گائے جاتے رہے چنانچہ اسلامی تاریخ کی بہت سی کتابوں میں ایسی بہت سی روایتیں ملتی ہیں۔

بعد اسلام نظم و نثر کی زبان کو سامانیوں کے عہد میں وسعت حاصل

ہوئی پھر یہ زبان غزنویوں اور سلجوقیوں کے عہد میں اپنے اوج کمال پہنچی
اس دوران میں سینکڑوں بڑے بڑے شاعر، حکیم اور مصنف پیدا ہوئے

اگرچہ اس دوران میں فارسی ادبیات عربی الفاظ اور عربی اسلوب سے
بہت زیادہ متاثر ہوئی لیکن اس نے اصلی خصوصیتوں کو ہاتھ سے جانے نہیں
دیا اس زمانہ کی نظم اور نثر کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی اور روانی
ہے اس زمانہ کی تصانیف میں عبارات آرائی مضامین کی تکرار، طول طویل
جملے اور واقفیت سے مضامین بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔

ادبی موضوع عبارت تھے قصیدے سے بر قصیدے زیادہ تر بادشاہوں
امیروں اور بزرگوں کی مدح میں لکھے جاتے تھے اس کے سوا بیان حال، پند
و عبرت کے لیئے بھی اس سے کام لیا جاتا تھا ان قصیدوں میں تشبیب اور
تغزل دونوں ہوتے تھے اسی طرح علمی، اخلاقی، ناصحانہ، رزمیہ، داستانی
دینی اور تاریخی قطعات بھی لکھے جانے لگے شعر کے اصناف میں قصیدے
اور قطعات کے سوا غزلیں، رباعیاں، مثنویاں، اور مسمط بھی لکھے جانے
لگے اس دور کے شاعروں کا کلام رودکی سے لے کر عنصری، فرخی، منوچہری
دقیقی، فردوسی، ناصر خسرو، قطران، سنائی، انوری، معزی، خیام، خاقانی
ادیب صابر اور نظامی تک سب ایک ہی طرز کا تھا انہوں نے ایسے مطالب
کو جن کا ذکر اوپر آچکا ہے بڑے اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔

اس عہد میں نثر کی ابتدائی کتابیں بھی لکھی گئی تھیں جیسے ترجمہ تاریخ طبری
ابوریحان بیرونی کی التفہیم سب کتابیں نہائیت سادہ اور بے تکلف نثر
میں لکھی گئی ہیں اور حشو و زوائد، مکررات اور کنایوں سے پاک ہیں۔

سلجوقی دور کے آخر سے فارسی شاعری کے سبک میں تبدیلی شروع ہو
گئی اور عربی کے متعلق الفاظ، عربی ترکیبیں اور علمی اور مذہبی اصطلاحیں
نظم اور نثر میں آہستہ آہستہ بار پانے لگیں اور چھٹی صدی ہجری کے مشہور

شعرا جیسے انوری اور خاقانی کے اشعار میں اس کے آثار نمودار ہونے لگے
اس دور کے بعض شاعروں اور اس کے بعد تو اکثر شاعروں نے مغلق گوئی، فضل فروشی، قافیہ پیمائی اور نکتہ پردازی شروع کردی اور پڑھنے والے کو مبہوت کرنے کے سمجھے اور دقیق علمی مسائل نظم میں ٹھونسنے لگے۔

نثر میں مرکب اور مسلسل عبارتیں اور بڑے بڑے جملے لکھے جانے لگے بے جا مترادفات استعمال ہونے لگے عربی جملے سمجھے اور صنعتیں شروع ہو گئیں سعد وراوینی کا مرزبان نامہ، راوندی کی راحت الصدور، مقامات حمیدی اور تاریخ یمینی کا ترجمہ اور اس طرح کی کتابیں اس کی مثالیں ہیں اقسام شعر میں قصیدہ، غزل، قطعہ، مثنوی رباعی اور ترجیع بند لکھے جاتے تھے مدح وصف، بیان حال، اظہار عشق مرثیہ پند و نصیحت، دینی مطالب، علمی اور صوفیانہ مسائل، زبان کی قواعد اور عروض کے محاسن ان کے موضوع تھے

مغل اور تیموری دور میں جو عام تباہی اور قتل و غارتگری ہوئی اس میں شمالی ایران اور خاص کر خراسان کے علمی اور ادبی آثار فنا ہو گئے کتاب خانے ویران اور مدرسے برباد ہو گئے شاعر اور عالم یا تو قتل ہوئے یا اس ملک سے بھاگ گئے ایک عرصہ تک ادبیات میں خلل سا پڑ گیا اور چھٹی صدی ہجری کے برخلاف جس میں بہت سے شاعر پیدا ہوئے اس دور میں بہت کم شاعر پیدا ہوئے لیکن اس کے باوجود جب مغلوں اور تیموریوں نے ایرانی تمدن اختیار کر لیا اور قتل و غارتگری چھوڑی تو پھر بہت سے شاعر اور مصنف پیدا ہونے لگے اور خاص کر فن تاریخ پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں علم نجوم، نقاشی، خطاطی کو خاص طور پر تیموریوں کے دور میں ترقی حاصل ہوئی۔

مغلوں اور تیموریوں کے دور میں فارسی سبک بگڑنا شروع ہوا اور

خاص کر یہ بگاڑ نثر میں بہت زیادہ رونما ہوا تصنع اور تکلف زیادہ ہونے لگا طول طویل جملے، مغلق ترکیبیں، بھونڈے استعارے پر تکلف اور بیجا سجع عربی کی تقلید میں کثرت سے استعمال کئے جانے لگے عربی جملے داخل کئے جانے لگے جملہ معترضہ کی بھرمار ہوئی استعارے، تشبیہیں، ایہام۔ مبتدا اور خبر میں زیادہ سے زیادہ فصل، چھوٹی چھوٹی باتوں میں مبالغہ خواص کی مدح میں اغراق یہ سب اس دور کے سبک کی خصوصیات ہیں اس سبک کی مثالیں تاریخ وصاف اور تاریخ معجم سے لے کر تاریخ نادری درۂ نادرہ تک برابر ملتی چلی آتی ہیں لیکن اس کے ساتھ گنتی کے کچھ ایسے استاد بھی ملتے ہیں جنہوں نے نظم و نثر دونوں میں پچھلے سادہ سبک ہی کو اختیار کیا اور سعدی اور حافظ کی نظم و نثر میں " تاریخ جہانگشا اور طبقات ناصری کی انشاء میں نہایت پاکیزہ اشعار اور تحریریں لکھی ہیں۔ انہوں نے اپنے زمانے کے پر تصنع اور مبہم اسلوب کے خلاف گویا قلمی جہاد کیا ہے۔

اس دور میں غزل کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوئی اور دونوں طرزوں میں لکھی جاتی رہیں اس سے پہلے قصیدہ کو جو اول درجہ حاصل تھا وہ اس سے چھن گیا سعدی اور حافظ جیسے استادوں نے اس فن کو اوج کمال پر پہنچایا مدحیہ قصیدوں پر بھی یہی رنگ چڑھ گیا شاعر ممدوح یا معشوق کو حد سے زیادہ سراہنے لگے تملق چاپلوسی خوشامد اور نفس کی تحقیر میں حد سے زیادہ مبالغہ ہونے لگا صوفیانہ شاعری نے بھی زور پکڑا اور اس کے مکمل نمونے اسی دور نے پیش کئے اسی دور نے اس صنعت کے بہترین استاد جلال الدین رومی، حافظ اور جامی کو جنم دیا۔

مغل دور کے غیر فطری سبک کو صفویوں کے دور میں اور ترقی ہوئی عجیب و غریب ترکیبیں، نامانوس الفاظ، مسلسل صنعتیں، نکتہ گوئی مضمون

آفرینی پیچیدہ اور باریک معانی پیدا کرنے کا عام رواج ہوا خاص کر ہندوستان میں رہنے والے شاعروں نے اس طرز میں بہت زیادہ افراط سے کام لیا اور نتیجے کے طور پر تکلف اور مصنوعی سبک کی بنیاد ڈالی جسے بعضوں نے ہندی سبک کے نام سے کیا ہے لیکن اس افراط کے باوجود ہندی سبک میں بہت سی خوبیاں بھی ہیں اگر ایک طرف اس میں پیچیدہ مصنوعی اور مبالغہ آمیز مضامین دجیسے کہ ذیل کے شعر میں موجود ہیں تو دوسری طرف اس میں لطیف اور دلنواز مضامین بھی ملتے ہیں ایسے اشعار کے نمونے صائبؔ اور ان کے معاصرین کے ہاں ملتے ہیں مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ ہو جو اسی سبک کا نمونہ ہے ؎

شمع را بر سر نمی دانم ہوائے زلف کیست　　　　بوی گل می آید از دود پر پروانہ ام

کہتا ہے محبوب تنا گل اندام ہے کہ شمع کے سر میں صرف اس کی خواہش ہی اسے اتنا معطر بنا دیتی ہے کہ اس شمع کی آگ میں جلنے والے پروانے کے دھوئیں سے گلاب کی بو آتی ہے انصاف یہ ہے کہ اس شعر میں حد درجہ مضمون آفرینی باریک اندیشی اغراق اور مبالغہ سے کام لیا گیا ہے لیکن اس مبالغہ کے باوجود جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے ۔

اس سبک کے بڑے شاعروں کی لطافت اور ہنرمندی کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس قسم کے مضامین نہایت دقیق اور مشکل ہوتے ہیں اور یہ خصوصیت دنیا کی تمام ادبیات میں صرف ادبیاتِ ایران ہی کا مایۂ اعتبار ہے اور کسی قوم نے بھی اس نکتہ پردازی مضمون آفرینی اور دقیقہ سنجی کا ثبوت نہیں دیا۔

نثر میں تاریخی کتابوں کے سوا شیعہ مذہب سے متعلق بہت سی کتابیں صفوی دور میں لکھی گئیں اور یہ بالکل بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ صفویوں کے دور میں فارسی نظم و نثر سے علوم حکمت اور عرفان خارج کر دیئے گئے اور ان کی جگہ مرثیہ، مذہبی مسائل، فقہ، مناقب ائمہ اور شیعہ عقائد نے لے لی۔

زندیوں کی حکومت کی ابتدا کے بعد سے ایک نئی تحریک شروع ہوئی اور ہاتف، مشتاق، نشاط، صبا، سروش اور قاآنی جیسے شاعر پیدا ہوئے ان شاعروں نے قدما کی طرز کو پھر سے زندہ کیا اور اس طرح مغلوں اور صفویوں کے عہد کا سبک بتدریج غائب ہوتا گیا اور اس کی جگہ ایک سادہ تر اور فصیح تر سبک لینے لگا فارسی نثر میں بھی نشاط، قائم مقام، امیر اور ہدایت جیسے ادیب پیدا ہوئے ان ادیبوں نے قدیم نثر کو پھر زندہ کیا اور نثر میں حشو و زوائد، مترادفات، پیچ در پیچ جملے لکھنے کا رواج ترک دیا۔

مغلوں سے پہلے کے دوران میں ایران کی ادبی زندگی اور معیار سبک کا مرکز خراسان اور ایک حد تک آذربائیجان تھا اس کے بعد صوبہ فارس نے اہمیت حاصل کر لی صفوی دور کے بعد عراق نے

سبک کا مرکز قرار پایا۔

اس آخری دور میں قصیدہ، اور غزل دونوں ساتھ ساتھ ترقی کرتے رہے اور ایک کو دوسرے پر برتری حاصل نہیں ہوئی لیکن چونکہ متقدمین کے سبک کو میزان قرار دیا گیا تھا اسلئے فطری طور پر غزل کی بہ نسبت کسی قدر قصیدے پر توجہ دی جانے لگی۔

اس دور میں فن تاریخ اور سیر و سوانح کو بھی خاص ترقی ہوئی روضۃ الصفاء اور ناسخ التواریخ جیسی علم تاریخیں اور آتشکدہ اور مجمع الفصحا جیسے تذکرے لکھے گئے اسی طرح بہت سی مذہبی کتابیں بھی فارسی زبان میں لکھی گئیں۔

دور مشروطیت کیساتھ ہی سیاسی انقلابات نے ادبیات میں بنیادی تبدیلیاں کر دیں یعنی شعر، مضامین اور تصانیف میں اجتماعی مطالب اور مسائل پر زیادہ توجہ کی جانے لگی اس علمی طرز اور علمی روش نے خود الفاظ کو روشن اور اجاگر کر دیا اور منشیانہ عبارت پردازی اور صنائع لفظی نے سادہ اور فصیح عبارتوں اور جملوں کے لئے اپنی جگہ خالی کر دی۔

یہاں یہ یاد رہے کہ ادبیات ایران کی پوری تاریخ میں صرف عربی زبان ہی دینی اور علمی زبان رہی ہے جس سے بہت سی ایسی اصطلاحیں اور ترکیبیں جن میں عربی سے احتراز کیا جا سکتا تھا عام طور پہ رائج ہو گئیں اس سے فارسی زبان کی موزونی متاثر ہونے لگی اس کے سوا فنی اصطلاحیں جو عربی سے لی گئی تھیں مصر اور ترکی کے رستے ہماری زبان میں داخل ہوتے لگیں جیسے بلدیہ، عدلیہ، نظمیہ۔ ارکان حرب اور ایسی ہی بہت سی ترکیبیں جیسے سوئی اندام اور نقطہ نظر وغیرہ فارسی میں نمودار ہونے لگیں ان دونوں نے مل کر فارسی زبان کے مخصوص آہنگ میں بگاڑ پیدا کر دیا دوسری طرف نئے نئے علوم و فنون کے رواج کی وجہ سے نئی اصطلاحیں گھڑنے کی ضرورت پیش آئی ان اسباب کی بنا پر آج سے کوئی پچاس سال پہلے لکھنے والوں میں سے ایک نئی ادبی تحریک شروع ہوئی ان لوگوں نے فارسی زبان سے بے ضرورت الفاظ، آرائشی اور بیکار جملے اور بھرتی کی فضول ترکیبوں کو نکالنا شروع کیا اور ان کی جگہ صحیح اور فصیح فارسی الفاظ استعمال کرنے لگے اس ادبی تحریک نے آخر کار فرہنگستان ایران کی تاسیس کی صورت اختیار کر لی (تاریخ ادبیات ایران رضا شفق)

مطالعۂ ادبیاتِ ایران

(حصۂ نثر)

مؤلفہ

سید خورشید حسین بخاری

فاضلِ فارسی۔ ایم۔ اے۔ ایم۔ او۔ ایل

بنظرِ ثانی

ڈاکٹر رانا محمد بہاء الحق اشک

ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی

ناشر

ملک نذیر احمد پروپرائٹر تاج بک ڈپو اردو بازار لاہور

بار اوّل .... سنہ ۱۹۶۶ء

تعداد .... ایک ہزار

قیمت

حصّہ نثر	(۱) نیوز پرنٹ	......	پانچ روپے
	(۲) سفید کاغذ		چھ روپے
حصّہ نظم	(۱) نیوز پرنٹ	......	پانچ روپے
	(۲) سفید کاغذ	......	چھ روپے
مکمل ہر دو حصّہ	(۱) نیوز پرنٹ	......	دس روپے
	(۲) سفید کاغذ	......	بارہ روپے

مطبع .... ویسٹرن پرنٹرز لاہور

ناشر .... ملک نذیر احمد

یہ کتاب

یہ کتاب ادبیات ایران کے حصہ نثر کے مطالعہ کے سلسلے میں لکھی گئی ہے اسی لئے سامانی دور سے لے کر قاچاری دور تک کی اہم نثری کتب کے بارے میں جو ممکن مواد مہیا ہو سکتا تھا۔ اس میں یکجا کر دیا گیا ہے اس کتاب کی ترتیب میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ جہاں کسی مخصوص کتاب پر تنقید کی جائے اور اس کے حسن و قبح سے بحث ہو، وہاں (اگر ممکن ہو تو) مصنف کے حالات زندگی کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔ اور یوں ہر کتاب کے بارے میں ایک مختصر سا مکمل و مبسوط مقالہ مرتب ہو گیا ہے۔ مزید یہ کوشش کی گئی ہے کہ جوں جوں قاری اس کتاب کا مطالعہ کرتا جائے ہر دور کی نثر کی فنی خصوصیات بھی اجاگر ہوتی جائیں۔

اس سلسلے میں ادبیاتِ ایران کے چوٹی کے نقادوں کی ادبی و تنقیدی تصنیفات اور نقد و نظر، کتب کے قلمی و مطبوعہ نسخوں اور ان کے آغاز میں دئے گئے تبصروں، تنقیدوں اور رایوں سے استفادہ کیا گیا ہے اور ان میں سے مناسب موزوں اور مفید مطلب اقتباسات اس کتاب میں شامل کئے گئے ہیں۔ تاہم مزید واقفیت کے لئے ادب کے طلباء ان نقادوں کی تصنیفات کا مطالعہ کر سکتے ہیں جن سے اس کتاب کے سلسلے میں مدد لی گئی ہے

اگرچہ یہ کتاب بنیادی طور پر ایم۔ اے (فارسی) کے طلباء کے لئے مرتب

کی گئی ہے لیکن اُمید ہے کہ عام طلبا اور قارئی اس کتاب کو یکساں مفید پائینگے۔
اور یہ کتاب ذوق وشوق سے پڑھی جائے گی۔ اور اس طرح مجھے مزید خدمت
کا موقع دیا جائے گا۔
آخر میں، مَیں اپنے استاد مکرم جناب ڈاکٹر رانا محمد بہار الحق اشک کا
تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جنہوں نے اس کتاب پر نظرِ ثانی کی، مفید مشورے
دئیے اور ادبی ذرائع کی نشاندہی کی ـــــ اور یہ کہنا بعید از حقیقت نہ ہوگا
کہ موجودہ کتاب موصوف کی محنت و کاوش ہی کا نتیجہ ہے۔

خورشید حسین بخاری

فہرست مطالب

دورِ تیموریہ کی نثر

دورِ صفویہ کی نثر

دورِ قاچاریہ کی نثر

مطالعۂ تاریخِ ادبیاتِ ایران

تاریخ بلعمی

سامانیوں کے عہد میں نظم کی طرح فارسی نثر کو بھی ترقی حاصل ہوئی۔ اس دور میں مصنفوں نے کتابیں لکھیں۔ ان میں سے کچھ انقلاباتِ زمانہ سے ناپید ہو گئیں۔ اور کچھ محفوظ رہ گئی ہیں۔ ان میں سے ایک اہم کتاب تاریخ طبری کا ترجمہ ہے۔ اس کا مترجم عبدالملک بن نوح (۳۴۳ھ - ۳۵۰ھ) اور منصور بن نوح (۳۵۰ھ - ۳۶۶ھ) کا وزیر ابوعلی محمد بلعمی ہے۔ اس نے یہ عربی تاریخ امیر منصور کے حکم سے فارسی میں منتقل کی ہے۔ یہ کتاب نہایت سادہ اور رواں نثر میں لکھی گئی ہے۔ اور اس عہد کی طرزِ تحریر کی ایک اچھی مثال ہے۔ (شفق)

تاریخ طبری مشہور مؤرخ ابوجعفر محمد بن جریر الطبری کی تالیف ہے۔ اس تاریخ کا اصل نام تاریخ الرسل والملوک ہے۔ اور یہ عربی زبان میں لکھی گئی ہے۔ تاریخ طبری کا فارسی ترجمہ منصور بن نوح کی فرمائش پر اس کے وزیر ابو علی محمد بن محمد نے کیا تھا۔

مجمل التواریخ والقصص کا مؤلف لکھتا ہے کہ ابوعلی محمد بلعمی نے اس عظیم تاریخ کو ترجمہ کرنے کا کام ۳۵۲ھ میں شروع کیا تھا۔

ترجمہ تاریخ طبری ذیل کے ابواب پر منقسم ہے :-
تمہید۔ پیغمبرانِ قدیم کا تذکرہ ۔ زمانہ قبل از تاریخ کے بادشاہ ۔عہد ساسانیہ
رسول اکرم اور خلفائے راشدین ۔خلفائے بنو امیہ اور خلفائے بنو عباس
ترجمہ تاریخ طبری کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بھی مقدمہ شاہنامہ کی طرح سجع ۔ موازنہ یا مترادف الفاظ کا کہیں وجود نہیں ۔ اس کی نثر کا انداز "سبک قدیم" کا سا ہے ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس میں مقدمہ کی نسبت عربی کے الفاظ کچھ زیادہ ہیں ۔ (بدخشانی)

یہ کتاب ترجمہ تاریخ طبری کے نام سے مشہور ہے لیکن چونکہ اس کے بہت سے مطالب طبری کی تاریخ الرسل والملک کے علاوہ بعض دیگر کتب سے بھی منقول ہیں ۔ اور یہ کتاب بذاتِ خود ایک علیحدہ تالیف کی صورت اختیار کر گئی ہے ۔ اس لئے ہم اس کو تاریخ بلعمی کے نام سے موسوم کرتے ہیں ۔ البتہ اس کتاب کو امیر منصور بن نوح سامانی کے وزیر بلعمی نے اس کے حکم سے ۳۵۲ھ میں ترجمۂ کتاب تاریخ طبری کے نام سے شروع کیا تھا ۔ لیکن بعد میں اس نے بہت سے ایسے مصادر سے بھی استفادہ کیا جو تاریخ ایران سے متعلق تھے ۔ تاریخ طبری کے بعض مضامین کو اس نے حذف بھی کر دیا ہے اسی کتاب کے آغاز میں اور کتاب مجمل التواریخ والقصص میں یہ کیفیت بیان کی گئی ہے ۔ کہ کس طرح ابوصالح منصور بن نوح نے کتاب کے ترجمہ کا حکم دیا اور کس طرح مؤلف نے ۳۵۲ھ میں ترجمہ کا کام شروع کیا ۔ اس کتاب کے بہت سے خطی نسخے دُنیا میں موجود ہیں ۔ اور ایک دفعہ یہ کتاب ہندوستان میں چھپ بھی چکی ہے ۔ لیکن اس میں غلطیاں بہت ہیں ۔ بلعمی کا نام ابو علی محمد بن محمد بن عبداللہ البلعمی تھا ۔ اور وہ امیر منصور بن نوح سامانی کا وزیر تھا ۔ وہ چوتھی صدی ہجری کے مشہور اکابر میں سے تھا ۔ اس کا باپ ابوالفضل

محمد بن عبداللہ بلعمی ۲۷۹ھ سے اسماعیل بن احمد سامانی کا اور پھر اس کے بیٹے احمد کا اور پھر اس کے بیٹے نصر کا وزیر تھا۔ ۳۲۶ھ میں وہ عہدۂ وزارت سے علیحدہ ہو گیا۔ اور اس نے ۳۲۹ھ میں وفات پائی۔ وہ بلعمی کے نام سے اس لئے مشہور ہے۔ کہ وہ اور اس کے اسلاف مرو کی ایک بستی "بلعمان" کی طرف منسوب ہوئے ہیں۔ لیکن بعض کے خیال میں اس نام سے مشہور ہونے کی وجہ یہ ہے۔ کہ بلاد روم میں بلعم ان کا اصلی وطن تھا۔ ابوالفضل کا بیٹا ابوعلی محمد ہے۔ ابوالفوارس عبدالملک بن نوح (۳۴۳ - ۳۵۰) اور پھر ابوصالح منصور بن نوح (۳۵۰ - ۳۶۶) کا وزیر تھا۔ اس آخری بادشاہ کے حکم سے اس نے کتاب کے ترجمہ و تالیف کا کام اپنے ذمہ لیا۔ اس کا سالِ وفات گردیزی نے ۳۶۳ھ تحریر کیا ہے۔ (صفا)

مقدمۂ شاہنامہ ابو منصوری

سامانیوں کے عہد میں نظم کی طرح فارسی نثر کو بھی ترقی حاصل ہوئی۔ اس عہد میں مصنفوں نے کتابیں لکھیں۔ ان میں سے کچھ انقلاب زمانہ سے ناپید ہو گئیں۔ اور کچھ محفوظ رہ گئی ہیں۔ ان میں سے ایک شاہنامہ کا مقدمہ ہے۔ شاہنامہ کا یہ مقدمہ طوس کے حاکم ابو منصور بن عبدالرزاق کے حکم سے ۳۴۶ھ میں لکھا گیا ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ چوتھی صدی ہجری میں فارسی نثر کتنی سادہ اور رواں تھی۔ اس میں پیچیدہ عبارتیں بہت کم تھیں اور جملے چھوٹے چھوٹے لکھے جاتے تھے۔ اور رسم الخط اور الفاظ کا تلفظ بھی آج کل کے رسم الخط اور تلفظ سے مختلف تھا۔ (شفق)

شاہنامہ فردوسی کا سب سے اہم ماخذ شاہنامہ ابو منصوری ہے۔ یہ شاہنامہ چوتھی صدی کے حاکم طوس ابو منصور محمد بن عبدالرزاق طوسی کے حکم پر لکھا گیا تھا۔ ابو منصور اپنے زمانہ کے بزرگوں میں شمار ہوتا تھا۔ اور اسے ایرانی قوم کا بڑا درد تھا۔ اس نے حکم دیا کہ بہت سے عالم ایک جگہ اکٹھے ہوکر قومی داستانوں کو جمع کریں اور ایک شاہنامہ تصنیف کریں۔ فردوسی نے اپنے شاہنامے کے بعض اشعار میں ابو منصور کے اس بڑے اقدام کا ذکر کیا ہے۔
(شفق)

"مقدمہ شاہنامہ" نثر فارسی کا قدیم ترین نمونہ ہے۔ اس کا مؤلف ابو منصور بن عبداللہ المعمری ہے۔ ملک الشعراء بہار سبک شناسی میں لکھتے ہیں کہ "ابو منصور المعمری" سامانی دور میں ابو منصور بن عبدالرزاق کا وزیر تھا۔ اور اسی تاجدار کے حکم سے وہ نثر میں شاہنامہ لکھنے پر مامور ہوا تھا۔ چنانچہ نثر کا شاہنامہ ۳۴۶ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ مقدمہ حقیقت میں اسی منثور شاہنامہ کا تھا۔ بعد میں جب فردوسی نے نظم میں شاہنامہ لکھا۔ تو یہ مقدمہ شاہنامہ فردوسی میں شامل کر دیا گیا۔

مقدمہ کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ ٹھیٹھ فارسی زبان میں ہے جسے فارسی دری کہا جاتا ہے۔ اس میں ناموں کے سوائے کوئی ایک لفظ بھی عربی زبان کا نہیں۔ مقدمے کی زبان سہل اور رواں ہے۔ جملے بہت واضح اور چھوٹے چھوٹے ہیں۔ نہ متروک الفاظ کہیں نظر نہیں آتے۔ نہ ایسی صنعتیں ہی لائی گئی ہیں۔ جو فقرات کو مقفیٰ و مسجع بنادیں۔ دورِ اوّل کی اس قسم کی نثر کا انداز "سبک قدیم" کہلاتا ہے۔ (بدخشانی)

ابو منصور بن عبدالرزاق نے اپنے وزیر ابو منصور محمد بن عبداللہ المعمری کو

اس امر پر مامور کیا تھا کہ وہ خراسان کے باخبر لوگوں کو جمع کر کے فارسی نثر میں ایک شاہنامہ لکھے۔ چنانچہ جب وہ شاہنامہ لکھا جا چکا تو ابو منصور المعمری نے اس کا مقدمہ لکھا جو "مقدمہ قدیم شاہنامہ" کے نام سے مشہور ہے۔ اور تاحال شاہنامہ فردوسی کے بعض قدیم نسخوں کے مقدمہ میں اس کا متن دستیاب ہوتا ہے۔

یہ ابو منصور المعمری جیسا کہ اس نے خود مقدمۂ شاہنامہ میں بیان کیا ہے۔ عہد سامانی کے ایک سردار کے نسل اور طوس کے شریف زادگان میں سے تھا۔ ابوالمؤید کی طرف منسوب ہونے والے قطعہ اور کتاب عجائب البلدان کو چھوڑ کر اس کی جو نثر بطور یادگار باقی ہے۔ وہ غالباً نثر فارسی کی تمام یادگاروں سے زیادہ قدیم ہے۔ اس کتاب میں عربی کلمات بہت کم پائے جاتے ہیں۔ اور اس کا طرز تحریر بہت سادہ اور طبعی ہے۔ (صفا)

ادبیات فارسی میں شروع سے ہی یہ رواج چلا آتا ہے کہ شاہنامہ فردوسی کے آغاز میں نثر کا ایک مقدمہ شامل کیا جاتا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے اسی قسم کے مقدموں کی تعداد چار ہے جو مختلف زمانوں میں لکھے گئے۔

ان میں سب سے پہلا مقدمہ وہ ہے جو مقدمۂ ابو منصوری کے نام سے آج کل مشہور ہے۔ اس کا محرک ابو منصور محمد بن عبدالرزاق بن عبداللہ بن فرخ طوسی تھا جس کا سلسلۂ نسب دربار ساسانی کے معروف سردار بہرام چوبین تک پہنچتا ہے۔ یہ ابو منصور سامانی بادشاہوں کی جانب سے طوس کا حاکم تھا۔ اور بعد میں خراسان کی فرمانروائی اور سپہ سالاری پر بھی فائز رہا۔ ۳۵۰ھ میں اسے زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ محرم ۳۴۶ھ میں اس نے خراسان کے بعض دانشمندوں کو حکم دیا کہ ایران کی قدیم داستانوں کا ایک مجموعہ تیار کیا جائے جو خراسان کی اس وقت کی زبان اور ہماری آج کل کی زبان یعنی دری میں ہو۔ اس مجموعہ کا نام شاہنامہ تجویز کیا گیا اور پھر اسی مجموعہ پر ایک مقدمہ تحریر ہوا جسے بعد میں فردوسی کے مشہور منظوم شاہنامہ

کے شروع میں چسپاں کردیا گیا۔ اسی وجہ سے وہ مقدمۂ ابو منصوری کے نام سے معروف ہے۔ اس مقدمہ کا متن آقا محمد قزوینی نے معتبر ترین نسخوں کے مقابلہ کے بعد مرتب کیا تھا۔ جو کتاب ہزارۂ فردوسی کے صفحات ۱۲۳ - ۱۴۰ پر شائع ہوا تھا۔

(سعید نفیسی)

(۴۳)، دانش نامہ علائی

شیخ الرئیس ابو علی حسین بن عبداللہ ابن سینا نہ صرف ایران کا زبردست فلسفی گذرا ہے۔ بلکہ اس کا شمار دُنیا کے بڑے بڑے عالموں میں ہوتا ہے۔ اس کا باپ بلخ کا باشندہ تھا۔ ابن سینا سنہ ۳۷۰ھ میں بخارا کے نواحی قریہ خرمیثن میں پیدا ہوا۔ وہ پہلے سامانیوں کے پایۂ تخت بخارا میں مقیم رہا۔ اس کے بعد خاندان شاہیوں کے پایۂ تخت گرگانج میں منتقل ہوگیا۔ پھر رے۔ ہمدان اور اصفہان گیا اور شمس الدولہ بن فخر الدولہ دیلمی کی ملازمت اختیار کرلی۔ اور سنہ ۴۰۵ھ اور سنہ ۴۱۲ھ کے درمیان دوبارہ ہمدان میں اسی کی وزارت پر فائز ہوا۔ اس نے بمقام ہمدان سنہ ۴۲۸ھ میں وفات پائی۔

شیخ کی تصانیف سو سے زیادہ تھیں۔ اس نے فارسی زبان میں بھی تصنیف و تالیف کی ہے۔ ان تصانیف میں سے ایک فلسفیانہ کتاب "دانشنامۂ علائی"[1] کے نام سے موسوم ہے۔ شیخ نے یہ کتاب کاکویہ کے بیٹے علاؤ الدولہ کے نام معنون کی ہے۔ یہ کتاب بہت مشہور ہے اور اس میں استاد نے اپنی مادری زبان پر کامل قدرت کا ثبوت دیا ہے۔ حتیٰ کہ علمی اصطلاحات تک کو فارسی کا جامہ پہنایا ہے۔

(شفق)

---

[1] یہ شیخ الرئیس بو علی حسین بن عبداللہ بن سینا کی تالیف ہے۔ اور علاء الدولہ

پسر کاکویہ کے نام کی نسبت سے دانش نامہ علائی کے نام سے موسوم ہے جیسے کہ مؤلف نے خود دیباچے میں لکھا ہے یہ کتاب فارسی دری میں لکھی گئی ہے اور اس میں علم منطق۔ علم طبیعات۔ علم ہیئات۔ علم موسیقی اور علم مافوق الطبیعات پر بحث کی گئی ہے۔

دانش نامۂ علائی کی زبان سادہ اور رواں ہے عربی الفاظ کی آمیزش بہت کم ہے۔ "مر" "اندر" "بمیدون" وغیرہ الفاظ جو قدیم نثر کا خاصہ ہیں۔ اس کتاب میں بھی موجود ہیں۔ قدیم نثر کی کتابوں میں "د" کو "ذ" کی صورت میں لکھتے تھے۔ اس کتاب میں بھی "د" کی یہی صورت قائم ہے۔ اس لحاظ سے دانش نامۂ علائی کا انداز بھی سبک قدیم کا سا ہے۔ (بدخشانی)

دانش نامہ علائی کو دانش نامہ علائیہ یا حکمتِ علائی یا حکمتِ علائیہ یا کتابِ دانش مایہ العلائی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب شیخ بوعلی سینا نے علاءالدولہ پسر کاکویہ کی فرمائش پر لکھی تھی جیسا کہ کتاب کی تمہید سے معلوم ہوتا ہے۔ اس سے اس کا مقصد منطق۔ طبیعیات۔ ہیئت۔ موسیقی اور مابعد الطبیعہ کی تحقیق کرنا تھا۔ لیکن اسے منطق۔ طبیعیات اور الہیات کے سوا اور کچھ لکھنے کی فرصت نہ مل سکی۔ باقی کتاب (یعنی ہیئت۔ ہندسہ۔ حساب۔ موسیقی) کی تالیف اس کے بعد اس کے شاگرد ابوعبید جوزجانی نے کی۔ اس نے شیخ ہی کی مختلف کتابوں سے ان مضامین کو اخذ کیا۔ چنانچہ اس نے علم موسیقی کے بارے میں تمام معلومات شیخ کی کتاب الشفا کے اس حصّے سے لیکر ترجمہ کر دیں جو اس نے موسیقی کے متعلق لکھا تھا۔

دانش نامہ کے متعدد نسخے دُنیا میں موجود ہیں۔ اور یہ تین بار طبع ہو چکی ہے اس کی اہمیت دو گونہ ہے۔ اوّل تو اس لئے کہ یہ حکمتِ مشائین کے متعلق کامل واقفیت بہم پہنچاتی ہے۔ اور اس موضوع پر فارسی زبان میں یہ پہلی کتاب ہے۔

دوسرے اس لئے کہ بہت سی منطقی اور فلسفی اصطلاحات کے مترادفات فارسی زبان میں پیش کرتی ہے۔ (صفا)

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے ابو علی سینا نے علاء الدولہ کاکویہ کی فرمائش پر منطق۔ الٰہیات۔ طبیعیات اور ریاضیات وغیرہ جیسے علوم حکمیہ کے بارے میں ایک جامع کتاب فارسی زبان میں لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن ریاضی کا حصہ شامل کتاب نہ ہو سکا۔ اس کام کو اس کے شاگرد ابو عبید جوزجانی نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اور شیخ کی کتاب نجات کے ساتھ کتاب ریاضی کا اضافہ کر کے اسے مکمل کر دیا۔ ابو عبید نے اس کتاب کے شروع میں لکھا ہے کہ یہ تمام مواد اس نے شیخ کی کتبِ ریاضی سے ترتیب دیا ہے۔ اور پارسی دری میں لکھ کر کتاب دانشنامہ کے ساتھ ملحق کر دیا ہے۔ (صفا)

یہ کتاب حکمتِ علائی یا حکمتِ علائیہ کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن ابن اصیبعہ کی کتاب عیون الانباء میں اس کا نام دانش مایہ ہے۔ اور شاہ مردان کی کتاب نزہت نامہ علائی میں اسے دانش نامۂ علائی کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ کتاب تہران سے ۱۳۱۵ھ شمسی میں دو جلدوں میں طبع ہوئی ہے۔ پہلی جلد مقدمۂ مصحح۔ منطق اور الٰہیات پر مشتمل ہے۔ اور دوسری جلد طبیعیات ہندسہ۔ ہیئت۔ ریاضی اور موسیقی پر حاوی ہے۔ اس کتاب کے قلمی نسخے کافی تعداد میں موجود ہیں۔ اور ان کے باہمی اختلافات بھی کم نہیں ہیں۔ خیال ہے کہ یہ کتاب چونکہ ایک قدیم یادگار ہے اور عربی سے نابلد فارسی زبان کے اہل علم اس کتاب کے ذریعہ علمِ فلسفہ حاصل کرتے رہے ہیں۔ اس لئے اس کتاب کے قلمی نسخے زیادہ سے زیادہ ہوتے چلے گئے۔ اور ہر نقل کرنے والے نے اس کی عبارات میں اپنے اپنے سلیقہ کے مطابق کم و بیش تصرف کر لیا۔

اس کتاب کے بیشتر قلمی نسخے صرف علم منطق۔ الٰہیات اور طبیعیات کے

بیان تک محدود ہیں۔ اور ان میں ریاضیات کا حصّہ مفقود ہے البتہ اس کے تین نسخے ایسے ملتے ہیں۔ جن میں ریاضیات کا حصّہ بھی شامل ہے۔

(احمد خراسانی)

---

(۴) التفہیم لاوائل صناعۃ التنجیم

ابوریحان محمد بن احمد البیرونی دنیا کے دانشمندوں اور ایران کے زبردست عالموں اور فاضلوں میں شمار ہوتا ہے سنہ ۳۶۲ھ میں بیرون (نواح خوارزم) میں پیدا ہوا۔ اور اس نے ۴۴۰ھ میں وفات پائی۔

البیرونی کی اہم تالیفوں میں سے ایک ہیئت، ہندسہ اور نجوم پر ہے جس کا نام "التفہیم لاوائل صناعۃ التنجیم" ہے۔ یہ کتاب اس نے ۴۲۰ھ میں بمقام غزنہ لکھی اور اسے حسین خوارزمی کی بیٹی ریحانہ کے نام معنون کیا۔ اس کا ایک حصّہ اس نے فارسی میں بھی لکھا ہے۔ (شفق)

یہ ابوریحان البیرونی کی ایک مشہور تالیف ہے جو عربی میں لکھی گئی تھی بعد میں مؤلف نے خود ہی اس کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ التفہیم غزنوی دور کی مشہور کتاب ہے۔ اس دور کی نثر میں سبکِ قدیم کی نسبت کافی تبدیلیاں ہوئیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ جدید ادب نے ابوریحان کو متاثر نہیں کیا۔ چنانچہ یہ کتاب سبکِ قدیم میں ہی لکھی گئی۔ اس میں وہی سادگی۔ روانی اور اختصار پایا جاتا ہے۔ جو قدیمی نثر کا خاصہ ہے عربی الفاظ بہت کم استعمال کئے گئے ہیں۔ قدیمی نثر میں لفظ "اندر" "در" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور یہی لفظ التفہیم میں بھی بکثرت دیکھنے میں آتا ہے۔ اس کے علاوہ "د" بھی "ذ" ہی کی صورت

میں لکھی گئی ہے۔ (بدخشانی)

یہ کتاب چوتھی اور پانچویں صدی کے بزرگ استاد ابوریحان البیرونی کی تصنیف ہے۔ جسے اس نے ریحانہ بنت الحسین الخوارزمیہ کے نام پر ۴۲۰ھ میں پہلے فارسی زبان میں لکھا اور بعدازاں خود ہی اسے عربی لباس پہنایا۔ عربی اور فارسی کے یہ دونوں نسخے ابھی تک دستیاب ہوتے ہیں۔ یہ اوّلین اور اہم ترین کتاب ہے۔ جو خاص علم نجوم۔ ہندسہ اور حساب پر لکھی گئی۔ اور چونکہ اس کا مصنف دنیا کے مشہور علما میں سے ہے اس لئے بھی اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس کتاب میں ابوریحان نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ علم ریاضی کے متعلق جو اصطلاحات فارسی زبان میں موجود ہیں۔ ان سے استفادہ کیا جائے۔ ان اصطلاحات میں سے بیشتر بعینہٖ وہی اصطلاحات ہیں۔ جو عہد ساسانی کے اواخر سے علم نجوم و ریاضی میں موجود چلی آرہی تھیں۔ مثلاً پُری یا پُرماہی یعنی چاند کی روشنی کا کامل ہونا۔ یہ تمام اصطلاحات ابوریحان کے پیش نظر رہی ہیں۔ بعض اصطلاحات ہندی اور سنسکرت سے بھی لی گئی ہیں۔ اس کتاب میں عربی کلمات کا استعمال کم ہے اور جو عربی لغات استعمال بھی کئے گئے ہیں۔ وہ سادہ اور اس زمانہ کی فارسی زبان میں عام طور پہ مستعمل تھیں۔ (صفا)

یہ کتاب ابوریحان محمد بن احمد بیرونی خوارزمی کا شاہکار ہے۔ اس کی ولادت ذوالحجہ ۳۶۲ھ بیرون (مضافاتِ خوارزم) میں اور وفات رجب ۴۴۰ھ میں ہوئی۔ ابوریحان مشرق کا ایک دانشمند ترین اور مشہور عالم تھا۔ اس کتاب کے علاوہ اس کی اور بہت سی کتابیں ہیں۔ مثلاً الآثار الباقیہ عن القرون الخالیہ تحقیق ما للہند۔ اور قانون مسعودی وغیرہ۔ موجودہ کتاب التفہیم پانچویں صدی ہجری کے دور کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ جبکہ اسلامی علم و ادب قریب قریب پختہ ہوچکا

تھا۔ التفہیم ریاضی و نجوم سے متعلق معلومات پر ایک نہایت مفید مجموعہ ہے جو پڑھنے والے کو علمی و ادبی فوائد کے گنجینہ سے مالا مال کرتا ہے۔ اور فارسی زبان کے بیش قیمت علمی و ادبی ذخائر میں سے ہے۔

ابوریحان نے یہ کتاب ریحانہ بنت الحسین (یا الحسن) خوارزمی کی خواہش پر بظاہر شہر غزنین میں تحریر کی تھی۔ اس کی تالیف سے اس کا مقصد نوآموزوں کو ابتدائی واقفیت بہم پہنچانا تھا۔ غزنین میں اس کتاب کے تالیف کئے جانے کی دلیل یہ ہے۔ کہ اس کی تصنیف کے وقت (یعنی ۴۲۰ھ میں) مؤلف غزنین میں تھا۔ اور سلطان محمود غزنوی کے دربار سے وابستہ تھا۔ اس سے اگلے سال یعنی سنہ ۴۲۱ھ میں (جو محمود کی زندگی کا آخری سال تھا) اس نے اپنی کتاب قانون مسعودی بھی اسی شہر میں سلطان محمود کے لئے لکھنی شروع کی تھی۔ لیکن اس کی وفات کے بعد جب اس کا بیٹا مسعود تخت نشین ہوا تو اس نے اس کے نام پر اس کتاب کا نام قانونِ مسعودی رکھ دیا۔

ابوریحان نے اس کتاب کو ایسے اسلوب اور روش پر لکھا ہے کہ اس سے بہتر اسلوب تصور میں نہیں آسکتا۔ اس نے چاروں اصل علوم یعنی ہندسہ، حساب، ہیئت اور نجوم اور ایک فرعی عملی فن یعنی اسطرلاب پر نہایت مختصر عبارت میں بحث کی ہے۔ چونکہ کتاب کی فرمائش کرنے والے کا اصل مقصد نجوم کے احکام کا بیان تھا۔ اور مؤلف کی اصل غرض نوآموزوں کے لئے چند علوم کے مقاصد پیش کرنا تھا۔ اس لئے اس کا نام التفہیم لاوائل صناعۃ التنجیم رکھا گیا۔

مؤلف نے دیکھا کہ اس جیسے متبحر عالم سے توقع ہو سکتی ہے، حتی الامکان کوشش کی ہے کہ مندرجہ بالا علوم کے مسائل کو بیان کرتے وقت نہ صرف کلیات کا ذکر کیا جائے بلکہ جزئیات کے ادنیٰ مسائل بھی نظر انداز نہ ہونے پائیں۔ اور تمام دقائق کو نہایت مناسب اور برمحل عبارات میں ایک قیمتی

خزانہ کی صورت میں ودیعت کیا جائے۔ یہ کتاب مندرجہ ذیل پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ (۱) ہندسہ (۲) حساب وجبر ومقابلہ (۳) ہیئت وجغرافیا ومعرفۃ الاقالیم (۴) اسطرلاب (۵) احکام نجوم۔

یہ کتاب قطعی طور پر ۴۲۰ھ کی تالیف ہے۔ خوش قسمتی سے ابوریحان نے خود ہی کتاب کے اندر اس کی تاریخ تالیف کا تین بار صراحت سے ذکر کر دیا ہے۔ اس لئے تحقیق کرنے والے کو شک وتردید کی زحمت برداشت کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی۔

ابوریحان نے اس کتاب اور اپنی دیگر تالیفات میں ہر جگہ منجموں اور غیب گو نجومیوں کی مذمت کی ہے۔ اور بار بار اس کی وضاحت کی ہے کہ وہ خود بھی احکام نجوم کا معتقد نہیں بلکہ اس فن کی آشفتگی کا قائل ہے اور اسے سست بنیاد قرار دیتا ہے۔

ابوریحان عربی وفارسی دونوں زبانوں کا استاد تھا۔ اور اپنے زمانے کے علما کی نسبت ہر دو زبانوں کا زبردست اور فصیح وبلیغ انشا پرداز تھا۔ وہ فارسی وعربی کے نکات ودقائق پر اس قدر حاوی تھا۔ کہ اگر اس کے سوا اس میں کوئی اور فضیلت نہ بھی ہوتی تو بھی اسے عربی وفارسی کے بزرگ ترین ادبا کا ہم پلہ شمار کیا جاتا اور وہ ملک وملت کے لئے باعث فخر سمجھا جاتا۔ لیکن اب تو اس فضل وفضیلت کے باعث اس کا وجود ہمیں یگانہ نظر آتا ہے عربی زبان میں اس کے کافی کارنامے موجود ہیں۔ لیکن فارسی میں اس کی صرف یہی ایک یادگار ہم تک پہنچی ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اگر اس کتاب کے تمام مناقب مثلاً علمی موضوعات۔ تاریخی فوائد، صحت واعتبار مطالب۔ قدامت اور ادبی اہمیت وغیرہ کو پیش نظر رکھا جائے۔ تو بے شبہ یہ فارسی زبان کی ایک بزرگ ترین اور بہترین یادگار ہے۔ اور اسلام کے بعد کے زمانہ کے فارسی کارناموں میں اس کی کوئی نظیر اور مثال نہیں مل سکتی۔ مصنفِ موصوف نے خود ہی اس کتاب

کو عربی و فارسی دونوں زبانوں میں لکھا تھا۔ پہلے اس نے اسے ایک زبان میں تصنیف کیا۔ اور بعد ازاں بالکل ہو بہو دوسری زبان میں اسے ترجمہ کر دیا۔ لیکن ترجمہ کرتے وقت اس نے ایسی مہارت اور استادی کا ثبوت دیا ہے کہ اصل اور ترجمہ کا امتیاز کرنا نہایت دشوار ہے حتیٰ کہ بعض لوگوں کو تو یہ خیال پیدا ہو گیا۔ کہ یہ دونوں بجائے خود الگ الگ تالیفات ہیں۔ اور ان میں سے ایک دوسری کا ترجمہ نہیں۔ اس بات کے دلائل کہ اصل کتاب عربی میں تھی۔ اور بعد میں فارسی میں منتقل ہوئی۔ یا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ دونوں طرف یکساں ہیں تاہم جہاں تک ہم نے غور کیا ہے۔ یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ اصل کتاب عربی میں تھی اور بعد میں فارسی میں ترجمہ ہوئی۔ لیکن اس رائے کو بھی یقینی نہ سمجھنا چاہیئے۔

یہ کتاب اپنی تاریخ تالیف یعنی ۴۲۰ھ سے ہی روز افزوں شہرت کی حامل رہی ہے۔ یہاں تک کہ التفہیم اور ابوریحان کے نام باہم دونوں اسی طرح لازم ملزوم ہو گئے تھے۔ جیسے مجسطی اور بطلیموس یا قانون اور ابو علی سینا کہ جب ایک کا نام لیا جائے تو دوسرے کا تصور خواہ مخواہ سامنے آ جاتا ہے۔ چونکہ یہ کتاب ریاضی ہیئت۔ نجوم اور اسطرلاب کے موضوع پر ایک صحیح ترین اور معتبر ترین سند تھی۔ اس لیئے وہ ہمیشہ ان علوم کے طالبوں اور علما کا مرجع و مآخذ بنی رہی۔ اس کی تالیف سے لے کر اب تک شاید ہی کوئی کتاب ان فنون پر لکھی گئی ہو گی جس میں اس سے نقل یا اقتباس نہ کیا گیا ہو۔ چنانچہ نظامی عروضی سمرقندی نے بھی اپنی کتاب چہار مقالہ میں ابوریحان کی التفہیم کا حوالہ دیا ہے۔ نقل و اقتباس کے علاوہ چند ایک کتابیں اس کتاب کی تقلید پر بھی لکھی گئی ہیں۔ جن کے مصنفین نے اسی ترتیب ابواب کو پیش نظر رکھا ہے۔ ان میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:۔

(۱) روضۃ المنجمین مؤلفہ ابو الخیر رازی (تالیف ۴۶۶ھ) (۲) گیہان شناخت مؤلفہ حسن قطان مروزی (تالیف ۴۹۸ھ) (۳) جہان دانش مؤلفہ شرف الدین محمد بن [illegible] (تالیف ۵۴۰ھ) (۴) کفایۃ التعلیم فی صناعۃ التنجیم مؤلفہ ابو المحامد

محمد بن مسعود غزنوی (تالیف ۵۴۲ھ) (۵) التفہیم فی معرفۃ استخراج التقویم مؤلفہ مظہر الدین محمد لاری (تالیف سنہ ۹۶۰ھ)

ان کے علاوہ معجم البلدان کے مصنف یاقوت حموی (متوفی ۶۲۶ھ) نے بھی اپنی کتاب میں جا بجا ابوریحان اور التفہیم کا ذکر کیا ہے۔ اور حوالے دیئے ہیں۔

فارسی نثر کی مشہور و معروف کتابوں میں (جو فی الحقیقت اہمیت کے قابل ہیں، شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہوگی۔ جو کتاب التفہیم کی تمام خصوصیات اور اوصاف کی حامل نظر آتی ہو۔ یہ کتاب اسلام کے بعد کے فارسی علم و ادب کی ایک معتبر اور قدیم ترین سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور فنونِ ریاضی کے چند ایک شعبوں کے لئے صحیح ترین ماخذ ہے۔ اس کے علاوہ قدیم فارسی زبان کے لغات و اصطلاحات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ بالخصوص ایرانیوں کی تاریخ، آداب و رسوم اور تمدن و معاشرت کے سلسلے میں کئی ایک ایسی باتیں اس میں پائی جاتی ہیں۔ جو اس کے سوا کسی دوسری جگہ سے دستیاب نہیں ہوتیں۔ اور اگر کسی نے ان کے بارے میں کچھ لکھا بھی ہے۔ تو وہ چنداں قابل اعتماد اور درست نہیں۔ کتاب کے طرزِ بیان۔ الفاظ کی عمدگی۔ معانی کی پختگی۔ مطالب کی استواری۔ مقالات کی گوناگونی کے علاوہ ہر موضوع پر ایسی سیر حاصل اور شافی بحث کی گئی ہے۔ جو پُر مغز ہونے کے ساتھ بے شمار علمی و ادبی فوائد پر بھی مشتمل ہوتی ہے۔ اس کی عبارات حشو و زوائد سے عاری اور ناپسند و نادرست الفاظ سے مبرا ہیں۔ یہ اس کتاب کی صرف وہ چند ایک خصوصیات ہیں جو مجموعی طور پر کسی فارسی تالیف میں نہیں ملتیں۔ اور اسلام کے بعد کے زمانہ میں ان تمام خصوصیات کی حامل کتاب یا تو سرے سے تالیف ہی نہیں ہوئی اور یا پھر ہم تک نہیں پہنچی۔ خواجہ نظام الملک کا سیاست نامہ اور محمد بن منور کی اسرار التوحید اگرچہ ادبی نقطۂ نظر سے قابل قدر ہیں۔ لیکن علمی لحاظ سے ان کی چنداں اہمیت نہیں۔ اسی طرح ناصر خسرو کی زاد المسافرین اگرچہ علمی لحاظ سے اہم ہے۔ مگر ادبی پہلو سے کوئی خاص بلند درجہ نہیں رکھتی

مذکورہ بالا کتاب کفایۃ التعلیم فی صناعۃ التنجیم علمی و ادبی نقطۂ نگاہ سے اہم ضرور ہے۔ لیکن مقالات کی جامعیت اور تنوع میں وہ التفہیم کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اور اگر کہیں کہیں گونا گونی کی جھلک اس میں نظر آتی ہے تو قدامت اور اعتبار و سند کے لحاظ سے التفہیم کو پھر بھی اس پر فضیلت حاصل ہے۔

کتاب التفہیم میں کوئی ایک لفظ یا جملہ بھی ایسا نہیں۔ جو نا صواب یا نا درست ہو اور معترضین کے لئے انگشت نمائی اور حرف گیری کا موقع مہیا کر سکے۔ یہ کتاب لفظی و معنوی تناقض، خلاف منطق و عقل مطالب۔ یاوہ گوئی اور خرافات ماشیا کے عجیب و غریب خواص شہروں اور مخلوقات کے عجائبات۔ جعلی تواریخ بے بنیاد افسانوں اور علوم غریبہ وغیرہ (جن سے اکثر کتابیں پُر ہوتی ہیں) کے ذکر سے بالکل پاک و صاف ہے۔ اگر احکام نجوم کے سلسلے میں کہیں کوئی چیز خلافِ عقل مذکور ہوئی بھی۔ تو وہ صرف اس لئے تاکہ لوگوں کو اہلِ فن کی اصطلاحات سے روشناس کرایا جا سکے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ابوریحان کا اپنا عقیدہ بھی وہی تھا۔ کیونکہ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ ابوریحان علمِ نجوم کے مقدمات اور قیاسات کی آشفتگی کا قائل تھا۔ اور اس نے اس قسم کے مطالب کے متعلق اپنے عقیدہ کا کھلم کھلا اظہار کر دیا ہے۔

کتاب التفہیم کی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ابوریحان نے تالیفِ کتاب کے دوران ہر ممکن اور بجا کوشش کی ہے۔ کہ اس زمانہ کے مستعمل عربی لغات و اصطلاحات کو خالص فارسی زبان میں پیش کیا جائے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ عبارات کے مفہوم کی وضاحت کے ساتھ ساتھ اسلوبِ نگارش کا پایہ بلاغت کے مدجہ سے نہ گرنے پائے۔ ابوریحان بلا شک و شبہ اپنی کوشش میں خوب کامیاب رہا ہے۔ اس لحاظ سے کتاب التفہیم اپنے دوسرے خصوصیات کے

علاوہ قدیم فارسی لغات اصطلاحات اور ترکیبات کا ایک قیمتی خزانہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کتاب کے لکھنے سے دو اہم مقصود مؤلف کے پیشِ نظر تھے۔ اول تو فنونِ ریاضی۔ ہیئت اور نجوم سے متعلق چند مطالب کا بیان اور دوسرے فارسی زبان کی تجدید اور اس میں علمی کتابیں لکھنے والوں کے لئے راہ ہموار کرکے ایک نمونہ لطور یادگار چھوڑنا۔ اس کا یہ طریقہ اس دور کے علما کے معمول کے خلاف تھا۔ کیونکہ وہ علمی کتابوں کے لئے عربی زبان استعمال کیا کرتے تھے۔ (جلال ہمائی)

---

(۵) تاریخ بیہقی

ابوالفضل بیہقی ۳۸۵ھ میں علاقہ بیہق کے شہر حارث آباد میں پیدا ہوا۔ اوائل عمر میں نیشاپور میں تعلیم پائی۔ تعلیم سے فراغت پاکر غزنی کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی۔ وہ غزنوی حکمران عبدالرشید کے عہد میں دیوانِ رسائل کا رئیس مقرر ہوا۔ لیکن زیادہ دیر تک اس منصب جلیلہ پر فائز نہ رہ سکا حاسدوں کی ریشہ دوانیوں کے باعث جو اکثر عبدالرشید کے کان بھرتے رہتے تھے بیہقی کو اس منصب سے ہٹا کر زندان میں ڈال دیا گیا۔ اور اس کا مال ومتاع بھی ضبط کر لیا گیا۔ عبدالرشید بالآخر ایک غلام کے ہاتھوں قتل ہوا۔ تو بیہقی کو زندان سے نجات ملی۔ اس کے بعد اس نے کبھی کسی دربار کی طرف رجوع نہ کیا۔ اور باقی زندگی تصنیف وتالیف میں گذار دی۔ اس نے ۴۷۹ھ میں وفات پائی۔

تاریخ بیہقی اس کی ایک ضخیم اور عظیم یادگار ہے جس کا بیشتر حصہ اب ناپید ہو چکا ہے۔ بقول ابن فندق یہ کتاب تیس جلدوں پر مشتمل تھی۔ لیکن افسوس کا مقام

ہے۔ کہ پوری تاریخ زمانے کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہ سکی۔ اس کا اب صرف ایک آخری حصہ باقی رہ گیا ہے۔ جو سلطان محمود کے بیٹے سلطان مسعود کے عہد سے متعلق ہے۔ یہ حصہ تاریخ بیہقی یا تاریخ مسعودی کے نام سے موسوم ہے تذکرہ نویس اس بات پر متفق ہیں۔ کہ تاریخ بیہقی ایک غیر جانبدار مورخ کا عظیم تاریخی کارنامہ ہے۔ جس میں تعصب کا شائبہ تک نہیں۔ ساری تاریخ ایک دیانتدار مؤرخ کے نقطۂ نگاہ سے لکھی گئی ہے۔ اور تاریخ نویسی کی ایک قابل تقلید مثال ہے۔

سب سے پہلے تاریخ بیہقی کو ایک انگریز مستشرق موالی نے ہندوستان میں طبع کرایا۔ پھر کپتان ناسولیس نے ۱۸۶۲ء میں کلکتہ میں شائع کرایا۔ اس کے بعد ادیب پیشاوری نے تصحیح کر کے اسے تہران میں چھپوایا۔ پھر یہ تاریخ آقائے سعید نفیسی کے زیر اہتمام دوسری مرتبہ ایران میں شائع ہوئی۔ اور حال ہی میں ڈاکٹر غنی اور ڈاکٹر فیاض کی متحدہ کوشش سے ایک مرتبہ پھر پوری آب و تاب سے ایران میں شائع ہوئی ہے۔

اس تاریخ کا انداز نگارش پہلے دور کی نثر سے بہت مختلف ہے۔ جملوں میں پہلی مرتبہ اختصار کی بجائے تفصیل نظر آتی ہے۔ عربی الفاظ اور ترکیبیں بھی فارسی نثر کا جزو بن گئی ہیں۔ عبارت کو مؤثر بنانے کے لئے مناسب حکایتیں اور موزوں اشعار بھی شامل کتاب کئے گئے ہیں۔ کہیں کہیں نثر میں شاعرانہ چاشنی بھی ہے صنائع لفظی سے بھی کام لیا گیا ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بیہقی نے سلطان سبکتگین اور سلطان محمود کے زمانے تک کی بھی تاریخ لکھی تھی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ تاریخ بیہقی میں مترادف الفاظ اور تشبیہوں اور استعاروں سے بھی کام لیا گیا ہے۔ (بدخشانی)

یہ اہم کتاب نہ صرف غزنوی خاندان کے تاریخی واقعات کے لحاظ سے اہمیت رکھتی ہے۔ کہ اس کے لکھنے والے ابوالفضل بیہقی نے ان میں سے اکثر واقعات کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا بلکہ اس کا مؤلف اپنے زمانے کے بہترین نثر نگاروں میں سے تھا۔ اس نے (۱۹) سال تک غزنوی دربار کے دیوان رسائل میں منشی گری کی خدمت انجام دی تھی۔ اس لحاظ سے اس نے اپنی کتاب نہایت شستہ۔ فصیح اور ادبی فارسی میں لکھی ہے۔ واقعات کے ذکر کے ضمن میں اس نے مناسب اشعار بھی استعمال کئے ہیں۔ اور بہت سے عالموں اور ادیبوں کے نام لئے ہیں۔ اس لئے یہ کتاب فارسی نثر کے شاہکاروں اور بہترین نمونوں میں شمار کی گئی ہے۔ اس کتاب کی اصل میں تیس جلدیں تھیں۔ اب چند ناقص جلدوں کے سوا جو تاریخ بیہقی کے نام سے مشہور ہیں۔ باقی سب جلدیں ناپید ہو گئی ہیں۔ جو جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔ ان میں سلطان مسعود کے دور حکومت کا حال درج ہے۔ اس لحاظ سے اس کا نام تاریخ مسعودی ہے۔

یہ کتاب سلطان محمود کے بیٹے فرخزاد کے عہد حکومت یعنی ۴۵۱ھ میں شروع ہوئی۔ اور کئی سال کے بعد ختم ہوئی۔ اس کتاب کے مطالب سے یہ بات بھی اچھی طرح ہویدا ہے کہ ابوالفضل بیہقی ایک نیک۔ حق پرست اور نیکوکار آدمی تھا۔ اس نے واقعات کے بیان اور وقائع کی نقل میں نہایت انصاف اور بڑی چھان بین سے کام لیا ہے۔ اس نے حقیقت سے انحراف نہیں کیا ہے اور کہیں بڑے بول نہیں بولے ہیں۔ (شفق)

غزنوی دربار کے مشہور وزیر اور فاضل دبیر خواجہ ابوالفضل محمد بن حسین بیہقی نے آل سبکتگین کے حالات کے متعلق ایک تاریخ لکھی جو اس خاندان کے آغاز سے لے کر سلطان ابراہیم بن مسعود کے زمانے تک کے حالات پر حاوی تھی۔ اور تیس جلدوں پر مشتمل تھی۔ لیکن اب اس کا صرف کچھ حصہ دستیاب

ہوتا ہے۔ جو سلطان مسعود بن محمود غزنوی اور کسی قدر تاریخ خوارزم کے بارے میں ہے۔ بیہقی کی ولادت ۳۸۵ھ اور وفات ۴۷۰ھ میں ہوئی۔

تاریخ بیہقی کتب تاریخ اور ادب فارسی کی ایک بلند پایہ اور بنیادی کتاب ہے۔ اس کی تاریخی اہمیت صرف اسی بات پر منحصر نہیں کہ اس میں غزنوی دور کے کچھ اہم ترین سیاسی حوادث تحریر کئے گئے ہیں۔ بلکہ اس وجہ سے بھی بہت زیادہ ہے۔ کہ بیہقی نے حوادث کے نقل کرنے میں صحتِ مطالب و واقعات کے متعلق پوری تحقیق سے کام لیا ہے۔ اور اس نے ایسے اسناد اور مراجع سے بھی استفادہ کیا ہے۔ جن تک اعلیٰ درباری مقام پر فائز ہونے کے باعث اسے رسائی حاصل تھی۔ بیہقی نے اس کتاب کی تالیف میں صرف سیاسی اور درباری حوادث اور ان کی تحقیق و تدقیق پر ہی نظر نہیں رکھی۔ بلکہ یہ کتاب ایک اور لحاظ سے بھی اہم ہے۔ اور وہ یہ کہ بیہقی نے اس زمانے کے رسوم و عادات اور معاشرتی آداب کا بھی مناسب مواقع پر ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں بعض شعرا اور انشا پردازوں کے بارے میں نہایت قیمتی معلومات بہم پہنچائے ہیں۔ اور بہت سے ایسے تاریخی وقائع و حوادث کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ جن کا بظاہر غزنوی دور کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ لیکن کسی مناسبت کی وجہ سے ضمناً ان کا ذکر آ گیا ہے اس بنا پر بیہقی کی یہ تاریخ اس زمانے اور اس سے پیشتر زمانے کے تاریخی ادبی اور اجتماعی مسائل کی تحقیق کے لئے ایک اہم ماخذ ہے۔ اگر اس کتاب کے تمام اجزا دستیاب ہو جاتے تو عین ممکن تھا۔ کہ ہم بعض دوسری کتابوں کی طرف رجوع کرنے سے بے نیاز ہو جاتے ہیں اور یا ہمیں بعض وہ گراں بہا معلومات حاصل ہو جاتے جن سے ہم اس وقت بے بہرہ ہیں۔

بیہقی کا طرزِ تحریر اپنے پیش روؤں کی نسبت جدید ہے۔ اور پانچویں صدی ہجری کی فارسی انشا پردازی اور اس زمانہ کے درباری انشا پردازوں

کا بہترین نمونہ ہے۔ واقعات کی تفصیل، مثالوں کے ذریعہ وضاحت، منظر نگاری میں بالغ نظری اور ادبِ عربی کا غیر معمولی اثر بیہقی کی اس کتاب کے خاص اوصاف ہیں۔ اس میں عربی لغات کا استعمال اُس درجہ سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ جو پانچویں صدی ہجری کے آغاز تک عام طور پر فارسی نثر میں دیکھنے میں آتا ہے۔
(صفا)

خواجہ ابوالفضل بیہقی کی کتاب تاریخ دورِ مغول سے پیشتر زمانہ کی ان چند فارسی نثر کی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ جو ہم تک پہنچ سکی ہیں۔ یہ کتاب ادب فارسی کے شاہکاروں میں سے ہے۔ اور اپنے موضوع کے لحاظ سے تاریخ نویسی کا ایک نہایت عمدہ نمونہ اور طرزِ انشا کے نقطۂ نظر سے فارسی زبان کی بلاغت کی ایک عمدہ مثال ہے۔

بیہقی فنِ تاریخ کا موجد نہیں۔ اس سے پہلے بھی فارسی زبان میں تاریخ کی کتابیں موجود تھیں۔ لیکن غالباً تمام قدیم مؤرخین میں سے کسی نے بھی تاریخ کے معنی کو بیہقی کی طرح اچھی طرح نہیں سمجھا۔ اور نہ ہی تاریخ نویسی کے شرائط و آداب کا پورا شعور حاصل کیا۔ بیہقی نے اس فن میں جو جدتیں پیدا کیں۔ ان کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی۔ چنانچہ وہ خود کہتا ہے۔ کہ "تاریخ کی دوسری کتابوں میں واقعات کی پوری تفصیل نہیں دی گئی۔ بلکہ ان میں حالات کو سرسری نظر سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن جب میں نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ تو میں چاہتا ہوں کہ میں تاریخ نویسی کا پورا پورا حق ادا کر دوں۔ اور پوشیدہ اور مخفی واقعات پر اس طرح روشنی ڈالوں کہ کوئی چیز مبہم باقی نہ رہ جائے۔" پھر ایک دوسری جگہ وہ تواریخ قدیمہ پر طنز کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ کہ "ان کے بیان کردہ بیشتر قصے تاریخی حقیقت سے بہت دور ہیں۔ کیونکہ ہم ان تاریخوں میں کچھ اس طرح کے واقعات پڑھتے ہیں۔ کہ

فلاں بادشاہ نے فلاں سالار کو فلاں جنگ میں روانہ کیا فلاں روز جنگ یا صلح ہوئی۔ فلاں نے فلاں کو مارا وغیرہ وغیرہ لیکن میں تاریخ نویسی کے تمام فرائض کو صحیح طور پر بجا لاؤں گا۔"

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ کون سے فرائض تھے۔ اس کا مطلب آنے والے لوگوں کے لئے زندہ و حساس قسم کی تاریخ لکھنا ہے۔ کیونکہ بیہقی نے بقول خود بعد میں آنے والوں کے لئے اس تاریخ کو لکھا ہے اور اس نے اس امر کی طرف پوری توجہ مبذول کی ہے۔ کہ وہ لوگ زندہ و حساس تاریخ کے خواہاں ہوں گے۔ بیہقی کی تاریخ کی دلچسپ تفاصیل کی تہ میں یہی راز مضمر ہے۔ اور یہی چیز اس کتاب کا طرۂ امتیاز ہے۔

مؤرخ کے لئے دو عمدہ "شرطیں" "صداقت" اور" اطلاع" ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیہقی کو اپنے پڑھنے والوں کی نسبت بھی ان کی اہمیت کا زیادہ احساس تھا۔ چنانچہ وہ ہر موقع پر پڑھنے والوں کے دل کو راست گوئی، حقیقت دوستی کے علاوہ اپنی وسعتِ معلومات اور کثرتِ اطلاعات کے باعث پوری طرح مطمئن کر دیتا ہے۔ جیسا کہ کتاب کے مطالعہ سے یہ چیز بخوبی واضح ہو سکتی ہے۔ تاریخ بیہقی کے مندرجات یا تو خود اس کے چشم دید واقعات ہیں جنہیں اس نے پوری دقیقہ رسی کے ساتھ جمع کیا ہے۔ اور یا پھر وہ اطلاعات ہیں۔ جو اس نے نہایت تجسس کے بعد متعلقہ اشخاص اور واقف کار افراد سے حاصل کی ہیں ان دو ذرائع کے علاوہ چند ایک منقولات ایسے بھی ہیں۔ جو اس نے دوسری کتابوں سے اخذ کئے ہیں۔

ان کتابوں کے اکثر نام اس نے خود ہی بتا دیئے ہیں۔ وہ ان واقعات کی قدر و قیمت کے بارے میں اپنا نظریہ بھی پیش کرتا ہے بیہقی مدت مدید سے اس کتاب کی تالیف کا ارادہ رکھتا تھا۔ اور وہ بڑی دلچسپی اور تندہی کے ساتھ اس کے مواد کی فراہمی میں مشغول تھا۔ اسی کام کی خاطر اس نے

شاہی دربار کے ساتھ تعلقات استوار کرکے موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔ جو اس کے اپنے قول کے مطابق کسی دوسرے کو میسر نہ آسکتا تھا۔

لیکن تاریخ نویسی کے لئے صرف مواد کا فراہم کر لینا ہی کافی نہیں۔ بلکہ اس مواد سے استفادہ کرنے کے لئے سلیقہ و ہنر کی بھی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طرزِ انشا ایسا ہونا چاہیئے۔ جس کے ذریعہ گزرے ہوئے اور فراموش شدہ واقعات کو آنے والے لوگوں کے سامنے مجسّم اور محسوس صورت میں پیش کیا جاسکے۔ یہ ہنر بیہقی میں بدرجۂ اُتم پایا جاتا ہے۔ قدیم کتابوں میں سے بہت کم ایسی ہوں گی۔ جو قدامتِ زبان کے باوجود اپنے پڑھنے والوں کو اس قدر اپنی طرف متوجہ کر سکیں۔ اور ہر مطالعہ کرنے والا ان کی زبان سے واقف ہونے کے باوجود بڑے ذوق و شوق کے ساتھ کسی رنج و ملال کے بغیر نہیں پڑھ سکتا ہو بیہقی کا یہ شاہکار فارسی کی طبعی بلاغت کا منتہا ہے اور متقدمین کے طرزِ انشا کا بہترین نمونہ ہے۔ بیہقی عبارت کی سادگی ہی کو آرائش کلام کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اس کی زبان زندہ۔ سادہ اور باشکوہ دکھائی دیتی ہے۔ اس کتاب میں انشا پردازی کے مختلف نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس کے بعض ٹکڑے ایسے ہیں۔ جو بلاغت کے نقطۂ نظر سے فارسی زبان کی افضلیت کے لئے بطور سند پیش کئے جاسکتے ہیں۔

ابوالفضل محمد[2] بن حسین بیہقی ۳۸۵ھ میں بیہق کے موضع حارث آباد میں پیدا ہوا۔ زندگی کا ابتدائی حصہ تحصیل علم کے سلسلے میں نیشاپور میں بسر کیا۔ اس کے بعد وہ محمود غزنوی کے دیوانِ رسالت میں دبیری کے عہدہ پر فائز تھا۔ شروع میں وہ خواجہ ابونصر مشکان رئیس دیوان کے ماتحت بطور نائب دبیر کام کرتا رہا اور اس کے ساتھ اس کے بہت گہرے مراسم رہے۔ خواجہ ابونصر کی وفات کے بعد سلطان مسعود کے آخری عہد میں ابوسہل زوزنی رئیس دیوان مقرر ہوا۔ اگرچہ بیہقی کے ساتھ نئے رئیس دیوان کے تعلقات کشیدہ تھے۔ تاہم اس نے بادشاہ

کی حمایت کے باعث امن وامان میں اپنا وقت گزارا اور اسے ابوسہل زوزنی کی طرف سے کوئی نقصان نہ پہنچ سکا۔ لیکن سلطان مسعود کی وفات کے بعد حالات بدل گئے۔ اور بیہقی اور ابوسہل کے درمیان اس طرح کے حوادث پیش آئے کہ جن کی تفاصیل کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ عوفی کی روایت ہے کہ سلطان عبدالرشید کے دور میں بیہقی رئیس دیوان کے عہدہ پر فائز ہوا۔ لیکن کچھ مدت بعد مخالفین کی سازشوں کا شکار ہو گیا۔ اسے ملازمت سے معزول کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ اور اس کا تمام مال و دولت لوٹ لیا گیا۔ قید سے رہائی ملنے کے بعد اس نے دوبارہ دربارِ شاہی کا رخ نہ کیا۔ بلکہ اس نے اپنی باقی کی عمر عزیز میں اپنے گھر کے اندر گوشۂ خلوت میں گزار دی۔ اس دوران میں وہ اپنی کتاب کی تالیف میں مشغول رہا۔ آخر صفر ۴۷۰ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔

بیہقی کی تالیفات میں ایک کتاب "تاریخِ آلِ سبکتگین" بھی تھی۔ موجودہ کتاب یعنی "تاریخِ بیہقی" اسی کتاب کا ایک حصہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اصل کتاب تیس جلدوں سے بھی زیادہ تھی۔ اس میں سلطان ابراہیم کے آغازِ زمانہ تک کے حالات درج تھے۔

مؤلفاتِ بیہقی میں سے بعض دیگر کتابوں کے بھی نام ہمیں مختلف جگہوں میں ملتے ہیں۔ لیکن اس کی تمام تالیفات میں سے جو کتاب ہم تک پہنچی ہے۔ وہ تاریخ بیہقی کا یہی حصہ ہے اور چونکہ یہ تقریباً تمام تر سلطان مسعود بن محمود کے عہد کے حالات سے متعلق ہے۔ اس لئے اسے تاریخِ مسعودی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کا اصل موضوع سلطان مسعود ہی کے حالات ہیں۔ لیکن ضمناً بعض دیگر تاریخی موضوعات پر بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً مسعود سے قبل غزنویوں کی تاریخ۔ سامانیوں، سلجوقیوں اور صفاریوں وغیرہ کے حالات کے متعلق بھی بہت سے مفید معلومات اس سے حاصل ہوتے ہیں اسی طرح تاریخ ادبیاتِ ایران کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں اس

میں موجود ہیں اور بعض ایسے شعرا اور اشعار کا ذکر اس میں پایا جاتا ہے۔ جو کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتا۔ اس امر پر سب متفق ہیں کہ امیر مسعود کے زمانہ کی تاریخ کے لئے بیہقی کی کتاب بہترین سند ہے۔ اور غزنویوں سے متعلق باقی تصانیف مثلاً تاریخ عتبی۔ تاریخ گردیزی اور طبقاتِ ناصری میں اس قدر مفید معلومات اور اس قدر کی انفرادی و اجتماعی زندگی کی تفصیلات نہیں ملتیں۔ اس لئے بیہقی کی یہ کتاب بعد میں آنے والے مورخین کے لئے کئی غلطیوں کی تصحیح کا کام دیتی ہے۔ یہ تمام فوائد ان فوائد کے علاوہ ہیں۔ جو زبان و لغتِ فارسی کی تاریخ سمجھنے کے لئے اس کتاب سے حاصل ہوتے ہیں۔ کتاب میں مندرجہ جغرافیائی اطلاعات بھی اپنی جگہ بہت اہم ہیں۔ بیہقی کو تفاصیل و جزئیات کے ذکر کرنے میں دقتِ نظر کا ملکہ حاصل تھا۔ اسی ملکہ سے اس نے بہت سے جغرافیائی مقامات کا تذکرہ کیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے۔ کہ قدیم جغرافیہ کے تاریک گوشوں کو روشن کرنے کے لئے اس کتاب سے بہت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ (دکتر غنی و دکتر فیاض)

---

(۶) تاریخ سیستان

یہ فارسی کی معتبر کتابوں میں سے ہے۔ اس کا بیشتر حصہ قرن چہارم و نیمہ اوّلِ قرنِ پنجم میں لکھا گیا۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ جو اپنے طرزِ انشار کے لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ نظر آتے ہیں۔ اور دو مختلف زمانوں کے طرزِ تحریر کی غمازی کرتے ہیں۔ لازماً یہ کتاب دو شخصوں کے دماغ کی پیداوار ہے۔ چنانچہ اس کا پہلا حصہ ۴۴۵ھ یعنی سلاجقہ کے اوائل

دور تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ اور دوسرا حصہ ۴۲۵ھ کے بعد سے ۵۲۷ھ تک کے حوادث پر حاوی ہے۔ یہ حصہ آٹھویں صدی ہجری کے شروع میں لکھا گیا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا نے اقرار کیا ہے۔ کہ اس دور سے متعلق حوادث کے ذکر کے سلسلے میں اسی کتاب کا پہلا حصہ ان کا مآخذ ہے۔ کتاب کے اس حصہ کے بعض مضامین قدیم ترین کتابوں مثلاً نثر ابو المؤید بلخی وغیرہ سے لئے گئے ہیں۔ باقی حالات جو کتاب کا جزو اعظم ہیں کسی نامعلوم مؤلف کے رشحاتِ قلم ہیں۔ اس مؤلف کا طرزِ تحریر نہایت سادہ اور طبعی ہے۔ یہاں تک کہ اس سادگی اور فصاحت نے اس کو قدیم بڑے بڑے فصحی مثلاً بلعمی وغیرہ کے ہمدوش لا کھڑا کیا ہے۔ یہ کتاب اگرچہ پانچویں صدی ہجری کے وسط میں لکھی گئی ہے۔ تاہم وہ عربی لغات اور مشکل ترکیبات سے نسبتاً بہت حد تک عاری ہے۔ البتہ ان سادہ اصطلاحات اور ترکیبات پر مشتمل ہے جو اس وقت عام طور پر زبان زد تھیں۔ مثلاً "سبحان اللہ العظیم" یا "اعز اللہ الامیر" وغیرہ۔ کتاب میں بعض مقامات پر زبان کی قدامت اور کلمات و تراکیب کی بناوٹ میں کہنگی کے آثار اسی حد تک نمایاں ہیں۔ کہ یہ کتاب کافی حد تک عہد سامانی کی نثر میں لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس کتاب کی عمدہ خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔ فقرات کا کوتاہ ہونا۔ عبارات کا واضح ہونا۔ افعال نامہ کا استعمال اور بعض خاص تراکیب کا استعمال جو زیادہ تر مقامی ترکیبات تصور کی جاتی ہیں۔ (صفا)

یہ کتاب طرزِ انشا اور صرف و نحو کی بہت سی خصوصیات کی حامل ہے جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ مختصر طور پر یوں سمجھنا چاہئے۔ کہ اس کتاب کے قواعدِ انشا اور طرزِ تحریر فارسی کی قدیم ترین کتابوں مثلاً تاریخ بلعمی اور حدود العالم کے ساتھ پوری طرح مشابہت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر طرزِ تحریر کی چند خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

(۱) سادگی اور ایجاز بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ مترادفات کا استعمال جو فارسی نثر نگاروں کا محبوب شیوہ ہے۔ اس میں مفقود ہے۔ فقرے اور جملے مختصر اور چھوٹے ہونے کے باعث کتاب کا طرزِ بیان بے مثال حد تک شیریں اور لطیف بن گیا ہے۔ اور اس لحاظ سے یہ کسی فارسی کتاب کے مشابہ نہیں۔ سجع کی صنعت سے جو شاعری کی انواع میں سے ہے یہ کلی طور پر پاک وصاف ہے۔

(۲) عربی کلمات کو اعتدال سے اور فارسی کلمات کو کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔ بعض اوقات تو سوائے خاص نام یا تاریخ کے تمام فقرے میں ایک آدھ عربی کلمہ بھی نظر نہیں آتا۔ اور خالص فارسی عبارت بغیر کسی تکلف اور تصنع کے لکھی گئی ہے۔

(۳) اگر کہیں کہیں عربی لغات استعمال ہوئے بھی ہیں تو وہ وہی ہیں جو اس زمانے کے لوگوں میں متداول تھے۔ چنانچہ ان میں سے بیشتر الفاظ کا استعمال خود بلعمی کے ہاں بھی موجود ہے۔ مثلاً حرب (برائے جنگ) صعب (برائے سخت) ہزیمت (برائے گریز) عظیم (برائے بزرگ) اور قوت (برائے نیرو) وغیرہ یا اسی طرح حکومت کے متعلق بعض الفاظ مثلاً عامل۔ خراج سلطان اور وفد وغیرہ۔

(۴) حتی الوسع کوشش کی گئی ہے کہ فارسی کے غیر مانوس اور غریب الفاظ سے اجتناب کیا جائے۔ چنانچہ اس زمانے کی شعر وشاعری میں اکثر ایسے فارسی لغات مذکور ہیں۔ جن کا اسی کتاب میں نام ونشان بھی نہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ پرانے زمانے میں تاریخی کتابیں لکھنے والوں کی یہ کوشش ہوتی تھی۔ کہ ان کے اندازِ بیان کو تمام لوگ بآسانی پڑھ کر سمجھ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مشکل اور وحشی لغات کے استعمال سے پرہیز کرتے تھے۔ اگر کوئی ایسا لفظ یا ترکیب اس کتاب میں نظر آئے۔ تو یوں

سمجھنا چاہیئے۔ کہ وہ اس زمانے میں ایک عام اور سہل لفظ سمجھا جاتا تھا لیکن اس طرح کے الفاظ کی تعداد اس کتاب میں بہت ہی کم ہے۔

(۵) لغات و قواعد نحو و صرف کی خصوصیات وہی ہیں جو عام طور پر قدیم فارسی کتب میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً بعض افعال و اسماء ایک الف کے اضافے کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ جیسے شتر کی بجائے اشتر، سپرد کی بجائے اسپرد اور شکم کی بجائے اشکم وغیرہ۔

ادبی۔ لغوی اور نحوی خصوصیات سے قطع نظر اس کتاب میں بعض تاریخی امور بھی نہایت مفید اور قابل توجہ ہیں مثلاً۔

(۱) فضائلِ سیستان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو المؤید بلخی۔ بلال یوسف ادقی اور تاریخ سیستان (مؤلف نامعلوم) کے علاوہ زردشتیوں کی کتابیں بھی مصنف کے پیش نظر تھیں۔ چنانچہ اس نے اپنی تاریخ میں دو بار کتاب بندھشن کا ذکر کیا ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے عرب و عجم کے اسلامی مؤرخین نے غالباً کافی مدت تک اس کتاب کا نام بھی نہ سنا تھا یا اگر سن رکھا تھا۔ تو انہوں نے کم از کم اس کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ اس کتاب کا ذکر صرف اسی تاریخ سیستان میں دیکھا گیا ہے۔

(۲) ایران بن رستم مرزبانِ سیستان کی داستان اور امیر عرب ربیع بن زیاد کے ساتھ اس کا قصہ اس کتاب کے سوا اور کہیں نہیں ملتا۔

(۳) مہلب بن ابی صفرہ کی داستان اور اس کے سپہ سالار بننے کا قصہ اس قدر تفصیل کے ساتھ اور کسی کتاب میں نہیں دیکھا گیا۔

(۴) یعقوب بن لیث۔ عمرو بن لیث بلکہ خاندانِ صفاریہ کے بعض دوسرے افراد کے بارے میں نہایت عمدہ اور نئے نئے معلومات اس کتاب میں موجود ہیں۔

(۵) سب سے اہم یہ کہ یہ کتاب ہمیں چار قدیم شعرا سے متعارف کراتی ہے

جو یہ ہیں :-

(۱) محمد بن وصیف کاتب سنجری (۲) بسام کورد خارجی (۳) محمد بن مخلد اور (۴) صالح ملنجی ان کے حالات کے ساتھ ان کے اشعار کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔

یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں ہے کہ آیا یہ کتاب عربی سے فارسی میں ترجمہ ہوئی یا دراصل فارسی ہی میں لکھی گئی تھی۔ اور عربی کتب سے صرف استفادہ کیا گیا تھا۔ بالخصوص قدیم انشاپردازوں کے بارے میں اس قسم کا فیصلہ کرنا اور بھی زیادہ دشوار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں نثر فارسی زیادہ تر نثر عربی کی ہی تقلید ہے اور فارسی کی جو قدیم ترین کتابیں ہمیں نظر آتی ہیں۔ وہ عربی سے ہی فارسی میں ترجمہ ہوئی تھیں۔ ہمارا خیال ہے کہ دراصل یہ کتاب فارسی ہی میں لکھی گئی تھی۔ البتہ کہیں کہیں عربی کتب کے مطالب کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا گیا۔ مثلاً وہ مطالب جو ابوالموئید کے گرشاسپ نامہ سے نقل کئے گئے ہیں۔ اور فردوسی کے حالات وغیرہ۔ ان کے متعلق شک نہیں کہ وہ فارسی مآخذوں ہی سے لئے گئے ہیں۔ لیکن آنحضرت صلعم اور آپ کے اسلاف کے علاوہ خلفائے اسلامی کے حالات عربی سے ہی فارسی میں نقل ہوئے ہیں۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ جملہ بندی کے ضمن میں بعض ایسی تراکیب ہیں۔ جو بالکل عربی زبان سے مشابہ ہیں۔ مثلاً بعض اوقات فعل کو فقرے کے شروع میں اور بعض اوقات درمیان میں استعمال کیا گیا ہے۔ اور بجائے اس کے کہ زبان فارسی کے قاعدہ کے مطابق فعل کو جملہ کے آخر میں لایا جائے کسی اسم پر جملہ کو ختم کر دیا گیا ہے۔ اندریں حالات کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ آیا یہ کتاب تمام کی تمام عربی سے فارسی میں ترجمہ ہوئی۔ ناچار احتیاطاً ہم یہ کہتے ہیں۔ کہ چونکہ اب یہ کتاب فارسی میں ہمارے سامنے ہے اس لئے ہم اس کی اصل فارسی ہی کو قرار دیتے ہیں۔

ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے۔ کہ اس کتاب کا اصل نام سیستان نامہ

یا اخبارِ سیستان یا تاریخ سیستان ہے یا کوئی اور کیونکہ اصل نسخہ میں کچھ سراغ اس سلسلے میں نہیں ملتا۔ لیکن چونکہ یہ تاریخ سیستان کے نام سے مشہور ہے لہٰذا ہم نے بھی اسی نام کو ہی اپنا لیا ہے۔ کتاب کے بعض حصوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ مؤلف نے اس نسخہ کو آخری اور قطعی نسخہ قرار نہیں دیا تھا بلکہ اس کا خیال تھا کہ مواد جمع کرنے کے بعد مزید کانٹ چھانٹ کر کے اس کے نقائص کو دور کرے گا۔ لیکن اسے اس کی مہلت نہ مل سکی۔

افسوس ہے کہ اس تاریخ کے مؤلف کی تعیین نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ خطبہ کے فوراً بعد مؤلف اصل موضوع پر بحث شروع کر دیتا ہے۔ اور کتاب کے متن کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ ——————— کتاب کے دوران میں بھی مؤلف نے اپنے متعلق کسی قسم کا کوئی اشارہ نہیں کیا۔ علاوہ ازیں جہاں تک ہماری تحقیقات کا تعلق ہے۔ دوسری کتبِ تاریخ میں بھی اس کتاب یا اس کے مؤلف کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔

اس میں شک نہیں کہ تاریخ سیستان کو دو یا تین شخصوں نے یکے بعد دیگرے مکمل کیا ہے۔ تحقیقات کے مطابق اس کے مؤلف مولانا شمس الدین محمد موالی اور محمود بن یوسف اصفہانی دو شخص ہیں۔ مولانا شمس الدین محمد موالی نے ۴۴۵ھ تک کے واقعات قلمبند کئے اور محمود بن یوسف نے بعد میں اسی تاریخ کو ۴۶۵ھ کے واقعات سے شروع کر کے اختصار کے ساتھ انہیں ۷۲۵ھ تک پہنچایا۔

اس کتاب کے نہایت قدیم ہونے کی ایک دلیل تو اس کا شیوۂ تحریر اور طرزِ بیان ہے جس کی بنا پر اس کو قدیم نثر فارسی کی تین کتابوں کے ساتھ شمار کیا جا سکتا ہے۔ یعنی تاریخ بلعمی۔ تاریخ بیہقی ~~اور تاریخ~~ گردیزی۔ بلکہ اس کتاب میں بعض مقامات پر ایسی ترکیبات۔ لغات

اور اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں۔ جو بیہقی اور گردیزی سے بھی قدیم تر نظر آتی ہیں۔

دوسری دلیل ان شہروں اور قصبوں کے نام ہیں جو سلاجقہ کے بعد ترکمانوں اور مغلوں کی تباہ کاریوں میں ویران ہو گئے تھے۔ اور ان کے نام بعد کی جغرافیہ اور تاریخ کی کتابوں مثلاً معجم البلدان۔ نزہت القلوب۔ تاریخ ہراۃ اور احیاء الملوک وغیرہ میں نہیں ملتے۔

تیسری دلیل اس کی قدامت کی یہ ہے کہ اس میں قدیم مؤرخین اور ان کی کتابوں کے نام آتے ہیں۔ مثلاً ابو المؤید بلخی جس نے شاہنامہ منثور گرشاسپ نامہ اور عجائب البر و البحر لکھیں یا ہلال یوسف ادقی جس نے فضائل سجستان لکھی یا عبد اللہ بن المقفع جس نے سیر الملوک تصنیف کی یا ابو الفرج قدامہ بن جعفر جس نے کتاب خراج لکھی یا آتش پرستوں کی کتاب بندھش وغیرہ۔ یہ سب ایسے مصنفین ہیں۔ جن کی صرف چند ایک تصانیف ہم تک پہنچی ہیں۔ اس کے برعکس مؤلف مسعودی۔ طبری۔ بلعمی۔ ابو علی مسکویہ۔ بیہقی۔ گردیزی عتبی۔ سلامی اور اسطخری وغیرہ کا کہیں نام نہیں لیتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مؤلف کے زمانے تک ان چوتھی صدی ہجری کے مؤرخین کو ابھی چنداں شہرت حاصل نہ ہوئی تھی بلکہ قدما کی کتب ابھی متداول تھیں۔

(ملک الشعراء بہار)

---

(۷) سیاست نامہ

سیاست نامہ یا سیر الملوک اولین مشہور فارسی کتاب ہے۔ جو آداب معاشرت خلاق۔ بادشاہوں۔ امیروں۔ وزیروں۔ قاضیوں خطیبوں اور دوسرے طبقوں

کی سیاست پر لکھی گئی ہے۔ اسی طرح اس کتاب میں قیادہ۔ مزدک۔ باطنی اور خرمؔ دینی جیسے مختلف فرقوں کا ذکر آیا ہے۔ جو تاریخی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ سیاست نامہ کی طرزِ انشاء نسبتاً سادہ۔ شیریں اور متین ہے۔

اس کتاب کا مصنف خواجہ ابوعلی حسن بن علی نظام الملک طوسی ایرانی وزیر ہے۔ خواجہ نظام الملک تیس سال تک الپ ارسلان اور ملک شاہ سلجوقی کے دربار میں منصب وزارت پر فائز رہا۔ اس نے سیاست نامہ کو ملک شاہ کی درخواست پر ۴۸۴ھ میں اسماعیلیوں کے ہاتھوں قتل ہونے کے کچھ ہی دنوں پہلے لکھا تھا۔ (شفق)

سیاست نامہ یا سیر الملوک نظام الملک طوسی کی تالیف ہے جو ملک شاہ سلجوقی کی فرمائش پر ۴۸۲ھ میں لکھی گئی تھی۔ سیاست نامہ حکمرانی کے اصول اور بادشاہوں کی سیرت پر ایک مفید اور دلچسپ کتاب ہے۔ اس میں نظام الملک نے اپنے سالہاسال کے تجربات کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ سیاسی نظریات کے ساتھ ساتھ تاریخی حکایات بھی بیان کی ہیں۔ جن سے کتاب دلچسپ ہو گئی ہے۔

سیاست نامہ پچاس ابواب پر مشتمل ہے۔ ان میں معاشرت۔ اخلاق اور سیاستِ ملوک پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ امراء۔ وزراء۔ قاضیوں اور خطیبوں کے آداب و فرائض پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے سات باب فرقۂ اسماعیلیہ سے متعلق ہیں۔ جن میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہ اسماعیلی عقائد اصل میں مزدکی تعلیم کی صدائے بازگشت ہے جو نسلِ انسانی کے لئے تباہ کُن ثابت ہو چکی ہے۔ چنانچہ مؤلف نے پُرزور الفاظ میں اسماعیلی عقائد کی مذمت کی ہے۔

سیاست نامہ کا انداز عبارت کی سادگی اور روانی کے لحاظ سے تاریخ بلعمی سے مشابہت رکھتا ہے۔ لیکن اصطلاحات اور تشبیہات کے اعتبار سے ابوالفضل

کی تاریخ بیہقی سے ملتا جلتا ہے۔ سیاست نامہ میں جا بجا عربی کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ جو اس سے پہلے کی کتابوں میں دیکھنے میں نہیں آئے۔

(بدخشانی)

سید الوزراء قوام الدین نظام الملک ابو علی حسن بن ابوالحسن علی بن اسحاق الطوسی ۴۰۸ یا ۴۱۰ھ میں پیدا ہوا۔ وہ مجموعی طور پر تیس برس تک وزارت کے عہدہ پر فائز رہا۔ جب سلطان الپ ارسلان اپنے والد کے بعد خراسان کا حاکم بنا تو اس نے ۴۵۱ھ میں وزارت کا قلمدان اس کے سپرد کیا۔ آخرکار دس رمضان ۴۸۵ھ میں حسن بن صباح کے فدائی فرقہ کے ایک پیرو کے ہاتھوں بغداد کے راستے میں قتل ہوگیا۔

نظام الملک نے اپنی طویل مدتِ وزارت کے دوران میں متعدد تجربات حاصل کئے تھے۔ جنہیں اس نے ایک کتاب میں اکٹھا کیا۔ وہ کتاب سیاست نامہ یا سیرالملوک کے نام سے مشہور ہے اور پچاس فصلوں پر مشتمل ہے۔ آج بھی یہ کتاب فارسی کی بہترین ادبی یادگاروں میں شمار ہوتی ہے۔ سلاستِ انشا۔ جزالتِ عبارت۔ روشنیٔ مطالب اور متنوع موضوع کے لحاظ سے فارسی کی بہت کم کتابیں اس کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ اور جیسا کہ کتاب کے آخر میں بیان ہوا ہے یہ کتاب نہ صرف پند و نصائح پر مشتمل ہے بلکہ اس میں ضرب الامثال تفسیر قرآن، رسول اکرم کے حالات دوسرے انبیا کے قصص و واقعات اور عادل بادشاہوں کی حکایات بھی موجود ہیں۔ گویا یہ گزشتہ لوگوں کے حالات اور موجودہ لوگوں کی داستانوں کا ایک بے نظیر مجموعہ ہے جو اتنا مواد اپنے اندر رکھنے کے باوجود مختصر بھی ہے اور عدل پسند بادشاہوں کے لئے پیروی کا ایک نمونہ ہے۔

سیاست نامہ خصوصاً طرزِ تحریر کی سادگی اور عبارت کی روانی کے لحاظ سے قابل توجہ ہے۔ اس کتاب کی طرزِ انشاء کی روانی کا اندازہ یہاں سے کیا جا سکتا ہے۔ کہ

سینکڑوں سال کی مدت گزر جانے کے باوجود اس کا اچھوتا پن اور ترو تازگی ابھی تک قائم ہے۔ اس فصیح اور سادہ نثر میں کوئی لفظ بے محل استعمال نہیں ہوا۔ فقرات گو مختصر اور کوتاہ ہیں۔ لیکن بہت واضح ہیں۔ اور اس وجہ سے مطلب کے اخذ کرنے میں کوئی ابہام باقی نہیں رہتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاست نامہ میں بہت سے مقامات پر تاریخی واقعات مشتبہ ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ اس میں بہت سے اہم تاریخی معلومات جمع ہیں۔ اگرچہ مصنف کا نصب العین تاریخی اطلاعات جمع کرنا نہ تھا۔ لیکن اس نے جہاں ضروری سمجھا موقع و محل کی مناسبت سے ایران کے ان تاریخی اور سیاسی حالات کا ذکر کر دیا ہے۔ جو زمانۂ سابقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاکہ وہ سلطنت و حکومت کرنے والوں کے لئے سامان عبرت مہیا کر سکیں۔ یہی تاریخی حکایات بعض مواقع پر ایسی اطلاعات فراہم کرتی ہیں۔ جو سیاست نامہ جیسی تفصیلات کے ساتھ کسی دوسری کتاب میں دیکھنے میں نہیں آتیں۔

ایک اور ضروری بات جو سیاست نامہ کے سلسلہ میں قابل ذکر ہے۔ یہ ہے کہ اس کتاب سے بہت سی ایسی قیمتی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ جو غلبۂ مغول سے پیشتر ایران کے سیاسی اور مملکتی امور سے متعلق ہیں۔ بالخصوص سلاجقۂ بزرگ کے حالات سیاست نامہ کا یہ ایک خاص پہلو ہے۔ جو اسے ایرانِ قدیم کے اجتماعی اور تمدنی حالات کا پتہ دینے والی کتابوں میں نمایاں حیثیت کا مالک بنا دیتا ہے۔

یہ کتاب سلطان ملک شاہ سلجوقی کی فرمائش پر تالیف ہوئی اور اس کی طرف نظام الملک نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں واضح طور پر اشارہ کر دیا ہے۔ فرمان شاہی ملنے پر خواجہ نظام الملک نے رموزِ مملکت داری اور گذشتہ فرمانرواؤں کے آئین و رسوم کے بارے میں یہ کتاب ترتیب دی اور پھر اسے اپنی تحویل میں رکھا

حتیٰ کہ ۴۸۵ھ میں جب وہ ایک سفر کے دوران میں سلطان ملک شاہ کے ہمراہ بغداد کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے کتاب کے اجزا شاہی کاتب محمد مغربی کے سپرد کر دیئے۔ تاکہ وہ انہیں نقل کر سکے۔ اس نے نظام الملک کے حادثہ قتل کے بعد ان اجزا کو ترتیب دیا۔ اور آخر کار یہ کام جیسا کہ تسلیم کیا گیا ہے۔ محمد بن ملک شاہ (۴۹۲ - ۵۱۱ھ) کے عہدِ سلطنت میں انجام پذیر ہوا۔

شروع میں جب خواجہ نظام الملک نے یہ کتاب لکھ کر بادشاہ کے حضور میں پیش کی، یہ کل (۳۹) ابواب پر مشتمل تھی۔ بادشاہ نے اسے پسند کر لیا۔ لیکن کتاب چونکہ بہت مختصر تھی۔ اس لئے بعد میں نظام الملک نے اس میں بعض ایسے نکات اضافہ کر دیئے جو ہر باب سے مناسب تعلق رکھتے تھے۔ اور نہایت واضح اور آسان الفاظ میں ان کی شرح بھی کر دی۔ اس طرح ابواب کی کل تعداد پچاس تک جا پہنچی۔

(صفا)

سیاست نامہ مصنفہ نظام الملک سلطنت رانی کے موضوع پر ایک نہایت قابلِ قدر کتاب ہے۔ اس کا فارسی متن مسٹر چارلس شیفر (CHARLES-SHEFER) نے ۱۸۹۱ء میں شائع کیا تھا۔ پھر اس کا فرانسیسی ترجمہ قابلِ قدر تاریخی حواشی سمیت ۱۸۹۳ء میں طبع کیا۔ بعد ازاں ۱۸۹۷ء میں ایک اور ضمیمہ شائع کیا گیا۔ جس میں نظام الملک کے حالاتِ زندگی اور اس کے زمانے کے عام حالات پائے جاتے تھے۔ جو مختلف کتبِ عربی و فارسی سے ماخوذ تھے۔ مسٹر شیفر نے اس ایڈیشن کی تیاری میں تین مختلف قلمی نسخے پیشِ نظر رکھے۔ جن میں سے ایک ان کا ذاتی تھا۔ دوسرا برٹش میوزیم میں اور تیسرا برلن میں تھا۔ ایک اور نسخہ کیمبرج کے کنگ کالج کی لائبریری میں بھی ہے۔ جو گو نسبتاً بعد کے زمانے کا ہے۔ لیکن بہت سے اغلاط کی درستی میں یہ ممد و معاون ثابت ہوا۔ اس ایڈیشن کے شائع ہونے سے بیشتر سیاست نامہ بہت ہی کم لوگوں کو دستیاب ہوتا تھا۔ کیونکہ اس کے قلمی نسخے صرف چند ایک ہی ہیں۔

سیاست نامہ پچاس ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں سلطنت مانی کے قریباً تمام فرائض اور ملک کے نظم و ضبط کے سلسلے میں ہر محکمہ کے متعلق ہدایات مذکور ہیں۔ یہ ۴۸۴ھ (۱۰۹۱ - ۱۰۹۲ء) میں یعنی مصنف کے قتل سے صرف ایک سال پہلے لکھا گیا تھا۔ اس کے معرضِ وجود میں آنے کا باعث یہ ہوا کہ ملک شاہ نے اپنے بعض لائق اور تجربہ کار مشیروں (مثلاً نظام الملک۔ شرف الملک۔ تاج الملک۔ مجد الملک وغیرہ) سے فرمائش کی تھی۔ کہ ان میں سے ہر ایک نظامِ حکومت کے بارے میں ایک مقالہ تحریر کرے۔ جس میں موجودہ حکومت کے نظم و ضبط کے عیوب و نقائص کی وضاحت کرے۔ اور اس کے ساتھ ہی گذشتہ زمانے کے ان اچھے رسوم و قواعد کا بھی ذکر کرے۔ جن کو اب متروک کر دیا گیا ہے۔ ملک شاہ کی اس فرمائش کی تعمیل میں جو مختلف مقالے تحریر ہوئے۔ ان سب میں سے اسے نظام الملک کا مقالہ بے حد پسند آیا۔ چنانچہ اس نے کہا کہ "نظام الملک نے تمام عنوانات پر میری مرضی کے مطابق اظہارِ خیالات کیا ہے۔ اس کتاب میں کسی قسم کے مزید اضافہ کی گنجائش نہیں"۔ پھر اس نے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ اسی کتاب کو اپنا ہادی اور راہ نما قرار دے گا۔ سیاست نامہ ۴۸۵ھ (۱۰۹۰ - ۱۰۹۳ء) میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اور کچھ ہی روز بعد نظام الملک قتل ہو گیا۔ نظام الملک نے خود لکھا ہے۔ کہ جب بادشاہ نے اس موضوع پر لکھنے کا مجھے حکم دیا تو میں نے اُنتالیس جواب قلم برداشتہ تیار کر لئے اور جب انہیں شاہی خدمت میں پیش کیا تو انہیں شرفِ قبول سے نوازا گیا۔ لیکن یہ ایک مختصر سا خاکہ تھا۔ بعد میں میں نے ہر باب میں اپنے ذاتی مشاہدات اور تجربات سے حاصل کردہ مناسب معلومات اس میں اضافہ کر دیئے اور زبان کو شُستہ اور صاف بنا دیا۔ ۴۸۵ھ میں جب ہم بغداد کو روانہ ہو رہے تھے۔ تو میں نے یہ مسودہ شاہی کتب خانہ کے ناسخ محمد مغربی کو سونپ

دیا۔ اور اسے فرمائش کی کہ اسے خوشخط نقل کیا جائے۔ اور اسے بادشاہ کے حضور نذر گذرانا جائے۔ نظام الملک کی وفات کے بعد اس مسودہ کے شائع کرنے میں اس لئے دیر ہوگئی کہ ملک شاہ کی وفات کے بعد بہت سی اندرونی خانہ جنگیوں اور فسادات نے اسطرف توجہ نہ ہونے دی۔

میرے خیال میں سیاست نامہ فارسی نثر کی کتابوں میں ایک نہایت بیش قیمت اور دلچسپ کتاب ہے۔ کیونکہ ایک تو یہ بہت سا تاریخی مواد اپنے اندر رکھتی ہے۔ دوسرے حکومت کے موضوع پر اُن نظریات کی بھی حامل ہے۔ جو اُس زمانے کے تمام مشرق میں مشہور ترین وزیر کے نزدیک صحیح تھے۔ کتاب کا انداز بیان غیر معمولی طور پر سادہ اور بے تکلف ہے۔ اور تصنع سے پیدا کردہ صنائع و بدائع سے یکسر پاک ہے۔ بلکہ بعض مقامات پر بول چال کی زبان اور بہت بے تکلفانہ الفاظ کا استعمال بھی روا رکھا گیا ہے۔ اس کے باوجود بعض قدیم تراکیب بھی اس میں پائی جاتی ہیں۔ جو اس زمانہ کے طرزِ انشا کی خاصیت تھیں۔

کتاب کے سات ابواب زیادہ تر ملحدانہ یا غیر اسلامی فرقوں کی تردید پر مشتمل ہیں۔ اسماعیلیہ اور باطنیہ کو بالخصوص موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

مصنف نے اس بات پر اظہار افسوس کیا ہے۔ کہ یہودیوں۔ عیسائیوں۔ آتش پرستوں اور قرامطہ کو حکومت کے عہدوں پر فائز کیا جاتا ہے۔ وہ سلطان الپ ارسلان کے دورِ حکومت کی تعریف کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے عہد میں ان لوگوں کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ وہ شیعہ کے خلاف بالعموم اور فرقہ سبعیہ کے خلاف بالخصوص پُر زور دلائل دے کر بحث کرتا ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کہ ان کے عقائد اور احکام دراصل جھوٹے اشتراکی پیغمبر مزدک کے جاری کردہ مذہب سے ماخوذ ہیں جسے نوشیروانِ ساسانی نے چھٹی صدی عیسوی میں قتل کرا دیا تھا۔ مصنف نے مزدک کے متعلق کافی لمبا بیان سپرد قلم کیا ہے اور بتایا ہے کہ مزدک اور اس کے پیرووں کے قتلِ عام کے بعد اس کے عقائد اور اصولِ تعلیم کی اشاعت

بابک خرمی نے کی۔ کتاب کا یہ حصہ اُن خرابیوں کا بھی تفصیلی ذکر کرتا ہے۔ جو عورتوں کے معاملاتِ سلطنت میں دخیل ہونے سے واقع ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں ان اوصاف کو بھی زیرِ بحث لاتا ہے۔ جن کی ایک قابل وزیر کو سخت ضرورت ہوتی ہے۔ مصنف نے سامانی دور میں اسماعیلی مذہب کے مبلغوں کی کارگزاریاں کا بھی جائزہ لیا ہے لیکن حسن صباح کا ذکر تک نہیں کیا۔ گویا بالواسطہ حسن بن صباح اور اس کے پیرووں کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا ہے۔

میں نے جن فارسی نثر کی کتابوں پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ ان سب میں سے مجھے یہ کتاب زیادہ پسند ہے۔ تاہم اس بات کے اعتراف کرنے میں بھی مجھے کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ اس کے بعض تاریخی واقعات کو بغیر سوچے سمجھے تسلیم کر لینا قرینِ عقل نہیں ہے۔ مثلاً یعقوب بن لیث کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے عباسی خلیفہ المعتمد کے مقابلے میں مہدیہ سے اس کے حریف فاطمی حکمران کو مقابلہ پر لانے کی دھمکی دی تھی۔ حالانکہ معتمد کا زمانہ حکومت ۸۷۰ سے ۸۹۲ء تک تھا۔ اور مہدیہ کا شہر ۹۱۰ء بلکہ ۹۲۰ء میں آباد ہوا تھا۔ اس قسم کی غلطیاں کتاب میں عام ہیں۔ بالخصوص ملحد اور غیر اسلامی فرقوں کے حالات میں اس کی وجہ غالباً یہ ہے۔ کہ ان فرقوں کے خلاف مصنف کے دل میں سخت عداوت اور نفرت کا جذبہ پہلے سے ہی موجود تھا۔ (براؤن)

سیاست نامہ کا ایک اڈیشن سنہ ۱۸۹۱ء میں پیرس سے شائع ہوا تھا۔ جسے فرانسیسی مستشرق چارلس شیفر (CHARLES — SHEFER) نے تصحیح کے بعد طبع کرایا تھا۔ اس کی تصحیح میں پانچ چھ قلمی نسخوں کو پیش نظر رکھا گیا۔ مصحح کا بیان ہے کہ ان میں سے بیشتر نسخے از حد درجہ غلط تھے۔ اس لئے عبارات کی درستی میں اسے نہایت محنت اور دقتِ نظر سے کام لینا پڑا۔ سیاست نامہ کا دوسرا نام سیر الملوک بھی ہے۔ یہ ابو علی حسن بن علی طوسی ملقب بہ نظام الملک کی تصنیف ہے۔ جو

الپ ارسلان اور ملک شاہ سلاطین سلجوقیہ کا ایک قابل وزیر تھا۔ اس نے اپنی یہ کتاب گیارھویں صدی عیسوی کے آخر میں جبکہ فتنہ و انقلاب کا دور تھا۔ قلم برداشتہ اور نہایت عجلت کے ساتھ تصنیف کی۔ یہ کتاب نہایت پسندیدہ موضوعات اور سلاطین و اکابر کی سیرت سے متعلق بہت مفید حکایات وغیرہ پر مشتمل ہے۔ (چارلس شیفر)

---

(۸) سفر نامہ ناصر خسرو

حکیم ناصر خسرو بن حارث قبادیانی ۳۹۴ھ میں بمقام قبادیان حوالی بلخ میں پیدا ہوا۔ اور اس نے ۴۸۱ھ میں وفات پائی۔ وہ سلجوقی عہد کا ایک نامور شاعر تھا جس نے شاعری کو مذہبی عقائد کی نشر و اشاعت کا وسیلہ بنایا۔ ناصر خسرو فارغ التحصیل ہونے کے بعد کچھ عرصہ غزنوی بادشاہوں محمود اور مسعود کے دربار سے وابستہ رہا۔ جیسا کہ اس نے اپنے سفرنامہ میں اشارہ کیا ہے۔ بعد میں دربار سلجوقیہ کی ملازمت اختیار کی۔ یہاں اسے دبیری کا منصب ملا۔ آخر (۴۵) سال کی عمر میں ملازمت کو خیرباد کہہ کر ۴۳۷ھ میں حج کعبہ کو روانہ ہوا۔ مکہ سے دمشق ہوتا ہوا بیت المقدس پہنچا۔ وہاں سے مصر آیا اور قاہرہ میں مقیم رہا۔ دوران سیاحت میں اس نے ارمنستان۔ ایشیائے کوچک۔ طرابلس۔ شام۔ سوریہ فلسطین جزیرۃ العرب۔ تہران۔ اور سوڈان کی سیاحت کی اور چار مرتبہ حج کی سعادت سے بھی سرفراز ہوا۔

ناصر خسرو نے سیاحت کے دوران میں اپنا سفرنامہ مرتب کیا۔ اس میں ان شہروں کا مفصل حال لکھا ہے۔ جہاں جہاں سے اس کا گزر ہوا۔ ان لوگوں کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ جن سے اسے ملنے کا موقع ملا۔ سفرنامے کے مطالعے سے پتہ

چلتا ہے کہ وہ مصر میں تین سال مقیم رہا۔ یہاں وہ فاطمی خلیفہ کے نظم ونسق ۔ عدل وانصاف اور شان وشکوہ سے بہت متأثر ہوا۔ اس کے علاوہ اسماعیلی عقائد کا بھی اس پر بہت اثر تھا۔ چنانچہ قیامِ مصر کے دوران میں وہ اس نئے دین کا حلقہ بگوش ہو گیا۔ ناصر خسرو کو خدمت میں شرفیاب ہونے کے اکثر موقعے ملتے تھے۔ خلیفہ اس کی بہت عزت کرتا تھا۔ چنانچہ اسے "حجت" کے لقب سے نوازا اور اُسے اختیار دیا کہ ایران جا کر اسماعیلیہ عقائد کی نشر و اشاعت کرے۔ (بدخشانی)

ناصر خسرو نے سلطان محمود اور سلطان مسعود غزنوی کے دربار بھی دیکھے چنانچہ اپنے سفرنامہ میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کے بعد انہیں سلجوقی دربار میں دیوانی کی خدمت ملی اور وہ دیر تک رہے ہے۔ ناصر خسرو نے تحصیلِ علم اور تحقیق کے سوا سفر بھی بہت کئے تھے اور جوانی ہی میں ہندوستان۔ افغانستان اور ترکستان کا سفر کر چکے تھے۔ غالباً اس سیر و سیاحت کا مقصد مختلف قوموں کے حالات اور ان کے عقائد کی تحقیق تھی چنانچہ انہوں نے حجاز میں طول طویل سفر کئے۔ اور اس کے بعد اس بارے میں اپنی تحقیقات کے نتائج پیش کئے۔ ان کا یہ سفر سات سال میں پورا ہوا۔ اس کی ابتدا ۴۳۷ھ میں ہوئی اور انہوں نے حجاز۔ ایشیائے کوچک شام اور مصر کی سیاحت کی اور ان ملکوں کی مختلف قوموں اور مذہبوں سے واقفیت حاصل کی۔ خاص کر انہوں نے مصر میں اسماعیلیہ شیعوں سے دینی مطالب اور تفسیر کی تعلیم حاصل کی۔ ناصر خسرو نے ان سے روابط پیدا کئے۔ اور ان کا مذہب اختیار کیا۔ اور اس طریقہ کے متعصب گروہ میں داخل ہو کر ایرانیوں میں اس مذہب کی تبلیغ کے لئے ایران کا رُخ کیا۔ ناصر خسرو کے اس سفر کا ایک اہم نتیجہ ان کا سفرنامہ ہے۔ جو سفر سے واپس آنے کے بعد لکھا گیا ہے۔ اس سفرنامے میں ناصر خسرو نے بیشتر ان شہروں کا حال لکھا جسے انہوں نے دیکھا تھا۔ اور جن مشہور لوگوں سے

ملاقات کی تھی ان کا نام لیا ہے۔ اس طرح وہ آج سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے کی دنیا کے حالات ایک نفیس کتاب میں محفوظ کر کے اپنی یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ (شفق)

ناصر خسرو کی نثر کی سب سے پہلی یادگار کتاب اس کا سفرنامہ ہے جیسا کہ ہمیں معلوم ہے۔ ناصر خسرو نے اس خواب کے نتیجہ کے طور پر جو اس نے جو جانان میں دیکھا تھا۔ ۶ جمادی الآخرہ ۴۳۷ھ کو سفر حجاز کا ارادہ کیا۔ پہلے تو مرو میں گیا۔ پھر اسی سال ماہ شعبان میں نیشاپور آیا۔ پھر وہاں سے سمنان۔ تنسے۔ قزوین۔ آذربائیجان۔ ایشیائے کوچک۔ شام فلسطین ہوتا ہوا مکہ مکرمہ جا پہنچا۔ وہاں سے وہ شام کے راستے عازم مصر ہوا۔ اور کچھ مدت تک قاہرہ میں مقیم رہا۔ قاہرہ کے قیام کے دوران میں وہ تین بار زیارت مکہ مکرمہ سے مشرف ہوا۔ ۴۴۲ھ میں جب اس نے مکہ معظمہ کی آخری بار زیارت کی۔ تو واپسی پر وہ طائف اور یمن سے ہوتا ہوا ۴۴۳ھ میں بصرہ پہنچا اور پھر وہاں سے ارجان کے راستے ۴۴۴ھ میں اصفہان آیا۔ اور اسی سال جمادی الآخرہ میں بلخ کی طرف واپس چلا گیا۔

اس طویل سفر کے دوران میں ناصر خسرو نے عجیب و غریب واقعات کا مشاہدہ کیا۔ اور سخت تکالیف برداشت کیں۔ وہ اس زمانے کے مشہور و معروف آدمیوں سے ملا خصوصاً قاہرہ میں مستنصر باللہ فاطمی کے دربار تک رسائی حاصل کی۔ اور مذہب اسماعیلی میں اس نے ایک بلند مقام حاصل کر لیا۔ بلکہ اس مذہب میں وہ "حجت" سمجھا جانے لگا۔

اس دور و دراز سفر کی یادگار اس کا وہ سفرنامہ ہے جو نہایت دل آویز اور انتہائی سہل عبارت میں لکھا گیا ہے۔ یہ سفرنامہ بعض نہایت دقیق مشاہدات پر مبنی ہے۔ اور مختلف ممالک و بلاد کے باشندوں کی عادات و آداب پر حاوی

ہونے کے علاوہ قیمتی جغرافیائی اور تاریخی اطلاعات بہم پہنچاتا ہے۔ (صفا)

یہ سفرنامہ بھی سیاست نامہ کی طرح سادہ اور غیر مرصع طرز میں لکھا گیا ہے مصنف کا پورا نام ابو معین الدین ناصر خسرو القبادیانی المروزی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ وہ کچھ عرصہ تک خراسان میں چغری بک داؤد سلجوقی کے عہد حکومت میں سیکرٹری اور افسر مال کے طور پر ملازم رہا۔ سنہ ۱۰۴۵ء کے موسم خزاں میں اسے ایک خواب کے ذریعہ تنبیہ کی گئی اور اس نے مے نوشی کو ترک کر دینے کا مصمم ارادہ کر لیا جو آج تک اس کا محبوب مشغلہ چلا آ رہا تھا۔ کیونکہ وہ اسے دنیاوی تفکرات کو فراموش کرنے کا واحد ذریعہ خیال کرتا تھا۔ اس کے بعد اس نے حج کا ارادہ کیا۔ اب اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہو چکی تھی چنانچہ وضو کر کے جوزجانان کی مسجد میں جا کر سچے دل سے توبہ کی۔ اور جمعرات کے دن چھ جمادی الآخرہ سنہ ۴۳۷ھ کو وہ اپنے سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ (مطابق انیس دسمبر سنہ ۱۰۴۵ء) وہ مرد سے ہوتا ہوا نیشاپور، دامغان، سمنان، قزوین، تبریز، اخلاط، میافارقین، آمد، حلب اور معرۃ النعمان آیا۔ اس دوران میں اس [illegible] کی ملاقات، خواجہ موفق استاد علی رنسائی، مشہور شاعر قطران اور ابو العلا معری سے ہوئی۔ وہاں سے طرابلس، بیروت، عکہ میں آیا۔ شام میں کچھ عرصہ تک انبیاء کے مزاروں اور مقدس مقامات کی زیارت کی۔ سنہ ۱۰۴۷ھ کے موسم بہار میں اس نے مکہ کو پہلا سفر کیا۔ حج ادا کرنے کے بعد وہ دمشق کے راستے بیت المقدس گیا۔ لیکن چونکہ بحری سفر کے لئے موسم خوشگوار نہ تھا۔ اس لئے اس نے خشکی کے راستہ مصر جانے کا عزم کر لیا۔ چنانچہ بروز اتوار سات صفر سنہ ۴۳۹ھ کو وہ قاہرہ میں آ پہنچا (مطابق تین اگست سنہ ۱۰۴۷ء)

مصر میں ناصر خسرو نے دو یا تین سال تک قیام کیا۔ اور اسی زمانے میں اس کی زندگی میں ایک نیا انقلاب پیدا ہوا۔ کیونکہ یہیں اس نے

فاطمی خلیفہ المستنصر باللہ کی شان و شوکت۔ عدل و انصاف اور دانشمندانہ نظم حکومت کا مظاہرہ کیا۔ اور یہیں وہ اسماعیلی مذہب کے عقائد سے روشناس ہوا۔ یہاں تک کہ اسے مذہب کا مبلغ بنایا گیا اور خراسان میں اسے "حجت" کا لقب دے کر بھیجا گیا۔ سفرنامہ میں جو اس نے عوام الناس کے لئے تالیف کیا ہے مذہبی معاملات کے بارے میں اس نے زیادہ کچھ نہیں لکھا تاہم اس کے سفرنامہ کے دو مقامات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ فاطمی خلفاء کے سلسلہ نسبت کو درست تسلیم کرتا تھا۔ اس نے ان کی سلطنت دانی۔ مال و دولت کی فراوانی رعایا میں امن و خوشحالی کا بڑے جوش و خروش کے ساتھ تذکرہ کیا ہے اور شہر قاہرہ کا حال۔ وہاں کی مسجدوں۔ باغوں۔ عمارتوں اور قاہرہ کے مضافات کی بہت تعریف کی ہے۔ فاطمی طرز حکومت کے متعلق اس کی بیان کردہ تفصیلات نہایت قیمتی اور قابل قدر ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ان کے فوجی نظم و ضبط سے سخت متاثر ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ چونکہ فوج کو تنخواہ باقاعدہ ملتی ہے۔ اس لئے رعایا کو کسی ناجائز ٹیکس عائد کئے جانے کا کوئی خطرہ نہیں۔ تمام فوج ۲۱۵۰۰۰ فوجی دستوں پر مشتمل ہے۔ جس میں قیروانی۔ افریقی۔ حجاز کے بدوی۔ مصمودی۔ مشارقہ۔ ترک اور ایرانی غرض مختلف علاقوں کے باشندے ملازم ہیں۔ بازار بڑے پُررونق ہیں۔ مال و دولت کی بہتات ہے۔ جان و مال کی حفاظت اس درجہ تک ہے۔ کہ تاجروں کو اپنی دکانوں پہ تالا لگانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

ناصر خسرو کا سفر اس وقت سے جب کہ اس نے اپنے وطن کو خیرباد کہا۔ واپسی تک پورے سات سال تک جاری رہا۔ یعنی چھ جمادی الآخرہ ۴۳۷ھ سے لے کر ۲۶ جمادی الآخرہ ۴۴۴ھ تک۔ اس دوران میں اس نے پانچ بار حج ادا کیا۔ آخرکار وہ حجاز سے تہامہ۔ یمن۔ لحساء قطیف کے راستے بصرہ آیا جہاں اس نے دو ماہ قیام کیا۔ پھر ارجان۔ اصفہان اور سرخس سے ہوتا ہوا واپس مرو آپہنچا۔ (براؤن)

یہ سفرنامہ پہلی دفعہ پیرس میں ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۱ء) میں مستشرق شیفر کے اہتمام سے طبع ہوا۔ اور دوسری بار ۱۳۱۴ھ میں تہران سے شائع ہوا۔ سفرنامہ کی عبارت انتہائی سادہ اور غیر مصنوع واقع ہوئی ہے۔ اور ادبی نقطۂ نظر سے اس کا درجہ بہت بلند اور ممتاز ہے۔ باوجود اس کے کہ یہ ان پہلی کتابوں میں سے ہے۔ جو عربوں کے ایران پر غالب آنے کے بعد ایران میں فارسی زبان میں تصنیف ہوئیں۔ اور نو سو سال پہلے کی فارسی زبان آج کی فارسی زبان سے ترکیب الفاظ، ترتیب عبارات اور فقرات کی بناوٹ کے لحاظ سے بہت مختلف تھی۔ لیکن پھر بھی ہمارے دور کے قارئین اس کتاب کے مطالعہ کے دوران میں کسی قسم کی کوئی غرابت یا اجنبیت محسوس نہیں کرتے یہ اس کی دلچسپی اور شیرینی کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔ ایک خاص امتیازی وصف جو اس سفرنامہ بلکہ ناصر خسرو کی تقریباً تمام تصانیف میں پایا جاتا ہے۔ یہ ہے کہ مؤلف نے اپنی تصانیف میں عربی الفاظ کا بہت ہی کم استعمال کیا ہے۔ یہاں تک کہ شاید موجودہ دور کے لکھنے والے بھی اس سلسلے میں اتنے کامیاب نہیں ہو سکے۔

سفرنامہ کے ایک دو مقامات سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ موجودہ اور متداول سفرنامہ غالباً ایک مفصل کتاب کا اختصار ہے جو بعد میں کسی نے کیا ہے۔ (م یغنی زادہ)

---

(۹) قابوس نامہ

قابوس نامہ کا مصنف امیر کیکاؤس بن اسکندر بن قابوس دشمگیر زیاری حکمران تھا۔ یہ کتاب اس نے اپنی زندگی کے آخری دور میں اپنے بیٹے گیلانشاہ کے لئے پند و نصیحت کی غرض سے (۴۴) فصلوں میں لکھی تھی۔ امیر کیکاؤس ایک

نہایت سچا نیک اور پارسا آدمی تھا۔

قابوس نامہ آداب معاشرت۔ رسوم دوستی و اُلفت۔ ترتیبِ زندگانی۔ کسبِ فضائل اور تہذیب خصائل پر لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب ۴۷۵ھ میں یعنی مصنف کی وفات سے کچھ ہی دنوں پہلے لکھی گئی تھی۔ امیر کیکاؤس شاعرانہ ذوق بھی رکھتا تھا۔ اور اس نے اچھے شعر بھی لکھے ہیں۔ (شفق)

آلِ زیار کی حکومت کا زمانہ ۳۱۶ تا ۴۳۴ ہجری ہے۔ سامانی حکمران نصر دوم کے زمانے میں ایک شخص علی بن اطروش نے طبرستان میں عہدِ علویہ کی بنیاد رکھی تھی۔ لیکن چند ہی سال بعد ایک اور شخص مرداویج بن زیاد نے طبرستان کا علاقہ اس سے چھین لیا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ شخص اصفہان اور ہمدان کے علاقوں پر بھی قابض ہوگیا۔ اور آلِ زیار کی ایک خود مختار حکومت قائم کی۔ جو ایک سو سال سے زیادہ عرصہ تک قائم رہی۔ یہ عہد علم و فضل کی قدردانی کی وجہ سے مشہور ہے۔ مرداویج کے جانشینوں میں سے قابوس بن وشمگیر (۳۶۶ — ۴۰۳ھ) خاص طور پر بہت مشہور ہے۔ قابوس علم دوست آدمی تھا۔ خود شاعر بھی تھا۔ اور عربی و فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔

آلِ زیار کے عہد کی ایک مشہور یادگار قابوس نامہ ہے۔ جو قابوس بن وشمگیر کے پوتے امیر عنصر المعالی کیکاؤس بن سکندر بن قابوس کی تالیف ہے کیکاؤس نے یہ کتاب اپنے بیٹے گیلان شاہ کی راہنمائی کے لئے ۴۷۵ھ میں لکھی تھی۔ اس کے چند موضوع ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں:-

قابوس نامہ ایک دیباچہ اور چوالیس ابواب پر مشتمل ہے۔ دیباچے میں مصنف اس بات کا گلہ کرتا ہے کہ دُنیا سے ادب و احترام اُٹھ چکا ہے۔ چھوٹے بڑے کی تمیز باقی نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے بیٹے گیلان شاہ

کو نیکی کی زندگی گزارنے کی تلقین کرتا ہے۔

اس کتاب کے پہلے چار باب ذاتِ باری تخلیقِ کائنات۔ آدابِ مذہب سے متعلق ہیں۔ پانچواں باب حقوقِ والدین پر اور چھٹا باب ذہنی تربیت اور اظہار و بیان کی قوت کے متعلق ہے۔ ان کے علاوہ متعدد ابواب کھانے پینے، شطرنج اور چوسر کھیلنے، مہمان داری، ہنسی مذاق، محبت، عیش و نشاط، نیند اور آرام، شکار، جنگ، دولت جمع کرنے، شادی بیاہ، تربیت اولاد دوستوں کے انتخاب، دشمنوں سے احتیاط، معافی، سزا، عطا و بخشش، مطالعہ، شاہانہ فرائض، علوم و فنون، فن شعر، مصاحبوں اور دبیروں کے فرائض، سپہ سالار اور وزیر کے اوصاف، بادشاہ کے اوصاف و فرائض زمینداری اور سخاوت پر مشتمل ہیں۔

قابوس نامہ میں پچاس کے قریب حکایتیں ہیں جن میں بیشتر ذاتی تجربات کا نچوڑ معلوم ہوتی ہیں۔ یہ حکایات، حالات و واقعات پر روشنی ڈالنے کے لئے شامل کی گئی ہیں۔ قابوس نامہ، سادہ، صاف اور رواں زبان میں لکھا گیا ہے۔ اس میں شگفتگی اور مزاح کی چاشنی بھی ہے۔ ضرب الامثال کثرت سے استعمال کی گئی ہیں۔ قابوس نامہ میں ایسے متعدد الفاظ نظر آتے ہیں۔ جو آج کل متروک ہیں۔

اخلاقی نظریات جو مصنف قابوس نامہ نے پیش کئے ہیں۔ زندگی کے ساتھ بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں مثلاً وہ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتا ہے "احمقوں سے عقل سیکھو" "بہت زیادہ شرم و حیا نہ کرو۔ کیونکہ دنیا میں اکثر شخص محض شرم و حیا اور حجاب کی وجہ سے اپنے مقاصد میں ناکام رہ جاتے ہیں۔" "راست گوئی میں شہرت حاصل کرو تاکہ اگر کبھی جھوٹ بھی بولو تو لوگ یہی سمجھیں کہ سچ ہے۔"

معاشرتی اصول جو مصنف نے پیش کئے ہیں بہت مفید ہیں۔ چند اصول حسب ذیل ہیں:۔

"مہمان کی خاطر و مدارت میں کمی ہو جائے تو معذرت نہ کرو کیونکہ مہمان اس میں اپنی سبکی محسوس کرے گا۔" "مہمان کی موجودگی میں نوکروں کو سرزنش نہ کرو" شراب نوشی کے متعلق مصنف نے ذیل کی نصیحت کی ہے "شراب مذہباً حرام ہے۔ لیکن مجھے خیال ہے کہ میں خواہ تمہیں کچھ بھی کہوں تم شراب ضرور پیو گے لیکن یہ یاد رکھو کہ صبح کے وقت کبھی شراب نہ پینا اور نہ اس طرح سے پینا کہ تمہاری نمازیں قضا ہو جائیں۔ شراب پینا گناہ ہے۔ لیکن اگر تمہیں یہ گناہ کرنا ہی ہو تو سلیقے سے کرنا۔" (بدخشانی)

قابوس نامہ پانچویں صدی کے اواخر کی اہم ترین فارسی کتابوں میں سے ہے۔ جسے امیر عنصر المعالی کیکاؤس بن اسکندر بن قابوس بن وشمگیر بن زیار نے تالیف کیا جو خاندان زیاری کے دانشمند امرا میں سے تھا۔ اس کی وفات ۴۹۲ھ کے بعد ۵۰۰ھ سے پیشتر واقع ہوئی۔

عنصر المعالی کا ایک بیٹا گیلانشاہ نامی تھا۔ اس نے یہ کتاب اپنے اسی بیٹے کے لئے لکھی تھی۔ جیسا کہ قابوسنامہ سے صاف ظاہر ہے عنصر المعالی ایک نہایت دانشمند شخص تھا اور اپنے زمانہ کے بیشتر علوم و فنون سے آگاہ تھا۔ اس کی انہی وسعتِ معلومات کا نتیجہ تھا۔ کہ اس نے قابوسنامہ میں مختلف مباحث کے دوران میں اکثر علوم و فنون کا نہایت سادہ اور واضح بیان میں ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب اس نے اس ارادے سے لکھی تھی۔ کہ اس کی وفات کے بعد اگر اس کا بیٹا حاکم بنے یا مجبوراً اسے کوئی دوسرا کام کرنا پڑے تو وہ اپنی ذمہ داریوں سے کیونکہ عہدہ برآ ہو سکے۔ اس نے اس کتاب میں اپنے بیٹے کی تربیت کی خاطر لشکر کشی اور مملکت داری کے آئین و رسوم کے علاوہ ہر قسم کے متداول علوم و فنون کو بھی اپنی بحث کا موضوع بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی کتاب نہایت بیش قیمت معلومات اور ایران کے ان آداب و رسوم

سے متعلقہ تمام مسائل پر حاوی ہے۔ جو پانچویں صدی ہجری میں مروج تھے۔
عنصر المعالی نے اس کتاب میں فارسی کی اسی نثر مرسل کو اختیار کیا ہے جو چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے انشا پردازوں کے ہاں متداول تھی اس کی انشا کی خصوصیات یہ ہیں۔
(۱) قدامتِ زبان (۲) ان اصطلاحات و ترکیبات کا استعمال جو فارسی زبان میں پانچویں صدی ہجری کے شروع میں عام طور پر رائج تھیں۔ اگرچہ قابوسنامہ قریباً اسی عہد میں لکھا گیا۔ جب کہ سیاستنامہ تحریر کیا گیا تھا۔ لیکن اس کی زبان اور انشا سیاستنامہ کی نسبت زیادہ قدیم معلوم ہوتی ہے۔
جیسا کہ کتاب کے متن سے ثابت ہوتا ہے۔ مؤلف نے اس کتاب کا نام نصیحت نامہ رکھا تھا۔ محمد عوفی نے بھی اپنی کتاب جوامع الحکایات میں ان نصائح کے زیر عنوان جو کیکاؤس نے اپنے بیٹے کو کی تھیں۔ اس نصیحت نامہ کا ذکر کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ قابوس نامہ کا نام اسے بعد میں دیا گیا۔
عنصر المعالی نے اپنے بعض اشعار جو فارسی اور طبری زبان میں تھے۔ قابوسنامہ میں نقل کئے ہیں۔ اور آغاز کتاب میں تالیف کتاب کے قصد اور اس کے اختتام پذیر ہونے کا بالتفصیل ذکر کیا ہے۔ (صفا)

قابوس نامہ اخلاق اور سیرت کے بعض پہلوؤں پر حاوی ایک کتاب ہے جسے قابوس بن وشمگیر حاکم طبرستان کے پوتے عنصر المعالی کیکاؤس نے ۱۰۸۲ء - ۱۰۸۳ء میں اپنے بیٹے گیلان شاہ کے لئے مرتب کیا تھا۔ اس کتاب کی تالیف کے وقت عنصر المعالی کی عمر تریسٹھ برس تھی۔ اور وہ اعلیٰ درجہ کی ادبی خصوصیات کا حامل تھا۔
قابوس نامہ کے قلمی نسخے برٹش میوزیم۔ لیڈن۔ اور برلن کے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس کا متن تہران میں رضا قلی خاں نے ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۸ء)

۱۸۸۶ء) میں طبع کیا تھا۔ اس کتاب کا ایک ترجمہ فرانسیسی زبان میں پیرس سے ۱۸۸۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اور تین مختلف ترجمے ترکی زبان میں ہو چکے ہیں، جن کے متعلق مسٹر ریو نے اپنی فہرستِ مخطوطاتِ ترکی میں بحث کی ہے۔ ان کو اس نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہ کتاب کافی ہر دل عزیز رہی ہے۔ اور واقعی یہ اس کا حق بھی ہے۔ کیونکہ یہ حکمت و دانش سے پُر ہے۔ اس میں بے شمار واقعات وحالات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ ایک شاہی خاندان کے فرد کی تصنیف ہے۔ جس میں اس نے اپنی زندگی کے تجربات کا نچوڑ بے کم وکاست قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے اس کتاب کو سیاست نامہ کے پہلو بہ پہلو رکھا جا سکتا ہے۔

قابوس نامہ کے (۴۴) ابواب ہیں۔ شروع میں ایک مقدمہ بھی ہے۔ جس میں مصنف نے جذبۂ اطاعتِ والدین کے مفقود ہو جانے پر ماتم کیا ہے۔ اس کے بعد مؤلف اپنے بیٹے کو اچھے اعمال سے آراستہ زندگی اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اور اسے اس بات کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ کہ وہ اپنے والد اور والدہ کی طرف سے بڑے اعلیٰ حسب ونسب کا مالک ہے۔ اس کے بعد مضامین کتاب کی فہرست دی گئی ہے۔ پہلے چار ابواب خالق، مخلوق اور مذہبی فرائض سے متعلق ہیں پانچواں حقوق والدین سے بحث کرتا ہے۔ چھٹا اور ساتواں ذہنی قوئے اور قوتِ بیان کو ترقی دینے کے بارے میں ہیں۔ آٹھویں باب میں پہلوی زبان کے چند نصائح اور اقوال درج ہیں۔ جو نوشیرواں کی قبر پر کندہ ہیں، بعد کے ابواب مختلف موضوعات مثلاً منازلِ عمر۔ کھانے پینے میں اعتدال۔ شراب نوشی۔ مہمان نوازی۔ شطرنج۔ مزاح عشق ومحبت۔ تعیش۔ حمام کا استعمال۔ نیند وآرام۔ شکار۔ چوگان۔ جنگ۔ بحیدو شکار۔ شادی بیاہ۔ تربیتِ اولاد۔ دوستوں کا انتخاب۔ دشمنوں سے احتیاط۔ عفو۔ تقریر۔ احسان۔ مطالعہ۔ طب۔ ہیئت۔ ریاضی۔ شعر وشاعری۔ وزارت۔ خدمتِ ملوک۔ درباری کے اوصاف۔ بادشاہ۔ وزراء اور جرنیلوں کے اوصاف وفرائض۔

کاشتکاری اور تجارت وغیرہ پر ہیں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ سیاست نامہ کی طرح قابوس نامہ میں بھی ایسے ۵۰ واقعات اور قصے پائے جاتے ہیں۔ جو مصنف کے ذاتی تجربات پر مبنی ہیں۔ ان میں سے بیشتر فارسی حکایات کے بعض مجموعوں میں ملتے ہیں۔ قابوس نامہ کے بعض مندرجات ابن اسفندیار کی تاریخِ طبرستان اور دولت شاہ کے تذکرہ میں بھی پائے جاتے ہیں۔

ان دلچسپ واقعات کے علاوہ قابوس نامہ میں بہت سے اشعار بھی موجود ہیں جن میں سے اکثر مصنف کی خود ساختہ رباعیات ہیں۔ بعض دوسرے شعرا مثلاً ابوسعید ابوالخیر۔ ابوشکور بلخی۔ عسجدی۔ فرخی۔ لبیبی وغیرہ کے اشعار بھی نقل کئے گئے ہیں۔ ان واقعات میں حکمائے یونان مثلاً فیثا غورث۔ سقراط۔ افلاطون۔ ارسطو۔ جالینوس اور اسکندر اعظم کے نام آتے ہیں۔ پھر ساسانی خاندان کے بادشاہوں اور وزیروں۔ پیغمبر اسلام کے اہلِ بیت۔ خلفائے بنی اُمیہ۔ بنی عباس۔ صفاریہ اور غزنویہ کے نام بھی موجود ہیں۔ مصنف نے اپنے بارے میں بہت کم لکھا ہے۔ وہ اپنا نسب نامہ نوشیرواں کے ساتھ ملاتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ اس نے خلیفہ قائم کے عہدِ حکومت میں حج ادا کیا۔

قابوس نامہ کا طرزِ انشا نہایت سادہ اور سیدھی سادی فارسی نثر کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ لیکن اس کی زبان سیاست نامہ کی نسبت کم منجھی ہوئی ہے اور گلستان جیسی کتاب سے اس کا درجہ فصاحت بہت کم ہے اس میں ظرافت اور مزاح کا کافی عنصر موجود ہے۔ دانشمندانہ اقوال اور ضرب الامثال کی بہتات بھی پائی جاتی ہے۔ مصنف مذہبی احکام مثلاً نماز۔ روزہ۔ حج اور زکوٰۃ وغیرہ کے روحانی فوائد کے علاوہ ان کے اخلاقی پہلو پر بھی بحث کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ مذہبی فرائض کس طرح انسان کو صفائی۔ تواضع اور تحمل وغیرہ کی عادت ڈال دیتے ہیں۔

اس کے بنیادی اقوال و نصائح نہایت دانشمندانہ ہیں اور اپنے اندر جدید رنگ رکھتے ہیں۔ مثلاً بیوقوفوں سے عقل سیکھنا۔ شیریں کلامی کے فوائد۔ زیادہ شرم و حیا

سے اجتناب - وغیرہ - صداقت کے متعلق اس کے خیالات بہت دلخوش کن ہیں چنانچہ وہ کہتا ہے کہ سچ بولنے میں اتنی شہرت حاصل کرو کہ اگر کسی وقت تم جھوٹ بھی بولو تو لوگ اسے درست سمجھیں - وہ اپنے بیٹے کو ایسا سچ بولنے سے بھی روکتا ہے - جسے ثابت کرنے کے لئے چار ماہ کی مدت اور دو سو معتبر آدمیوں کی شہادت کی ضرورت پیش آئے - اس کے بعد وہ جوا - شراب - تربیت اولاد - مہمان نوازی وغیرہ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے -

——————— ایراؤن)

کتاب کا نام :- یہ کتاب قابوس نامہ کے نام سے مشہور ہے اور بظاہر ہمیشہ اسی نام کے ساتھ معروف رہی ہے لیکن اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کتاب کا اصل نام نہیں کیونکہ نہ تو قابوس نامی کوئی شخص اس کا مولف تھا - اور نہ یہ قابوس نامی کسی شخص کے لئے لکھی گئی - اس کے مولف کا نام تو کیکاؤس تھا - اور اس نے اپنے بیٹے گیلانشاہ کے لئے یہ کتاب لکھی تھی - البتہ اس کے دادا کا نام قابوس ضرور تھا - چاہیئے تو یہ تھا کہ اس کتاب کا نام کاؤس نامہ یا کیکاؤس نامہ ہوتا - کیونکہ کتاب ہمیشہ اپنے مولف کے نام کی طرف منسوب ہوا کرتی ہے نہ کہ اس کے دادا کے نام کی طرف - ایک دلیل یہ ہے کہ مصنف نے خود کتاب کے آغاز میں لکھا ہے کہ میں نے اس نصیحت نامہ کو ۴۴ ابواب پر ترتیب دیا ہے - اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصل نام نصیحت نامہ تھا مگر اس نے قابوس نامہ کے نام سے شہرت حاصل کی -

کتاب کی افادیت :- ایرانی نوجوانوں کے لئے فارسی نثر میں جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں - ان میں سب سے زیادہ مفید قابوس نامہ ہی ہے - صاف اور شیریں زبان میں لکھی جانے کے علاوہ یہ نہایت مفید اور قیمتی نصائح کی حامل ہے اور اس میں ہماری بہت سی اندرونی بیماریوں کا مداوا موجود ہے - ہمارے اسلاف نے فارسی نثر میں اس سے پیشتر جو کتابیں لکھی تھیں - ان میں سے اکثر حوادث زمانہ کا شکار ہو گئیں - اور صرف ان کے نام ہی باقی رہ گئے - اور وہ جو اس وقت

ہمارے پاس موجود ہیں۔ وہ بھی چند وجوہات کی بنا پر اس کتاب کی برابری نہیں کر سکتیں۔ اول وجہ تو یہ ہے کہ دوسرے مؤلفین نے الفاظ اور معانی میں اس قدر سادگی اور خوش سلیقگی سے کام نہیں لیا۔ ان کی بیشتر تحریریں الفاظ کے نقطۂ نظر سے وہ روانی اور سادگی اپنے اندر نہیں رکھتیں جو دلفریبی کا بہترین حربہ ہے۔ زمانۂ قدیم کا تکلف اور تصنع جو کبھی مشکل پسند طبائع کو بہت مرغوب تھا۔ ہمارے زمانہ میں ناپسند سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے اگر پند و اندرز پر بحث کی ہے۔ تو انہوں نے ایسی باتیں نہیں کی ہیں۔ کہ جو عام انسانوں کی عادات سے بعید، مشکل اور نامناسب ہیں۔ یہاں تک کہ ان پر عمل پیرا ہونا بڑے بڑے آدمیوں ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کتاب کے ہر ورق پر بہت سے لغوی اور تاریخی فوائد بکھرے پڑے ہیں۔ اور اس زمانہ کے بہت سے رسوم و عادات کے متعلق ایسی معلومات پائی جاتی ہیں۔ جو کسی دوسری جگہ سے دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے۔ کہ اس کا لکھنے والا ایک اعلیٰ درجہ کا منشی اور دبیر تھا جس نے پانچویں صدی ہجری کی فارسی نثر کا بہترین نمونہ ہمارے لئے یادگار چھوڑا ہے۔ اس سے پیشتر ہمارے اسلاف نے جس قدر کتابیں تصنیف کیں ان میں سے ہر ایک پر کچھ نہ کچھ اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً محمد بن محمد بلعمی نے تاریخ طبری کا جو ترجمہ کیا ہے۔ اس میں بیشتر جگہ پر عبارت ہمارے اسلاف کی طبعی فارسی کی طرح سادہ نہیں ہے۔ اور مترجم کے لئے عربی الفاظ سے پیچھا چھڑانا ناممکن ہو گیا ہے۔ اسی طرح خواجہ ابوالفضل محمد بن حسین بیہقی کی تاریخ مسعودی میں اکثر جگہوں پر تکلفات اور منشیانہ دشوار پسندیاں۔ نازیبا معلوم دیتی ہیں۔ اس کی بیشتر عبارات پیچیدہ اور مغلق ہیں۔ فقرات کی کوتاہی اور ایجاز جو فنِ بلاغت کا مدار علیہ ہے۔ اس کتاب میں مفقود ہونے کے برابر ہے۔ ان دونوں کتابوں کے علاوہ فارسی نثر میں چند علمی کتابیں مثلاً کتب

طب و نجوم و جغرافیہ ہیں۔ لیکن انہیں ادبی نثر کا نمونہ کہنا مشکل ہے۔ کلیلہ و دمنہ کا ترجمہ جو ابو المعالی نصر اللہ بن عبدالحمید شیرازی نے کیا ہے باوجود فصاحت اور عمدگی کے عربی الفاظ سے مبالغہ آمیز حد تک پُر ہے۔ یہی اعتراض تاریخ جہانکشائے عطا ملک جوینی پر بھی عائد ہوتا ہے۔ سعد الدین وراوینی کی کتاب ترجمۂ مرزبان نامہ۔ فضل اللہ قزوینی کی کتاب تاریخ معجم اور عبداللہ بن فضل اللہ شیرازی کی کتاب تاریخ وصاف وغیرہ میں یہ چیز اس افراط اور مبالغہ سے پائی جاتی ہے۔ کہ ان کتابوں کی انشا انتہائی ناپسند اور مکروہ بن کر رہ گئی ہے۔ شیخ الاسلام عبداللہ بن محمد انصاری کی بھی بہت سی کتابیں ہم تک پہنچی ہیں۔ وہ چونکہ مسجع اور مصنوعی نثر میں لکھی گئی ہیں۔ اس لئے عام پڑھنے والوں اور مدارس کے متعلمین کے لئے قابل تقلید نمونہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ یہی اعتراض قاضی حمید الدین بن عمر کی کتاب مقاماتِ حمیدی پر بھی وارد ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں بھی ایسے کلمات اور مطالب موجود ہیں۔ جو اس سادگی اور پاکیزگی سے عاری ہیں۔ جس کا مدارس کے ماحول کے لئے ہونا ضروری ہے۔ اندریں حالات ہمارے مدارس کی کتابوں میں سے بہت کم ایسی ہیں۔ جنہیں ہم جرأت کے ساتھ رواں فارسی نثر کا نمونہ قرار دے سکتے ہیں۔ مثلاً خواجہ نظام الملک کا سیاستنامہ۔ زین الاخبار مؤلفہ عبدالحیٔ بن ضحاک گردیزی۔ چہار مقالہ مؤلفہ نظامی عروضی۔ ترجمۂ تاریخ سیستان اور ترجمہ تاریخ بخارا وغیرہ۔ ان کتابوں میں سے ہر ایک سادہ و رواں فارسی نثر کا شاہکار ہے۔ لیکن ان کو بھی شروع سے لے کر آخر تک ہمارے مدارس میں نہیں پڑھایا جاسکتا۔ کیونکہ ہر ایک میں بعض ایسی باتیں پائی جاتی ہیں جو ہمارے زمانہ اور ماحول سے موافق نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ان کتابوں سے بھی انتخابات کرنے پڑتے ہیں۔ صرف ایک ہی کتاب ایسی ہے۔ جو ان تمام عیوب و نقائص سے بری ہے۔ اور وہ یہی عنصر المعالی کیکاؤس بن اسکندر کا قابوس نامہ

ہے۔ ان ہی خوبیوں کی بنا پر میں نے اس تحفہ کو اچھے لباس میں شائع کر کے اپنے اہل وطن کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب قدیم زمانے یعنی اپنی تالیف کے وقت سے ہی ایران میں شہرت حاصل کر چکی تھی۔ اور یہ فارسی کی مشہور ترین کتابوں میں شمار ہوتی رہی ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس کتاب کا دو زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اول ترکی زبان میں جسے سنہ ۸۲۴ھ اور سنہ ۸۲۷ھ کے درمیان احمد بن الیاس نے سلطان مراد دوم بادشاہ عثمانی کے حکم سے کیا۔

دوسرا ترجمہ فرانسیسی زبان میں فرانسیسی مستشرق مسٹر (A. QUERRY) آکیویری نے کیا جو سنہ ۱۸۸۶ء میں پیرس سے طبع ہوا۔

قابوس نامہ کا اصل متن اب تک ایران اور ہندوستان میں کم و بیش سات آٹھ بار طبع ہو چکا ہے۔ (سعید نفیسی)

---

(۱۰) کیمیائے سعادت

یہ ایک اخلاقی اور دینی کتاب ہے۔ اسے حجۃ الاسلام امام غزالی نے پانچویں صدی ہجری کے آخر میں تصنیف کیا تھا۔ اصل میں یہ کتاب ان کی مشہور عربی کتاب احیاء العلوم کے بہترین مطالب کا خلاصہ ہے۔ جو فارسی میں کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں اسلام کی اخلاقی تعلیم کے اصول کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ ایک نہایت مفید کتاب ہے۔ (شفق)

سلجوقی دور کی ایک زندہ جاوید کتاب کیمیائے سعادت ہے۔ جس کے مصنف محمد غزالی ہیں۔ جو پانچویں صدی ہجری کے بہت بڑے مفکر اسلام ہوئے ہیں۔ آپ کی تصنیفات کا چرچا ایشیا ہی میں نہیں بلکہ یورپ میں بھی ہوا۔ آپ کی ایک اہم

تصنیف "اکسیر ہدایت" ہے ۔ جو عربی زبان میں لکھی گئی تھی ۔ لیکن بعد میں انہوں نے خود ہی اس کا ترجمہ فارسی میں کیمیائے سعادت کے نام سے کیا ۔ اس عظیم کتاب کا موضوع اخلاقیات ہے ۔ اس میں احیاء العلوم کی طرح فلسفے اور مذہب کا لطیف امتزاج پایا جاتا ہے ۔ کیمیائے سعادت کا شمار سلجوقی دور کی بہترین کتابوں میں ہوتا ہے ۔

کیمیائے سعادت کا انداز بیان سادہ اور رواں ہے ۔ عبارت کے جملے چھوٹے چھوٹے ہیں ۔ مترادف الفاظ اور غیر ضروری فقرات کہیں نام کو نہیں ۔ استدلال کی غرض سے قرآنی آیات اور احادیث نبوی سے کلام کو زینت دی گئی ہے ۔ بعض بعض فقرات کے آخری فعل مثلاً "بود" "باشد" "شد" "گشت" وغیرہ حذف کر دیتے ہیں ۔ جس سے کلام میں حسن پیدا ہو جاتا ہے ۔ کبھی کبھی کسی فلسفیانہ نکتے کو واضح کرنے کے لئے اس کی تشریح بھی کر دیتے ہیں ۔ لیکن تفصیل میں غیر ضروری مترادفات نہیں آنے پائے ۔ (بدخشانی)

یہ کتاب امام غزالی کی اہم ترین یادگاروں میں سے ہے ۔ اور ان کی اپنی کتاب احیاء العلوم کا خلاصہ ہے ۔ جسے انہوں نے اپنے دس سالہ سفر کی واپسی کے بعد ۴۹۰ھ اور ۵۰۰ھ کے درمیان تحریر کیا تھا ۔ غزالی نے اس کتاب کو چار عنوانات اور چار رکنوں میں تقسیم کیا ہے ۔ چار عنوانات یہ ہیں :-

(۱) شناختنِ نفس خویش (۲) شناختنِ حق تعالیٰ (۳) شناختنِ دنیا (۴) شناختنِ آخرت ۔

چار ارکان مندرجہ ذیل ہیں :-

(۱) عبادات (۲) معاملات (۳) مہلکات (۴) منجیات ۔

امام غزالی نے ان عنوانوں اور رکنوں کو اس نقطۂ نظر سے ترتیب دیا ہے ۔ ۔۔۔ کہ پڑھنے والا اپنے آپ کو نقص و عیب کی صفات سے پاک و صاف

کرکے کمال کی صفات سے آراستہ ہو جائے۔ اور تمام اطراف سے قطعِ تعلق کرکے اپنے آپ کو خدا کے حوالے کردے۔ یعنی وہ انتہائی سعادت حاصل کرلے۔ جہاں طبقۂ صوفیان کے افراد پہنچنا چاہتے ہیں۔ بظاہر غزالی نے یہ کتاب ایک اخلاقی کتاب کی صورت میں لکھی ہے۔ اور اس کی بنیاد دین پر رکھی ہے۔ لیکن درحقیقت خانقاہ نشین صوفیوں کے نقطۂ نظر کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اور اس میں ان خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ جو امام غزالی کی زندگی میں انقلاب آنے کے بعد ان کے دماغ کی پیداوار تھے۔ (صفا)

امام غزالی بغداد میں چار سال تک مدرسۂ نظامیہ میں درس دیتے رہے۔ اسی اثنا میں دُنیا کی فانی چیزوں سے ان کا دل اچاٹ ہوگیا۔ چنانچہ سب کچھ چھوڑ کر وہ مکہ کو حج کے لئے چلے گئے وہاں سے ملک شام میں آئے اور یہیں انہوں نے اپنا شاہکار احیاء علوم الدین کی صورت میں ترتیب دیا۔ یہ کتاب عربی زبان میں تھی۔ بعد میں اس کا خلاصہ فارسی زبان میں پیش کیا۔ اور اس کا نام کیمیائے سعادت رکھا۔ اِس مجموعہ نے اُس سلسلۂ مواعظ کا کام دیا۔ جو مصنّف نے بغداد میں سفر سے واپسی کے بعد شروع کیا تھا۔ (براؤن)

امام غزالی نے قریباً ایک سو سے زیادہ تصانیف بطور یادگار چھوڑی ہیں۔ یہ تصانیف ضخیم کتابوں اور چھوٹے بڑے رسالوں کی صورت میں ہیں اور مختلف قسم کے علوم مثلاً فقہ، حدیث، کلام، اخلاق اور فلسفہ وغیرہ کے مضامین پر حاوی ہیں۔ کتاب احیاء علوم الدین جو عربی زبان میں ہے۔ وہ ان سب تصانیف میں گُل سرسبد کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کا فارسی میں خلاصہ کیمیائے سعادت کے نام سے موسوم ہے۔ امام موصوف نے احیاء العلوم کو اپنی گوشہ گیری اور عزلت نشینی کے زمانے میں تالیف کیا۔ اس میں مختلف ابواب و فصول

کی تقسیم تقریباً کیمیائے سعادت ہی کی طرح عمل میں لائی گئی ہے۔ غالب گمان بلکہ یقین ہے کہ کیمیائے سعادت احیاء العلوم کا خلاصہ کی صورت میں فارسی ترجمہ ہے جسے امام غزالی نے خود ہی احیاء العلوم سے اخذ کیا ہے۔ کیمیائے سعادت کا مقدمہ چند سال قبل تہران میں طبع ہوا تھا۔ الا مکمل کتاب ہندوستان میں کئی بار شائع ہو چکی ہے۔ ہمیں ایک ایسا نسخہ بھی ملتا ہے جس میں کسی شخص نے اصل مصنف کے طرزِ تحریر کو بعد کے زمانے کے مطابق ڈھالنے کے لئے کچھ تبدیلیاں کی ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اس میں بعض بیجا تصرفات کر دیئے گئے ہیں۔

(احمد آرام)

---

(۱۱) کشف المحجوب

کتاب کشف المحجوب پانچویں صدی ہجری کے وسط میں تالیف ہوئی۔ یہ اولین مشہور ترین کتاب ہے جو مشائخِ صوفیہ کے حالات۔ عقائد اور مقالات پر نہایت فصیح فارسی میں لکھی گئی ہے۔

اس کتاب کے مصنف ابوالحسن غزنوی ہیں۔ جو غزنہ کے آس پاس کے دو مقامات کی نسبت سے جلابی اور ہجویری کہلاتے ہیں۔ یہ کتاب نہ صرف پانچویں صدی کی فارسی نثر کا ایک نہایت اہم نمونہ ہے۔ اور اس میں نہایت مفید اور عمدہ اخلاقی اور صوفیانہ اقوال و حکم آئے ہیں، بلکہ اس میں عربی اشعار اور مختصر عربی جملے بھی نقل ہوئے ہیں جن میں سے بعض تصوف کی تعریف میں ہیں۔ (شفق)

یہ کتاب اہلِ تصوف کی اہم یادگاروں میں سے ہے جو پانچویں صدی کے وسط میں تالیف ہوئی۔ اس کے مؤلف کا نام ابوالحسن علی بن عثمان بن ابی علی جُلابی غزنوی ہجویری

ہے۔ جن کی وفات ۴۶۵ھ میں ہوئی۔ یہ بزرگ شیخ ابوالفضل محمد بن حسن ختّلی کے مرید تھے۔ انہوں نے اور بھی کئی ایک مشائخ کی صحبت سے فیض پایا تھا جن کے اقوال انہوں نے اپنی اس کتاب میں نقل کئے ہیں۔ ان کی یہ کتاب فرقۂ صوفیہ کی بنیادی اور قدیم ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اور بعد کے مصنّفین نے جنہوں نے مشائخ صوفیہ کے حالات و کوائف پر قلم اٹھایا ہے، اس سے بہت استفادہ کیا ہے۔ مثلاً شیخ عطار نے تذکرۃ الاولیاء میں اور مولانا جامی نے نفحات الانس میں۔

اس کتاب کا طرزِ تحریر مجموعی طور پر سادہ ہے۔ البتہ مؤلف نے اپنے معاصر مصنّفین کی نسبت مفرد عربی الفاظ کا استعمال زیادہ کیا ہے۔ بالخصوص ایسے مفردات یا عربی ترکیبات جو صوفیہ کے ہاں عام طور پر مستعمل تھے مثلاً عین الیقین۔ حق الیقین مقام و تمکین۔ محاضرہ و مکاشفہ وغیرہ کے الفاظ اس کتاب میں اکثر ملتے ہیں۔

ایک اور چیز جو قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ کشف المحجوب میں کہیں کہیں فقرے متوازن اور ایک قسم کی نثر موزوں میں ہیں۔ اس قسم کی نثر نے بعد میں خواجہ عبداللہ انصاری کی کتابوں میں زیادہ راہ پا لیا تھا۔ یہ طرزِ تحریر فرقۂ صوفیہ کی خصوصیات میں سے ہے۔ اور اس کی مثال تقریباً تمام مصنّفین کی کتب میں اکثر ملتی ہے۔ اس قسم کی عبارات کو درحقیقت ہم نثرِ مسجّع کے زمرہ میں شمار نہیں کر سکتے۔ بلکہ ہمارے خیال میں یہ ایک قسم کی نثرِ موزوں ہے۔ جو شعر کے زیادہ قریب ہے اور اس نے صوفیہ اور مجلس و منبر پہ وعظ کہنے والوں کے ہاں عام طور پر رواج پا لیا تھا۔ (صفا)

یہ کتاب مصنّف نے اپنی زندگی کے آخری سالوں میں لکھی۔ اس کا کچھ حصّہ انہوں نے قیامِ لاہور کے دوران میں بھی لکھا۔ یہ کتاب درحقیقت ان کے ایک ہموطن ابوسعید الہجویری کے بعض سوالات کے جواب کے سلسلے میں تصنیف کی گئی تھی۔ اس کتاب کا مقصد مختلف مشائخ کے صرف اقوال جمع کر دینا ہی نہیں ہے۔ بلکہ نظامِ تصوف پر بحیثیتِ مجموعی بحث، اور بڑے بڑے صوفیہ کے قواعد

واصول انسان کے اعمال وافعال کا مفصّل جائزہ لیتا ہے۔ شروع سے آخر تک مصنّف کا طرزِ بیان ایک معلم کا سا ہے جو اپنے شاگرد کو مسائل کی تلقین کرنا چاہتا ہو۔ کتاب کا وہ حصّہ جو صوفیہ کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ اسے بھی بڑے مشروح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مصنّف کسی موضوع یا مسئلہ پر اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرنے سے پہلے بالعموم تمام مختلف متداول آراء کا تجزیہ کرتا ہے۔ اور اگر ضرورت محسوس ہو تو ساتھ ساتھ ان کی تردید بھی کرتا جاتا ہے۔ تصوف کے مختلف مباحث اور مسائل کی بحث کو زیادہ جاندار اور مؤثر بنانے کے لئے مصنّف نے اپنے ذاتی تجربات کے ذریعہ ان کی وضاحت کی ہے۔ اس لحاظ سے کشف المحجوب رسالہ قشیری کی نسبت زیادہ دلچسپ ہے۔ کیونکہ مؤخر الذکر اگرچہ صوفیہ کے اقوال۔ معاملات اور مصطلحات تصوف کی تعریف وغیرہ کا ایک قیمتی مجموعہ ہے۔ لیکن اس میں رسمی اور عالمانہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اور عالمانہ اصطلاحات اور ایرانی فلسفیانہ مذاق رکھنے کے بغیر کوئی شخص اس کتاب سے استفادہ نہیں کر سکتا۔

علی ہجویری مذہب کے لحاظ سے سُنّی اور حنفی تھے۔ انھوں نے اپنے سے پہلے اور بعد میں آنے والے صوفیہ کی طرح شریعت اور تصوّف کے اعلیٰ مسائل کو باہم تطبیق دی ہے۔ اس سلسلۂ میں فنا کا مسئلہ بالخصوص قابلِ ذکر ہے۔ وہ اپنے روحانی پیشوا ختّلی سے متفق ہیں۔ کہ صحو، سُکر کے مقابلے میں قابلِ ترجیح ہے۔ وہ اپنے قارئین کو متعدد بار اور پُر زور طریق سے ہدایت کرتے ہیں کہ کوئی صوفی خواہ وہ کمال کے کسی درجہ پر کیوں نہ پہنچ جائے۔ کسی وقت بھی شریعت کی پابندی سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح راگ اور سماع سے وجد میں آنے یا اسی قسم کے محرکِ جذبات امور مثلاً شعر وغیرہ کے بارے میں ان کی رائے احتیاط پر مبنی ہے۔ وہ حلاج کے جادوگر ہونے کی تردید کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ کہ اس کے اقوال صرف بظاہر خلافِ شرع ہیں۔ وہ تصوّف

کو اسلام کی صحیح تعبیر اور تشریح کے طور پر پیش کرنے کے خواہشمند معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی تعلیمات کے بنیادی اصول ان کے معاصرین مثلاً ابو سعید بن ابو الخیر اور عبد اللہ انصاری وغیرہ سے ملتے جلتے ہیں۔ ان ہی تینوں صوفیوں کے پیش کردہ نظریات کو بعد میں فرید الدین عطار اور جلال الدین رومی نے مزید شدومد کے ساتھ دُنیا کے سامنے پیش کیا۔

کشف المحجوب میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ وہ باب ہے۔ جو اہلِ تصوّف کے مختلف فرقوں کے عقائد و اصول سے بحث کرتا ہے۔ یہ کتاب کا چودھواں باب ہے۔ اس میں مصنّف نے اہلِ تصوّف کے بارہ مختلف فرقوں کا ذکر کر کے ہر فرقہ کے خاص خاص عقائد کا جائزہ لیا ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے علی ہجویری سے پیشتر صرف ایک ہی فرقہ یعنی ملامتیہ کا ذکر تصوّف کی ابتدائی کتابوں میں پایا جاتا ہے بعد کی کتابوں میں باقی مکاتیبِ فکر کے متعلق جو اشارات پائے جاتے ہیں (مثلاً تذکرۃ الاولیاء وغیرہ میں) وہ غالباً علی ہجویری کے پیش کردہ معلومات پر ہی مبنی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ تصوّف کے بارہ مکاتیبِ فکر فی الواقع موجود تھے یا ہجویری نے تصوّف کے نظریہ کو منظم طریقہ سے پیش کرنے کی خواہش کے سلسلے میں اپنے دماغ سے اختراع کر لیے تھے۔ دوسرے گمان کا احتمال کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی معقول وجہ نہیں۔ البتہ یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ مصنّف نے ان مکاتیب فکر کے بانیوں کی طرف جو خاص عقائد منسوب کئے ہیں۔ ان میں مصنّف نے اپنے خیالات اور عقائد کا اظہار کر دیا ہو۔ اور اس طرح اصل عقائد میں گڑبڑ پیدا ہو گئی ہو۔ اس لئے ان مکاتیبِ فکر کا اس زمانے میں واقعی موجود ہونا غیر یقینی نہیں۔

کشف المحجوب کا مواد بیشتر زبانی روایات سے ہی اخذ کیا ہوا معلوم ہوتا ہے موضوع تصوف پر اپنے مآخذوں میں مصنّف نے جن کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے اب صرف کتاب اللمع ہی باقی رہ گئی ہے۔ جو ابو نصر السراج کی تصنیف ہے اس

نے ۳۷۷ یا ۳۷۸ھ میں وفات پائی ۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ اور اپنی طرز کی کتابوں کا سب سے پرانا نمونہ ہے۔ کشف المحجوب سے پتہ چلتا ہے کہ ہجویری نے اپنے اس پیشرو کے شاہکار کا اچھی طرح مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ کشف المحجوب کی ترتیب کسی حد تک کتاب اللمع ہی کی ترتیب پر مبنی ہے ۔ دونوں کتابیں اپنے طرزِ بیان کی عمومیت میں بھی ایک دوسرے کے بہت مشابہ ہیں ۔ کتاب اللمع کی بعض تفصیلی بحثیں بھی کشف المحجوب میں شامل کر دی گئی ہیں ۔

ہجویری نے ابو عبدالرحمان السلمی کی کتاب طبقات الصوفیہ اور ابوالقاسم القشیری کے رسالہ سے کافی استفادہ کیا ہے۔ حتیٰ کہ کشف المحجوب میں رسالۂ قشیری کی بعض عبارات کا فارسی ترجمہ بھی شامل ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ قشیری کے ساتھ ہجویری کے ذاتی تعلقات بھی تھے۔ اسی طرح بعض اقتباسات عبداللہ انصاری کی کتابوں سے بھی ماخوذ ہیں ۔

کشف المحجوب کے متعدد نسخے یورپ کے کئی ایک کتب خانوں میں موجود ہیں۔ یہ کتاب لاہور سے لیتھو پر طبع ہو چکی ہے۔ پروفیسر نکلسن نے اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ۱۹۱۱ء میں بریل سے شائع کیا تھا۔ (نکلسن)

---

(۱۲) چہار مقالہ

یہ اہم کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، چار مقالوں پر محتوی ہے جس کی ترتیب یہ ہے در ماہیت علم دبیری، در ماہیت علم شعر، در ماہیت علوم نجوم، در ماہیت علم طب۔ اس کتاب کا مصنف ابوالحسن احمد سمرقندی ملقب بہ نظامی عروضی ہے۔ عروضی نہ صرف فارسی انشا اور بلاغت کا استاد تھا۔ بلکہ وہ علمِ ادب میں بھی بڑی مہارت رکھتا تھا۔ اور خود بھی شعر کہتا تھا۔ چنانچہ اسی کتاب میں اس کے اشعار دیکھنے میں آتے ہیں۔

چہار مقالہ ۵۵۰ھ میں تصنیف ہوا اور اس کتاب کو غوری شہزادے ابوالحسن حسام الدین علی کے نام معنون کیا گیا ہے۔

چہار مقالہ سلاست انشاء طرزِ سخن - اسلوب عبارت کے لحاظ سے درجۂ اول کے فارسی نثر کے آثار میں شمار ہوتا ہے۔ اور فارسی نثر کا بہترین نمونہ سمجھا جاتا ہے اس لحاظ سے اس کا پایہ تاریخ بیہقی اور کلیلہ ودمنہ کے برابر ہے۔ اس کتاب کی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں اُس زمانے کے بہت سے شاعروں اور عالموں کے حالات اور ان کے اشعار آئے ہیں۔ اس لحاظ سے اس کتاب کی تاریخی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ خاص کر ایسے شاعروں اور عالموں کے حالات کے لئے جو مصنّف کے قریب العہد تھے ـــــ جیسے فردوسی ـــــ یا مصنف کے ہم عصر تھے جیسے معزّی اور خیّام۔ یہ کتاب بہت اہم معلومات کی حامل ہے۔ (شفق)

چہار مقالہ غوری عہد کی مشہور ترین کتاب ہے۔ اس کا مؤلف نظامی عروضی سمرقندی ہے۔ یہ غوری خاندان کے ایک شاہزادہ ابوالحسن حسام الدین علی کے نام سے منسوب ہے۔ اور اس کا سنِ تالیف ۵۵۱ - ۵۵۲ ہجری ہے۔ اس کتاب کا اصل نام مجمع النوادر ہے۔ لیکن چار مقالوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے یہ چہار مقالہ کے نام سے مشہور ہے۔ پہلا مقالہ علمِ دبیری کی ماہیت پر ہے۔ دوسرا علم شعر کی ماہیّت پر تیسرا علم طب اور چوتھا علمِ نجوم کی ماہیّت پر۔ مؤلف کا خیال ہے کہ ایک بادشاہ کو اپنی داخلی اور خارجی زندگی کے لئے مشیروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان مشیروں میں دبیر، شاعر، طبیب اور منجم خاص طور سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ نظامی عروضی ان چار قسم کے مشیروں کے اوصاف بتاتا ہے۔ ہر مقالے کے آخر میں اپنے خیال کی وضاحت کرنے کے لئے چند تاریخی مثالیں اور حکایتیں بھی لکھی ہیں۔

چہار مقالہ ایک مختصر سا رسالہ ہے لیکن ادبی اور تاریخی اہمیت کے پیشِ نظر

یہ تاریخ ادبیات ایران کا ایک قدیم ترین ماخذ ہے۔ سب سے پہلا شخص نورالدین محمد عوفی ہے جس نے اپنے تذکرہ لباب الالباب (مؤلفہ ۶۱۷ھ) کی تالیف میں چہار مقالہ سے استفادہ کیا۔ عوفی کے بعد حمداللہ مستوفی نے تاریخ گزیدہ (مؤلفہ ۷۳۰ھ) کی تالیف میں اس سے مدد لی۔ دولت شاہ سمرقندی نے اپنے تذکرۃ الشعراء (مؤلفہ ۸۹۲ھ) میں چہار مقالہ کے اقتباسات شامل کیئے۔ امین احمد رازی نے ۱۰۰۲ھ میں تذکرہ ہفت اقلیم لکھا اور اس نے بھی چہار مقالہ کے بیانات کو پیش نظر رکھا۔ ایران کے موجودہ تذکرہ نویس رضا زادہ شفق، سلیم نیساری، بدیع الزمان، ذبیح اللہ صفا اور مشہور مشرق پروفیسر براؤن نے بھی جگہ جگہ چہار مقالہ کے حوالے دیئے ہیں۔ علامہ شبلی نے شعر العجم میں چہار مقالہ کے بیانات کو سند کے طور پہ پیش کیا ہے۔

چہار مقالہ اس لیئے بھی تاریخ ادبیات کا بہترین ماخذ سمجھا جاتا ہے کہ یہ سلجوقی دور کی تالیف ہے۔ جو نظم و نثر کا اہم ترین دور ہے۔ اس زمانے کے بعض شعرا کے ساتھ مؤلف کے دوستانہ مراسم تھے۔ بعض کی شاگردی کا اسے شرف حاصل تھا۔ بعض کے متعلق اس نے بہت کچھ سنا تھا۔ اس لیئے اس کے بیانات نسبتاً زیادہ مستند ہیں۔

چہار مقالہ چھٹی صدی کے وسط کی تالیف ہے۔ لیکن اس کا انداز پانچویں صدی کی کتابوں مثلاً قابوس نامہ، سیاست نامہ اور تاریخ بیہقی کا سا ہے۔ اس میں بھی وہی سادگی، سلاست روانی اور اختصار پایا جاتا ہے۔ جو پانچویں صدی کی نثر کی خصوصیت ہے۔ چھٹی صدی کی نثر میں مترادف الفاظ کی بہتات اور مسجع کی بھرمار نظر آتی ہے جس سے چہار مقالہ خالی ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ نظامی عروضی نے پانچویں صدی ہجری کی نثر میں اس کتاب کو لکھنے کا اہتمام کیا۔ اس لحاظ سے چہار مقالہ کو متقدمین کی ادبی کتابوں کا خاتم سمجھنا چاہیئے۔ الفاظ و لغات کے اعتبار سے چہار مقالہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ آغاز کتاب

ہے جس کی چار فصلیں ہیں۔ ان میں الہیات وطبیعات کا ذکر ہے۔ ان علوم کے بیان میں مؤلف کو علم الہٰی، فلسفہ، طبیعات اور ہیئت کی اصطلاحات استعمال کرنی پڑیں اور عربی الفاظ کا استعمال بھی ناگزیر ہوا۔ لیکن اس کے باوجود مؤلف نے متقدمین کا اسلوب نہیں چھوڑا۔

دوسرا حصہ مقالات کا متن ہے۔ متن کی نثر سادہ، سلیس، رواں اور قدرتی ہے۔ اس میں چھٹی صدی کی نثر کا کہیں رنگ نظر نہیں آتا۔ کہیں صنعت مقابلہ، صنعت سجع یا استعارہ وکنایہ آیا ہے تو اس میں بھی سلاست وسادگی کا حسن نمایاں ہے۔ (بدخشانی)

یہ کتاب جس کا نام اصلی مجمع النوادر ہے۔ چار مقالوں پر مشتمل ہے جن میں ندمائے سلاطین کے چار طبقوں یعنی دبیروں، شاعروں، منجموں اور طبیبوں کے لئے ضروری شرائط کا بیان کیا گیا ہے۔ مصنف نے ہر مقالہ کے مقدمہ میں نہایت مزین اور پر تکلف عبارت میں مذکورہ فنون کے لئے مناسب شرائط وضروریات بیان کرنے کے علاوہ ان ابتدائی علوم کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن کا جاننا ان فنون کے لئے لازمی ہے۔ مصنف ان شرائط کو ہر مقالہ کے آخر تک لگاتار ذکر کرتا جاتا ہے۔ اور اپنے بیان کردہ نظریات کے دعویٰ کے ثبوت میں ایک یا زیادہ حکایات بیان کرتا ہے۔ جو متعلقہ فن کے مشہور ومعروف ماہرین کے حالات اور خصوصیات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور سلاطین کے ہاں ان کے جاہ و مرتبہ پر روشنی ڈالتی ہیں۔ اس بنا پر یہ کتاب نہ صرف مذکورہ بالا چاروں فنون اور ان کے ماہرین کے بارے میں تنقیدی لحاظ سے بہت مستند درجہ رکھتی ہے بلکہ اس سے زیادہ وہ ادب فارسی کی تاریخ میں بھی ایک بلند رتبہ کی مالک ہے۔ کیونکہ یہ بہت سے ایسے اہم تاریخی معلومات پر مشتمل ہے۔ جو بعض دوسری فارسی کتابوں میں بہت کم میسر آتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ کتاب چہار مقالہ شروع سے ہی شہرت اور اہمیت کی حامل چلی آرہی ہے۔ اور بعد کی کتابوں مثلاً تاریخ مؤلفہ ابن اسفندیار، تذکرۃ الشعراء مؤلفہ دولت شاہ اور تاریخ گزیدہ مؤلفہ حمد اللہ مستوفی وغیرہ میں اس سے بہت سے اقتباسات اخذ کئے گئے ہیں۔ کتاب مجمع النوادر یا چہار مقالہ کی تالیف ۵۵۱ - ۵۲ھ میں ہوئی ہوگی۔ کیونکہ اس کی تالیف کے وقت سلطان سنجر (متوفی ۵۵۲ھ) ابھی زندہ تھا۔ اس کے علاوہ ضمنی طور پر مصنف نے دبیروں کے زیر مطالعہ رہنے والی کتابوں میں مقامات حمیدی کا نام لیا ہے۔ جو ۵۵۱ھ میں تالیف ہوئی۔ یہ کتاب غوری شاہزادہ ابوالحسن حسام الدین علی کے نام پر لکھی گئی تھی۔ کتاب کا مؤلف ابوالحسن نظام الدین احمد بن عمر بن علی سمرقندی ہے۔ جو نظامی عروضی کے نام سے مشہور ہے۔ وہ چھٹی صدی ہجری کے مشہور انشاپردازوں اور شاعروں میں سے تھا۔ عوفی نے بہت مختصر طور پر اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اور اس کے چند اشعار بھی نقل کئے ہیں۔ جن میں کوئی خاص لطافت نہیں۔ گو نظامی نے شعر وسخن میں اپنا مقام بہت بلند بتایا ہے۔ لیکن اسے شاعری میں کما حقہ مہارت نہ تھی۔ اگر اسے شعر وسخن میں ایک باخبر استاد تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی یہ ماننا پڑے گا۔ کہ اسے ذوق خداداد سے کافی حصہ نہ ملا تھا۔ وہ شعر وشاعری کی نسبت فارسی نثر کا بزرگ استاد ہے۔ خواہ وہ نثر صنائع و بدائع سے آراستہ ہو یا سادہ اور فصیح ہو۔ اس کی کتاب چہار مقالہ گو بہت سے تاریخی شبہات کی حامل ہے۔ تاہم اسے فارسی نثر کی کتابوں میں ایک بہترین نمونہ اور یادگار شمار کیا جاتا ہے۔ ادب میں عالم متبحر ہونے کے علاوہ نظامی عروضی طب و نجوم میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ اس کے حالات زندگی زیادہ معلوم نہیں وہ پانچویں صدی کے آخر میں سمرقند میں پیدا ہوا تھا۔

کتاب چہار مقالہ اب تک کئی بار زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہے

پہلی دفعہ ۱۹۰۹ء میں بڑی تحقیق وتدقیق کے بعد حواشی و توضیحات کے ساتھ علامہ مرحوم مرزا محمد خاں قزوینی نے لیڈن سے شائع کی تھی۔ نظامی عروضی کا طرزِ انشا ادب فارسی میں بہت قابلِ توجہ ہے۔ کتاب کے چاروں ابواب کے شروع میں اگرچہ وہ نسبتاً صنائع وبدائع سے مزین عبارات کا استعمال کرتا ہے۔ لیکن کتاب کے باقی مقامات پر اس کی توجہ اس التزام کی طرف کم ہوگئی ہے وہ کبھی کبھی سجع کا استعمال بھی کرتا ہے۔ تاہم ہر جگہ اس کا کلام نہایت متین۔ مضبوط اور حشو وزوائد سے پاک ہے۔ لہذا انتہا درجہ کا فصیح وبلیغ ہے (صفا)۔

نظامی کی کتاب چہار مقالہ میرے خیال میں فارسی نثر کی نہایت دلچسپ اور قابلِ توجہ کتب میں سے ہے۔ یہ بارھویں صدی عیسوی میں ایران اور وسطِ ایشیا کی درباری زندگی پر سب کتابوں سے زیادہ روشنی ڈالتی ہے۔ اس کا مصنف یقینی طور پر درباری شاعر تھا۔ اور خاندان غور (یا ملوک الجبال) کی ملازمت میں منسلک تھا۔ چہار مقالہ کی تصنیف کے وقت تک اس شاہی خاندان کے ساتھ اس کے ۴۵ سالہ تعلقات تھے۔ اس کا نام اس کے اپنے بیان کے مطابق احمد بن عمر بن علی اور لقب نجم الدین تھا۔ لیکن وہ عام طور پر اپنے تخلص نظامی ہی کے ساتھ مشہور ہے۔ چونکہ اس کے معاصرین میں سے کئی ایک افراد نظامی کے نام سے مشہور تھے۔ اس لئے ان سے امتیاز کرنے کے لئے چہار مقالہ کے مصنف کو نظامی عروضی سمرقندی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ شاعر بھی تھا لیکن اس کے بہت کم اشعار ہم تک پہنچ سکے ہیں۔ دولت شاہ کے بیان کے مطابق وہ بہت سی مثنویوں کا مصنف تھا۔ لیکن اب ان کے نام تک بھی ہمیں نہیں ملتے۔ اس کے متعلق ہمارے تمام معلومات کا ماخذ اس کی اپنی کتاب چہار مقالہ ہی ہے۔ ۵۰۴ھ میں وہ سمرقند میں تھا اور ۵۰۶ھ میں نیشاپور میں مشہور منجم اور شاعر عمر خیام کی صحبت میں تھا۔ ۵۰۹ھ

میں ہرات میں سنہ ۵۱۰ھ میں دوبارہ نیشاپور میں اور طوس میں جہاں اس نے فردوسی کے متعلق مختلف روایات جمع کیں۔ اور اس کی قبر کی زیارت کی۔ اسی زمانے میں اس نے ملک الشعرا معزی کی حوصلہ افزائی اور مدد سے سلطان سنجر کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ اس وقت سے اس کا ستارۂ قسمت چمکا اور اس کی شہرت بڑھنے لگی۔ سنہ ۵۱۲ھ اور سنہ ۵۳۰ھ میں ہم اسے دوبارہ نیشاپور میں دیکھتے ہیں۔ اور اس آخری سال میں اس نے عمر خیام کی قبر کی زیارت کی۔ سنہ ۵۴۷ھ میں وہ ہرات میں روپوش ہو گیا۔ کیونکہ غوریوں کی فوج سلطان سنجر سلجوقی کے ہاتھوں شکست کھا گئی تھی۔ اس کی آخری زندگی کے حالات کے متعلق ہمارے پاس کوئی مواد نہیں اور اس کا صحیح سنِ وفات بھی نامعلوم ہے۔

اس کی ابدی شہرت کا باعث اس کی صرف یہی کتاب چہار مقالہ ہے جس کی ابھی تک کماحقہٗ قدر دانی نہیں کی گئی۔ حالانکہ وہ فارسی دان اہل علم کے سامنے شائع ہو کر منصۂ شہود پر آ چکی ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۳۰۵ھ میں اسے تہران سے طبع کیا گیا۔ اور اس کے تقریباً دس سال بعد پروفیسر براؤن نے اس کا انگریزی ترجمہ پیش کیا۔ کتاب شروع سے آخر تک مطالعہ کرنے کے قابل ہے۔ اس کے بعض اشعار کا نمونہ بھی اس کتاب میں ملتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے کلام کے متعلق بڑی اچھی رائے رکھتا تھا۔ (براؤن)

کتاب مجمع النوادر معروف بچہار مقالہ احمد بن عمر بن علی نظامی سمرقندی کی تالیف ہے جو باوجود مختصر ہونے کے فارسی زبان کی نہایت اہم ادبی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس کی اہمیت مندرجہ ذیل چند وجوہ کی بنا پر ہے:۔

(۱) قدامت:۔ اس کتاب کی تالیف جیسا کہ ابھی ثابت کیا جائے گا۔ ۵۵۰ھ کے لگ بھگ ہوئی۔ یہ واضح ہے کہ ایران پر مختلف قوموں مثلاً عربوں منگولوں۔ ترکوں۔ غزوں وغیرہ کے قتل و غارت کے باعث اور کچھ ایرانیوں

کے اپنے اسلاف کی یادگاروں کے تحفظ میں تساہل کی بنا پر فارسی زبان کی تقریباً تمام ادبی وعلمی کتابیں معدوم ہوگئی ہیں۔ اب جو کچھ باقی ہے۔ اس کی مقدار نہایت قلیل ہے اور ان کتابوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ زیر بحث کتاب بھی ان ہی بہترین اور دلکش ترین کتابوں میں سے ہے۔

(۲) **مطالب**:۔ یہ کتاب بہت سے ایسے تاریخی عنوانات اور بڑے بڑے مشاہیر کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ جن سے دوسری ادبی وتاریخی کتابیں بالکل عاری ہیں۔

(۳) **اسلوب بیان**:۔ انشا کے نقطۂ نظر سے یہ کتاب ایجازِ لفظ، اشتمالِ معنی اور سلاستِ کلام کا نمونہ ہے۔ یہ کثرتِ مترادفات، ثقیل قسم کی مسجع اور دور از کار صنائع لفظی سے بالکل پاک ہے۔ جو ایران کے اکثر انشا پردازوں بالخصوص متاخرین کی ناخوشگوار خصوصیات میں سے ہیں۔ اس لحاظ سے بہت ہی قلیل فارسی کتابیں اس کے متوازی رکھی جاسکتی ہیں۔ مثلاً تاریخ ابوالفضل بیہقی، تذکرۃ الاولیاء شیخ عطارؔ، گلستانِ شیخ سعدی، تاریخ گزیدہ مستوفی، منشآت مرزا ابوالقاسم قائم مقام وغیرہ۔

اپنی عام شہرت کے باعث کتاب چہار مقالہ پر کسی لمبی چوڑی بحث کی ضرورت نہیں۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ یہ کتاب چار مقالوں پر مشتمل ہے جن میں مصنف نے اپنے نظریہ کے مطابق ان چار طبقہ کے لوگوں سے بحث کی ہے۔ جو بادشاہ کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ یعنی دبیر، شاعر، منجم اور طبیب ہر مقالہ کے ضمن میں ہر طبقہ سے متعلق مخصوص شرائط کی شرح کے بعد مصنف نے مناسبِ حال دس تاریخی حکایات بیان کی ہیں۔ کتاب کا دوسرا مقالہ ادبی نقطۂ نظر سے بہت زیادہ اہمیت کا مالک ہے۔ کیونکہ اس میں ایران کے قدیم شعراء میں سے اکثر کے نام مذکور ہیں۔ جو سامانی، غزنوی، دیالمی، سلجوقی اور غوری درباروں سے وابستہ یا ان کے ہمعصر تھے۔ مزید برآں یہ مقالہ ان میں

سے چند مشہور شعرا مثلاً رودکی۔ عنصری۔ فرخی۔ معزی۔ فردوسی۔ ازرقی۔ رشیدی اور مسعود سعد سلمان کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالتا ہے۔ تیسرا مقالہ اپنے بعض معلومات بالخصوص عمر خیام کے متعلق اطلاعات بہم پہنچانے کے لئے اہم ہے۔ عمر خیام نے اسی دور میں رباعیات کا بہت سی مغربی زبانوں میں ترجمہ ہو جانے کے باعث یورپ اور امریکہ میں غیر معمولی شہرت حاصل کر لی ہے۔ غالباً چہار مقالہ اولین کتاب ہے جس میں عمر خیام کا ذکر ہمیں پہلی بار ملتا ہے۔ ساتھ ہی مصنف اس کا نہ صرف ہمعصر تھا۔ بلکہ اس نے اس کے ساتھ ملاقات بھی کی تھی۔ چہار مقالہ کی ایک حکایت میں عمر خیام کی اس پیش گوئی کا ذکر پایا جاتا ہے۔ جس میں اس نے کہا تھا کہ میری قبر ایسی جگہ واقع ہوگی جہاں ہر موسمِ بہار میں بادِ شمال مجھ پر گل افشانی کیا کرے گی۔ یہی حکایت اس کا باعث بنی کہ انجمنِ عمر خیام لندن نے عمر خیام کی قبر واقع نیشاپور سے گلِ سرخ کا پودا لا کر فیٹز جیرالڈ مشہور شاعر انگریزی اور بہترین مترجم رباعیات عمر خیام کی قبر پر لگایا

چہار مقالہ اپنے موضوع کی اہمیت اور اختصار کے باعث اپنے زمانۂ تالیف سے مشہور چلا آیا ہے۔ اور مقبول عام رہا ہے۔ تاریخ و ادب کی اکثر کتابوں میں اس کے مندرجات نقل کئے گئے ہیں۔ قدیم ترین کتاب جس نے اس کے اقتباسات لئے ہیں۔ محمد بن الحسن بن اسفندیار کی تاریخ طبرستان ہے جو چہار مقالہ کے قریباً ساٹھ سال بعد ۶۱۳ھ کے لگ بھگ تالیف ہوئی۔ ابنِ اسفندیار نے وہ فصل جو فردوسی اور سلطان محمود کی حکایت سے تعلق رکھتی ہے۔ تمام کی تمام اسی کتاب سے نقل کر دی ہے۔ اگرچہ اس نے چہار مقالہ کا نام نہیں لیا۔ اس کے بعد تاریخ گزیدہ۔ تذکرہ دولت شاہ۔ نگارستان قاضی احمد غفاری اور دوسری کتب تاریخ و تذکرہ میں بہت سی فصلیں اسی کتاب سے نقل کی گئی ہیں۔

بظاہر کتاب کا اصل نام مجمع النوادر ہی تھا۔ لیکن چار مقالوں پر مشتمل ہونے

کی وجہ سے اسے چہار مقالہ کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ امین احمد رازی نے تذکرہ ہفت اقلیم میں اور حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں یہ گمان کر لیا ہے کہ مجمع النوادر اور چہار مقالہ دونوں علیحدہ علیحدہ کتابیں ہیں۔ لیکن یہ ایک سہو ہے درحقیقت یہ دونوں نام ایک ہی کتاب کے ہیں۔ مجمع النوادر تو خود مصنف کا وضع کردہ نام ہے۔ اور چہار مقالہ زبانِ زدِ عام ہونے کی وجہ سے۔ اس کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ حمداللہ مستوفی نے تاریخ گزیدہ میں صرف مجمع النوادر کا ذکر کیا ہے۔ اور چہار مقالہ کا کہیں نام بھی نہیں لیا۔ حالانکہ اس کے پیش نظر صرف یہی کتاب چہار مقالہ تھی۔ کیونکہ اس کے اکثر مضامین اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں۔ اگر یہ دونوں نام ایک ہی کتاب کے نہ ہوتے تو کیا وجہ ہے کہ مستوفی چہار مقالہ کی شہرت کے باوجود اس کا نام بھی نہیں لیتا اور ساتھ ہی اس سے اقتباسات بھی کرتا ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ قاضی احمد غفاری نے نگارستان میں اپنے مصادروں کے ذکر میں مجمع النوادر کا نام لیا ہے اور پھر اسی مجمع النّوادر کے حوالے سے سات آٹھ حکایات لفظ بلفظ نقل کی ہیں اور یہ تمام حکایات ہر طرح چہار مقالہ کی حکایات کے مطابق ہیں۔ یہ بھی اس چیز کے لئے قطعی دلیل ہے کہ مجمع النّوادر اور چہار مقالہ ایک ہی کتاب کے دو نام ہیں۔ اسی طرح رضا قلی خان نے مجمع الفصحا کے مقدمہ میں صاف لکھا ہے کہ مجمع النّوادر نظامی عروضی مشہور بہ سمرقندی موسوم بچہار مقالہ"

باقی رہی تالیف چہار مقالہ کی تاریخ۔ اگرچہ کتاب کے اندر اس کا کہیں ذکر نہیں لیکن یہ یقیناً ۵۵۲ھ کے بعد کی تالیف نہیں جو سلطان سنجر سلجوقی کا سال وفات ہے کیونکہ کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ

سنجر تالیف کتاب کے وقت زندہ تھا چنانچہ مصنف اسے دعا دیتے ہوئے کہتا ہے۔ "الحال اللّٰہ بقاءہ و ادام الے المعالی ارتقاءہ" پھر ایک جگہ سلطان سنجر اور سلطان علاؤالدین غوری دونوں کے حق میں یوں کہتا ہے "خلد اللہ تعالیٰ ملکھما و سلطانھما" دوسری طرف مصنف نے انشا پردازوں کے لئے کتاب مقامات

حمیدی کا پڑھنا لازم قرار دیا ہے اور یہ کتاب ۵۵۱ھ میں تالیف ہوئی تھی اس لئے ثابت ہوا کہ چہار مقالہ کی تالیف ۵۵۱ھ سے پہلے بھی نہیں ہوئی۔ اندریں حالات اس کی تاریخ تالیف ۵۵۱ھ ـــ ۵۵۲ھ کے درمیان ثابت ہوتی ہے۔

(محمد خان قزوینی)

---

(۱۳) مقاماتِ حمیدی

مقاماتِ حمیدی کا مؤلف قاضی حمیدالدین ابوبکر بلخی ہے۔ جو بلخ کا قاضی القضاۃ تھا۔ یہ کتاب عربی کی مشہور کتاب مقاماتِ بدیعی کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ جس کا مؤلف بدیع الزمان ہمدانی ہے۔ اسی موضوع پر عربی کی ایک اور کتاب مقاماتِ حریری ہے۔ جو صنائع سے بھرپور ہے۔ مقاماتِ حمیدی لکھتے ہوئے غالباً قاضی حمیدالدین کے پیشِ نظر کتاب مقاماتِ حریری بھی تھی۔ کیونکہ صنائع کے اعتبار سے دونوں کا اسلوب ایک سا ہے۔

مقاماتِ حمیدی چھٹی صدی ہجری کی تالیف ہے۔ اس سے فارسی نثر کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ مقاماتِ حمیدی میں نثر کی سادگی کی جگہ تکلّف اور تصنّع نے لے لی ہے۔ صنعتِ مقابلہ، صنعتِ ایہام، صنعتِ تجنیس، صنعت سجع اور تشبیہیں اور استعارے بکثرت استعمال ہوتے ہیں۔ اسی اسلوب کو بعد کے ادیبوں نے بھی اپنایا ہے۔ بعض مقامات مناظروں کی صورت میں لکھے گئے ہیں۔ مثلاً شباب و شیب اور طبیب و نجومی وغیرہ۔ بعض مقامات معموں اور پہیلیوں پر مشتمل ہیں۔ بعض بیانیہ ہیں مثلاً بہار۔ خزاں۔ محبت۔ دیوانگی وغیرہ دو بیانیہ مقامات بلخ اور سمرقند پر بھی لکھے ہیں۔ ان میں بعض تاریخی اور جغرافیائی معلومات بھی بہم پہنچائی گئی ہیں۔ لیکن ایسے مقامات میں حمیدالدین نے اپنا

اسلوبِ خاص نہیں چھوڑا۔

مقاماتِ حمیدی کو اگرچہ مقاماتِ بدیعی اور مقامات حریری کا سا بلند مرتبہ تو حاصل نہیں . . . . لیکن اہل ایران کے نزدیک مقاماتِ حمیدی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ قاضی حمید الدین نے ۵۵۹ھ میں وفات پائی۔ (بدخشانی)

مقاماتِ حمیدی مسجّع فارسی کی مشہور کتاب ہے۔ کتاب کے مصنّف کا مقصد مقاماتِ حریری اور بدیع الزمان ہمدانی کی طرح نظیرہ گوئی ہے۔ اس کتاب میں ۲۳ ؟ مقامات ہیں اور یہ ادبی مطالب، مباحثات، مناظرات اور چیستان پر مشتمل ہیں۔ مصنّف کے پیش نظر فارسی میں مقالہ نویسی کی طرز کو رواج دینا اور بیرونی الفاظ اور مسجّع عبارتوں سے فارسی کو مزین کرنا تھا۔ کتاب کا مصنّف حمید الدین ابوبکر بن محمود بلخ کا مشہور قاضی تھا۔ اور مشہور ادیبوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس کے زمانے کے مشہور شعراء جیسے انوری وغیرہ نے اپنے اشعار میں اس کی مدح کی ہے۔ مقاماتِ حمیدی چھٹی صدی ہجری کے وسط میں لکھی گئی ہے۔ اور حمید الدین نے ۵۵۹ھ میں وفات پائی۔ (شفق)

یہ کتاب چھٹی صدی ہجری کی تالیفات میں سے ہے جس میں صنائع لفظی کا بہت زیادہ استعمال ہوا ہے۔ اس کا مصنّف . . . قاضی حمید الدین عمر بن محمود بلخی تھا۔ جو شہر بلخ میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز تھا۔ ابن اثیر کے بیان کے مطابق اس نے ۵۵۹ھ میں وفات پائی۔ انوری شاعر نے شہر بلخ کی ہجو کی تھی جس کی وجہ سے اس شہر کے عوام الناس نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ آخر انوری نے قاضی حمید الدین کے پاس پناہ لے کر نجات حاصل کی

عوفی نے لب الالباب تک مقامات کے علاوہ اس کی چند ایک دیگر تصانیف کے نام بھی بیان کئے ہیں۔ مجمع الفصحی میں ان کتابوں کے علاوہ ایک مثنوی بنام سفرنامۂ مرو بھی اس کی طرف منسوب کی گئی ہے۔

حمید الدین نے یہ مقامات بدیع الزمان ہمدانی اور ابوالقاسم حریری کی پیروی میں لکھے تھے، طرزِ تحریر اور مضامین میں بھی ان ہی کی تقلید کی۔ مقامات کا یہ مجموعہ چوبیس مقالات اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا آغاز جمادی الآخر ۵۵۱ھ موسم بہار میں ہوا اور نظامی عروضی کی کتاب چہار مقالہ کی تالیف سے تھوڑا ہی عرصہ قبل انجام پذیر ہوئی۔ اپنی شہرت کی بنا پر کتاب چہار مقالہ میں اس کا شمار ان کتابوں میں کیا گیا ہے جن کا مطالعہ دبیروں اور انشا پردازوں کے لئے لازم ہے۔ چونکہ اس کتاب میں خلیفہ مستنجد باللہ (۵۵۵ — ۵۶۶ھ) کے دورِ خلافت کے متعلق بھی بعض امور کا ذکر پایا جاتا ہے، اس لئے ماننا پڑے گا کہ قاضی حمید الدین نے کتاب مکمل کرنے کے بعد اس میں بعض تصرفات سے کام لیا ہے۔

نظامی کے چہار مقالہ کے علاوہ بعض دیگر مستند علما کی کتابوں میں بھی مقاماتِ حمیدی کو بہت سراہا گیا ہے۔ چنانچہ عوفی اس کتاب کے طرزِ انشا کے بارے میں کہتا ہے۔ کہ "اگرچہ مصنف نے عبارت میں سجع کے پہلو کو مدنظر رکھا ہے جیسا کہ اہوازی نے عربی نثر میں اور رشید الدین وطواط نے اپنے انشا میں۔ لیکن جہاں کہیں قاضی نے تکلف کی حد سے باہر نکل کر عبارت آرائی کی ہے۔ وہ حصہ نہایت لطیف ہو گیا ہے"۔ اسی طرح انوری نے بھی مقاماتِ حمیدی کی جو تعریف کی ہے۔ وہ اس کی مقبولیت کا ثبوت ہے اور اس چیز کی دلیل ہے کہ اس کتاب نے مؤلف کے حینِ حیات میں ہی ناقدینِ سخن کے ہاں قدر و منزلت حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ انوری کہتا ہے:۔

هر سخن کان نیست قرآن یا حدیثِ مصطفےٰ   از مقاماتِ حمید الدین شد اکنون ترهات

اشکِ اعمیٰ و آں مقاماتِ حریری و بدیع   پیش آں دریائے مالامال از آبِ حیات

کتاب کے مقدمہ اور اس کے خاتمہ میں جو چوبیسویں مقامہ کے بعد درج ہے قاضی حمیدالدین نے اس روش اور طریق کار کی شرح کر دی ہے جسے اس نے مقامات کی ترتیب میں ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ سوائے چند شعروں کے باقی تمام عربی و فارسی اشعار اس کے اپنے افکار کا نتیجہ ہیں۔ اثنائے کلام میں اس نے جابجا فارسی اور عربی ضرب الامثال سے استشہاد کیا ہے۔ اور اس کے علاوہ سلسلۂ کلام کے مختلف مواقع پر اس نے قسم قسم کے صنائع و بدائع کا استعمال بھی کیا ہے۔ (صفا)

یہ کتاب قاضی حمیدالدین ابوبکر بلخی کی تالیف ہے جو مشہور فارسی شاعر انوری کا معاصر تھا۔ انوری کی نظموں میں قاضی موصوف کی مدح سرائی بھی کی گئی ہے۔ مقامات حمیدی عربی مصنفین بدیع الزمان ہمدانی اور حریری کے مقامات کی تقلید میں لکھی گئی ہے۔ اور اس میں وہی طرزِ انشا اختیار کیا گیا ہے۔ اس کی تالیف کا آغاز سنہ ۱۱۵۶ء میں ہوا۔ صاحب چہار مقالہ نے اسے خاص طور پر انشا کا ایک اعلیٰ نمونہ قرار دیا ہے۔ بعض ایڈیشنوں میں مقامات کی تعداد تیئیس اور بعض میں چوبیس ہے۔ قاضی حمیدالدین کی وفات سنہ ۱۱۶۴ء میں ہوئی۔ اس کتاب کے مطالب کا تفصیلی ذکر مسٹر ریو نے اپنی کتب فارسی کی فہرست میں کیا ہے۔ اگرچہ وسعتِ مضامین اور طرزِ انشا کے لحاظ سے وہ عربی کی دونوں کتابوں سے کمتر درجہ رکھتی ہے۔ تاہم اہلِ ایران کے نزدیک اسے بہت بڑا مرتبہ حاصل ہے۔ جیسا کہ انوری کے مندرجہ ذیل اشعار سے بالکل واضح ہے۔

ہر سخن کآں نیست قرآں یا حدیثِ مصطفیٰ   از مقاماتِ حمیدالدین شد اکنوں ترّہات

. . . .

اکثر مقامات مناظرات کی طرز پر ہیں۔ مثلاً جوانی اور بڑھاپے کا مناظرہ۔ ایک

کتر سُنّی اور شیعہ کے درمیان مناظرہ ۔ اور طبیب اور نجومی کے درمیان مباحثہ ۔ کچھ مقامات اس قسم کے موضوعات پر ہیں ۔ موسم بہار ۔ محبت ۔ خزاں ۔ جنون وغیرہ بعض مقامات معمّٰی اور چیستان کی صورت میں ہیں ۔ اور بعض تصوّف کے مسائل پر حاوی ہیں ۔ دو بیانیہ مقامات بلخ اور سمرقند کے شہروں پر ہیں جن سے ان شہروں کے متعلق کافی واقفیت بہم پہنچتی ہے ۔ بعض مقامات میں مصنف کے ذاتی حالات بھی بیان ہوئے ہیں ۔ کتاب کا پُر تکلف اور مصنوعی طرزِ تحریر کچھ اس قسم کی مشکلات پیش کرتا ہے ۔ کہ اس کا ترجمہ کرنا آسان نہیں رہ جاتا ۔ تقریباً تمام زور طبع الفاظ اور طرزِ انشا پر صرف کر دیا گیا ہے ۔ چاہے مواد کچھ بھی نہ ہو ۔ اس لئے کتاب کے اصل خیالات کا اظہار کرنے کے لئے خالی ترجمہ کام نہیں دیتا ۔ بلکہ اس کی تشریح بھی درکار ہوتی ہے ۔ (براؤن)

یہ کتاب قاضی ابوبکر حمید الدین عمر بن محمود بلخی (متوفی ۵۵۹ھ) کی تصنیف ہے ۔ اور چوبیس مقامات اور ایک مقدمہ پر حاوی ہے ۔ اس میں بہت سے لغوی فوائد ۔ نوادر حکایات اور عربی و فارسی کے امثال و اشعار پائے جاتے ہیں جیسا کہ خود مصنف نے مقدمۂ کتاب میں اشارہ کیا ہے ۔ اس نے یہ کتاب مقاماتِ بدیعی تالیفِ ابوالفضل احمد بن حسین ہمدانی معروف بہ بدیع الزمان ہمدانی (۳۵۸ - ۳۹۸ھ) اور مقاماتِ حریری تالیف قاسم بن علی حریری (۴۴۶ - ۵۱۶ھ) کی تقلید میں لکھی ۔ یہ دونوں کتابیں عربی زبان میں ہیں ۔ اور نہایت پُر تکلف طرزِ انشا میں لکھی گئی ہیں ۔ اگرچہ مؤلف کی غرض اپنے مطالب کو سہل ، سادہ اور قریب الفہم فارسی میں ادا کرنا تھا ۔ لیکن اس کے باوجود وہ مشکل لغات اور بعض عربی ابیات و جملات کے استعمال سے بچ نہیں سکا ۔ کیونکہ اس عہد میں ان کو اپنے کلام میں لانا لکھنے والے کے فضل و کمال پر دلالت کرتا تھا ۔ قاضی حمید الدین نے اپنی قدرتِ لفظی کے اظہار کے لئے نثرِ مسجع کو نثرِ مرسل

پر ترجیح دی ہے۔

قاضی حمیدالدین دینی اور مشرقی علوم پر پورا عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ ادبی علوم خصوصاً کتابت و انشا میں استاد تھا۔ اور نثر نویسی میں مختلف قسم کے صنائع مثلاً تسجیع۔ ترصیع اور تمثیل کے استعمال میں اسے مہارت تامہ حاصل تھی۔ گو وہ فارسی میں شعر بھی کہتا تھا۔ لیکن نثر نویسی میں اسے اس قدر ید طولیٰ حاصل تھا کہ اس کے سامنے اس کی شاعری کا درجہ پست ہو گیا ہے۔ اور ہر جگہ اس کا نام چھٹی صدی ہجری کے اعلےٰ مسجع عبارت لکھنے والوں کی صف میں شمار کیا جاتا جاتا ہے لباب الالباب کے مندرجات اور بعض دیگر قرائن سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ قاضی موصوف کی تمام تالیفات مقامات کی مانند نثر مسجع میں ایک ہی اسلوب پر لکھی گئی ہیں۔ یہ کتاب مؤلف کے حینِ حیات اور اس کے بعد کے زمانہ میں پوری طرح مشہور ہوئی۔ اور ایک ادبی شاہکار شمار ہوتی ہے۔ چنانچہ انوری کا یہ شعر کتاب کی تعریف میں مشہور ہے۔

ہر سخن کاں نیست قرآن یا حدیثِ مصطفےٰ ازمقاماتِ حمیدالدین شدا کنوں ترھات

اسی طرح نظامی عروضی نے جو حمیدالدین کا معاصر تھا۔ اپنی کتاب چہار مقالہ کے مقالہ اوّل میں دبیری کتابت ترسّل اور فنِ انشا میں مہارت حاصل کرنے کے لئے جن کتب کے مطالعہ کی سفارش کی ہے۔ ان میں مقاماتِ حمیدی کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ سعدالدین وراوینی نے مرزبان نامہ کے مقدمہ میں نثر فارسی کی ممتاز کتابوں کے ذکر کے سلسلے میں مقامات حمیدی کا نام کلیلہ و دمنہ کے ساتھ لیا ہے۔ اور اس کی ادبی قدر و قیمت کی بہت تعریف کی ہے۔

زیرِ بحث کتاب مقاماتِ حمیدی چوبیس مقاموں پر مشتمل ہے۔ اس کا سلسلۂ روایات کسی دوسرے شخص کی زبان سے منقول ہے۔ یہ روایات ادبی و لغوی فوائد۔ دقیق اخلاقی و اجتماعی نکات اور بعض علمی و فلسفی مطالب پر روشنی ڈالتی ہیں۔ مؤلف نے جس شخص کو اپنا دوستِ یک پوست اور رفیق

یک دل قرار دیا ہے۔ اور جوان حکایات کا رادی ہے۔ اس سے مراد موٗلف کی اپنی ذات ہی ہے۔ گویا اس نے اپنے ذاتی مشاہدات و تاثرات کو ایک فرضی دوست کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ کتاب کے آخر میں مؤلف نے پڑھنے والوں سے ایسی حکایات کے نقل کرنے کے لئے معافی اور اللہ سے مغفرت طلب کی ہے۔ جو نہ اس نے سنیں اور نہ درحقیقت اُسے پیش آئیں۔

چونکہ مقامات کے موضوع گوناگوں ہیں۔ اس لئے باوجود ان کی طرز نگارش اور انداز بیان کی مشابہت اور یکسانیت کے قاری کسی جگہ بھی مطالعۂ کتاب کے بعد خستگی اور ملال محسوس نہیں کرتا۔ مثلاً بعض مقامات کا موضوع بحث ادبی بعض کا علمی۔ بعض کا مذہبی۔ بعض کا انتقادات اجتماعی بعض کا انتقاد اخلاقی بعض کا افکار عارفانہ۔ بعض کا احساسات لطیف عشقی اور بعض کا مطالب تاریخی ہے۔ اس طرح گویا یہ کتاب ایک معجون مرکب ہے۔ جو ہر قسم کی طبیعت کے موافق اور ہر قسم کی بیماری کا سودمند علاج ہے۔

مقامات حمیدی طرز انشا اور اصول نگارش کے لحاظ سے فارسی زبان میں بینظیر اور چھٹی صدی ہجری کی نثر فارسی میں ایک اہم یادگار ہے۔ اور باوجود اس کے کہ اس کی عبارات اور فقرات سجع اور قافیہ کی صورت میں ہیں۔ یہ اس قدر سلیس و رواں عبارت میں ہے۔ کہ ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کی کتب نثر کے برخلاف اس میں کہیں بھی کوئی

لفظ معنی کے لئے پردہ بن کر نہیں رہ گیا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ (جیسا کہ سعدالدین وراوینی کا بھی خیال ہے) کہ قاضی حمیدالدین کی طبیعت فطری طور پر سجع بندی کی طرف مائل تھی اور اس نے عبارات کو ترتیب دیتے وقت ہرگز تکلف سے کام نہیں لیا۔ ہاں البتہ چند مقامات پر سجع کی رعایت سے یا مناسب لغات اور مترادف الفاظ کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے موٗلف نے

بعض خیالات کو دور از کار استعارات کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اور کہیں کہیں کنایہ۔ ایہام۔ توریہ وغیرہ کے دامن میں پناہ لی ہے۔ لیکن اگر ادبی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہی استعارات و کنایات اس کتاب کے لئے باعثِ زینت ہیں۔ اور جنہوں نے نہ صرف کتاب کو زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔ بلکہ اس کی ادبی قدر و قیمت کو بھی بڑھا دیا ہے۔ (علی اصغر شمیم ہمدانی)

---

(۱۴) کلیلہ و دمنہ (بہرام شاہی)

سلجوقی زمانے کی مشہور ترین کتاب کلیلہ و دمنہ ہے جس کا مؤلف ابو المعالی حمید الدین نصر اللہ بن محمد بن عبد الحمید الغزنوی ہے۔

ابو المعالی بہرام شاہ کے زمانے (۵۱۲ - ۵۴۷ھ) میں دربار غزنی سے وابستہ ہوا۔ اور علم و فضل کی بدولت دربار میں شہرت حاصل کی۔ خسرو ملک تاج الدولہ غزنوی کے عہد (۵۵۲ - ۵۸۲ھ) میں وہ وزارت کے منصب جلیلہ پر بھی فائز ہوا۔ لیکن نور الدین عوفی لکھتا ہے کہ اسی عہد میں حاسدوں نے ابو المعالی کے خلاف خسرو ملک کے کان بھرے [illegible] جس سے متاثر ہو کر خسرو نے اسے زندان میں بھیج دیا۔ ابو المعالی کی اسیری کے دن ختم ہونے کو آئے تھے۔ کہ دشمنوں کو پھر کچھ کہنے سننے کا موقع ملا۔ اور خسرو ملک کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اسے ہلاک کر دیا جائے۔ دشمنوں کے ارادوں کا اسے بھی علم ہو گیا۔ چنانچہ اپنی موت سے پہلے اس نے ایک رباعی کہی۔

جیسا کہ کلیلہ و دمنہ کے مقدمہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ کتاب سنسکرت میں لکھی گئی تھی۔ اور ہندوستانی راجاؤں کے خزانوں میں جہاں اور

گراں بہا چیزیں تھیں۔ وہاں یہ کتاب بھی رکھی گئی تھی کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے ایک قدیمی راجا کے بیٹے تعلیم سے سخت گریزاں تھے۔ انہیں تعلیم دلانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ لیکن ان کا دل تعلیم میں نہیں لگتا تھا۔ بالآخر اس زمانے کے ایک مشہور ادیب نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ راج کماروں کو تعلیم دے سکے گا۔ چنانچہ اس نے جانوروں کی زبان میں ایک ایسی کتاب لکھی جس میں تمام سیاسی اور معاشرتی مسائل باتوں ہی باتوں میں زیر بحث آگئے۔ راج کماروں نے اس کتاب کو بڑے شوق اور دلچسپی سے پڑھا اور انہیں تعلیم دلانے کا مقصد اسی ایک کتاب سے پورا ہو گیا۔ اس کتاب کا نام "پنچ تنتر" یا "کرتکا دمنگا" ہے۔ اور اس کا مصنف وشنو شرما ہے۔

نوشیرواں عادل کے زمانے میں اس کا ایک طبیب برزویہ بادشاہ کے حکم سے اس کتاب کی ایک نقل ہندوستان سے لایا اور پہلوی زبان میں اس کا ترجمہ کیا۔ پھر برزویہ کی درخواست پر حکیم بزرجمہر نے بابِ برزویہ کے نام سے ایک باب لکھ کر اس میں شامل کیا۔

"کرتکا دمنگا" کا جب پہلوی میں ترجمہ ہوا تو یہ کتاب "کلیک ودمنک" کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس کے بعد کلیلہ دمنہ کے نام سے ابن المقفع نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا۔ سامانی دور میں رودکی نے نصر بن احمد سامانی کے لئے اسے فارسی نظم میں ترجمہ کیا۔ پھر سلطان بہرام شاہ غزنوی کے عہد میں ابوالمعالی نے نثر میں اس کا ترجمہ کر کے بہرام شاہ کے نام سے منسوب کیا۔ یہ کتاب ۵۳۸ – ۵۲۹ ہجری میں لکھی گئی۔ اور اس کے مؤلف ابوالمعالی نے ۵۵۵ ہجری کے لگ بھگ وفات پائی تھی۔

ابوالمعالی کی کلیلہ ودمنہ کو پھر ملا حسین واعظ کاشفی نے نویں صدی ہجری میں اپنے مخصوص انداز میں ڈھال کر پیش کیا۔ اور انوارِ سہیلی کا نام دے کر اسے امیر شیخ احمد سہیلی کے نام منسوب کیا۔ بالآخر یہی کتاب مغلیہ تاجدار جلال الدین اکبر

کے حکم سے ابوالفضل نے عیارِ دانش کے نام سے اپنے اسلوبِ خاص میں لکھی۔
علم وادب کی دُنیا میں کوئی ایسی کتاب نظر نہیں آتی جو دنیا کی متمدن زبانوں میں ترجمہ ہونے کے علاوہ ایک ہی زبان میں کئی مختلف صورتوں میں لکھی گئی ہو۔ یہ کتاب بادشاہوں کی مونس۔ علما کی منظورِ نظر اور عوام کی انیس و رہنما رہی ہے اور آٹھ سو سال کے طویل عرصہ گذرنے کے بعد آج بھی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔
سرسری جائزہ لینے پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہ کلیلہ دمنہ میں خارجی حسن پیدا کرنے کے لئے صنائع بدائع کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں۔ شاعرانہ صنائع مثلاً طباق۔ مراعاۃ النظیر۔ اضداد۔ جمع و تفریق۔ سیاقۃ الاعداد۔ تنسیق الصفات مجاز مرسل۔ تشبیہہ۔ استعارہ اور طرد العکس۔ قافیہ اور سجع کلیلہ و دمنہ کے صفحوں پر جابجا نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ صنائع کچھ اتنی مہارت سے استعمال کئے گئے ہیں۔ کہ نہ عبارت کی موزونی میں فرق آتا ہے۔ نہ معانی ہی میں کوئی الجھن پیدا ہوتی ہے۔

(بدخشانی) ___________

اس مشہور داستان کی اصل سامانیوں کے عہد میں ہندی زبان سے پہلوی زبان میں منتقل ہوئی۔ اس کے بعد عبداللہ بن مقفع نے اسے پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا۔ اگرچہ ابن مقفع کی کلیلہ کو سامانی دور میں فارسی نظم اور نثر کا جامہ پہنایا گیا تھا۔ لیکن اب وہ ناپید ہو چکے ہیں۔ اور رودکی کی نظم کی ہوئی کلیلہ کے کچھ اشعار باقی رہ گئے ہیں۔ موجودہ کلیلہ دمنہ جس میں اصل ہندی پر دو تین ایرانی اور اسلامی حکایتیں بڑھائی گئی ہیں۔ ابوالمعالی نصراللہ بن عبدالحمید کا ترجمہ ہے۔ یہ شخص اس زمانے کے عالموں میں شمار ہوتا تھا۔ اور اس نے ابن مقفع کے ترجمہ سے یہ ترجمہ چھٹی صدی ہجری کے وسط یعنی بہرام شاہ غزنوی (۵۱۲ - ۷ھ) کے دورِ حکومت میں مرتب کیا۔ نصراللہ نے اس کتاب کو بہرام شاہ کے نام معنون کیا اور اس میں فارسی اور عربی امثال اور اشعار کا اضافہ کیا حقیقت یہ ہے۔ کہ اس نے نہایت متین اور عمدہ نثر سے کام لیا ہے۔ اسی لئے یہ کتاب

فارسی کی ادبی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ نصر اللہ نظم میں بھی مہارت رکھتا تھا۔
اور اس نے عربی اور فارسی میں اشعار لکھے ہیں۔ (مشفق)

یہ کتاب کلیلہ و دمنہ کا مشہور ترین ترجمہ و تہذیب ہے۔ کلیلہ و دمنہ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے۔ ان کتابوں میں سے ہے۔ جو پہلے سنسکرت سے پہلوی میں ترجمہ ہوئیں۔ لبعدازاں عبداللہ بن المقفع نے اس کا پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا۔ پھر نصر بن احمد سامانی کے حکم سے یہ کتاب پہلی دفعہ عربی سے نثر دری میں ترجمہ ہوئی۔ اور لبعدازاں نثر دری سے رودکی شاعر نے اسے فارسی نظم کا جامہ پہنایا۔ پھر چھٹی صدی ہجری کے شروع میں ایک بار پھر اسے بلیغ فارسی نثر میں ترتیب دیا گیا۔ اور یہی کلیلہ و دمنہ بہرام شاہی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ترجمہ ابوالمعالی نصراللہ بن محمد بن عبدالحمید منشی کے ہاتھوں سرانجام پایا۔ جو بعض روایات کے مطابق شیراز اور بعض کے خیال میں غزنی کا باشندہ تھا۔

ابوالمعالی نصراللہ کی یہ یادگار زمانہ قدیم سے ہی انشاپردازوں کے ہاں شہرت رکھتی تھی۔ اور اس کا شمار درسی کتب ادب میں ہوتا تھا۔ اس نے اس کتاب کو کلیلہ و دمنہ سے ترجمہ کیا۔ جس کی صحیح تاریخ ہمیں معلوم نہیں ہے لیکن چونکہ اس نے اپنی اس کتاب کو ابوالمظفر بہرام شاہ بن مسعود بن ابراہیم کے نام پر معنون کیا ہے۔ اس لئے اس کی تاریخ تالیف سنہ ۵۱۲ھ اور ۵۴۷ھ کے درمیان سمجھنی چاہیئے۔ اور چونکہ مؤلف نے اپنی کتاب میں مسعود سعد کے بعض اشعار بطور استشہاد و تمثیل پیش کئے ہیں۔ اس لئے غالباً یہ ترجمہ مسعود سعد کے سالِ وفات یعنی سنہ ۵۱۵ھ یا اس شاعر کے آخر ایام زندگی سے بیشتر وجود میں نہ آیا تھا۔ اندریں حالات اس کتاب کی تاریخ تالیف سنہ ۵۱۵ھ اور سنہ ۵۴۷ھ کے درمیان معلوم ہوتی ہے۔

یہ ترجمہ بلیغ منشیانہ نثر۔ لطیف استشہادات و تمثیلات اور صنائع و بدائع

کی بنا پر شروع زمانے سے ہی انشا پردازوں کی توجہ کا مرکز چلا آ رہا ہے۔ عوفی جو خود بھی چھٹی اور ساتویں ہجری کے بلیغ انشا پردازوں میں سے ہے۔ کلیلہ و دمنہ بہرام شاہی اور اس کے مؤلف کے متعلق یوں رقمطراز ہے جبکہ اسے ترجمہ ہوئے ابھی سو سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے۔" نصر اللہ بن عبدالحمید نے کلیلہ و دمنہ کا جو ترجمہ کیا ہے۔ وہ تمام انشا پردازوں کے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ ہر شخص جو کوئی تالیف کرتا ہے۔ اس کے فوائد سے بہرہ یاب ہو سکتا ہے۔ کسی کو اس میں حرف گیری کی مجال نہیں۔ اور نہ ہی آج تک کسی نے اس میں کوئی عیب نکالا ہے۔ فارسی انشا پردازوں کی تحریروں میں سے کسی تالیف و تصنیف کو اس قدر ہر دلعزیزی اور قبولیت حاصل نہیں ہوئی"۔

فی الحقیقت کلیلہ و دمنہ بہرام شاہی۔ سلاستِ انشا، عبارات کی قوتِ تراکیب، حسنِ اسلوب اور آراستگیٔ کلام کے لحاظ سے فارسی نثر کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے اور اسے فارسی کی پُر تکلف نثر کے اولین کارناموں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ابوالمعالی نے گو چند ایک مقامات کے سوا کہیں بھی کامل طور پر مسجع عبارت کا استعمال نہیں کیا۔ لیکن درجِ ذیل قیود کی پابندی کے باعث اس کی کتاب پُر تکلف فارسی نثر کے اولین نمونوں میں شمار ہوتی ہے۔

(۱) جملے کے اجزا و عبارات میں توازن قائم رکھنا۔

(۲) سجع ناقص کا استعمال (۳) مترادف و متوازن کلمات کا استعمال۔

(۴) آیات و امثال اور عربی و فارسی اشعار سے استشہاد وغیرہ۔

اس کے باوجود ابوالمعالی کسی جگہ بھی صنائع سے مغلوب نہیں ہوا۔ اور تمام کتاب میں کہیں بھی اس نے لوازماتِ فصاحت و بلاغت کو نظر انداز نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی طرزِ تحریر چھٹی صدی ہجری سے ہی انشا پردازوں کے لئے ایک قابلِ تقلید نمونہ کا کام دیتی رہی ہے۔ اور ہمیشہ فارسی کی درسی کتب میں شامل رہی ہے۔ یہ کئی بار زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکی

ہے۔ اور بعد میں آنے والے بعض مصنّفین نے کوشش کی ہے۔ کہ تہذیب و ترجمہ جدید کلیلہ و دمنہ کے نام سے اس کی تقلید میں کتابیں تصنیف کریں۔ مثلاً انوار سہیلی مؤلفہ حسین واعظ کاشفی اور عیار دانش مؤلفہ ابو الفضل دکنی۔

صفا

ابن المقفع کی عربی کتاب کلیلہ و دمنہ کو نظام الدین ابو المعالی نصر اللہ بن محمد بن عبد الحمید نے فارسی نثر کا جامہ پہنایا۔ یہ ترجمہ اس نے بہرام شاہ غزنوی کی خاطر کیا۔ اور اسی کے نام معنون کیا۔ جو سنہ ۵۱۲ھ سے سنہ ۵۴۴ھ (یا سنہ ۵۴۷ھ یا سنہ ۵۴۸ھ) تک حکمران رہا۔ مسٹر ریو نے اپنی فہرست میں لکھا ہے۔ کہ ایران میں یہ کتاب بہت قدر و عزّت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ منگولوں کے قصیدہ گو اور مورّخ وصّاف نے اسے فصاحت و بلاغت کا ایک عمدہ نمونہ قرار دیا ہے۔ اسی طرح مصنّف ہفت اقلیم نے لکھا ہے کہ کسی فارسی نثر کی کتاب کی اس قدر تعریف و توصیف بیان نہیں کی گئی۔ اس ترجمہ کا ایک نہایت عمدہ ایڈیشن تہران سے سنہ ۱۳۰۵ھ میں شائع ہوا تھا۔

دُنیا میں بہت کم ایسی کتابیں ہیں جنہیں کلیلہ و دمنہ کی طرح ہر دلعزیزی حاصل ہوئی ہے۔ یا جو اس قدر کثیر التعداد زبانوں میں ترجمہ کی گئی ہیں۔ دراصل یہ کتاب ہندوستان میں تصنیف ہوئی تھی۔ چھٹی صدی عیسوی میں نوشیروان کے عہدِ حکومت میں یہ ایران پہنچی۔ اور اس کا پہلوی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ پھر پہلوی ترجمہ سے ابتدائی سریانی اور عربی ترجمے معرضِ وجود میں آئے۔ لعدازاں عربی ترجمہ سے اسے متعدد مشرقی و مغربی زبانوں میں منتقل کیا گیا۔ اس کتاب کو حکایاتِ بیدپا کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ تبتی زبان میں ترجمہ براہِ راست سنسکرت سے کیا گیا تھا۔ باقی تمام تراجم پہلوی ترجمہ سے اخذ کئے گئے۔ مگر وہ پہلوی ترجمہ اب ناپید ہو چکا ہے۔ اس پہلوی ترجمہ سے قدیم سریانی ترجمہ سنہ ۵۷۰ھ

میں آیا۔ ابن المقفع کا عربی ترجمہ قریباً ۷۵۰ء میں وجود میں آئے۔ باقی تراجم جن میں بعد کا سریانی ترجمہ بھی شامل ہے اور جو دسویں یا گیارھویں صدی عیسوی میں ہوا۔ سب ابن المقفع کے عربی ترجمہ سے کئے گئے ہیں اور وہ اِن زبانوں میں ہوئے۔ یونانی۔ فارسی۔ عبرانی۔ لاطینی۔ اندلسی۔ اطالوی۔ ترکی۔ جرمنی۔ انگریزی۔ ڈنمارکی۔ ہالینڈی اور فرانسیسی وغیرہ

جس فارسی ترجمہ کا ذکر ہمارا موضوع بحث ہے۔ وہ قدیم زمانہ سے رائج ہے۔ کتاب کا قصہ بہت عرصہ پہلے رودکی شاعر نے نظم میں بیان کیا تھا۔ فارسی کا بہترین ترجمہ جس کا ہمیں اچھی طرح علم ہے۔ غالباً وہ ہے۔ جسے پندرھویں صدی عیسوی میں ملا حسین واعظ کاشفی نے کیا تھا۔ اور وہ انوار سہیلی کے نام سے مشہور ہے۔ اسی ترجمہ سے ایک تیسرا فارسی ترجمہ وجود میں آیا۔ جو عیار دانش کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور جسے ابوالفضل نے اکبر کے لئے لکھا تھا۔ ترکی ترجمہ کا نام ہمایوں نامہ ہے جسے علی چلپی نے سلطان سلیمان اوّل کے لئے کیا تھا۔ یہ دونوں تراجم سولھویں صدی عیسوی میں ظاہر ہوئے۔

بظاہر انوار سہیلی کے مصنّف نے نصراللہ کے فارسی ترجمہ کو زیادہ سلیس اور ہر دلعزیز بنانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن فی الحقیقت اس کی طرزِ انشا زیادہ پُرتکلف اور مشکل ہے۔ مختلف تراجم کے مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ انوار سہیلی میں گو حکایات کو نسبتاً زیادہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اور وہ اصل کتاب کی عبارت کے زیادہ قریب بھی ہے۔ لیکن یہ ترجمہ عام طور پر فضول مبالغہ آرائی۔ دُور از کار تشبیہات اور روکھے پھیکے موٹے موٹے الفاظ کا مجموعہ ہے۔ اور ان مُصنّفین کی نثر نویسی کا بدترین نمونہ ہے۔ جو تیموری بادشاہوں کے زیر سایہ شمال مشرقی ایران اور ماوراءالنہر کے علاقے میں پندرھویں

اور سولھویں صدی عیسوی میں پرورش پا رہے تھے۔ اور بدقسمتی سے بابر کے ہندوستان میں آنے پر ان کی تحریریں اس ملک کے پُرتکلف انداز تحریر کے مشتاق لوگوں کے لئے ایک نمونہ قرار پا گئیں۔ غالباً یہی سب سے بڑی وجہ ہے۔ کہ ہندوستان میں سلیس اور فصیح و بلیغ فارسی لکھنے والوں اور اُسے پسند کرنے والوں کی کمی رہی۔ (براؤن)

---

(۱۵) مرزبان نامہ

مرزبان نامہ داستانوں۔ قصوں۔ حکایتوں اور افسانوں پر مشتمل کتاب ہے اور کلیلہ و دمنہ کی طرح بیشتر حیوانوں کی زبانی نقل کی گئی ہے۔ اس کتاب کو طبرستان کے ایک حکمران مرزبان بن رستم بن شروین نے ــــ جس کے خاندان کو باوندیان یا آلِ باوند کہتے ہیں۔ چوتھی صدی ہجری کے آخر میں قدیم طبرستانی زبان میں تصنیف کیا تھا۔ پھر ساتویں صدی کی ابتداء میں اس زمانے کے ایک بڑے ادیب اور درجۂ اوّل کے منشی سعدالدین وراوینی نے جو آذربائیجان کا رہنے والا تھا۔ اسے فصیح ادبی فارسی میں منتقل کیا اور اسے ربیب الدین ہارون وزیر ازبک بن محمد اتابک آذربائیجان کے نام معنون کیا۔ (شفق)

اصل کتاب مرزبان نامہ کو مرزبان بن رستم بن شروین نے لکھا تھا۔ جو آلِ باوند کا تاجدار تھا۔ یہ کتاب چوتھی صدی ہجری کے آخر میں طبری زبان میں لکھی گئی تھی۔ کلیلہ و دمنہ کی روش پر قصص۔ امثال اور حکم سے اسے مرتّب کیا گیا تھا۔ اور اس کے مضامین و مطالب دحاشی۔ طیور۔ دیو۔ پری اور انسانوں

کی زبان سے ادا کئے گئے تھے۔

طبری زبان کے اصل مرزبان نامہ کی تالیف کے بعد اسے دو بار یعنی چھٹی صدی کے ہجری کے آخر اور ساتویں صدی ہجری کے شروع میں طبری لہجہ سے مزین و آراستہ فارسی نثر میں ترجمہ کیا گیا۔ پہلا ترجمہ محمد بن غازی ملطیوی نے کیا، جو سلاجقہ روم کے دربار کے فضلائے عظام میں سے تھا۔ وہ کچھ عرصہ تک سلیمان شاہ بن قلیج ارسلان کا دبیر تھا۔ لیکن بعد ازاں منصب وزارت پر فائز ہو گیا تھا۔ اس نے سلیمان شاہ مذکور کے عہد سے بیشتر ہی ترجمہ کا کام شروع کر رکھا تھا۔ پھر اس تاجدار کی تشویق اور ہمت افزائی پر اس نے اسی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ یہ کتاب ماہِ محرم ۵۹۸ھ میں ختم ہوئی۔ اور اس کا نام روضۃ العقول رکھا گیا۔ روضۃ العقول ابواب کی تعداد۔ حکایات کی ترتیب اور مواد کی کمی بیشی کے لحاظ سے مرزبان نامہ سے بہت زیادہ مختلف ہے۔ چنانچہ روضۃ العقول میں کئی ایک ایسی حکایات پائی جاتی ہیں جو مرزبان نامہ میں موجود نہیں ہیں۔ روضۃ العقول گیارہ ابواب اور مرزبان نامہ وراوینی نو ابواب پر مشتمل ہے۔ روضۃ العقول کی طرز تحریر مختلف قسم کے صنائع سے آراستہ ہے اور اس میں عربی امثال و اشعار سے جابجا استشہاد کیا گیا ہے۔ ملطیوی نے عربی لغات و کلمات کے استعمال میں مبالغہ سے کام لیا ہے۔ اور بہت سے ایسے عربی کلمات اس کی کتاب میں موجود ہیں۔ جن کا استعمال مناسب نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی طرز انشا انتہائی درجہ سلیس اور بلیغ ہے۔

اس ترجمہ کے چند سال بعد عراق کے ایک فاضل شخص سعد الدین وراوینی نے ایک بار پھر طبری زبان کے اصل مرزبان نامہ کو زبان فارسی

میں ترجمہ کیا اسے روضۃ العقول کی تالیف کا علم نہ تھا۔ وراوینی نے اپنے ترجمہ کی عبارت کو صنائع و بدائع سے مزین کیا۔ اور اس کا نام بھی مرزبان نامہ ہی رکھا اور جیسا کہ بیان ہوا اس کے ابواب کی تعداد نو سے زیادہ نہیں ہے۔

وراوینی کے حالات پردہ اخفا میں ہیں۔ البتہ اس کی کتاب مرزبان نامہ کے مقدمہ و خاتمہ کے مطالعہ سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ خواجہ ربیب الدین ہارون کا ملازم تھا جو اتابک ازبک بن محمد اتابک آذربائیجان کا وزیر تھا۔ وراوینی نے اپنی کتاب اسی علم دوست وزیر کے نام معنون کی۔ وزیر کا ملازم ہونے کے باعث وراوینی نے کافی مدت تبریز ہی میں رہائش اختیار رکھی۔

صحیح طور پر معلوم نہیں کہ وراوینی نے مرزبان کو کب فارسی نثر کا جامہ پہنایا۔ لیکن یہ مسلم ہے۔ کہ ترجمہ و تہذیب کا یہ کام ۶۰۷ - ۶۲۲ھ کے درمیانی سالوں میں کسی وقت انجام پایا۔ کیونکہ اس نے اپنی کتاب کے آخری باب میں اتابک ازبک بن محمد ایلدگز اور اس کے وزیر خواجہ ربیب الدین ہارون کے ناموں کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ اتابک ازبک کا دور سلطنت ۶۰۷-۶۲۲ھ تک قائم رہا۔ اس لئے مرزبان نامہ کی تاریخ ترجمہ بھی ان ہی سالوں کے درمیان سمجھنی چاہیئے۔

وراوینی کا مرزبان نامہ نو ابواب - ایک مقدمہ اور ایک ذیل پر حاوی ہے۔ روضۃ العقول کے ساتھ اس کا موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل کتاب کی بعض حکایات و ابواب کو وراوینی نے ترجمہ میں حذف کر دیا ہے۔ چنانچہ اس نے خود بھی اپنی کتاب میں اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ وراوینی کا یہ ترجمہ بے شک و شبہ فارسی نثر

کے شاہکاروں میں شمار ہوتا ہے ۔ جو اعلیٰ قسم کی نثر سے مزین ہے ۔ بلکہ اسے ساتویں صدی ہجری کے شروع تک کی تمام ایسی تصانیف کا گل سر سبد کہنا چاہیئے ۔ اکثر مقامات پر مرزبان نامہ کی عبارت متداول نثر سے بہت مختلف ہو گئی ہے ۔ اور اس کے اندر شعریت نمایاں نظر آتی ہے ۔ کیونکہ ان مقامات پر عبارت میں ایسی تشبیہات اور اوصاف پائے جاتے ہیں ۔ جو اس سے قبل صرف اشعار ہی سے مخصوص تھے ۔ اور لکھنے والے ویسی تشبیہات اور معانی نثر میں استعمال نہ کیا کرتے تھے ۔ وراوینی نے ان معانی کو ایسی تعجب انگیز مہارت سے عبارت میں جلوہ گر کر دیا ہے کہ وہ قاری کے لئے ہر گز موجب ملال نہیں ہوتے ۔ کیونکہ ساتھ ہی ساتھ اس نے قصص و امثال کے ذریعہ اپنے کلام کو دلچسپ بنا دیا ہے ۔ چند ایک مواقع پر اس کا طرزِ بیان فنِ ایجاد میں کمال کو پہنچا ہوا ہے ۔ اس نے قدیم بزرگ استادوں کے عربی و فارسی اشعار ۔ امثال اور شواہد کو کافی حد تک اپنی کتاب میں استعمال کیا ہے ۔ ایسے مواقع پر یقیناً وراوینی نے کلیلہ و دمنہ بہرام شاہی کے طرزِ تحریر کو پیش نظر رکھا ہے ۔ (صفا)

ابتدائی منگول عہد کی ایک اور قابلِ ذکر کتاب مرزبان نامہ کا فارسی ترجمہ ہے ۔ اصل میں یہ کتاب مرزبانِ رستم شروین نے طبرستان کی زبان میں تصنیف کی تھی ۔ اور اسے شمس المعالی قابوس بن وشمگیر کے نام پر معنون کیا تھا ۔ بعد میں اسے سعد وراوینی نے ایران کی عام فہم ادبی زبان میں منتقل کر دیا ۔ (براؤن)

مرزبان نامہ ایک ایسی کتاب ہے جو مختلف قسم کی حکایات، تمثیلات

اور حکمت آمیز افسانوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب کلیلہ و دمنہ کی طرح وحشی جانوروں پرندوں اور دیو و پری کی زبان سے ادا کی گئی ہے۔ بظاہر اس کتاب کی اصل وہ مسودہ ہے۔ جو چوتھی صدی ہجری کے آخر میں مازندران کے شہر میں قدیم طبرستانی لہجہ میں لکھا گیا تھا۔ اور جس کا مصنف اصفہبد مرزبان بن رستم بن شروین بتایا جاتا ہے۔ جو سلسلۂ آلِ باوند میں سے طبرستان کا حاکم تھا۔

متاخرین تاریخ نویسوں اور تذکرہ نگاروں میں سے سوائے حاجی خلیفہ اور رضا قلی خاں کے اور کسی نے مرزبان نامہ کا ذکر تک نہیں کیا۔ حاجی خلیفہ نے تو صرف نام ہی لکھ دیا ہے۔ البتہ رضا قلی خاں نے صرف اتنا اضافہ کیا ہے کہ "مرزبان نامہ نظم و نثر حکمت و حکایت پر مشتمل ایک کتاب ہے۔ جسے مرزبان بن رستم شاہِ مازندران نے لکھا اور اسے امیر قابوس شمس المعالی کے نام پر معنون کیا۔"

سب سے زیادہ قدیم کتاب جس میں مرزبان اور اس کے مصنف کا ذکر ہمیں ملتا ہے۔ قابوس نامہ ہے۔ جسے عنصر المعالی کیکاؤس بن اسکندر بن قابوس بن وشمگیر نے ۴۷۵ھ میں تالیف کیا تھا۔ اس کے بعد تاریخ طبرستان میں اس کا نام دیکھنے میں آتا ہے۔ جسے محمد بن الحسن بن اسفندیار نے ۶۱۳ھ میں تصنیف کیا تھا۔ چنانچہ وہ حکمائے طبرستان سے متعلقہ فصل میں مصنف مرزبان نامہ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "اسپہبد مرزبان بن رستم بن شروین نے دحوش و طیور اور انس و جان و شیاطین کی زبان سے ایک کتاب لکھی جو مرزبان نامہ کے نام سے مشہور ہے۔ اگر کوئی داناشخص از روئے انصاف اس کتاب کے معانی و غوامض اور حکم و مواعظ کا مطالعہ کر کے انہیں ذہن نشین کر لے۔ تو وہ ہندوستان کے فیلسوف بیدپا کی دانش پر خاک

ڈالے جس نے کلیلہ و دمنہ کی کتاب تالیف کی تھی۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ کتاب اہلِ عجم کے لئے نہ صرف اہلِ ہند بلکہ دوسرے ممالک کے باشندوں پر بھی کس قدر فخر اور فضیلت کا باعث بنی۔"

تحقیقی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ مرزبان نامہ کا اصل مصنّف کس زمانہ میں فوت ہوا۔ مشہور فرانسیسی مستشرق شیفر نے لکھا ہے کہ اس نے طبرستان میں سنہ ۲۸۲ھ (اور بقول شیفر سنہ ۳۰۲ھ) میں وفات پائی۔

علامہ محمد بن عبدالوہاب قزوینی دلائل دینے کے بعد لکھتے ہیں۔ کہ اصل مرزبان نامہ کی تالیف چوتھی صدی ہجری میں ہوئی۔ شیفر کے قول کے مطابق یہ چوتھی صدی کے شروع میں مرتب ہوا۔ لیکن ہماری تحقیقات کے مطابق وہ چوتھی صدی کے آخر میں تالیف ہوا۔ تقریباً دو صدی تک مرزبان نامہ اپنی اصلی زبان یعنی طبری قدیم میں رائج رہا۔ یہاں تک کہ چھٹی صدی ہجری کے آخر اور ساتویں صدی ہجری کے شروع میں تقریباً ایک ہی زمانہ میں دس یا بیس سال کے فرق سے دو دفعہ طبریٔ قدیم سے رائج فارسی زبان میں منتقل ہوا۔ اور اسے عربی امثال و اشعار سے بھی مزیّن کر دیا گیا۔ لیکن ان ہر دو ترجمہ کرنے والوں کو ایک دوسرے کے ترجمہ کا کوئی علم نہ تھا۔

پہلے سنہ ۵۹۸ھ میں ابوالفتح رکن الدین سلیمان شاہ بن قلج ارسلان (۵۸۸۔ ۶۰۰ھ) جو سلاجقہ روم میں سے تھا۔ کے عہد میں اس کے ایک فاضل دبیر اور وزیر محمد بن غازی الملطیوی نے مرزبان نامہ کی اصلاح کر کے اسے فارسی زبان میں ڈھالا اور اس کا نام روضۃ العقول رکھا۔ اس کتاب کا ایک نسخہ ہالینڈ کے کتب خانہ لیڈن میں ہے۔ اور دوسرا پیرس کے کتب خانہ ملی میں۔ روضۃ العقول ابواب کی تعداد، حکایات کی ترتیب اور مواد کی کمی و بیشی کے لحاظ سے مرزبان نامہ سے بہت مختلف ہے۔ بہت سی حکایات ایسی ہیں۔ جو روضۃ العقول

میں موجود اور مرزبان نامہ میں مفقود ہیں۔ روضۃ العقول حجم کے لحاظ سے کم از کم دو مرزبان ناموں کے برابر ہے۔ اور گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کا آخری باب تو مرزبان نامہ میں سرے سے موجود نہیں۔

روضۃ العقول کے دس یا بیس سال بعد عراق کے ایک فاضل سعدالدین دراوینی نے مرزبان نامہ کو دوبارہ قدیم طبری زبان سے عراق کی رائج فارسی زبان میں منتقل کیا۔ لیکن اسے پہلے ترجمہ کا ہرگز علم نہ تھا۔ اسی نے اپنے ترجمہ کو عربی و فارسی کے اشعار و امثال سے مزیّن کیا۔ جو مرزبان نامہ اس وقت مطبوعہ صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ یہ وہی دراوینی کا ترجمہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عذوبتِ انشا، سلاستِ عبارت اور رواتی کلام میں بہت ہی کم کتابیں اس کے پایہ کو پہنچ سکتی ہیں

سعدالدین وراوینی کے متعلق ہماری معلومات بہت ہی محدود ہیں۔ البتہ اسی کتاب کے خاتمہ و مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خواجہ ربیب الدین ہارون بن علی کے ملازموں اور ندیموں میں سے تھا۔ جو اتابک ازبک بن محمد اتابکِ آذربائیجان (۶۰۷ - ۶۲۲ھ) کا وزیر تھا وراوینی نے یہ کتاب اسی وزیر کے نام پر معنون کی۔ یقینی طور پر ہمیں یہ معلوم نہیں کہ وراوینی نے مرزبان نامہ کی اصلاح و ترجمہ کا یہ کام کس سن میں شروع کیا۔ لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ یہ (۶۰۷ — ۶۲۲ھ) کے درمیانی عرصہ میں سرانجام دیا گیا۔

مرزبان نامہ کا ایک عربی اختصار کتاب خانۂ ملّی پیرس میں محفوظ ہے۔ جس پر مترجم کا نام شیخ شہاب الدین لکھا ہے۔ یہ عربی مرزبان نامہ ترکی زبان سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ عربی مترجم نے خود لکھا ہے۔ کہ میں نے اسے ترکی مرزبان نامہ سے ترجمہ کیا ہے۔ قرائن سے ثابت ہوتا ہے کہ

تہ کی مرزبان نامہ کا ماخذ سعدالدین وراوینی کا فارسی مرزبان نامہ ہی ہے نہ کہ روضتہ العقول ۔ (محمد خان قزوینی)

---

(۱۶) تاریخ طبرستان

تاریخ طبرستان ایران کی اُن مقامی تواریخ کی مستند کتابوں میں سے ہے جو ساتویں صدی ہجری کے شروع میں تالیف ہوئیں ۔ اس کا مؤلف بہاءالدین محمد بن حسن بن اسفندیار کاتب ہے ۔ جو ایران کے مشہور کاتبوں میں سے تھا ۔ اس کے اپنے بیان کے مطابق اس نے اپنی جوانی کا زمانہ آلِ باوند کے تاجداروں کی خدمت میں بسر کیا ۔ ۶۰۶ھ سے پہلے وہ بغداد میں آ گیا تھا ۔ اسی سال آلِ باوند کا تاجدار رستم بن اردشیر قتل ہوا ۔ اور طبرستان کے اکابر سلطان محمد خوارزم شاہ کے پاس آ گئے ۔ چنانچہ ہمارا مصنف رے میں آ گیا اور اس نے کچھ مدت وہاں قیام کیا اس دوران میں شہنشاہ غازی رستم بن علی بن شہریار کے کتب خانہ میں اسے آمد و رفت کا موقع ملا ۔ وہاں اس نے ایک کتاب دیکھی جسے ایک مشہور عالم ابوالحسن بن محمد الیزدادی نے عربی زبان میں تاریخ طبرستان کے کچھ حصے پر لکھا تھا ۔ یہ کتاب پڑھ کر بہاءالدین نے اسے فارسی جامہ پہنایا ۔ اور اپنی کتاب تاریخ طبرستان کے سلسلے میں اسے بنیاد قرار دیا ۔ اس کے علاوہ اسے شہر خوارزم میں عبداللہ بن المقفع کا ترجمہ کیا ہوا ایک رسالہ بھی ہاتھ لگ گیا ۔ بہاءالدین نے اسے بھی فارسی میں ترجمہ کر لیا ۔ یہ اس کے بڑھاپے کا زمانہ تھا ۔

ان دو کتابوں کے علاوہ تاریخ طبرستان کی تالیف کے سلسلے میں اسے جس قدر مواد کی ضرورت تھی ۔ وہ اس نے متفرق کتب اور علما کی زبانی روایات سے بہم پہنچایا اور اس طرح اس نے ۶۱۳ھ میں اپنی کتاب کو مکمل کیا ۔

تاریخ طبرستان چار حصوں میں منقسم ہے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

(۱) پہلا حصہ :- یہ طبرستان کی قدیم تاریخ ہے اس میں شہروں کی تعمیر۔ طبرستان کے خصائص و عجائب کے علاوہ ملوک ۔اکابر۔علما۔زہاد۔کتاب ۔اطبا۔ اہل نجوم ،حکما اور شعرا کے حالات بیان کئے گئے ہیں ۔ یہ حصہ خاص طور پر اس لئے اہم ہے ۔کہ اس میں طبرستان کی متعدد مشہور و معروف علمی و ادبی شخصیات کے نام اور ان کے حالات درج کئے گئے ہیں ۔جن کا ذکر دوسری کتابوں میں یا تو سرے سے مفقود ہے اور یا بہت کم پایا جاتا ہے ۔ان میں بعض ایسے شعرا بھی شامل ہیں ۔ جنہوں نے طبری زبان میں طبع آزمائی کی ہے ۔اس حصے کے آخر میں مصنف نے سادات آلِ ابی طالب کے بارے میں بہت سے مفید معلومات جمع کر دیئے ہیں ۔اور بتایا ہے کہ کس طرح دیلمی سرداروں نے ان سادات کے ہاں رسائی حاصل کی ۔اس لئے اس حصہ کا مطالعہ سلسلۂ دیالمہ کی تشکیل کی پوری کیفیت بیان کرتا ہے۔

(۲) دوسرا حصہ :- یہ سلسلۂ زیاریاں یا آلِ وشمگیر کے بارے میں ہے ۔

(۳) تیسرا حصہ :- اس حصے میں یہ بتایا گیا کہ آلِ وشمگیر سے آلِ محمود اور آل سلجوق کی طرف سلطنت کیونکر منتقل ہو گئی ۔

(۴) چوتھا حصہ :- یہ حصہ ملوک آلِ باوند کے حالات پر مشتمل ہے ۔ اور ان کے سالِ خاتمہ یعنی سنہ ۶۰۶ھ تک کے واقعات پر حاوی ہے ۔

کتاب کا پہلا باب جس میں سکندر کے ہاتھوں ایرانی حکومت کے زوال اور ساسانی سلطنت کے آغاز کا ذکر ہے ۔اپنی اہمیت کی بنا پر دو بار طبع ہو چکا ہے ۔ایک بار ایک فرانسیسی مستشرق نے اسے روزنامۂ ایشیا میں فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ۔ دوسری دفعہ ایک ضخیم مقدمہ کے ساتھ آقا مجتبیٰ مینوی نے اسے تہران سے طبع کرایا ۔ تاریخ طبرستان کا ایک مختصر انگریزی ترجمہ مسٹر براؤن نے بھی ترتیب دیا تھا ۔لیکن سنہ ۱۳۲۰ھ میں سن کتاب کی بنیادی طباعت مرحوم عباس اقبال آشتیانی نے دو جلدوں میں شروع کی تھی ۔

اگر ہم تاریخِ طبرستان کے مقدمہ کو نظر انداز کر دیں۔ جو انشا پردازی کے لحاظ سے اشعار۔ امثال اور شواہد وغیرہ سے بھرپور ہے تو باقی کتاب ساتویں صدی ہجری کے آغاز کی سادہ فارسی نثر کا نمونہ ہے۔ جو نہایت ہی سلیس اور جامع طریقہ انشا میں لکھی گئی ہے۔ اور فارسی انشاپردازی کا ایک دلپذیر نمونہ ہے۔ (صفا)

فارسی میں لکھی ہوئی مقامی تاریخوں میں تاریخِ طبرستان مصنفہ محمد بن الحسن بن اسفندیار بہت اہمیت رکھتی ہے۔ مصنف کے بارے میں ہمارے معلومات بہت کم ہیں۔ بلکہ صرف اتنے ہی ہیں جو اس نے اتفاقیہ طور پر اپنی کتاب میں کہیں کہیں خود ہی بیان کر دیتے ہیں۔ کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۶۰۶ھ میں بغداد سے رَے آیا۔ اور وہاں اس نے رستم بن شہریار حکمران کے کتب خانہ میں طبرستان کی ایک تاریخ دیکھی جو عربی زبان میں تھی۔ جسے الیزدادی نے قابوس بن وشمگیر کے عہد میں مرتب کیا تھا۔ اسی کتاب پر اس نے اپنی فارسی کی تاریخ طبرستان کی بنیاد رکھی۔ کچھ مدت بعد اسے پہلے آمل اور پھر خوارزم کی طرف جانا پڑا۔ خوارزم کے متعلق اس نے لکھا ہے۔ کہ وہ اُس وقت اہلِ علم کا مرکز اور بڑا بارونق شہر تھا۔ یہاں اس نے کم از کم پانچ برس تک قیام کیا۔ اسی دوران میں اسے اپنی کتاب کے لئے بہت اچھا مواد میسر آگیا۔ چونکہ وہ ۶۱۳ھ تک اپنی کتاب کی تالیف میں مشغول تھا۔ اس لئے اس نے اُسے اپنی کتاب میں شامل کر لیا۔ اس کے بعد مصنف کے حالات کا کچھ پتہ نہیں۔ اور صحیح طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کہ آیا جب منگولوں نے ۶۱۷ھ میں خوارزم کو تاخت و تاراج کیا۔ تو مصنف ان فسادات میں مارا گیا۔ یا وہ اس سے قبل ہی اپنے وطن مازندران کو واپس جا چکا تھا؟

اس کتاب کے متعلق زیادہ تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اس مختصر انگریزی ترجمہ سے لگایا جا سکتا ہے جسے

پروفیسر براؤن نے سلسلۂ گب میموریل کی دوسری جلد کی صورت میں شائع کیا تھا کتاب کے ابتدائی حصّہ میں افسانوی عنصر کی کثرت ہے۔ لیکن اسلامی تاریخ کے حصّے میں بہت سے تاریخی۔ سوانحی اور جغرافیائی معلومات پائے جاتے ہیں جو بہت قیمتی ہیں۔ بالخصوص ان مشہور مقامی شخصیتوں کے تفصیلی کوائف اور ان شعراء کے حالات جو طبری زبان میں اشعار کہتے تھے۔ ابن اسفندیار کی تاریخ رستم بن اردشیر کی وفات پر ختم ہو جاتی ہے۔ جو سنہ ۶۰۶ھ میں واقع ہوئی۔ لیکن کسی بعد کے مصنّف نے اس کتاب میں واقعات کے سلسلے کو سنہ ۷۵۰ھ تک جاری رکھا ہے۔

(براؤن)

طبرستان کے متعلق محمد بن الحسن بن اسفندیار (جو اختصار کے ساتھ عام طور پر ابنِ اسفندیار کے نام سے مشہور ہے) کی تاریخ سب سے زیادہ قدیم ہے جو متلم صورت میں ہم تک پہنچی ہے۔ مؤلف کی زندگی کے متعلق ہمیں سوائے اس کے اور کچھ معلوم نہیں جو اس نے کتاب کے شروع میں اپنے متعلق ہمیں خود بتایا ہے۔ اس کے اپنے بیان کے مطابق اس کے جو دو قابلِ ذکر مآخذ باوندنامہ اور عقود ہیں۔ وہ بھی بظاہر ضائع ہو چکے ہیں مستشرق ڈارن (DORN) نے اس کتاب کا سالِ تالیف سنہ ۱۲۱۶ء بنایا ہے۔

مصنّف نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ جب وہ سنہ ۶۰۶ھ (۱۲۰۹-۱۲۱۰ء) میں بغداد سے عراق واپس آیا تو اسے یہ خبر سُن کر انتہائی رنج ہوا۔ کہ رستم بن اردشیر بن حسن بن رستم حاکم طبرستان کو ۲۱ شوال سنہ ۶۰۶ھ دکیم اپریل سنہ ۱۲۱۰ء) میں قتل کر دیا گیا ہے۔ وہ دو ماہ تک غم و غصّہ کی حالت میں رَے میں مقیم رہا سوائے کتاب بینی کے غم غلط کرنے کا اس کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا۔ ایک دن شہنشاہ رستم بن شہریار کے بنا کردہ مدرسہ کی لائبریری میں شاہِ طبرستان کا دبارا کے عہد کی تاریخ کے متعلق اسے چند لکھے ہوئے صفحات مل گئے۔ اسے فوراً یاد آگیا

کہ اس سے قبل مرحوم حسام الدولہ اردشیر نے اس سے کئی بار دریافت کیا تھا۔ کہ آیا اُس نے اس شاہ طبرستان کا ذکر کسی عربی یا فارسی کتاب میں دیکھا ہے۔ چنانچہ اس نے اس سوال کا جواب نفی میں دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ اسے باوندنامہ کے سوا کسی دوسری تاریخ طبرستان کا نام معلوم نہیں۔ جو مختلف حکایات اور قصوں سے پُر ہے۔ اور جسے حسام الدولہ شہریار بن قارن کے لئے تصنیف کیا گیا تھا۔ جب ابن اسفندیار نے ان اوراق کا بغور مطالعہ کیا۔ تو معلوم ہوا کہ اس میں عقود السحر وقلائد الدُرر مؤلفہ ابوالحسن محمد یزدادی کا تمام مواد موجود ہے جس میں مصنف نے پڑھنے والوں کو مفید معلومات بہم پہنچانے کی بجائے عربی زبان پر اپنی مہارت کا مظاہرہ کیا تھا۔ ابن اسفندیار نے اسے فارسی میں ترجمہ کر لیا۔ اور اس میں حسام الدولہ اردشیر اور اس کے شاندار اسلاف کے کچھ کارنامے اضافہ کر دیئے۔ جب اس کے چند علم دوست احباب نے اس کی حوصلہ افزائی کی تو اس نے اپنی مرتب کردہ کتاب کا ایک صاف نسخہ تیار کرنا شروع کیا۔ اسی اثنا میں اسے اپنے باپ کی طرف سے ایک خط ملا۔ جس میں اس نے اپنی موت کے قریب ہونے کی اطلاع درج کر رکھی تھی۔ اس لئے وہ کسی کو الوداع کہے بغیر فی الفور اپنے باپ کے پاس چل پڑا۔ اور وہاں پہنچ گیا۔ اور وہ کچھ عرصہ مازندران کے علاقے آمل میں قیام پذیر رہا۔ لیکن وہاں سے جلد ہی خوارزم کو چلا گیا۔ جو اس وقت ایک بہت بارونق شہر تھا۔ یہاں اس نے پانچ سال تک قیام کیا۔ ایک دن اس نے ایک کتب فروش کی دکان پر ایک کتاب دیکھی جو دس مختلف مقالات پر مشتمل تھی۔ ان میں سے ایک مقالہ ہندی سے عربی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ جسے داؤد یزدی نے ۱۹۷ھ (۸۱۲ - ۱۳ء) میں سندھ کے علاء بن سعید کے لئے تیار کیا تھا۔ دوسرا مقالہ عبداللہ بن المقفع کا تھا۔ جو اس نے پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا تھا۔ ابن اسفندیار نے ان مقالات سے بھی اپنی کتاب کے سلسلے میں کافی استفادہ کیا۔

اس نے اپنی کتاب کو مندرجہ ذیل چار حصوں میں تقسیم کیا ہے :۔

(۱) حصہ اوّل :۔ سلطنتِ طبرستان کی اولین بنیاد کے بارے میں۔

اس میں ابن المقفع کے مندرجہ بالا مقالہ کا ترجمہ طبرستان اور اس کے شہروں کی اوّلین بنیاد اور ان کی خصوصیات۔ وہاں کے شاہزادوں۔ امرار۔ طبیبوں۔ انشاپردازوں۔ نجومیوں۔ فلاسفروں، شاعروں اور شاہدوں کے حالات شامل ہیں۔

(۲) حصّہ دوم: طبرستان میں خاندانِ وشمگیر اور بویہ کے عروج اور ترقی کا زمانہ۔

(۳) حصّہ سوم:۔ آلِ وشمگیر کے آخری حاکم نوشیروان بن منوچہر بن قابوس کے ہاتھوں سے طبرستان کی حکومت کیونکر نکل کر غزنوی اور سلجوقی حکمرانوں کے قبضہ میں چلی گئی۔

(۴) آلِ باوند کا عروج اور زوال۔ (باوَن)

---

(۱۷) تذکرہ اولیاء

تذکرۃ الاولیاء بھی کشف المحجوب کی طرح اور اسی ترتیب کے مطابق بزرگانِ صوفیہ کے مقامات، ان کے عجیب و غریب صفات، ان کے منتخب اقوال اور ان کی عبادت اور عادات پر لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں مفید نصیحتیں۔ دل پسند حکایتیں اور عبرت انگیز واقعات کو تفصیل کے ساتھ مؤثر فارسی نثر میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کی عبارت آسان اور دلکش ہے۔ اس کتاب میں اور اسرار التوحید اور کشف المحجوب میں معانی اور اسلوب کے لحاظ سے بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ اور کہیں تو کشف المحجوب کی عین عبارتیں ذرا سے تغیر کے ساتھ اس میں دکھائی دیتی ہیں۔

تذکرۃ الاولیاء کے مؤلف شیخ فریدالدین عطار ہیں اور یہ کتاب ساتویں

صدی ہجری کی ابتدا میں تالیف ہوئی ہے۔ (شفق)

یہ بیش قیمت اور مشہور کتاب فریدالدین محمد بن ابوبکر عطار نیشاپوری کی تصنیف ہے۔ مقاماتِ صوفیہ کے موضوع پر جو کتابیں فارسی زبان میں تالیف ہوئی ہیں۔ ان میں یہ کتاب تیسرے نمبر پہ ہے۔ اس سلسلے کی پہلی کتاب جلابی کی کشف المحجوب ہے اور دوسری طبقات الصوفیہ کا ترجمہ۔

تذکرۃ الاولیاء میں (۹۶) اولیاء اور مشائخ کا ذکر ہے۔ ہر فرد کے ذکر کے ساتھ اس کے مقامات، مناقب، مکارمِ اخلاق، نصائح و مواعظ اور حکمت آمیز اقوال پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ عطار نے اپنے سے پیشتر تمام ان کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ جو مقاماتِ صوفیہ کے بارے میں تالیف ہو چکی تھیں۔ تذکرۃ الاولیاء کا طرزِ بیان بعینہٖ وہی ہے۔ جو ہمیں عطار کی نظم میں نظر آتا ہے۔ یعنی سادہ، دل انگیز اور تکلف سے عاری۔ البتہ ہر بزرگ کے حالات کے ابتدائی فقرات متوازن اور مسجع عبارت پر مشتمل ہیں۔ اور یہ طریق تمام صوفی مشرب مصنفین کے ہاں متداول ہے۔ کتاب کے باقی حصہ کی نثر روانی میں آب اور لطافت میں نسیم صبا سے مشابہ ہے۔ منجملہ دوسرے اسباب کے یہ ایک ایسا سبب ہے جس کی بنا پر تذکرۃ الاولیاء کو بہت سی دیگر فارسی کتب پر فوقیت حاصل ہے۔ قیاس کے مطابق اس کتاب کی تالیف چھٹی صدی ہجری کے آخر یا ساتویں صدی ہجری کے شروع میں ہوئی ہوگی۔ آغازِ کتاب میں عطار نے اس کی تالیف کے متعدد اسباب بیان کئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی کتاب کو ایسی مختلف کتابوں سے نہایت اختصار کے ساتھ فراہم کیا ہے۔ جو اولیاء اور مشائخ کے حالات کے بارے میں پائی جاتی ہیں۔ قرآن اور حدیث کے بعد مشائخ طریقت کے اقوال سے بڑھ کر اور کوئی چیز قابلِ قدر نہیں کیونکہ ان کے اقوال درحقیقت

ان کے اعمال و احوال کا ثمرہ ہیں اور وہ صرف زبانی جمع خرچ اور قیل وقال پر منحصر نہیں ہیں۔ وہ ذاتی مشاہدات پر مبنی ہیں۔ اور ان سے مقصود عبارت آرائی نہیں۔ وہ باطنی اسرار و رموز اور علم لدنی کے آئینہ دار ہیں ——— میں نے اپنے دوستوں کی ایک جماعت کو بزرگوں کے اقوال کی طرف راغب پایا اور مجھے خود بھی ان بزرگوں کے حالات کے مطالعہ کا شوق تھا۔ اس لئے یہ کتاب تالیف کی گئی۔ سلسلۂ کلام تو بہت لمبا تھا۔ اگر میں سب باتوں کو جمع کرتا تو موضوع طویل ہو جاتا لیکن میں نے اپنے لئے اور اپنے دوستوں کے لئے اس مجموعے سے انتخاب کر لیا۔ اگر اس سے زیادہ حالات واقوال کا مطالعہ کرنا ہو تو متقدمین اور متاخرین کی کتابوں میں ان لوگوں کے حالات بہت مل سکتے ہیں۔ ان کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ جن کتابوں سے میں نے مواد جمع کیا ہے۔ ان میں اگر کسی بزرگ کے متعلق ایک روایت کسی طرح موجود ہے۔ تو وہی روایت کسی دوسری کتاب میں اور طرح بیان کی گئی ہے۔ تاہم میں نے حتی الامکان احتیاط سے کام لیا ہے۔ (صفا)

کتاب تذکرۃ الاولیاء کی اہمیت اور قدر و قیمت مختلف وجوہات کی بنا پر مسلّم ہے۔ مثلاً:

(۱) متن کی قدامت :۔ اوّل تو عام طور پر فارسی زبان میں کتب نثر کی تعداد ویسے بھی کم ہے۔ پھر بالخصوص اُس دَور میں جبکہ یہ کتاب لکھی گئی۔ (یعنی چھٹی صدی کے اواخر اور ساتویں کے اوائل میں) ہم نثری کتابوں کی اور بھی زیادہ قلت محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ اگر ہم پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کے لگ بھگ لکھی گئی فارسی نثر کی کتابوں کا شمار کرنا چاہئیں تو مختلف قسم کی فہرستوں کی ورق گردانی کے بعد بڑی کوشش اور مشکل سے ان کی تعداد کو چند دہائیوں تک پہنچایا جا سکے گا۔ اس لئے ان حالات میں اگر اس دَور سے متعلق

کوئی کتاب ہمارے ہاتھ لگ جائے۔ اور وہ ہو بھی شیریں اور سادہ زبان میں تو یقیناً وہ بہت قابلِ تصور کی جائے گی۔ تذکرۃ الاولیا سے پیشتر عربی زبان میں تو اولیاء کے حالات، صوفیہ کے مناقب اور مشائخ طریقت کے اوصاف پر بہت سی کتابیں موجود تھیں۔ مثلاً ابو عبدالرحمان محمد بن الحسین السلمی نیشاپوری کی طبقات الصوفیہ۔ ابونعیم احمد بن عبداللہ الاصفہانی کی حلیتہ الاولیاء ابوعبداللہ الحسین بن نصر الموصلی کی مناقب الابرار ومحاسن الاخیار اور ابوالفرج عبدالرحمان بن علی بن الجوزی کی صفوۃ الصفوۃ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن فارسی زبان میں ہمیں صرف ایسی دو ہی کتابوں کا علم ہے۔ جو تذکرۃ الاولیاء سے پیشتر تالیف کی گئیں۔ ایک تو کشف المحجوب الارباب القلوب ہے جس کے مؤلف ابوالحسن علی بن عثمان الجُلّابی الغزنوی (متوفی ۴۶۵ھ) ہیں اور دوسری کتاب مندرجہ بالا طبقات الصوفیہ کا ترجمہ ہے۔ جسے ابواسماعیل عبداللہ بن محمد انصاری ہروی (متوفی ۴۸۱ھ) نے ترتیب دیا۔ انہوں نے اپنی مجالس وعظ ونصیحت میں اسے املا کرایا تھا۔ بعض دیگر مشائخ کے سوانح حیات جو اصل کتاب میں مذکور نہ تھے۔ وہ انہوں نے اس ترجمہ میں اپنی طرف سے اضافہ کر دیئے۔ اور ساتھ ہی اپنے ذاتی احوال ومشاہدات بھی درج کر دیئے۔ لیکن چونکہ یہ کتاب قدیم ہروی زبان میں تھی۔ اس لئے مولانا عبدالرحمان جامی نے اس کی تلخیص و تہذیب کر کے اپنے زمانے کی مروّج زبان میں اسے منتقل کر دیا۔ اور اس کا نام نفحات الانس رکھا۔ ممکن ہے کہ ان دو کتابوں کے علاوہ اور بھی اس موضوع پر کوئی کتاب ہو۔ لیکن یا تو وہ مشہور نہیں ہو سکی۔ اور یا ہمیں اس کا علم نہیں ہو سکا۔

(۲) **تنوع مضامین** :۔ مقاماتِ عارفین۔ مناقب صوفیہ۔ مشائخ طریقت کے مکارمِ اخلاق۔ اولیاء اور صالحین کے سوانح حیات اور ان کے حالات کی تفصیل۔ زہد و ورع حاصل کرنے کے لئے ان کے مختلف طریقے۔

ان کی سخت قسم کی ریاضتیں اور تکلیف دہ مجاہدات۔ ان کے حکمت آمیز اقوال و نصائح و مواعظ جو اجتماعی زندگی اور عوام الناس کے لئے بہت سود مند تھے۔ وغیرہ وغیرہ اس قسم کے مضامین کے لحاظ سے یہ کتاب بہت زیادہ اہمیت اور سخت قوی تاثیر رکھتی ہے۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس لحاظ سے وہ بے نظیر ہے۔ حاجی خلیفہ نے لکھا ہے کہ بعد میں کسی صوفی نے اس کتاب میں مندرج مختلف مشائخ کے کلمات و اقوال کو علیحدہ کتابی صورت میں جمع کیا تھا۔

(۳) طرزِ انشا اور اسلوب عبارت :۔ اس کتاب کی طرزِ انشا کے سلسلے میں دو صفات بالکل واضح ہیں۔ ایک سادگی اور دوسری شیرینی۔ ان دو اوصاف کے لحاظ سے اس کتاب کا درجہ بہت بلند ہے۔ فارسی زبان میں ہمیں کسی اور ایسی کتاب کا علم نہیں۔ جو بیک وقت اس درجہ تک ان دو صفات کی جامع ہو۔ اور اسے اس کے ساتھ مشابہ قرار دیا جا سکے۔ کیوں نہ ہو۔ ایک ایسی کتاب جو لوگوں کی پند و عبرت کے لئے لکھی گئی ہو اسے کمالِ سادگی کا نمونہ اور ہر قسم کے تصنع و تکلف سے عاری ہی ہونا چاہیئے۔ ورنہ اس کی تصنیف کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

اس کتاب کے متن میں بعض غریب اور مخصوص قسم کے الفاظ و تراکیب کا استعمال دیکھنے میں آتا ہے۔ جن کی نظیر یا تو بالکل نایاب ہے۔ اور یا کم از کم فارسی نثر میں نہیں ملتی۔ بلکہ وہ شعر و شاعری کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ایسی تراکیب و الفاظ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) وہ جو نحوی خصوصیات کی حامل ہیں۔
(۲) جو صرفی خصوصیات کی حامل ہیں اور
(۳) جو لغوی خصوصیات کی حامل ہیں۔

ان صفات کے پہلو بہ پہلو یہ بھی مدنظر رکھنا چاہیئے۔ کہ اگر تاریخی نقطۂ

نظر سے اس کتاب کو ملاحظہ کیا جائے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ واقعات کے ضبط کرنے اور مطالب کو صحت کے ساتھ سپرد قلم کرنے میں مسامحات سے خالی نہیں اور اس پر پورا اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں اکثر مشکوک وضعیف بلکہ بالکل بے بنیاد مطالب۔ غیر مطابق واقعات۔ موضوع احادیث (خوارق عادات اور کرامات سے قطع نظر) بہت سے عجیب وغریب واقعات اور تاریخی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔

تاہم یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس قسم کی کتاب کی تالیف سے غرض مندرجہ بالا امور کے علاوہ کچھ اور ہوتی ہے۔ اور اس کا مصنف تاریخی مسائل کی تحقیق وتدقیق اور واقعات کے نقل وضبط میں ان کی صحت کا چنداں خیال نہیں رکھتا۔ کیونکہ اس کا اصل مقصد وعظ ونصیحت اور تہذیب اخلاق و عادات وغیرہ ہوتا ہے۔ اور یہ چیزیں تاریخی واقعات کی صحت وعدم صحت سے چنداں واسطہ نہیں رکھتیں۔ اس لئے ایسی کتابوں میں صحیح اور غلط کی آمیزش بھی اس اصل غرض کو پورا کردیتی ہے۔ (محمد خان قزوینی)

---

(۱۸) جوامع الحکایات ولوامع الروایات

محمد عوفی نے ۶۳۰ھ میں ایک کتاب تالیف کی جو جوامع الحکایات ولوامع الروایات کے نام سے موسوم ہے۔ اس کی چار جلدیں ہیں۔ مؤلف دیباچے میں لکھتا ہے۔ کہ اس نے اس کتاب کی تیاری میں تقریباً ایک سو کتابوں سے مدد لی ہے۔ اور خود دیکھی سُنی باتیں بھی اس میں شامل کی ہیں۔ (بدخشانی)

لباب الالباب کے مصنف محمد عوفی نے ایک اور کتاب جوامع الحکایات

کے نام سے لکھی ہے۔ اور اس میں ادبی حکائتیں اشعار اور مختلف مثلیں درج کی ہیں۔ عوفی کا باپ مرو کا رہنے والا تھا۔ خود عوفی نے بخارا میں تعلیم حاصل کی۔ خراسان کے شہروں کا سفر کیا اور اس کے بعد ہندوستان پہنچا۔ (شفق)

یہ کتاب عوفی کی ایک اہم یادگار ہے۔ اور ان معتبر ترین کتابوں میں سے ہے۔ جو فارسی زبان میں لکھی گئیں۔ یہ بعض ایسے تاریخی اور ادبی فوائد پر مشتمل ہے جو بعض دوسری کتابوں کی ورق گردانی سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ جوامع الحکایات کے متعدد نسخے نہ صرف ایران بلکہ بیرونی ممالک کے کتب خانوں میں بھی موجود ہیں۔ یہ کتاب چار جلدوں میں ہے۔ اور ہر جلد پچیس ابواب پر مشتمل ہے عوفی نے اس کتاب کی تالیف کے سلسلے میں مختلف قسم کے تاریخی اور ادبی مصادر کے علاوہ قصص و حکایات اور نثر نویسی اور شعر گوئی سے متعلقہ کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ جن میں سے اب بعض کا وجود تک نہیں ملتا۔ علاوہ ازیں بہت سے معلومات کو بھی جو اس نے مختلف ممالک کی سیر و سیاحت اور اہل علم و فضل کی ملاقات کے بعد بہم پہنچائے تھے۔ اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے۔ اس لئے اس کی یہ کتاب نہ صرف ادبی لحاظ سے بلکہ کئی ایک نقطہائے نظر سے خصوصاً تاریخی لحاظ سے نہایت اہم اور قابلِ توجہ بن گئی ہے۔ اسی اہمیت کی بنا پر جوامع الحکایات بعد میں بہت سے اہل تصنیف و تالیف کے معلومات کا مصدر رہی ہے مثلاً امین احمد رازی نے ہفت اقلیم میں منہاج سراج نے طبقاتِ ناصری میں۔ قزوینی نے عجائب المخلوقات میں۔ ہندو شاہ نے تجارب السلف میں حمد اللہ مستوفی نے تاریخ گزیدہ اور نزہتہ القلوب میں اور بعض دیگر مؤلفین نے بھی اپنی کتب کی تالیف میں اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ ترکی زبان میں اس کے تین ترجمے ہو چکے ہیں۔

اگر اس کتاب کے دیباچہ کے بعض مقامات کو جو اس زمانے کی عادت کے

مطابق مسجع و مقفیٰ عبارات میں لکھے گئے ہیں۔ نظر انداز کر دیا جائے۔ تو باقی کتاب نہایت سادہ اور رواں نثر میں لکھی گئی ہے۔ تاہم اس سادہ عبارت میں بھی عربی کلمات و تراکیب کی فراوانی ہے۔ لیکن یہ کلمات و تراکیب اس لئے استعمال نہیں کی گئیں کہ لکھنے والے کا ادبی مقام لوگوں پر ظاہر کیا جائے۔ بلکہ یہ ایسے کلمات و تراکیب ہیں جو چھٹی صدی ہجری کے آخر اور ساتویں صدی کے شروع میں فارسی زبان میں رائج ہو کر جزو زبان بن چکے تھے۔ (صفا)

جوامع الحکایات ولوامع الروایات محمد عوفی کی تصنیف ہے۔ مصنف کا اپنا بیان ہے۔ کہ اس کا سلسلۂ نسب مشہور صحابی عبدالرحمان بن عوف سے ملتا ہے اسی مناسبت سے وہ عوفی کہلاتا ہے۔ اس کی ابتدائی زندگی خراسان۔ ماوراءالنہر بالخصوص بخارا میں بسر ہوئی۔ وہاں سے وہ ہندوستان میں آیا۔ اور سلطان ناصرالدین قباچہ کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔ ۶۲۵ھ ایریل ۱۲۲۸ء) میں ناصرالدین قباچہ کی شکست اور وفات کے بعد عوفی فاتح سلطان شمس الدین التتمش کے دربار میں جا پہنچا جس کے نام پر اس نے اپنی کتاب جوامع الحکایات کو معنون کیا۔ پروفیسر براؤن لکھتے ہیں۔ کہ عوفی کی یہ کتاب ابھی تک زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس کے قلمی نسخے نایاب نہیں ہیں۔ اس کا ایک عمدہ اور پرانا نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ حکایات کا یہ ضخیم مجموعہ چار حصوں میں منقسم ہے۔ ہر حصہ پچیس ابواب پر مشتمل ہے۔ پھر ہر باب میں متعدد حکایات ہیں۔ جو باب کے عنوان کی وضاحت کرتی ہیں۔ کتاب کا طرزِ تحریر سیدھا سادا اور صاف ہے۔ اور عوفی کی دوسری کتاب لباب الالباب کے مقابلے میں نہایت آسان ہے۔ دونوں کے طرز انشا بالکل ایک دوسرے کی ضد نظر آتے ہیں۔ (براؤن)

یہ ایک بہت ہی اہم کتاب ہے۔ جو فارسی میں تالیف کی گئی ہے۔ اس میں بہت سے تاریخی اور ادبی فوائد موجود ہیں۔ جو کسی دوسری کتاب میں میسّر نہیں آتے۔ یہ کتاب اطرافِ عالم میں مشہور ہے۔ اور اس کے متعدد قلمی نسخے یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ عوفی نے قریباً ۶۳۰ھ میں اسے تالیف کیا۔ سنہ ۱۰۰۰ھ تک عوفی کا نام صرف اسی کتاب کے ذریعہ معروف تھا۔ چنانچہ تاریخ گزیدہ کے مؤلف کے علاوہ دیگر کئی مؤلفین نے عوفی کا نام جوامع الحکایات کے سلسلے میں ذکر کیا ہے۔ جوامع الحکایات چار جلدوں میں ہے۔ اور ہر جلد میں پچیس الباب ہیں۔ یعنی الباب کی مجموعی تعداد ایک سو ہے۔ اس کی ہر جلد قریباً لباب الالباب کی ایک جلد کے برابر یا قدرے کم ہے۔ عوفی نے قاضی محسّن تنوخی کی عربی کتاب الفرج بعد الشدۃ کا فارسی ترجمہ بھی کیا تھا۔ جو اب ناپید ہے۔ تاہم اس کی بیشتر حکایات جوامع الحکایات میں بھی مذکور ہیں۔ (براؤن)

اس کتاب کا اصل مصنّف نورالدین محمد بن محمد العوفی البخاری الحنفی الاشعری ہے۔ جو چھٹی صدی ہجری کے اواخر اور ساتویں صدی ہجری کے اوائل کے فضلا میں سے تھا۔ چونکہ وہ اور اس کے خاندان کے لوگ حضرت عبدالرحمان بن عوف مشہور صحابی کی اولاد میں سے ہونے کے مدعی تھے اس لیئے وہ عوفی کی نسبت سے مشہور ہوا۔ عوفی ماوراءالنہر کے علمی و ادبی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ کتاب جوامع الحکایات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ مصنّف کی ولادت بخارا میں ہوئی اور وہیں اس نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد طلبِ علم اور ملاقاتِ مشائخ کے سلسلے میں اکثر بلادِ ماوراءالنہر، خراسان اور ہندوستان کے چند شہروں کی بھی سیاحت کی۔ وہ ہر ملک کے علما کی خدمت میں پہنچا۔ اور ان سے روایتِ احادیث کی اجازت

حاصل کی وہ وعظ و نصیحت کی مجالس کے قائم کرنے میں ہمیشہ مشغول رہا کرتا تھا۔ اور اسی وسیلہ سے اس نے امرائے وقت اور ملوکِ عصر کی خدمت میں تقرب حاصل کر لیا۔

عوفی نے قریباً ۶۰۰ھ میں ماوراءالنہر سے خراسان کی طرف ہجرت کی اور ۶۰۷ھ تک خراسان اور خوارزم کے شہروں میں گھومتا پھرتا رہا۔ فتنۂ مغول کے انتشار کے آغاز میں خراسان سے ہجرت کر کے سندھ میں ناصرالدین قباچہ کی خدمت میں آگیا۔ چنانچہ ۶۱۷ھ میں وہ اس بادشاہ کی خدمت میں جا پہنچا اور جوامع الحکایات کو جسے اس نے ناصرالدین قباچہ کی خدمت میں شروع کیا تھا۔ دہلی کے قیام کے دوران میں نظام الملک جنیدی کے نام پر اسے ختم کیا۔ ۶۲۵ھ کے بعد مصنف نے دہلی کے ہی پایۂ تخت میں رہائش اختیار رکھی اس کی تصانیف حسب ذیل ہیں:-

(۱) لباب الالباب دو جلد۔

(۲) جوامع الحکایات و لوامع الروایات چار جلدوں میں۔

(۳) قاضی المحسن بن علی کی کتاب "الفرج بعد الشدۃ" کا فارسی ترجمہ۔

(۴) رائح السلطان بر دوش حدیقۃ انسانی۔ عوفی قریباً ۶۳۰ھ تک جامع الحکایات کی تالیف میں مشغول تھا۔ اس کے بعد اس کے حالات کا ہمیں کچھ علم نہیں۔

جوامع الحکایات و لوامع الروایات فارسی کی اہم ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ فارسی نثر کی کتابوں میں قدر و قیمت، جامعیت اور افادہ کے نقطۂ نظر سے اس قسم کی کوئی دوسری کتاب موجود نہیں تو اسے مبالغہ پر محمول نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اس میں بے شمار تاریخی و ادبی فوائد پائے جاتے ہیں علاوہ ازیں اس میں ایسے اسناد ملتے ہیں، جو دوسری کتابوں میں موجود نہیں۔ عوفی کے پاس یہ کتاب تصنیف کرتے وقت بعض ایسے ماخذ و مصادر موجود تھے جو اب سب کے سب ناپید ہو چکے ہیں۔ لیکن اُن کے مطالب اس کتاب میں محفوظ

ہیں۔ ان خصوصیات کے علاوہ یہ کتاب طرزِ تحریر میں ایک عمدہ روش اور سبک انشا میں خاصی پختگی کی مالک ہے۔ اور بالعموم تکلفات لفظی۔ کثرت مرادفات اور حشو و زوائد سے پاک ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ اندازِ تحریر میں پختگی پیدا کرنے اور فارسی صرف و نحو سے واقفیت بہم پہنچانے کے لئے بہت سود مند ہے۔ جوامع الحکایات اصل کتاب پوری طبع نہیں ہوئی۔ لیکن اس کے نسخے ایران ہندوستان اور یورپ میں موجود ہیں۔ (ملک الشعرا بہار)

عوفی گو شاعر بھی تھا۔ اور لباب الالباب میں نمونہ کے طور پر اس کا ایک نامکمل قصیدہ بھی ملتا ہے۔ اور جوامع الحکایات میں تو اس کے بہت سے شعر ہمیں نظر آتے ہیں۔ لیکن وہ چنداں دلکش نہیں۔ درا صل عوفی کی مہارت کا میدان نثر ہے۔ چنانچہ ملک الشعراء بہار سبک شناسی کی تیسری جلد میں لکھتے ہیں :۔

"فن ادب میں استادی کے لحاظ سے گو عوفی کو ہم اولین درجہ کے اساتذہ میں شمار نہیں کر سکتے کیونکہ اول تو اس کی نثر کا انداز یکساں نہیں اور اسی میں تشبیب و فراز بہت ہیں۔ دوسرے وہ کسی خاص طرز کا موجد نہیں بلکہ مقلد ہے۔ تاہم ایک لحاظ سے ہم اسے اوّل درجہ کے انشا پردازوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ اس کی بنا اس حسنِ انتخاب پر ہے۔ جسے اس نے اپنی دو مرغوب و مفید تالیفات (لباب الالباب و جوامع الحکایات) میں پیش کیا ہے۔ حسنِ انتخاب بجائے خود ہر تالیف و تصنیف کی بہت عمدہ وجہ فضیلت قرار دی جا سکتی ہے۔

یہ دونوں کتابیں ادبیات ایران کے آسمان پر ہمیشہ درخشندہ رہنے والے دو ستاروں کی مانند ہیں۔ اور جب تک زبانِ فارسی زندہ ہے۔ ادب و تاریخ کے علما ان دونوں کتابوں کے مرہونِ احسان رہیں گے۔

عوفی کا طرزِ انشا صحیح طور پر لباب الالباب سے ہی انداز کیا جا سکتا ہے کیونکہ جوامع الحکایات سے درست طور پر یہ معلوم نہیں ہوتا۔ کہ فلاں حکایت عوفی نے

اپنے قلم سے لکھی ہے یا فارسی کی کسی دوسری کتاب سے بعینہٖ نقل کردی ہے۔ چنانچہ بہت سی حکایات ایسی ہیں۔ جو بیہقی کے طرزِ انشا پر لکھی گئی ہیں۔ ہر چند مؤلف نے اپنی طرف سے ان میں کچھ تصرف کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کا اصل اسلوب مخفی نہیں رہ سکا۔ بعض مواقع پر تکلف اور تصنع کی کثرت کے باعث عبارت فصاحت و لطافت کی راہ سے ہٹ گئی ہے۔ بلکہ اس میں تعقید و تعسف رونما ہو گیا ہے۔ کہیں کہیں ایسی عبارات بھی پائی جاتی ہیں۔ جو انتہائی سادگی کی وجہ سے آٹھویں صدی ہجری اور بعد کے دور کی سادہ نثر کے مشابہ معلوم ہوتی ہیں۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے۔ عوفی کے اسلوب نثر نویسی کا کوئی مستقل اور واضح ڈھنگ نہیں ہے۔ کبھی تو وہ گھٹیا درجہ کی سجع اور پُر تکلف عبارت استعمال کرتا ہے۔ اور کبھی نہایت دلکش اور اعلےٰ درجہ کی نثر لکھتا ہے۔ مختصر یہ کہ اس کی نثر میں یکسانیت اور ہمواری موجود نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ کثرت مطالعہ اور جوامع الحکایات کی تالیف کے سلسلے میں مختلف مراجع کی طرف رجوع کرنے کی وجہ سے اس کا طرزِ تحریر ایک کھچڑی سا بن کر رہ گیا ہے۔ اس لئے ناچار اس کا طرزِ انشا معلوم کرنے کے لئے ہمیں لباب الالباب ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔

عوفی نے جوامع الحکایات میں کہیں کہیں اپنی تنقید بھی کی ہے۔ اور بعض عجیب و غریب داستانوں کو غیر معقول قرار دیا ہے۔ لیکن پھر بھی مؤلف عارفوں کے حالات لکھتے وقت، ان کے کرامات اور خوارق عادات افعال کو معمولی اور عادی قرار دیتا ہے۔ جہاں کہیں اس نے آیات و احادیث اور امثال و حکم وغیرہ سے استشہاد کیا ہے۔ وہاں وہ ان کا صرف ترجمہ پیش کر دینے پر اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ ان کی تعبیر و تشریح بھی پیش کرتا ہے۔

جوامع الحکایات: ۔ اس کتاب کا نام جوامع الحکایات و لوامع الروایات ہے۔ "لوامع" کا لفظ دلالت کرتا ہے۔ کہ پہلا لفظ "جوامع" ہونا چاہئے نہ کہ "جامع"

جیسا کہ غلط مشہور ہو گیا ہے۔ چنانچہ برٹش میوزیم کے سب سے قدیم اور صحیح ترین نسخوں میں سب جگہ وضاحت کے ساتھ "جوامع" ہی درج ہے۔ البتہ حاجی خلیفہ نے دونوں جگہ واحد کے صیغہ کے ساتھ "جامع" اور "لامع" لکھا ہے۔ اور اس طرح کتاب کا نام "جامع الحکایات و لامع الروایات" بیان کیا ہے۔ لیکن یہ سہو واضح ہے۔

یہ کتاب فارسی زبان کی نہایت اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اور بہت سے ایسے تاریخی و ادبی فوائد پر مشتمل ہے۔ جو کسی دوسری کتاب میں دستیاب نہیں ہو سکتے۔ یہ کتاب چار دانگ عالم میں مشہور ہے۔ اور اس کے متعدد نسخے یورپ کے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں۔ ۱۰۰۰ھ تک عوفی کا نام صرف اسی کتاب کے باعث لوگوں میں روشناس تھا؟

ڈاکٹر نظام الدین اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "جس زمانے میں عوفی ظہور پذیر ہوا۔ وہ دو لحاظ سے اہم ہے۔ اوّل تو اس لئے کہ اس دور کا تعلق خراسان پر منگولوں کی ابتدائی یلغاروں اور خوارزم شاہی خاندان کی تباہی و بربادی سے ہے۔ دوسرے اس لئے کہ یہ دور عربی و فارسی ادبی نثر کی کتابوں سے مالا مال ہے۔ اس لئے ادبی نقطۂ نظر سے عوفی اس گذشتہ دولت علم و دانش کا نہ صرف وارث ہے۔ جو جلدی ہی ہم سے چھن گئی بلکہ اسے آنے والی نسلوں تک منتقل کرنے والا بھی ہے۔ اگر ہم منگولوں کے ابتدائی عہد کے مصنفین پر نظر دوڑائیں تو ہم ابن الاثیر مؤلف کتاب کامل جیسے مؤرخین۔ ابن خلکان مؤلف وفیات الاعیان جیسے تذکرہ نویس یاقوت حموی مؤلف معجم البلدان اور زکریا قزوینی مؤلف آثار البلاد جیسے جغرافیہ نویس۔ اور ابن القفطی مؤلف تاریخ الحکماء اور ابن ابی اصیبعہ مؤلف طبقات الاطباء جیسے مؤرخین و سوانح نویس دیکھتے ہیں جو سب کے سب مشہور عربی انشا پرداز تھے۔ اس کے ساتھ ہی فارسی زبان میں بھی مندرجہ ذیل اہم کتابیں تصنیف ہوئیں۔ شمس قیس کی المعجم فی معاییر

اشعار العجم - ابو مشرف ناصح جرباذ قانی کی کتاب الیمینی - ابن اسفندیار کی تاریخ طبرستان - مسعود وراوینی کا مرزبان نامہ فریدالدین عطار کا تذکرۃ الاولیاء اور عوفی کی جوامع الحکایات -

عوفی مندرجہ بالا سب مصنفین سے جو مختلف علاقوں کے باشندے تھے - براہِ راست تعلق نہ رکھتا تھا - لیکن یہ سب معاصرین کا گروہ تھا - اور جس وقت عوفی اپنی حکایات کی تدوین میں مشغول تھا - وہ اپنی اپنی تصنیف کی تکمیل میں مصروف تھے - عوفی کے علاوہ دیگر مصنفین خاص خاص اشخاص، جگہوں، زمانوں اور علوم کے متعلق معلومات فراہم کر رہے تھے - اور وہ ہر قسم کا تحریری یا غیر تحریری سرمایہ اپنی تالیف کے لئے مواد کے طور پر جمع کر رہا تھا - اور اسے مختلف حکایات کی صورت میں ترتیب دے کر محفوظ کر رہا تھا - کتاب کا اصل نام یعنی "جوامع الحکایات ولوامع الروایات" ہی کتاب کی وسعتِ مضامین کا پتہ دے رہا ہے -
کیونکہ اکثر اسلامی معلومات عربی یا فارسی مآخذوں سے ہی مختلف شکلوں میں جوامع الحکایات اور دوسری تصانیف کے درمیان نظر آتی ہیں - لیکن طرزِ بحث و شرح و توضیح کے نقطۂ نظر سے کسی حد تک ان میں انفرادیت کی جھلک نمایاں ہے - اس کتاب کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے - جب ہم اسلاف کی تصانیف سے اس کا موازنہ کرتے ہیں - خاص طور پر ادبیاتِ فارسی کی کتابوں سے - اب تک مختلف موضوعوں پر کتابیں لکھی جا چکی ہیں - لیکن ان میں سے ایک مجموعہ بھی ایسا نظر نہیں آتا جس میں تمدن ادبیات اور اسلامی دُنیا کے علوم کے متعلق اس طرح معلومات فراہم کی گئی ہوں -

تاریخی مآخذوں کے لحاظ سے بھی یہ کتاب قابلِ قدر ہے - بعض ایسے مآخذ بھی ہیں - جو مؤلف کی دسترس میں تو موجود تھے - مگر اب بہت کمیاب ہیں مثلاً صُولی کی تاریخ بنی عباس - محمد بن کلبی کی تفسیر اور اس کے بیٹے کی تصنیف ادیان العرب - خطیب بغدادی کی تاریخِ بغداد - سلامی کی تاریخ

ولاۃِ خراسان ۔ ابراہیم بابی کی تاریخ تاجی ۔ مرزبانی کی کتاب الشباب والشیب ابن المقفع کی تاریخِ ملوک عجم ۔

کتاب کی طبقہ بندی اور ترتیب سے عوفی کے بعض مآخذوں کا سراغ ملتا ہے ۔ کیونکہ اس نے اُن ہی تصانیف کو اپنے لئے مشعلِ راہ بنایا ہے ۔ اور انہیں بطور نمونہ اپنے پیش نظر رکھا ہے ۔ مثلاً تاریخ خلافت کے واقعات اس نے تاریخ طبری سے لئے ہیں ۔ سلاطینِ قدیم ایران کی تاریخ کے سلسلے میں غرر ثعالبی شاہنامۂ فردوسی اور تاریخ ملوک عجم سے استفادہ کیا گیا ہے ۔ طاہریہ ۔ صفاریہ ، اور سامانیہ کے حالات کا کچھ حصہ سلامی کی تاریخ ولاۃِ خراسان سے اخذ کیا گیا ہے ۔ آلِ بویہ کے واقعات کے لئے اس کا مآخذ تاریخ تاجی یا تاریخ دیالمہ ہے تاریخِ غزنویہ کے لئے تاریخ ناصری ۔ تاریخ یمینی اور خلق الانسان کو پیش نظر رکھا ہے ۔ درباری امور اور سلطنت کی سیاست کے متعلق غالباً اس کے مآخذ سیاست نامہ قابوس نامہ ۔ اغراض الریاستہ اور سیر الملوک وغیرہ ہیں ۔ پیغمبر اسلام صحابۂ کرام اور زاہدوں اور بزرگانِ دین کے حالات کتاب المغازی ، ربیع الابرار ، رسالہ قشیریہ ۔ اسرار التوحید ۔ روضتہ العلما ، سیر الصالحین اور قصص الانبیاء سے منقول ہیں ۔

یہ تو تھے جوامع الحکایات کے مآخذ و مصادر ۔ ذیل میں اب ان چند کتابوں کے نام درج کیے جاتے ہیں ۔ جنہوں نے جوامع الحکایات کو اپنا مآخذ قرار دیا ہے ۔ یا جن میں اس کا نام مذکور ہے ۔

ہفت اقلیم ۔ طبقات ناصری ۔ عجائب المخلوقات ۔ تجارت السلف ۔ تاریخ گزیدہ نزہتہ القلوب ۔ زبدۃ التواریخ ۔ آثار الوزراء ۔ روضتہ الصفا ۔ مآثرِ ملوک ۔ خلاصتہ الاخبار ۔ دستور الوزراء ۔ حبیب السیر ۔ لطائف الطوائف ۔ جہاں آراء ۔ تاریخ نگارستان ۔ زینتہ المجالس ۔ کشف الظنون ۔ تاریخ فرشتہ ۔ مجمع الفصحاء ۔

جوامع الحکایات کی شہرت اس قدر زیادہ تھی کہ یہ ترکی کے بادشاہوں اور

شاہزادوں کی توجہ کا مرکز بنی رہی ۔ چنانچہ حاجی خلیفہ نے اس کے تین ترکی ترجموں اور ایک نثر کی اختصار کا ذکر کیا ہے ۔ (محمد معین)

---

(۱۹) لباب الالباب

یہ شاعروں اور ادیبوں کا اہم تذکرہ ہے جس کا مؤلف نورالدین محمد عوفی ہے۔

عوفی چھٹی صدی ہجری کے آخر اور ساتویں صدی ہجری کے اوّل کا ایک نامور ادیب ہے۔ سلسلۂ نسب عبدالرحمان بن عوف سے ملتا ہے۔ اسی نسبت سے عوفی کے نام سے شہرت پائی۔ وطن مرو تھا لیکن طالب علمی کا زمانہ بخارا میں گزارا۔ یہاں ایک مشہور عالم قطب الدّین سرخسی سے تعلیم پائی اور وعظ و خطابت میں مہارت حاصل کی۔ آخر وعظ و خطابت کو ہی معاش اور سیاحت کا وسیلہ بنایا۔

عوفی نے ۵۹۷ھ میں بخارا سے چل کر سمرقند، ماوراءالنہر، خراسان اور سیستان میں کچھ وقت گزارا۔ آخر مغلوں کے حملے کی خبر سُنی تو خراسان سے نکل کر سندھ آگیا اور ۶۱۷ھ میں ناصرالدّین قباچہ کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ جس نے سندھ اور ملتان میں اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی تھی۔ آخر قباچہ کو جب شمس الدین التمش نے شکست دی۔ تو عوفی ۶۲۵ھ میں التمش کی خدمت میں "اچھ" گیا۔ ہندوستان کے قیام کے دوران میں اس نے اپنی دو مشہور کتابیں "لباب الالباب" اور "جوامع الحکایات" تالیف کیں۔

تذکرہ لباب الالباب کو عوفی نے ۶۱۸ھ میں مکمّل کر کے ناصرالدین قباچہ کے وزیر عین الملک کے نام منسوب کیا۔ اس تذکرے میں ایران کے اولین فارسی شاعر سے لے کر مؤلف کے ہمعصر شعراء تک کے حالات لکھے ہیں۔ اور ان کے کلام پر تنقید کی ہے۔ پروفیسر براؤن نے لباب الالباب کو دو جلدوں میں شائع کرایا ہے۔ پہلی

جلد میں ان بادشاہوں اور امراء و وزراء کے حالات لکھے ہیں جو شعر کہتے تھے، دوسری جلد میں عام شعراء اور ادیبوں کے حالات ہیں ۔ (بدخشانی)

لباب الالباب ایرانی شاعروں اور ادیبوں کے حالات پر فارسی کی نہایت اہم کتاب ہے ۔ اس میں فارسی شعر کی ابتدا سے لے کر مصنف کے زمانے تک کے شاعروں اور ادیبوں کے حالات درج ہیں ۔ اس کی دو جلدیں ہیں پہلی جلد شعر کہنے والے سلاطین ۔ امرا ۔ وزراء ۔ علما ۔ اور حکما کے لئے مختص ہے دوسری جلدیں عام شاعروں اور ادیبوں کے حالات درج ہیں ۔ اس کتاب میں (۱۶۹) شاعروں کے نام اور حالات آئے ہیں ۔ بظاہر لباب الالباب ۶۱۸ھ کے قریب یعنی مغلوں کے استیلا کے زمانے میں تصنیف ہوئی ہے ۔

عوفی کا باپ مرو کا رہنے والا تھا ۔ خود عوفی نے بخارا میں تعلیم حاصل کی خراسان کے شہروں کا سفر کیا اور اس کے بعد ہندوستان پہنچا ۔ ہندوستان میں اس نے سلطان ناصرالدین قباچہ (متوفی ۶۲۵ ھ) کے وزیر حسین بن شرف الملک کے نام لباب الالباب معنون کی ۔ ناصرالدین قباچہ نے ایرانی عالموں کی خاص طور پر سرپرستی کی تھی ۔ جو مغلوں کے حملوں میں ایران سے بھاگ کر ہندوستان آ گئے تھے ۔ (شفق)

یہ کتاب ساتویں صدی ہجری کے شروع تک کے ایرانی شعراء کا تذکرہ ہے ۔ جو دو جلدوں میں ہے ۔ پہلی جلد میں ان شعراء کا حال ہے ۔ جو بادشاہوں ۔ وزیروں اکابر اور علما میں سے پیدا ہوئے ۔ اور دوسری جلد میں ان ایرانی شعرا کا ذکر ہے جو طاہری دور سے لے کر تالیف کتاب کے زمانے (یعنی ناصرالدین قباچہ کے دورِ حکومت) تک مختلف ایرانی درباروں سے وابستہ تھے ۔

یہ کتاب سدیدالدین (یا نورالدین) محمد بن محمد عوفی بخاری کی تصنیف ہے

جو چھٹی صدی ہجری کے آخر اور ساتویں صدی ہجری کے شروع میں ایران کے مشہور اہلِ دانش اور مصنفین میں سے تھا۔ اس کا سلسلۂ نسب عبدالرحمان بن عوف مشہور صحابیٔ رسول تک پہنچتا ہے۔ اسی باعث اس کا خاندان عوفی کے نام سے مشہور ہے۔ عوفی نے جوامع الحکایات کی نسبت اپنی اس کتاب میں عبارت آرائی کی طرف بہت زیادہ خیال رکھا ہے۔ اور جن شعرا کا اس نے ذکر کیا ہے۔ ان کے نام۔ لقب۔ وطن اور جائے تربیت کی مناسبت سے مسجع اور مرصع عبارت لانے کی کوشش کی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے لباب الالباب کا شمار طرزِ انشا کے لحاظ سے فارسی کی پُر تکلف تصانیف میں ہونا چاہیئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جب ہم ہر شاعر کے ابتدائی حالات کا حصہ مطالعہ کر چکتے ہیں۔ تو عوفی کا وہی معمولی اور سادہ طرزِ نگارش ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ جو اس نے جوامع الحکایات میں استعمال کیا ہے۔ لباب الالباب کی اہمیت بس صرف اسی چیز پر ہی منحصر نہیں کہ وہ ایران کے فارسی گو شاعروں کا پہلا قدیم ترین تذکرہ ہے بلکہ اس وجہ سے بھی ہے۔ کہ اس کا مصنف مختلف بلاد و امصار کی سیر و سیاحت کے سلسلے میں بہت سے ایسے ہمعصر شاعروں سے روشناس ہوا۔ جن کے دیوان ابھی تک پوری طرح شائع نہیں ہوئے تھے۔ اور وہ حملۂ مغول کے باعث تلف ہو چکے تھے۔ عوفی نے ان شعرا سے تعلقات استوار کرنے کے بعد ان کے حالات اور نمونہ ہائے کلام اپنی کتاب میں مہیا کئے ہیں۔ اور اس طرح سے حملۂ مغول کے لگ بھگ زمانہ میں فارسی شاعری کی روش سے ہمیں آشنا کر دیا ہے۔

لباب الالباب کا مقدمہ ایک ایسی نثر کا عجیب و غریب نمونہ ہے جو شاعرانہ افکار سے پُر ہے۔ خاص طور پر چھٹی صدی ہجری کے شروع میں اس قسم کی پُر تکلف نثر مصنفین کا شیوہ بن چکی تھی۔ اس دلچسپ مقدمہ کے آخر میں عوفی نے وجہ بیان کر دی ہے۔ کہ تصنیف و تالیف کو بیان کی دو قسموں یعنی نظم و نثر میں کیوں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (صفا)

جب عوفی بخارا سے ہندوستان میں آیا اس نے اپنے آپ کو سلطان ناصرالدین قباچہ (حاکمِ سندھ و ملتان) کے دربار سے وابستہ کر لیا۔ تو اس نے قباچہ کے وزیر عین الملک حسین ابوالاشعری کے نام پر اپنا تذکرۂ فارسی شعراء (لباب الباب) معنون کیا۔

لباب الالباب ایک قدیم ترین تذکرہ ہے جس میں فارسی شعراء کے حالاتِ زندگی جمع کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب عام طور پر نایاب تھی۔ یہاں تک کہ پروفیسر براؤن نے اسے دو حصّوں میں بالترتیب ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۶ء میں شائع کیا۔ یہ تذکرہ اپنی قدامت کے لحاظ سے بہت اہم ہے اور اس میں بعض کم مشہور بلکہ ایسے شعرا کے حالات بھی ہیں جن کا ذکر اور کہیں موجود نہیں۔ اس لئے فارسی ادب کی تاریخ میں اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ لیکن اس میں بعض نقائص بھی ہیں۔ مثلاً اکثر شعراء کے حالات بیان کرتے وقت تاریخوں کا تعین صحیح نہیں کیا گیا۔ علاوہ ازیں ان پر جو تنقید کی گئی ہے۔ وہ محض لفاظی اور عبارت آرائی تک محدود ہے اور شعرا کے نمونہائے کلام نہایت روکھے پھیکے اور غیر دلچسپ ہیں۔ پھر کئی ایک قابلِ قدر شعرا مثلاً ناصر خسرو اور عمر خیام وغیرہ کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ بہت سے متوسط درجہ کے شعرا کا (بالخصوص وہ جن کا ذکر کتاب کی جلد اوّل کے آخر میں پایا جاتا ہے یعنی وہ شعرا جو سلطان ناصرالدین قباچہ کے دربار میں مصنّف کے ہمعصر تھے) ذکر نہایت مبالغہ آمیز مدحیہ الفاظ و تراکیب سے پُر ہے اور معمولی سی بات کو خواہ مخواہ بلا ضرورت طول طویل بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان نقائص کے باوجود یہ کتاب تقریباً ان تین سو فارسی شعراء کے حالات بیان کرتی ہے۔ جو شیخ سعدی کے شہرت حاصل کرنے سے پیشتر نام پیدا کر چکے تھے۔ اس لئے اس ابتدائی دَور کے فارسی ادب کے متعلق یہ ہمارے معلومات میں بہت حد تک اضافہ کرتی ہے۔ تاہم اس کا مطالعہ طبیعت میں ایک طرح کا ملال اور ناگواری کا احساس پیدا

کئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ کیونکہ قاری کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مؤلف کے پاس پہلے سے کافی مواد موجود تھا جس کی بنا پر وہ اپنی اس کتاب کو زیادہ دلچسپ اور قابل قدر بنا سکتا تھا ۔ (براؤن)

لباب الالباب کی اصل اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ یہ شعرائے فارسی کے حالات زندگی پر سب سے قدیم تذکرہ ہے ۔ یا زیادہ صحیح اور بہتر الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے ۔ کہ سب سے قدیم تذکرہ ہے جو ہم تک پہنچا ہے ۔ کیونکہ ہمیں تذکرہ سے ملتی جلتی صرف دو ایسی کتابوں کے نام معلوم ہیں ۔ جو لباب الالباب سے قبل تالیف ہو چکی تھیں ۔ ایک تو مناقب الشعراء مؤلفہ ابوطاہر خاتونی اور دوسری چہار مقالہ مؤلفہ نظامی عروضی سمرقندی ۔ ابوطاہر خاتونی پانچویں صدی ہجری کے آخر اور چھٹی صدی ہجری کے شروع کا آدمی ہے ۔ اور اسی طرح چہار مقالہ بھی تقریباً ۵۵۰ھ کی تصنیف ہے ۔ لیکن درحقیقت ان دونوں میں سے کسی کو بھی اصطلاحی لحاظ سے تذکرۃ الشعراء نہیں کہا جا سکتا ۔ کیونکہ تذکرہ کا اصل مقصود شعرا کے حالات ہوتے ہیں ۔ اگرچہ کتاب مناقب الشعرا بظاہر ناپید ہو چکی ہے ۔ اور اس کے موضوع کا ہمیں کچھ علم نہیں ۔ لیکن غالب گمان یہی ہے ۔ کہ وہ بھی از قسم تذکرہ نہ تھی ۔ کیونکہ دولت شاہ نے اپنے تذکرہ کے مقدمہ میں دعویٰ کیا ہے کہ اس میں شک نہیں کہ اس نے نہ ہی لب الالباب کو ملاحظہ کیا ۔ اور نہ ہی وجود کا اسے علم تھا کہ فارسی شعرا کے حالات و واقعات اور ان کی تاریخ کو ابھی تک کسی فاضل نے جمع نہیں کیا ۔ اس کے باوجود دولت شاہ نے خود مناقب الشعراء سے ہی ایک دو جگہ عبارات نقل کی ہیں ۔ اگر مناقب الشعراء فی الواقع تذکرۃ الشعرا کی نوعیت کی حامل ہوتی تو دولت شاہ کے قول و فعل میں

یہ تناقض نہ پایا جاتا ... مناقب الشعراء شعرا کے علم ...

اور شاعروں سے تعلق رکھنے والی حکایات اور ان کے اشعار کے منتخبات سے متعلق کتاب ہوگی۔ باقی رہا چہار مقالہ اگرچہ اس کے مقالۂ دوم میں ضمنی طور پہ چند مشاہیر شعرا کے حالات مذکور ہیں۔ لیکن یہ واضح ہے کہ مؤلف کا مقصد ان کے حالات بیان کرنا نہ تھا۔ بلکہ وہ تو صرف خواص بادشاہ کے چار گروہوں یعنی دبیروں، شاعروں، منجموں اور طبیبوں کے لئے دستور العمل پیش کرنا چاہتا تھا۔ بنابریں یہ کہا جا سکتا ہے کہ سب سے پہلی کتاب جو شعرا کے حالات پر مشتمل ہے۔ اور ہم تک پہنچی ہے۔ وہ یہی لب الالباب ہے نہ کوئی دوسری کتاب۔

لباب الالباب اگرچہ شعرا کے حالاتِ زندگی کے بارے میں کچھ مفید معلومات بہم نہیں پہنچاتا۔ بالخصوص سنینِ وفات (جو لوگوں کے حالاتِ زندگی میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں) اس کتاب میں اکثر مقامات پر مفقود ہیں مصنّف کا واحد مقصد پُر تکلف مسجّع عبارت دور از کار تشبیہات و استعارات اور پُر تصنّع تجانیس کا استعمال ہے۔ کیونکہ ان چیزوں کے سوا قاری کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا۔ اسی طرح جو اشعار نمونہ کے طور پر انتخاب کئے گئے ہیں، وہ زیادہ تر متوسط بلکہ گھٹیا درجہ کے ہیں۔ حتیٰ کہ ان منتخبات سے زیرِ بحث شاعر کے سبک اور اسلوبِ بیان کا کھوج نہیں لگایا جا سکتا

ان سب باتوں کے باوجود یہ کتاب تاریخی اور ادبی نقطۂ نظر سے نہایت اہم ہے اور جیسا کہ غلام علی خاں آزاد نے خزانۂ عامرہ کے مقدمہ میں لکھا ہے "بعد کے تمام تذکرہ نویس شعراء کے حالات لکھنے میں لباب الالباب ہی کے احسان مند ہیں" "درحقیقت اگر یہ تذکرہ ہمارے ہاتھ نہ آتا تو اکثر شعرائے متقدمین کے حالات سے ہم بالکل ناآشنا رہتے۔ اور غالباً ان شعرا کے نام تک بھی ہم کو معلوم نہ ہو سکتے۔ تذکرۂ دولت شاہ ہی کو لیجئے۔ جو

مصنّف کے گمان کے مطابق شعرا کا سب سے پہلا تذکرہ ہے اگر ہم اس کا لباب الالباب کے ساتھ موازنہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ بیشتر متقدمین شعرا کا بالخصوص صفاری، سامانی اور غزنوی دَور کے شعرا جن کے حالات لباب الالباب میں مذکور ہیں، تذکرہ دولت شاہ میں نام و نشان تک نہیں ملتا، اور غالباً دولت شاہ نے ان کا نام تک بھی نہیں سُنا۔ ورنہ وہ ضمناً ہی کہیں ان کا نام لے دیتا، علاوہ ازیں جن شعرا کے حالات اس نے ذکر بھی کئے ہیں، وہ بھی چنداں قابلِ اعتماد نہیں ہیں بلکہ ان میں فرضی افسانوں اور جعلی اور جھوٹی روایتوں کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ اسی لئے لباب الالباب کی اہمیت اور قدر و قیمت کے متعلق ہم جو کچھ بھی کہیں اس کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اجمالی طور پر صرف اسی قدر اشارہ کافی ہے۔

بظاہر لباب الالباب کا سالِ تالیف ۶۱۸ھ ہے۔ کیونکہ مصنّف نے اپنی کتاب میں دوبار ۶۱۷ھ کا اس طرح ذکر کیا ہے۔ کہ وہ گزرے ہوئے سالوں میں سے کوئی سال سمجھا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف مصنّف ایک جگہ لکھتا ہے۔ کہ "ممالکِ سجستان اس وقت یمین الدین بہرام شاہ کے زیرنگیں ہیں۔" اور چونکہ یمین الدین بہرام شاہ نے ۶۱۲ھ سے ۶۱۸ھ تک سیستان پر حکومت کی، اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کی تالیف ۶۱۸ھ سے بعد بھی نہیں ہوئی۔

تذکرہ بزم آراء (تالیف ۱۰۰۰ھ) کے مصنّف سید علی بن محمود الحسینی نے تقریباً تمام لباب الالباب کو بغیر کسی کمی بیشی کے نقل کر کے اپنی طرف منسوب کر لیا ہے، ہاں بعض مقامات پر اس نے عوفی کی بیان کردہ تفصیلات کو قدرے مختصر ضرور کر لیا ہے۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ تمام کتاب میں مصنّف نے یہ ظاہر کیا ہے کہ اسے دُنیا بھر میں لباب الالباب کو بغیر کسی کمی بیشی کے نقل

کر کے اپنی طرف منسوب کر لیا ہے۔ ہاں بعض مقامات پر اس نے عوفی کی بیان کردہ تفصیلات کو قدرے مختصر ضرور کر لیا ہے۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے۔ کہ تمام کتاب میں مصنف نے یہ ظاہر کیا ہے۔ کہ اسے دُنیا بھر میں لباب الالباب نامی کتاب کا کہیں بھی پتہ نہیں ہے۔

لباب الالباب بھی شیخ عطار کے تذکرۂ اولیاء کی طرح (جو قریباً اسی زمانہ کی تصنیف ہے) کسی خاص قسم کے طرزِ نگارش یا قدیم اصطلاحات یا قابلِ ذکر صرفی و نحوی خصوصیات کی حامل نہیں ہے۔ البتہ ایک چیز قابلِ توجہ یہ ہے کہ اس کے عجیب و غریب اسلوبِ بیان کی جھلک ہمیں جوامع الحکایات اور المعجم فی معاییرِ اشعار العجم میں عام طور پر نظر آتی ہے۔ لیکن اب وہ بالکل متروک ہو چکا ہے۔ (محمد خاں قزوینی)

---

(۲۰) راحت الصُدور

عہدِ سلجوقیہ کے اولین دَور میں ایشیائے کوچک میں فارسی زبان میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں راحت الصُدور خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ یہ ۵۹۹ھ کی تالیف ہے۔ کتاب کا اصل نام اعلام الملوک المسمیٰ براحت الصدور و آیت السرور ہے۔ اس کا مؤلف محمد بن علی بن سلیمان راوندی ہے۔

محمد بن علی اصفہان کے ایک گاؤں راوندکا رہنے والا تھا۔ فنِ خطاطی کا بہت بڑا ماہر تھا۔ اس کا ماموں جب طغرل بن ارسلان (۵۷۳ تا ۵۹۰ھ) کا اتالیق مقرر ہو کر ہمدان آیا تو مؤلف راحت الصدور بھی اس کے ساتھ آگیا۔ ملک الشعراء بہار لکھتے ہیں کہ طغرل بن ارسلان کلام مجید اپنے ہاتھوں سے

لکھتا تھا۔ اور مؤلف راحت الصدور اس کو طلائی نقش و نگار سے مزین کرتا تھا۔

حکومت سلجوقیہ کے اختتام پر خوارزمیوں نے غلبہ پایا۔ تو محمد بن علی عراق سے چل کر ایشیائے کوچک پہنچ گیا۔ جہاں اس نے سلجوقیوں کی یہ تاریخ یعنی راحت الصدور لکھی اور وہاں کے حکمران کیخسرو بن قلیچ ارسلان کے نام منسوب کی۔

راحت الصدور کا شمار نثر فارسی کی بہترین کتابوں میں ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ تاریخ بھی کلیلہ و دمنہ کی طرح فنی نثر ہی کا نمونہ ہے۔ لیکن یہ نسبتاً سادہ ہے۔ اور اس میں عربی کے الفاظ بھی کم ہیں۔ البتہ آیات واحادیث سے کلام کو مزین کیا گیا ہے۔ مناسب موقعوں پر مشہور شعرا کے اشعار بھی درج کئے گئے ہیں بعض شعرا کے قصیدے بھی لکھے گئے ہیں ہر فصل میں اپنا ایک ترجیع بند بھی لکھا ہے جس میں اپنے ممدوح کی مدح وستائش کی ہے۔ راحت الصدور سادہ اور رواں فارسی میں لکھی گئی ہے۔ (بدخشانی)

راحت الصدور سلجوقیوں کی تاریخ ہے۔ اور فارسی کی اہم ترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس میں ایران کے سلجوقیوں کی ابتداء سے لے کر خوارزمشاہیوں کے ہاتھوں ان کے انقراض تک کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔

راحت الصدور کا مصنف ابوبکر محمد راوندی کاشان سے قریب ایک مقام راوند کا رہنے والا تھا۔ اس نے خود سلجوقی دربار دیکھا تھا۔ اور عراق کے سلجوقیوں کے آخری حکمران طغرل بن ارسلان کی خدمت میں رہ چکا تھا۔ اس نے اپنی کتاب چھٹی صدی ہجری کے آخر میں لکھی ہے اور ۶۰۳ھ میں روم کے سلجوقی حکمران کیخسرو بن قلیچ ارسلان کے نام

معنون کیا۔ اس سلطان کے دربار میں راوندی کی بڑی عزت تھی۔
راحت الصدور کو نہ صرف سلجوقیوں کی تاریخ ہونے کی وجہ سے اہمیت حاصل ہے۔ بلکہ اسے بڑی ادبی اہمیت بھی حاصل ہے۔ کیونکہ اس کے مؤلف نے بہت سے شاعروں اور علماء و فضلا کے نام لئے ہیں۔ اور ان کے اشعار اور قصیدے بھی نقل کئے ہیں۔ اور قصیدے بھی نقل کئے ہیں۔ اسی طرح بہت سے عربی امثال بھی اس نے نقل کئے ہیں۔
راوندی نے اور کتابیں بھی لکھی تھیں۔ اور خود شعر بھی کہتا تھا چنانچہ اس کتاب میں اس کے کئی قصیدے کیخسرو اور قلج ارسلان کی مدح میں درج ہیں۔ (شفق)

اس کتاب کا اصل نام اعلام الملوک ہے۔ لیکن زیادہ مشہور نام راحت الصدور و آیتہ السرور ہے۔ یہ چھٹی صدی ہجری کے آخر اور ساتویں صدی ہجری کے شروع میں تصنیف کی گئی اہم کتابوں میں شمار ہوتی ہے اس کی اہمیت صرف طرز بیان کی سلاست اور مؤلف کی فضیلت و شرف پر ہی موقوف نہیں بلکہ اس لئے بھی ہے۔ کہ یہ بہت سی تاریخی و اجتماعی اطلاعات پر مشتمل ہونے کے باعث فارسی کی ان معتبر ترین اور سودمند ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ جو حملۂ مغول سے پیشتر معرضِ وجود میں آئیں۔
اس کے مؤلف کا نام نجم الدین ابوبکر محمد بن علی راوندی ہے۔ راوند کاشان کے علاقے میں ہے۔ مؤلف نے خود ہی اپنے حالات کی تفصیل بیان کر دی ہے۔ اور اس سلسلے میں اس نے اپنے دوستوں اور استادوں کی تعریف بھی کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ابھی وہ چھوٹا ہی تھا کہ اس کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔ پھر وہ اپنے ماموں تاج الدین احمد بن محمد کی خدمت میں آ گیا۔ جو

علوم شرعی و ادبی میں سرآمدِ روزگار تھا۔ اور دس سال اس کے پاس رہا۔ اس نے اس دوران میں عراق کے کئی بڑے بڑے شہروں کی سیاحت کی اور اپنے ماموں سے شرعی و ادبی علوم سیکھنے کے لئے ستر قسم کے خط لکھے۔ اسی سلسلے میں اس کی رسائی سلطان طغرل بن ارسلان کے دربار تک ہو گئی۔ جسے علمِ خط سیکھنے کا بڑا شوق چرایا۔ طغرل بن ارسلان کے ۵۹۰ھ میں قتل ہو جانے کے بعد آلِ سلجوق کا خاتمہ ہو گیا۔ اور راوندی عراق سے ایشیائے کوچک کی طرف نکل گیا۔ اور یہاں غیاث الدین کیخسرو بن قلیج ارسلان سلجوقی کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔ یہاں اس نے راحت الصدور کو مکمل کر کے غیاث الدین کیخسرو کے نام اسے ممنون کر دیا۔ اس کتاب کی تالیف اس نے کچھ مدت پیشتر شروع کر رکھی تھی۔ مصنف کا اپنا بیان ہے۔ کہ اسے ۵۸۰ھ میں پہلی بار اس کتاب کے لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ لیکن اس نے اپنے مطالب اور یادداشتوں کو ایشیائے کوچک کی ہجرت کے بعد ۵۹۶ھ میں ترتیب دیا اور اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے اور غیاث الدین کیخسرو کے نام معنون کرنے کا کام ۶۰۳ھ کے بعد پیش آیا۔

راوندی نے اس بیش قیمت کتاب کے بعد دولت سلجوقی پر بحث کی ہے۔ ہر ابتدائے سلطنت سے ان کے حالات بیان کئے ہیں۔ اور سلاجقۂ بزرگ کے عہد سے تمام واقعات سلطان سنجر کے دورِ حکومت کے آخر تک ذکر کئے ہیں۔ بعدازاں سلاجقۂ عراق کا تذکرہ طغرل بن ارسلان کے آخر زمانے تک کیا ہے اور پھر عراق پر خوارزمشاہیوں کے غلبہ کے حالات بیان کئے ہیں۔

کتاب کے آخر میں راوندی نے چند فصلیں ندیمی، شطرنج، شراب، گھوڑ دوڑ، تیراندازی، شکار وغیرہ کے آداب میں لکھی ہیں۔ پھر ایک فصل کتاب کے خاتمہ میں درج کر کے آخر میں سلطان غیاث الدین کیخسرو کی مدح کی ہے۔ اور اس

پر کتاب ختم ہو جاتی ہے۔

یہ کتاب نثرِ فارسی کی بہترین کتب میں شمار ہوتی ہے۔ جس کا کچھ حصّہ پُرتکلّف اور مزیّن عبارت پر مشتمل ہے۔ اور باقی حصّہ بالکل سادہ نثر میں ہے پُرتکلّف عبارت کے مقامات پر راوندی نے عربی و فارسی اشعار و امثال بالخصوص اشعارِ شاہنامہ سے استشہاد کیا ہے۔ بعض جگہوں پر راوندی کا کلام شعر کی طرح لطیف بلکہ شاعری کی تمام شرائط اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ راحت الصدور کا ایک ادبی امتیاز یہ ہے کہ اسی میں چھٹی صدی ہجری کے بڑے بڑے شاعروں کے قصائد کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ راوندی خود بھی متوسط درجہ کا شاعر تھا۔ اور اس نے اپنے بعض قصائد راحت الصدور میں نقل کئے ہیں۔ (صفا)

یہ کتاب ابوبکر نجم الدین محمد بن علی بن سلیمان الراوندی کی تصنیف ہے۔ راوند کاشان کے قریب ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ مصنّف وہاں کے ایک علمی خاندان کا رُکن تھا سلجوقیہ خاندان کا آخری حکمران سلطان طغرل (سنہ ۵۷۱ھ تا سنہ ۵۹۰ھ) اہلِ علم کا مربّی اور علم حاصل کرنے کا خواہشمند تھا۔ سنہ ۵۷۷ھ میں اسے فنِ خطاطی سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور اس سلسلے میں اس نے راوندی کے ماموں زین الدین محمد بن محمد بن علی کو اپنا استاد اور رہنما بنا لیا۔ جب سلطان اس فن میں ماہر ہو گیا تو اس نے قرآن مجید کے نقل کرنے کے سلسلے میں کئی ایک مذہبین اپنے ارد گرد اکٹھے کر لئے۔ اسی موقع پر راوندی اپنے ماموں کے ذریعہ سلطان سے متعارف ہوا۔ آہستہ آہستہ وہ دربار میں بہت زیادہ مقرب ہو گیا۔

راوندی نے اس کتاب کی تصنیف کا آغاز سنہ ۵۹۹ھ میں کیا اور

غالباً دو تین سال تک اس میں مشغول رہا۔ کتاب مکمل ہو جانے کے بعد راوندی کی خواہش یہ تھی کہ وہ اسے ایشیائے کوچک کے کسی سلجوق حکمران کے نام پر معنون کرے، کیونکہ یہ اسی خاندان کے اسلاف کی تاریخ تھی۔ اس طرح وہ یہ چاہتا تھا۔ کہ ایک طرف تو اسے اس کا بیش بہا صلہ مل جائے گا۔ اور دوسری طرف اسے خاندانِ سلجوق کے ساتھ تجدیدِ تعلقات کا موقع ہاتھ آ جائے گا۔ آخر اس سلسلے میں اس کی توجہ حاکمِ وقت رکن الدین سلیمان شاہ کی طرف منعطف کرائی گئی جس نے ۵۹۷ھ میں اپنے بڑے بھائی غیاث الدین کیخسرو کے خلاف بغاوت کر کے سلطنت اس سے چھین لی تھی۔ اور بعد ازاں چار سال (یعنی اپنے سالِ وفات ۶۰۱ھ) تک تختِ حکومت پر قابض رہا۔ مصنف کا اپنا بیان ہے کہ وہ یہ کتاب رکن الدین کے نام پر معنون کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ وہ غاصب اور ظالم ہے اور تخت و تاج کا اصل وارث اس کا بھائی کیخسرو ہے تو اس نے یہ کتاب کیخسرو کے نام پر معنون کر دی۔

یہ تو مصنف کا اپنا بیان ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ اس کتاب کا پہلا نسخہ رکن الدین کے نام پر ہی معنون کیا گیا تھا۔ اور جب ۶۰۱ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اور کیخسرو تخت نشین ہوا۔ تو مصنف نے مناسب تبدیلیوں کے بعد اسے دوبارہ نئے حکمران کی خدمت میں پیش کر دیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نظرِ ثانی کے موقع پر بہت زیادہ احتیاط سے کام نہیں لیا گیا۔ کیونکہ اب بھی کتاب میں اس قسم کے آثار موجود ہیں جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ یہ کتاب پہلے رکن الدین ہی کے نام پر معنون کی گئی تھی۔

یہ کتاب سلاجقۂ عظام کے عروج (یعنی پانچویں صدی ہجری کے آغاز) سے لے کر ان کے زوال (یعنی ۵۹۰ھ) تک کی تاریخ پر حاوی ہے۔ ضمیمہ کے طور پر ایک باب میں بعد کے پانچ سالوں کے واقعات بھی بالتفصیل بیان ہوئے ہیں اور اس طرح یہ کتاب ۵۹۵ھ تک کے حالات پر ختم ہوتی ہے۔ تاریخی لحاظ سے ۵۵۱ھ

سے ۵۹۵ھ تک کے حالات بہت اہم ہیں جو اس خاندان کے آخری دو حکمرانوں یعنی ارسلان اور طغرل کے دورِ حکومت پر مشتمل ہیں۔ کیونکہ یہ مصنّف کے چشم دید بھی ہیں اور زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ اس سے قبل کی تاریخ پر یہ کتاب چنداں مفید نہیں کیونکہ پہلے بارہ حکمرانوں کے حالات نہایت مختصر اور غیر دلچسپ انداز بیان میں پیش کیے گئے ہیں۔ گو یہ کتاب صاف اور سادہ سبک میں لکھی گئی ہے۔ جو منگولوں سے پہلے کی تحریروں کا خاصہ تھا۔ لیکن غیر ضروری مواد کے باعث اس کا حسن کافی حد تک کم ہو گیا ہے۔ مثلاً لمبے لمبے خارج از موضوع مباحث۔ نامناسب اور عامیانہ عربی مقولات کی کثرت اور ان کا فارسی ترجمہ اور کثیر التعداد اشعار وغیرہ۔ میرے خیال میں اگر اس قسم کے مواد کو جو نہ صرف غیر ضروری ہے بلکہ واقعات کے تسلسل میں رکاوٹ بھی پیدا کرتا ہے۔ کتاب سے خارج کر دیا جائے۔ تو کتاب موجودہ حجم کا صرف چوتھا حصّہ باقی رہ جائے گی۔ مصنّف نے ۲۶۴ عربی امثال و محاورات کا ذکر کیا ہے۔ جو سب بغیر حوالے کے ثعالبی کی کتاب الفرائد و القلائد سے ماخوذ ہیں۔ اس طرح کل اشعار کی تعداد ۲۷۹۹ ہے۔ جن میں سے کچھ اشعار مصنّف کے اپنے اور باقی انوری۔ سید اشرف حسن غزنوی اثیر الدین اخیکشی۔ مجیر بیلقانی۔ جمال الدین اصفہانی عمادی اور نظامی گنجوی کے ہیں۔ عربی کے کل ۱۲۲ شعر ہیں۔ جو زیادہ تر طغرائی اور متنبّی کے ہیں۔ ۶۷۶ شعر شاہنامہ سے بھی نقل کیے گئے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس کتاب کے ابتدائی حصّہ کا ماخذ ظہیر الدین نیشاپوری کی کتاب سلجوق نامہ ہے۔ جو سلطان ارسلان کا اتالیق اور ہمارے مصنّف کا رشتہ دار تھا۔ کتاب کے آخری متفرق ابواب کے مطالب اتنے اہم نہیں جتنے وہ بادی النظر میں معلوم دیتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے دو ابواب جو تیر اندازی اور گھوڑ دوڑ سے متعلق ہیں۔ بآسانی حذف کیے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ بالکل غیر دلچسپ اور مذہبی نقطۂ نظر سے ان دونوں کھیلوں کے حلال و حرام ہونے کی بحث

تک محدود ہیں۔ اس طرح ایک باب شراب کے جواز و عدم جواز پر ہے۔ اس قسم کے تمام مواد کا ماخذ حنفی فقہ کی بعض مشہور کتب ہیں جو مصنف نے خود بیان کر دی ہیں۔ مثلاً الجامع الکبیر، الجامع الصغیر وغیرہ۔ شطرنج پر جو باب لکھا گیا ہے۔ اس میں کوئی غیر معمولی بات بیان نہیں ہوئی۔ بلکہ یہ کم و بیش ان ہی باتوں کا اعادہ ہے۔ جو اس سے قبل عربی اور فارسی کے متقدمین و متاخرین مؤلفین شطرنج کے موضوع پر لکھ چکے ہیں۔ مثلاً یہ کہ یہ کھیل ہندوستان میں ایجاد ہوا۔ اور نوشیرواں عادل کے دورِ حکومت میں ہندوستان سے ایران میں لایا گیا۔ اور اس کے وزیر بزرجمہر نے اس میں چند ایک تبدیلیاں کیں۔

فنِ کتابت والا باب قدرے دلچسپ ہے۔ اس میں چار مختلف رسم الخط یعنی نسخ، رقاع، ثلث اور محقق پر بحث کی گئی ہے۔

ایک باب الغالب والمغلوب کے موضوع پر ہے۔ اس میں دو حریفوں کے باہمی تنازع کے نتائج کے اخذ کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔

جیسا کہ بیان ہو چکا مصنف کی کتاب کے ابتدائی تاریخی واقعات کا ماخذ صرف ظہیر الدین نیشاپوری کا سلجوق نامہ ہے۔ جسے اس نے آخری سلجوقی فرمانروا سلطان طغرل کے عہد میں لکھا تھا۔ اس وقت اس کتاب کے موجود ہونے کا ہمیں کچھ علم نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ سلاجقہ کے لکھنے میں تقریباً تمام بعد میں آنے والے مصنفین نے اسے اپنا بنیادی ماخذ قرار دیا ہے۔ ہمارے مصنف کے علاوہ حمد اللہ مستوفی نے تاریخ گزیدہ میں اور حافظ ابرو نے زبدۃ التواریخ میں اس سے استفادہ کیا ہے۔

جن کتابوں میں راحت الصدور سے براہِ راست استفادہ کیا گیا ہے ان کی کیفیت حسب ذیل ہے:-

(۱) سلاجقہ کی تاریخ پر ایک مختصر خلاصہ جو تاریخ جہانگشائے کے قلمی نسخہ کے آخر میں بطور ضمیمہ لگا ہے۔ اس کے مصنف یا تاریخ تصنیف کا کچھ

پتہ نہیں۔ اس میں سلاجقہ کی تاریخ کے متعلق تمام مواد۔ راحت الصدور سے منقول ہے۔

(۲) العراضہ فی الحکایات السلجوقیہ تاریخ سلاجقہ کے متعلق ایک مختصر رسالہ یہ محمد بن محمد کی تالیف ہے۔ جو آخری مغول حکمران ابوسعید کا وزیر تھا۔

(۳) رشید الدین کی کتاب جامع التواریخ میں تاریخ سلاجقہ کے متعلق جو باب ہے وہ بھی راحت الصدور سے ماخوذ ہے۔ جہاں تک ہم نے تحقیق کی ہے۔ رشید الدین نے کہیں بھی راحت الصدور کا حوالہ نہیں دیا۔ اور نہ ہی اس کے استعمال اور اس سے استفادہ کا ذکر کیا ہے۔ اتنے بڑے مورخ سے اس قسم کی حرکت اگر ناقابلِ معافی نہیں تو کم از کم نازیبا ضرور ہے۔

(۴) ترکی زبان میں تواریخ سلجوق کے نام سے ایک قلمی کتاب موجود ہے۔ اس کا بیشتر حصہ راحت الصدور سے ہی ترجمہ کیا گیا ہے۔

(۵) تاریخ جہاں آرا کے مصنف قاضی احمد غفاری نے بھی راحت الصدور سے کافی استفادہ کیا ہے۔ جیسا کہ دونوں کی عبارتوں کا مقابلہ کرکے یہ چیز واضح ہو سکتی ہے۔ (پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال)

---

(۲۱) المعجم فی معاییر اشعار العجم

محمد بن قیس رازی کی تصنیف المعجم فی معاییر اشعار العجم عروض، قوافی اور نقدِ شعر پر فارسی کی اہم ترین کتاب ہے۔ جو ہم تک پہنچی ہے۔ یہ کتاب نہ صرف ان تینوں فنون کے قواعد کی جامع ہے۔ بلکہ اس میں نہایت کار آمد مثالیں اور اشعار بھی آئے ہیں۔ اور بہت سے بڑے شاعروں اور خاص کر مصنف کے معاصروں کے حالات آئے ہیں۔ اس لحاظ سے اس کتاب کی اہمیت اور بھی

بڑھ گئی ہے۔ اس کتاب کا مصنف رَے کا رہنے والا تھا۔ اور مغلوں کے حملہ کے زمانے میں خوارزم شاہ کے ساتھ ساتھ شہر بشہر مارا مارا پھرتا رہا۔ آخر کار مغلوں کے ڈر سے فارس بھاگ گیا۔ اور یہاں سنہ ۶۲۳ھ میں اتابک سعد بن زنگی کی خدمت اختیار کر لی۔ اس زمانے میں اس کتاب معجم کو جسے فارس آنے سے پہلے اس نے عربی زبان میں تصنیف کیا تھا۔ سنہ ۶۳۰ھ میں فارسی کا جامہ پہنایا۔

(شفق)

المعجم فی معاییر اشعار العجم شمس الدین محمد بن قیس رازی کی تالیف ہے۔ شمس قیس کا شمار چھٹی اور ساتویں صدی ہجری کے مشہور علما اور ادبا میں ہوتا تھا۔ اس کا وطن رَے تھا۔ کچھ عرصہ تحصیل علم کے لئے خراسان، ماوراء النہر اور خوارزم میں قیام کیا۔ سنہ ۶۱۴ھ میں جب سلطان علاؤالدین خوارزمشاہ بغداد کو مسخر کرنے کے ارادے سے خوارزم سے نکلا تو شمس قیس بھی اس کی خدمت میں آ گیا۔ پھر سنہ ۶۱۷ھ میں جب علاؤالدین تاتاریوں کے لشکر سے ہزیمت کھا کر طبرستان کی طرف بھاگا تو اس وقت بھی شمس قیس اس کا ہمرکاب تھا۔ اس افراتفری کی حالت میں جہاں اور نقصان ہوا۔ وہاں شمس قیس کا قیمتی ساز و سامان اور اس کی گراں قدر تحریریات بھی ضائع ہو گئیں۔ آخر جب خوارزم شاہ روپوش ہو گیا۔ اور خراسان پر تاتاریوں کا تسلط ہو گیا۔ تو شمس قیس نے سنہ ۶۲۳ھ میں فارس میں پناہ لی۔ اور اتابک سعد بن زنگی حاکم فارس کی ملازمت اختیار کر لی۔

شمس قیس نے اپنا تذکرہ "المعجم" سنہ ۶۱۴ھ میں لکھنا شروع کیا تھا۔ سنہ ۶۱۷ھ میں اس تذکرے کا کچھ مسودہ لوٹ مار کی نذر ہو گیا۔ آخر شمس نے مسودے کو پھر سے ترتیب دیا۔ یہ مسودہ شروع میں عربی زبان میں لکھا گیا تھا۔ لیکن شمس قیس جب اتابک سعد بن زنگی کے دربار میں آیا۔ تو یہاں خود ہی بعض فضلا کی فرمائش پر اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

المعجم علم عروض اور تنقید شعری کا ایک مستند تذکرہ ہے۔ اس میں مشہور شعراء کے حالاتِ زندگی بھی لکھے گئے ہیں۔ یہ تذکرہ ساتویں صدی ہجری کے شروع کی تالیف ہے۔ اس میں نہ مترادف الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ نہ صنائع بدائع ہی کی بھرمار ہے۔ اس کی نثر سادہ اور رواں ہے۔ البتہ عربی کے الفاظ سے یہ تذکرہ خالی نہیں۔ (بدخشانی)

کتاب المعجم فی معاییر اشعار العجم اہم ترین رجامع ترین اور معروف ترین کتاب ہے جو ساتویں صدی ہجری کے شروع میں علوم ادبی کے موضوع پر فارسی زبان میں لکھی گئی۔ یہ کتاب دو حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ فنِ عروض کے بارے میں ہے۔ اور دوسرا علمِ قافیہ اور نقدِ شعر میں۔ نقدِ شعر کے سلسلے میں محاسنِ شعر، نظم و نثر میں استعمال ہونے والے اچھے اچھے صنائع و بدائع اور شرائط شعر و شاعر پر بھی بحث کی گئی ہے۔ علمِ عروض اور علمِ قافیہ کے متعلق تحقیقات کے سلسلے میں ہر موقع پر مؤلف نے بہت سے اشعار اور شاعروں کے ناموں کا ذکر، کیا ہے۔ اور بعض جگہ شاعر کی تمام غزل یا قصیدہ نقل کر دیا ہے۔ اس لئے کتاب المعجم نہ صرف فارسی کے ادبی علوم کے بارے میں فوائد کثیر کی حامل ہے۔ بلکہ جملۂ منقول سے پیشتر کے شعرا کے ناموں اور ان کے اشعار کے نمونوں کے نقطۂ نظر سے بھی بہت نفع بخش ثابت ہوئی ہے۔ کتاب المعجم کا طریق کار۔ طرزِ تحریر اور ترتیبِ مطالب سب اعلےٰ انداز پر مبنی ہیں۔ اور مؤلف کی کمالِ استادی، وسعتِ اطلاع اور عربی و فارسی کے مختلف ادبی علوم پر احاطۂ کامل کا پتہ دیتی ہیں۔ اسی وجہ سے یہ کتاب ان لوگوں کے لئے بھی استفادہ کا مآخذ قرار پاتی ہے۔ جنہوں نے اس کے بعد فارسی کے ادبی علوم پر تصنیف و تالیف کا کام کرنا چاہا ہے۔ لیکن پھر بھی ان میں سے کوئی ایک معجم کی سی جامعیت اور کمال کو نہیں پہنچ سکا۔

اس سود مند اور بے نظیر کتاب کا مؤلف شمس الدین محمد بن قیس رازی ہے

لیکن افسوس کہ اس کے بارے میں ہمارے پاس کافی معلومات نہیں ہیں۔ اس کی کتاب کے مطالعہ سے صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ وہ رے کا باشندہ تھا اور اپنی عمر کا بیشتر حصہ اس نے خراسان ماوراءالنہر اور خوارزم میں گزارا۔ اس کے بعد وہ بخارا مرو میں گیا اور پھر عراق میں آکر چند سال گزارے۔ ۶۱۷ھ میں جب سلطان محمد خوارزمشاہ مغلوں کے لشکروں کے تعاقب کے خوف سے بھاگا بھاگا پھر رہا تھا تو شمس قیس اس کے ہم رکاب تھا۔ اور اس جنگ میں شریک تھا جو سلطان اور مغلوں کے لشکر کے درمیان اصفہان اور ہمدان کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اس دوران میں معجم کے تمام مسودات اور اس کی دوسری نفیس کتابیں ضائع ہوگئیں خوارزم شاہیوں کے خاتمہ کے بعد ۶۲۳ھ میں وہ عراق سے فارس میں آگیا۔ اور اتابک سعد بن زنگی کی خدمت سے وابستہ ہو گیا۔ ۶۲۸ھ میں اتابک سعد کی وفات کے بعد اس کے بیٹے اتابک ابوبکر نے بھی اسے ندیم خاص کے عہدہ پر برقرار رکھا۔

جیسا کہ مؤلف نے خود اپنی کتاب کے دیباچے میں بیان کیا ہے۔ معجم کی تالیف کا آغاز ۶۱۴ھ میں خراسان کے ایک فاضل شخص کی خواہش کے مطابق ہوا۔ لیکن مولف خراسان سے ہجرت کر کے مختلف علاقوں میں پھرتا رہا۔ اس لئے یہ کام نا تمام رہا۔ حتیٰ کہ ۶۱۷ھ میں اس کی کچھ یادداشتیں گم بھی ہو گئیں۔ وہ ایک کسان کے ہاتھ لگیں۔ جس نے کچھ مدت کے بعد اسے پہنچا دیں۔ فارس میں آنے کے بعد مؤلف نے اتابک سعد بن زنگی اور اس کے بیٹے ابوبکر کے زیر سایہ قریباً ۶۳۰ھ میں اپنی کتاب کو مکمل کیا۔ اصل کتاب عربی میں لکھی گئی تھی۔ اور یہ عربی فارسی دونوں زبانوں کے علم عروض وقافیہ کے بارے میں تھی۔ لیکن ۶۳۰ھ میں بعض فضلائے فارسی کی فرمائش پر شمس قیس نے اس ضخیم کتاب سے ان تمام چیزوں کو انتخاب کر لیا جو فارسی زبان اور اشعار دری سے متعلق تھیں اور انہیں نسبتاً ایک چھوٹی کتاب میں فارسی زبان میں

ترتیب دیا یہی کتاب اب المعجم فی معاییر اشعار العجم کہلاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جو کچھ عربی اشعار کے متعلق تھا۔ اسے مؤلف نے ایک دوسری کتاب میں جمع کر دیا جو المعرب فی معاییر اشعار العرب کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ رازی کی اور کئی کتابیں بھی تھیں۔ مثلاً الکافی فی العروضین والقوافی۔ حدائق العجم وغیرہ۔ کتاب المعجم کو ایک دفعہ میرزا محمد خاں قزوینی نے مقدمہ و حواشی کے ساتھ تیار کیا۔ اور پروفیسر براؤن نے اسے طبع کرایا اس کے بعد آقا مدرسی رضوی استاد تہران یونیورسٹی نے مختلف نسخوں سے اس کا مقابلہ کر کے دوبارہ سے شائع کرایا۔ (صفا)

یہ کتاب شمس قیس نے شیراز میں اتابک ابوبکر بن مسعد زنگی (۶۲۳ - ۶۶۰) کے لئے لکھی تھی۔ جو مشہور شاعر سعدی کا مربی تھا۔ معجم فی معاییر اشعار العجم فارسی علمِ عروض کا ایک مشہور مگر کمیاب رسالہ ہے۔ جس کا قلمی نسخہ کبھی وقت تمام یورپ میں صرف برٹش میوزیم میں ہی موجود سمجھا جاتا تھا۔ گو بعد میں یہ سراغ مل گیا۔ کہ اس کے دو نسخے قسطنطنیہ میں بھی موجود ہیں۔ یہ کتاب بیروت میں سلسلۂ گِب میموریل کے تحت شائع ہو چکی ہے۔ اس کی اہمیت کا قابلِ ذکر پہلو یہ ہے۔ کہ اس میں متقدمین شعرائے فارسی کے جن میں بعض بالکل گمنام شعراء بھی شامل ہیں۔ کثرت سے نمونہائے کلام پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ مقامی بولیوں میں لکھی ہوئی بعض نظمیں بھی اس میں موجود ہیں۔ اس کے مصنف کے حالات ہمیں صرف اسی قدر معلوم ہیں۔ جو مسٹر ریو نے خود اسی کی کتاب المعجم سے اخذ کئے ہیں۔ مصنف غالباً خراسان یا ماوراء النہر کا باشندہ تھا۔ (براؤن)

زبانِ فارسی کی نفیس و نادر کتب میں سے جو ساتویں صدی ہجری کے

شروع میں تصنیف ہوئیں۔ اور حسن اتفاق سے انقلاباتِ زمانہ اور عالمگیر فتنۂ مغول کی دستبرد سے محفوظ رہ کر ہم تک پہنچ سکیں۔ موجودہ کتاب المعجم فی معاییر اشعار العجم ہے۔ جو فاضل محقق علامہ شمس الدین محمد بن قیس رازی کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب کیمبرج میں پروفیسر براؤن کے اہتمام سے اوقافِ گب کے خرچ پر مرزا محمد خان قزوینی کے تصحیح و حواشی کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔

زیرِ بحث نفیس کتاب فنونِ ادب کے تین شعبوں پر مشتمل ہے۔ یعنی علمِ عروض، علمِ قوافی اور علمِ نقد الشعر۔ یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ اسلام کے بعد عہدِ سامانیہ میں فارسی علوم کی ابتدا سے لے کر آج یعنی تیرہ سو ہجری تک کوئی کتاب بھی اس کمالِ تحقیق، تنقیح اور جامعیت کے ساتھ فارسی زبان میں مذکورہ بالا تینوں فنون پر نہیں لکھی گئی۔ اور اگر تالیف ہوئی بھی ہے تو کم از کم ہم تک نہیں پہنچ سکی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کتاب سے پہلے بھی ان تینوں فنون (نقد الشعر، عروض، قوافی) میں فضلائے ایران نے کافی کتابیں تالیف کی تھیں چنانچہ بعض ادبی کتابوں میں جستہ جستہ ان کے نام دیکھنے میں آتے ہیں۔ مثلاً ابو الحسن علی بن جولوغ بلخی (مشہور شاعر فرخی) کی کتاب ترجمان البلاغۃ (علم شعر و صنائع بدیعیہ میں) اسی طرح ابو محمد عبداللہ بن محمد رشیدی سمرقندی کی کتاب زینت نامہ (علم شعر میں)، احمد بن محمد المنشوری السمرقندی کی کتاب کنز الغرائب (صنعتِ تلون میں)، اور رشید الدین وطواط کی کتاب حدائق السحر فی دقائق الشعر جو فارسی ادب کے شاہکاروں میں سے ہے اور جس کی وجہ سے مؤلف کا نام قیامت تک زندہ رہے گا۔ اسی طرح ابو الحسن علی بہرامی سرخی کی مختلف کتابیں جو علمِ عروض و قافیہ پر تھیں۔ مثلاً غایۃ العروضیین یا

غایۃ العروضیّین اور کنز القافیہ اور خجستہ نامہ (علم عروض میں) وغیرہ۔
ممکن ہے ان کے علاوہ بھی بعض فضلا نے کچھ کتابیں تالیف کی ہوں۔ اور ان کے نام ہم تک نہ پہنچ سکے ہوں۔ سوئے اتفاق سے یہ تمام کتب بھی زمانے کے پے در پے انقلابات اور ملک ایران پر وحشی اقوام کے لگاتار حملوں کے باعث بالکل ناپید ہو چکی ہیں۔ البتہ ان میں سے صرف رشید وطواط کی حدائق السحر خوش قسمتی سے اب تک ہمارے پاس موجود ہے جو فی الحقیقت بقیۂ سلف اور یادگار خلف ہے۔

معجم اور حدائق السحر کے موازنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حدائق السحر شمس قیس کا ایک عمدہ ماخذ و مصدر ہے۔ بالخصوص کتاب کے دوسرے حصّہ کی تالیف اور شواہد شعر کے سلسلہ میں کئی اقتباسات لفظ بلفظ حدائق السحر سے منقول ہیں گو رازی نے اس نقل کی کہیں تصریح نہیں کی۔ اگرچہ حدائق السحر کو تقدمِ زمانی بلکہ تقدمِ فضیلت بھی حاصل ہے۔ لیکن المعجم کو بھی حدائق پر کئی وجوہ سے افضلیت و ترجیح حاصل ہے۔ مثلاً المعجم شعر کے تینوں فنون یعنی عروض۔ قوافی اور نقد الشعر پر حاوی ہے۔ مگر حدائق السحر صرف آخری فن پر۔ دوسرے حدائق السحر بہت مجمل اور مختصر ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں المعجم مفصّل اور مکمل ہے۔ تیسرے یہ کہ رشید وطواط نے حدائق السحر میں اشعار سے استشہاد کرتے وقت صرف ایک یا دو اشعار پر اکتفا کیا ہے جو عین محلِ شاہد ہیں اور جن کے ذکر کے بغیر چارہ نہیں اس کے برعکس شمس قیس نے المعجم میں عام طور پر طویل قصائد و قطعات اور کامل و تمام غزلیات پیش کر دی ہیں۔ یہ چیز صد درجہ اہمیت رکھتی ہے کیونکہ بدقسمتی سے ہمارے متقدمین و متوسطین شعرا کے اکثر اشعار بلکہ بعض کے تو نام بھی ناپید ہو چکے ہیں۔ اس لئے ان اشعار کو دنیا کے

سامنے پیش کرنے اور ان شعرا سے روشناس کرانے کے نقطۂ نظر سے بھی المعجم کو فوقیت حاصل ہے۔

المعجم کے بعد اب تک جو کتابیں ان ہر سہ فنون بالخصوص علم عروض پر لکھی گئی ہیں ان میں سے کوئی بھی چنداں قابلِ ذکر اور محلِ توجہ نہیں۔ کیونکہ وہ بیشتر نہایت مختصر اور مجمل ہیں۔ اور خشک اور ملال انگیز ہونے کے علاوہ تحقیق و تدقیق سے عاری ہیں۔ البتہ ایک کتاب کو جو ۶۴۹ھ میں تصنیف ہوئی۔ اور جس کا مصنف نامعلوم ہے۔ اس کی اہمیت اور قدامت کی بنا پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ علمِ عروض و قوافی کے بارے میں ہے۔ اور اس کا نام معیار الاشعار ہے۔ مفتی محمد سعد اللہ مراد آبادی نے نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ اس کی شرح لکھ کر ۱۲۸۲ھ میں لکھنؤ سے شائع کی۔ اور اس کا نام میزان الافکار رکھا۔ مفتی مذکور نے معیار الاشعار کو خواجہ نصیر الدین طوسی کی طرف منسوب کیا ہے۔ لیکن معلوم نہیں ان کا ماخذ کیا ہے؟

المعجم کے مصنف شمس الدین محمد بن قیس رازی کی زندگی کے حالات کسی تاریخ یا تذکرہ میں نہیں ملتے۔ البتہ المعجم کے صفحات اور بالخصوص اس کے دیباچہ سے مصنف کے متعلق چند ایک باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

مصنف رَے کا باشندہ تھا۔ وہ طویل مدت تک ماوراء النہر خراسان اور خوارزم میں مقیم رہا۔ ۶۱۴ھ میں سلطان علاء الدین محمد بن تکش خوارزمشاہ نے خوارزم سے عراق و بغداد کی فتوحات کے سلسلے میں کوچ کیا۔ چونکہ مغول کے حملۂ کے متعلق بھی ان دنوں عام افواہ پھیل رہی تھی۔ اس لئے خوارزم اور خراسان سے تمام امرا ہجرت کر کے عراق میں خوارزم شاہ کی خدمت میں جمع ہو گئے تھے۔ مصنف بھی ان کے ہمراہ

وہاں آ گیا۔ پھر فتنۂ مغول کے باعث جب تمام ایران کے ممالک میں انقلاب پیدا ہو گیا۔ تو مصنف عراق کے مختلف شہروں میں جان بچانے کے لئے سات آٹھ سال تک مارا مارا پھرتا رہا۔ اس نے کئی شہروں میں مغلوں کی ہولناک تباہی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ بلکہ لڑنے میں ایک دو بار مغل سپاہیوں کے ہاتھ گرفتار بھی ہوا۔ ۶۱۷ھ میں جب سلطان محمد خوارزم شاہ مغلوں کے تعاقب کے خوف سے شہر بہ شہر بھاگا پھر رہا تھا۔ اس وقت ہمارا مصنف اس کے ہمرکاب تھا۔ پھر جب اصفہان و ہمدان کے درمیان قلعہ فرزین کے دامن میں سلطان اور اس کے لشکر کو شکست ہوئی تو سلطان وہاں سے بھاگ نکلا اس موقع پر بھی شمس قیس رازی اس کے ہمراہ تھا۔ اسی حملہ کے دوران میں المعجم کے مسودات اور تمام دوسری نفیس کتابیں جنہیں مصنف ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا۔ ضائع ہو گئیں۔ خوارزم شاہوں کا شیرازہ بکھر جانے کے بعد مصنف ۶۲۳ھ کے لگ بھگ عراق سے فارس میں اتابک سعد بن زنگی بن مودود سلغری کی خدمت میں آ گیا۔ اتابک موصوف نے اسے اپنے ندما میں شامل کر لیا۔ ۶۲۳ھ میں اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹے ابوبکر نے بھی اسے اسی عہدہ پر برقرار رکھا۔ اس کے بعد مصنف کے حالات کا ہمیں کچھ علم نہیں کہ وہ کب تک زندہ رہا۔

کتاب المعجم کی تالیف کا آغاز مصنف کے بیان کے مطابق ۶۱۴ھ میں شہر مرو میں ہوا۔ اس کا محرک ایک فاضل شخص تھا۔ پھر چونکہ مؤلف خراسان سے ہجرت کر گیا۔ اور فتنۂ مغول کے باعث حالات دگرگوں ہو گئے۔ اس لئے کتاب کی تصنیف و تکمیل کا کام رک گیا۔ پھر ۶۱۷ھ

میں مصنف کا تمام سامان وکتب اور المعجم کے مسودات قلعہ فرزین
کے دامن میں حملہ مغول کے موقع پر ضائع ہو گئے۔ اور ایک مدت کے
بعد ایک دہقان کے توسط سے مسودات کے بعض متفرق اجزاء مصنف
کے ہاتھ آئے آخر جب مصنف کو فارسی میں اتابک سعد اور اس کے بیٹے ابوبکر
کے ہاں پناہ ملی۔ تو فارس کے فضلا نے اس سے کتاب کی تکمیل کی درخواست کی۔
چنانچہ مصنف نے سنہ ۶۳۰ھ کے لگ بھگ اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔

چونکہ اصل کتاب عربی زبان میں تھی۔ اور بہت طویل تھی اور اس کا موضوع
بھی صرف عروض قوافی کے موضوع تک محدود ہیں۔ اور اس میں عربی و فارسی
دونوں زبانوں کے اشعار بطور شواہد و امثلہ مذکور تھے۔ اس لئے بعض ادبائے
فارسی نے اعتراض کیا کہ دو زبانوں کے علم عروض و قوافی کو مبہم ایک کتاب میں
بیان کرنا معمول کے خلاف ہے۔ اس طرح کتاب سے جو فائدہ مقصود ہے۔ وہ
کماحقہٗ میسر نہیں آسکتا۔ کیونکہ جو لوگ عربی زبان سے بے بہرہ ہیں۔ وہ اصل
کتاب کو سمجھنے سے محروم رہیں گے۔ اور دوسری طرف عربی دانوں کے لئے
فارسی شواہد و اشعار بالکل بے سود ہیں۔ چنانچہ مصنف نے اس درخواست
پر کتاب کے دو حصے کر دیئے۔ جو چیزیں فارسی زبان کے متعلق تھیں۔ انہیں
تلخیص کے بعد علیحدہ انتخاب کر کے ایک مستقل کتاب میں جمع کر دیا۔ جو المعجم
فی معاییر اشعار العجم کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ بظاہر ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ جو حصہ عربی زبان اور عربی اشعار سے متعلق تھا۔ اسے ایک دوسری
کتاب بنام المعرب فی معاییر اشعار العرب میں منتقل کر دیا گیا۔ جس کا مصنف
نے المعجم میں دو بار ذکر کیا ہے۔

اس جلیل القدر کتاب کے صرف تین قلمی نسخوں کا ہمیں علم ہے جن میں
سے ایک برٹش میوزیم لندن میں دوسرا مولوی خدا بخش خاں حیدر آبادی کے

ذاتی کتب خانہ میں اور تیسرا استامبول کے کتب خانۂ ایا صوفیہ میں موجود ہے۔

(محمد خان قزوینی)

---

(۲۲) تاریخ جہانگشائے جوینی

یہ چنگیز خاں اور اس کے جانشینوں کی اہم ترین تاریخ ہے جس کا مؤلف علاء الدین جوینی ہے۔ یہ تاریخ تین جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد میں مغلوں کے عادات واطوار، چنگیز خاں اور اس کے جانشینوں کے حالات درج ہیں۔ دوسری جلد میں شاہانِ خوارزم کا ذکر ہے۔ تیسرا حصہ اسماعیلیوں کے حالات پر مشتمل ہے۔

فارسی کی قدیم نثر میں بہت سادگی اور روانی ہے۔ الفاظ اور فقرات میں اختصار سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن ساتویں صدی ہجری میں قدیمی نثر کی جگہ ایک ایسی نثر رائج ہوئی جس میں صنائع بدائع کثرت سے استعمال ہونے لگے، اختصار کی جگہ تفصیل نے لے لی۔ مترادف الفاظ کی بھرمار شروع ہوئی۔ اس قسم کی نثر "فنی نثر" کہلاتی ہے۔ تاریخ جہانگشائے جوینی اسی فنی نثر کا شاہکار ہے۔ اس میں سجع۔ تلمیح۔ تجنیس۔ اشتقاق۔ تضاد ایسی بے شمار صنعتیں ملتی ہیں۔ عربی الفاظ کی کثرت ہے۔ مترادف الفاظ کی بھرمار ہے۔ ایک خیال جو صرف ایک فقرے میں ادا ہو سکتا ہے۔ کئی فقرات میں ادا ہوتا ہے۔ کہیں کہیں تاریخ جہانگشا کو قرآن مجید اور حدیث کے اقتباسات سے زینت دی گئی ہے۔ عربی اور فارسی کے موزوں اشعار بھی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے لائے گئے ہیں۔

اس تاریخ کی نثر ناہموار ہے۔ کہیں عبارت تکلف آمیز اور پیچیدہ ہے

کہیں سادہ سلیس اور لطیف ۔ اس مختصر سی تاریخ میں اتنی گنجائش نہیں کہ ایسے اقتباسات پیش کئے جائیں۔ جن میں اس کی تمام خصوصیات ظاہر ہو سکیں ۔

(بدخشانی)

مغلوں اور تیموریوں کے دور کی اہم ترین تاریخوں میں ایک تاریخ جہاں گشا ہے ۔ یہ علاؤالدین عطا ملک جوینی ابن بہاءالدین محمد کی تصنیف ہے ۔ عطا ملک جوینی مغل امراء اور خاص کر ہلاکو خاں اور اباقاخان کا درباری ملازم تھا۔ اور ان کی طرف سے عراق عرب اور دوسرے صوبوں کی حکومت پر مقرر تھا۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے ۔ اور اس میں مصنف نے مغلوں کی عادات و اخلاق ۔ ان کی فتوحات ۔ ان کے بادشاہوں کے حالات خاص کر چنگیز خاں کے حالات سن ۶۵۵ھ تک نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں ۔ اسی کے ضمن میں خوارزمشاہیوں اور اسماعیلیوں کی تاریخ بھی لکھی ہے ۔ اس کتاب کی اہمیت اور شہرت کے بارے میں اتنا کہنا کافی ہے ۔ کہ تقریباً تمام تاریخ نویسوں نے اس کتاب کے مضامین نقل و اقتباس کئے ہیں ۔ عطا ملک نے ۶۸۱ھ میں آذربائیجان میں وفات پائی اور تبریز کے مقبرۂ سرخاب میں دفن ہوا ۔

(شفق)

عطا ملک جوینی کی تاریخ جہانگشائے ۶۵۸ھ میں مکمل ہوئی ۔ یہ ۶۵۵ھ کے واقعات اور خصوصاً مصنف کے آقا اور مربی ہلاکو خاں کے ہاتھوں حشیشین کی تباہی کے ساتھ ختم ہوتی ہے ۔ چند قلمی نسخوں میں بغداد کی لوٹ پر جو ایک سال بعد کا واقعہ ہے ایک ضمیمہ بھی ملتا ہے ۔ لیکن غالباً یہ بعد کے کسی شخص کے قلم کا اضافہ ہے ۔ کتاب کے تین حصے ہیں پہلا

حصہ چنگیز خاں اس کے اجداد اور چغتائی تک اس کے اخلاف کی تاریخ سے بحث کرتا ہے۔ دوسرے میں خوارزم شاہیوں بالخصوص اس سلسلے کے آخری دو تاجداروں یعنی قطب الدین محمد اور جلال الدین کی تاریخ بیان ہوئی ہے۔ تیسرا حصہ اسماعیلی فرقہ خصوصاً حسن بن صبّاح اور اس کے جانشینوں یعنی اَلمُوت کے حشیشین سے متعلق ہے۔ پس یہ تاریخی عمومی تاریخ نہیں بلکہ مخصوص طور پر چنگیز خاں کے اسلاف و اخلاف پر ایک تاریخی تصنیف ہے۔ جس میں ان دو شاہی خاندانوں کے حالات بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔ جن سے ایران اور عراق میں چنگیز خاں کی مجاولت رہی یہ تینوں جلدیں "سلسلہ یادگار گب" کی طرف سے تصحیح و ترتیب کے بعد شائع ہو چکی ہیں۔ (براؤن)

اس کتاب کا آغاز عطا ملک جوینی نے قراقورم میں ۶۵۰ھ میں کیا اور جب ۶۵۸ھ میں وہ بغداد کا گورنر مقرر ہوا تو اس وقت بھی وہ اس کی تصنیف میں مشغول تھا۔ اس سال یا اس کے جلد غالباً مصنف نے اپنی اس تصنیف کو جاری رکھنے کا خیال ترک کر دیا ہوگا۔ کیونکہ ۶۵۸ھ کے بعد واقعات کتاب میں نہیں ملتے۔ چنانچہ اس نے خود بھی گوناگوں مصروفیات کے باعث اپنے عدیم الفرصت ہونے کا ذکر کیا ہے اور اس کے اثرات اس کی تاریخ پر بھی واضح ہیں۔ مثلاً اکثر مقامات پر واقعات کی تاریخیں یا تو بالکل چھوڑ دی گئی ہیں۔ اور یا غلط درج ہیں۔ بعض مقامات پر مصنف کے بیانات میں تضاد نمایاں ہے۔ اس قسم کے عیوب ایسی کتابوں میں عام طور پر نظر آتے

ہیں جو نظر ثانی سے محروم رہی ہوں بالخصوص ان کتابوں میں ان کی تعداد اور بھی زیادہ ہوتی ہے جو نامکمل رہی ہوں۔ کتاب کے بعض نسخوں میں سات سات آٹھ آٹھ سطر کے بیاض بھی موجود ہیں۔ غالباً مولف ان مقامات پر بعد میں کچھ لکھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن اس پر عمل نہ ہو سکا۔ بعض مقامات پر کسی ایسے باب کی طرف اشارات بھی پائے جاتے ہیں۔ جو کتاب میں سرے سے موجود ہی نہیں۔ کتاب کی تیسری جلد تو اپنے مُنہ سے نامکمل ہونے کی شہادت دے رہی ہے۔ خیال ہے کہ بغداد کی گورنری کی ذمہ داریوں نے مصنّف موصوف کو اجازت نہ دی کہ وہ اپنے اس تاریخی شاہکار کا کام جاری رکھ سکتا۔

مسٹر بارتھولڈ (BARTHOLD) لکھتے ہیں کہ جوینی کی کتاب کی وہ قدر نہیں ہو سکی جس کی وہ مستحق تھی۔ کم از کم مغرب میں اس کے مقابلہ میں رشید الدین کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ وہ جوینی کی نسبت منگول تاریخ کے مراجع و مصادر تک رسائی حاصل کرنے میں زیادہ کامیاب نظر آتا ہے۔ چنانچہ چنگیز خاں کی ابتدائی زندگی کے متعلق اس کی بیان کردہ تفصیلات تمام پیشرو مورخین سے زیادہ مکمل ہیں۔ دوسری طرف جوینی اپنے بیان کردہ واقعات کے زیادہ قریب کا آدمی ہے۔ اور حملۂ منگول کے زیادہ تر حالات اس کی اپنی چشمدید گواہی پر مبنی ہوتے چاہئیں۔ منگولوں کے حملہ اور ہلاکو کی آمد کے درمیانی زمانہ کی ایرانی تاریخ کے متعلق وہ اپنے باپ کی روایات اور اپنی ذاتی معلومات پر اعتماد کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ خود بھی بعض آخری مہمات میں شریک ہوا۔

تاریخ جہانکشائے کسی وقت منگولوں کے حملہ کے متعلق ایک بہت

مستند کتاب سمجھی جاتی تھی اور اس لحاظ سے اس کے معاصر اور بعد کے موٴرخین خواہ وہ عربی ہوں یا ایرانی اس سے بہت استفادہ کرتے رہے ہیں۔ چونکہ بعد میں اس کے کچھ اجزا لاطینی زبان میں ترجمہ ہو گئے تھے اس لئے بالواسطہ یہ کتاب علمائے مغرب تک بھی پہنچ گئی۔ بار تھولڈ ہی ایک ایسا موٴرخ ہے جس نے جوینی کی کتاب سے براہ راست سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن اس نے صرف حملہ سے متعلق واقعات کے ساتھ تعلق رکھا ہے اور چنگیز خان کے جانشینوں کی تاریخ کو چھوا تک بھی نہیں۔ اس نے اپنے انگریزی ایڈیشن میں قزوینی کی مرتب کردہ پہلی دو فارسی جلدوں سے مواد اخذ کیا ہے۔ آخر جب ۱۹۳۷ء میں کتاب کی تیسری جلد بھی شائع ہو گئی تو یہ کتاب مکمل طور پر مستشرقین یورپ کے ہاتھوں میں پہنچ گئی اور اب یہ انگریزی ترجمہ کی صورت میں تاریخ کے سامنے ہے۔

رشید الدین کی زبان انتہائی سادہ اور صاف ہے لیکن اس کے برعکس جوینی اس فارسی طرز تحریر کا استاد تھا جو اس زمانہ کی فارسی ادبی نثر میں ایک روایتی درجہ حاصل کر چکا تھا۔ صنعت تجنیس کا استعمال اس طرز میں بہت عام تھا۔ کتاب کے متن میں عربی فارسی شعرا کے اشعار موٴلف کے خود ساختہ اشعار اور قرآن مجید کی آیات کی بہتات ہے۔ جوینی ایک باذوق شخص تھا، وہ فصاحت و بلاغت کو ایک ضبط و نظام کے تحت استعمال کرتا تھا۔ جب ضرورت پیش آتی تو وہ اپنی داستان کو سیدھے سادے اور عام فہم الفاظ میں بھی پیش کرتا تھا۔ یہ طریقہ وصاف سے بالکل مختلف ہے جو اس قدر مصنوعی طرز پر تالیف کی گئی ہے کہ

کتاب کا موضوع لفاظی کی نذر ہو گیا ہے۔ لیکن جوینی کی کتاب میں معمولی صنائع و بدائع میں بھی کوئی نکتہ یا کام کی بات ضرور مضمر ہوتی ہے:

جوینی کا نقطہ نظر

ابن الاثیر نے منگولوں کے حملہ کی ابتدا میں لکھا ہے کہ وہ اس واقعہ کا ذکر کرنے سے کئی سال تک گریز کرتا رہا۔ کیونکہ اس کا معرض تحریر میں لانا بھی سخت خوفناک اور دہشت انگیز تھا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دنیا کی سب سے بڑی مصیبت تھی جو عالم انسانیت پر ٹوٹی۔ جوینی چونکہ منگولوں کے دربار میں ملازم تھا اس لئے اس سے اس قسم کے جذبات کے اظہار کی بہت ہی کم توقع کی جا سکتی ہے۔ فی الحقیقت اس نے اپنے آقاؤں کی تعریف میں بہت کچھ کہا ہے اور وہ ان کے حملہ کو ارادہ ازلی کی تکمیل کا لقب دیتا ہے۔ لیکن دوسری طرف چونکہ وہ ایک متشدد قسم کا مسلمان بھی ہے اس لئے اس کے صحیح تاثرات اور اصل جذبات دوسرے اسلامی مورخین مثلاً ابن الاثیر وغیرہ سے مختلف نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں جوینی کے خاندان خوارزمشاہی کے ساتھ روایتی تعلقات تھے کیونکہ اس کے دادا نے سلطان محمد خوارزم شاہ کا ہر جگہ ساتھ دیا تھا۔ اور اس نے اپنی زندگی کے آخری ایام محمدؒ کے بیٹے جلال الدین کی خدمت میں بسر کئے تھے۔ اندریں حالات اسے اس خاندان کی تباہی کا غم ضرور ہوا ہو گا۔ اور اگرچہ جوینی کو ابن الاثیر کی طرح آزادیٔ افکار حاصل نہ ہو گی تاہم وہ منگولوں کی موجودہ حکومت پر گذشتہ اسلامی حکومت کو ضرور ترجیح دیتا ہو گا۔

منگول حملہ کے متعلق اگرچہ جوینی کوئی ذاتی رائے پیش نہ کر سکتا تھا تاہم

قتل عام کی گرم بازاری کا تمام نقشہ اس نے پوری ایمانداری سے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ چنانچہ اس نے چنگیز خاں کے ہاتھوں بخارا کی مسجد میں قرآن مجید کی بے حرمتی کا واقعہ بیان کر دیا۔ اس کے علاوہ حملہ کے نتائج بیان کرتے وقت وہ بعض اوقات پوری بے تکلفی سے کام لیتا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے بارونق صوبہ خراسان کی بربادی اور تباہی کا ذکر کیا ہے۔ اور اسی طرح علم و علما کی خرابی اور پریشان حالی کا بیان بھی کیا ہے۔ وہ نئے حکمرانوں کے مقرر کردہ افسروں کے نقائص و عیوب بھی واضح کرتا ہے۔ اس کی تحریر میں ایسے اشارات پائے جاتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا رویہ اس کی نظروں میں پسندیدہ نہ تھا۔ بالخصوص وہ ان کی شراب نوشی پر سخت تعریض کرتا ہے۔ وہ محمد خوارزم شاہ پر متعدد دفعہ نکتہ چینی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کی فتوحات نے منگولوں کے حملہ کے لئے راستہ صاف کر دیا تھا۔ اور اس نے چنگیز خاں کے سفیروں کو قتل کر کے گویا خود حملے کو دعوت دی۔ اور پھر ان کی مدافعت نہ کر سکا۔ البتہ محمد کے بیٹے جلال الدین کو وہ ہر مقام پر بہادری اور جرأت کا پیکر بنا کر پیش کرتا ہے۔ اور شاہنامہ کے ہیرو رستم کے ساتھ اسے تشبیہ دیتا ہے۔

بعض مقامات ایسے بھی ہیں۔ جہاں وہ منگولوں کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ مثلاً وہ چنگیز خاں کی فوجی قابلیت کا صحیح معترف ہے۔ اور اسی سلسلے میں اسکندر اعظم کو اس کا ایک شاگرد خیال کرتا ہے۔ وہ منگول فوج کے عزم، نظم و ضبط اور تحمل کا بہت جوش و خروش سے ذکر کرتا ہے۔ چونکہ جوینی منگولوں کا خدمت گزار ہے۔ اس لئے وہ ان کی تعریف کے علاوہ ان کے حملہ کے جواز کے لئے بھی عذر خواہی کرتا ہے۔ اور اسے منشائے

قدرت قرار دے کر پیچھا چھڑاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس طرح گذشتہ اقوام پر اللہ تعالےٰ کی نافرمانی کے باعث عذاب نازل ہوا۔ اسی طرح یہ حملہ خدا کا قہر اور عذاب تھا اس سلسلے میں وہ احادیثِ نبوی سے بھی استشہاد کرتا ہے۔ مثلاً ان فناء امتی بالسیف وغیرہ وہ کہتا ہے۔ کہ حملۂ منگول کے کچھ فوائد بھی تھے۔ مثلاً یہ کہ منگولوں کی فتوحات اسلامی ممالک کی حدود وسیع کرنے میں ممد ثابت ہوئیں۔ کیونکہ بہت سے صناع اور تاجران شہروں میں جا کر آباد ہو گئے۔ جہاں ابھی تک دینِ اسلام نہ پہنچا تھا۔ اسی طرح کئی مسلمانوں کو درجۂ شہادت نصیب ہوا۔ بالآخر وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس حملے کی پیش گوئی رسول کریم صلعم نے پہلے سے ہی کر رکھی تھی۔

(جان انڈریو)

اسلام کے بعد اب تک بلکہ مطلق طور پر جتنے اہم واقعات پیش آئے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم واقعہ مغول کی تاخت و تاراج کا ہولناک حادثہ ہے جو ساتویں صدی ہجری کے شروع میں انتہائی مشرقی علاقہ سے نمودار ہوا جس نے تیس چالیس سال کے عرصہ میں دریائے چین کے ساحل سے لے کر شام و مصر کی حدود تک طولاً اور دشتِ قبچاق سے لے کر خلیج فارس اور بحرِ عمان تک عرضاً تمام علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا جس کی وجہ سے ایک وسیع ترین مملکت وجود میں آئی۔ اور بالآخر ۶۵۶ھ میں قدیم عربی خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کشمکش اور طوفانِ بدتمیزی کے سلسلے میں جو ممالک وحشی مغولوں کی تاخت و تاراج اور قتل و غارت کا نشانہ بنے ان سب میں سے بدبختی کے لحاظ سے ایران اوّل نمبر پر تھا جسے مغول

کے عالمگیر طوفان نے یکسر تہ و بالا کر دیا۔ کروڑہا بے گناہ انسان تباہ ہو گئے مختلف شہر، قصبے اور بستیاں چٹیل میدان بن کر رہ گئے اور علم و ادب کے مراکز تمام کے تمام اجڑ گئے۔ صنعت و حرفت اور مال و دولت کے اڈے ویران ہو کر الوؤں اور گدھوں کی آماجگاہ بن گئے۔ ہر جگہ بڑے بڑے بڑے علماء و فضلا کو بھیڑ بکریوں کی مانند ذبح کر دیا گیا۔ مغلوں کے ایران پر قابض ہونے کا کم سے کم نتیجہ اور ادنیٰ سے ادنیٰ اثر یہ ہوا کہ ان کے دور میں ایران کے اندر علم و ادب تنزل و انحطاط کے ممکن آخری درجہ تک جا پہنچا۔ جو لوگ اسلامی علوم و ادبیات سے تھوڑے سے بہت بھی واقف ہیں وہ یقیناً مغلوں سے پہلے کی تالیفات اور ان کے غلبہ کے بعد کی تصنیفات میں زمین و آسمان کا فرق محسوس کر سکتے ہیں۔

اس کے باوجود یہ عجیب بات ہے۔ کہ مغلوں کے عہد میں ادبیات کے ایک خاص فن یعنی علم تاریخ نے پورا پورا رواج پایا اور عظیم ترقی حاصل کی۔ فارسی زبان کی نفیس ترین تاریخیں اسی دور میں لکھی گئیں۔ اس قسم کی کتابوں میں سے مندرجہ ذیل بالخصوص قابل ذکر ہیں:۔

(۱) تاریخ جہانگشائے از علاء الدین عطا ملک جوینی (تالیف تقریباً ۶۵۸ھ)

(۲) جامع التواریخ از رشید الدین فضل اللہ (تالیف قریباً ۷۱۰ھ)

(۳) تجزیۃ الامصار و تزجیۃ الاعصار یعنی تاریخ وصاف از عبداللہ بن فضل اللہ شیرازی (تالیف قریباً ۷۲۸ھ)

(۴) تاریخ گزیدہ از حمداللہ بن ابی بکر مستوفی قزوینی (تالیف ۷۳۰ھ) جو کسی حد تک جامع التواریخ کا اختصار ہے۔

(۵) ظفر نامہ از حمداللہ مستوفی جو ایک منظوم تاریخ ہے۔ اور شاہنامہ

کی طرز پر ۵۰۰۰ ۷ اشعار پر مشتمل ہے۔ (تالیف ۷۳۵ھ)

(۶) روضۃ اولی الالباب فی توریخ الاکابر والانساب یعنی تاریخ بناکتی از ابوسلیمان داؤدبن ابوالفضل (تالیف ۷۱۷ھ)

(۷) نظام التواریخ از ناصر الدین عبد اللہ بن عمر بیضاوی (تالیف ۶۷۴ھ)

(۸) مجمع الانساب از محمد بن علی شانکارہ (تالیف ۷۳۳ھ) وغیرہ وغیرہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے مطلق طور پر اول الذکر تین کتابیں اہم ترین ہیں۔ یعنی جہانگشائے۔ جامع التواریخ اور وصاف۔ لیکن تاریخ جہانگشائے کو باقی دو کتابوں پر زمانہ کے لحاظ سے اور غالباً رتبہ کے اعتبار بھی فضیلت حاصل ہے۔

اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ مغلوں کے تاریخی حالات (بالخصوص وہ جو ایران کے حاکم ہوئے) کے متعلق تمام معاصر مؤلفین میں سے کسی نے ان تینوں کتابوں سے زیادہ بہتر اور معتبر کتاب تصنیف نہیں کی۔ جہانگشائے کا مؤلف علاؤ الدین عطا ملک جوینی سلطنت مغلیہ میں بلند مرتبہ کا مالک تھا۔ وہ قریباً ۱۵ برس تک امیر ارغون کا دبیر خاص رہا۔ پھر ہلاکو کا دبیر خاص مقرر ہوا۔ اور ہلاکو اور اس کے بیٹوں اباقا اور تکودار احمد کی طرف سے چوبیس سال تک بغداد اور تمام عراقِ عرب کا حاکم رہا۔ اس لئے مولف اکثر واقعات میں جو اس کتاب میں مندرج ہیں۔ خود حاضر اور ان کا عینی شاہد تھا۔ جامع التواریخ کا مؤلف رشید الدین فضل اللہ شروع میں اباقا کا طبیب تھا۔ پھر قریباً بیس سال تک غازان اور اس کے بھائی اولجایتو کا وزیر رہا۔ اس دوران میں ممالکِ مغولی کے تمام معاملات کی باگ ڈور

ی کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے جامع التواریخ کو غازان کے حکم سے شروع کیا۔ اور اولجائیتو کے فرمان کے مطابق پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اپنی نفیس کتاب میں تمام معلومات اور اطلاعات جو اس نے جمع کی ہیں۔ وہ یا تو اس کے ذاتی مشاہدات و محسوسات کا نتیجہ ہیں۔ جو اس نے مغل بادشاہوں کی طویل ملازمت کے دوران میں فراہم کئے تھے۔ اور یا ایسی روایات و منقولات ہیں۔ جو اس نے مغل بادشاہوں کے درباروں میں موجود ہر قوم و ملت یعنی مغول چینی، تبتی، ہندی، ترک، عرب، یہود و نصاریٰ وغیرہ کے علماء و حکماء، منجمین، مورخین اور اہلِ ادیان و ملل کی زبان سے سُنی تھیں۔ یا ان کتابوں سے براہِ راست ان کے علماء کے توسط سے نقل و ترجمہ کی تھیں۔ چنانچہ اس کتاب کی اہمیت حدِ تصور و تحریر سے بھی بالاتر ہے۔ جامع التواریخ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ صرف تاریخ مغول تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ دُنیا کی عام سلطنتوں اور قوموں کے حالات پر بھی مشتمل ہے۔ جو قدیم زمانہ سے لے کر مصنف کے زمانہ تک معرضِ وجود میں آئیں۔ یہ کتاب نہایت جلیل القدر اور عظیم الحجم ہے۔ حتیٰ کہ جہانگشائے سے قریباً پانچ گنا زیادہ ہے۔ باقی رہی تاریخ وصاف جو عبداللہ بن فضل اللہ کی تالیف ہے۔ اس کا مصنف رشید الدین فضل اللہ صاحبِ جامع التواریخ کا ہمعصر تھا۔ وہ سلطنتِ مغول میں مستوفی کے عہدہ پر فائز تھا۔ اس نے بھی اپنی نفیس کتاب میں جو اکثر واقعات درج کئے ہیں یا تو ان میں حاضر تھا اور اس نے انہیں خود مشاہدہ کیا۔ یا سلطنتِ مغول کے اکابر و امراء سے براہِ راست ان کو سُنا۔ جہانگشائے کی طرح تاریخ وصاف کا موضوع بھی بنیادی طور پر تاریخ مغول ہی ہے۔ اگرچہ ضمنی طور پر دونوں مؤلفین مغول کے بعض ہمعصر یا قریب العہد دوسرے طبقاتِ سلاطین

کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ تاریخ جہانگشائے ۶۵۵ھ تک کے واقعات پر ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن تاریخ وصاف جو خود مؤلف کے قول کے مطابق تاریخ جہانگشائے کی ذیل اور اس کا تتمہ ہے ۶۵۶ھ سے لے کر ۷۲۸ھ کے حالات پر حاوی ہے (یعنی ہلاکو کے ہاتھوں فتح بغداد سے ایران کے آخری مغل حکمران ابوسعید کے عہد سلطنت کے وسط تک) ظاہر ہے کہ ایران اور تمام ایشیائی ممالک میں سلطنت مغول کے ستر سالہ عہد کے ان واقعات کی اہمیت و افادیت مغلوں کے ایک اول درجہ فاضل اور ملازم کے قلم سے کس قدر زیادہ ہو گی۔ لیکن بدقسمتی سے حد سے زیادہ عبارت کے تصنع اور انشا کے تکلف مراعات لفظی کی پابندی اور معانی سے بے اعتنائی نے کتاب کے درجۂ اہمیت کو باقی دونوں کتابوں سے کم کر دیا ہے۔

ان تینوں کتابوں میں سے جو کتاب اب تک چھپ کر عام لوگوں کی دسترس میں آئی تھی۔ وہ تاریخ وصاف تھی جو ۱۲۶۹ھ میں بمبئی سے نہایت نفیس طریقے پر طبع ہوئی تھی۔ لیکن جہانگشائے اور جامع التواریخ جو یقیناً زمان پر زمانہ اور رتبہ کے لحاظ سے مقدم ہیں اور تکلف انشاء اور ملال انگیزی عبارت کے عیب سے عاری ہیں۔ اب تک خطی صورت میں کتب خانوں کے گوشوں میں پڑی تھی۔ اور سوا اس کے معدودے چند شخصوں کے دوسرے لوگوں کے لئے ان سے متمتع ہونا ممکن نہ تھا۔ خوش قسمتی سے اوقاف گب کے کارپردازوں نے دونوں کتابوں کی طباعت کا بیڑا اٹھایا اور جہانگشائے کی طباعت و تصحیح کا کام راقم الحروف کے سپرد کیا گیا۔

جیسا کہ بیان ہو چکا جہانگشائے کا مصنف دولت مغول کے اکابر میں سے تھا۔ اور اس نے سالہا سال تک ممالک مغول میں سفر کیا تھا۔ اس نے اکثر واقعات کا بچشم خود ملاحظہ کیا تھا یا انہیں معتبر لوگوں سے بلا واسطہ سنا تھا۔ اس کے آباؤ اجداد اور اقارب خوارزمشاہی اور مغولی سلطنتوں کے ملازموں میں سے تھے۔ الموت کا مشہور و معروف کتب خانہ بھی ہلاکو کے حکم

سے مؤلف کے تصرف میں دے دیا گیا تھا۔ چنانچہ اس کتاب کے حصہ تاریخ اسماعیلیہ کو اسی کی امداد سے ہی مکمل کیا۔ ان سب باتوں کے علاوہ جہانگشائے کا موضوع بھی بہت اہم تھا۔ یعنی مغول۔ خوارزمشاہیہ اور اسماعیلیہ کی تاریخ اور ان دنوں ان موضوعات پر دوسری کتاب دستیاب بھی نہ ہوتی تھی۔ یہ خصوصیات ایسی تھیں جنہوں نے اس کتاب کو زمان تالیف سے ہی شہرت عظیم اور قبولیت عامہ کا مالک بنا دیا۔ چنانچہ مؤلف کے معاصرین اور اس کے بعد میں آنے والے اکثر مؤرخین نے جابجا اس کتاب کے حوالے دیئے ہیں اور اسے اپنے معتبر ماخذوں میں شمار کیا ہے۔ مثلاً عبداللہ بن فضل اللہ شیرازی نے تاریخ وصاف میں رشید الدین فضل اللہ نے جامع التواریخ میں۔ ابن العبری نے مختصر الدول میں (جو عربی زبان میں ہے) ابن الطقطقی نے کتاب الفخری میں۔ شہاب الدین احمد بن یحییٰ دمشقی نے مسالک الأبصار فی ممالک الامصار میں جہانگشائے کو بالواسطہ اپنا ماخذ قرار دیا ہے اور بعض جگہ اس کے لمبے لمبے اقتباسات نقل کئے ہیں۔ اسی طرح تاریخ گزیدہ۔ تاریخ بناکتی۔ روضۃ الصفا۔ حبیب السیر اور بعد کی تمام تاریخوں میں بیشمار تفصلیں جہانگشائے سے نقل کی گئی ہیں۔

جہانگشائے تین جلدوں پر مشتمل ہے:۔

جلد اوّل: ایک طویل دیباچہ کے بعد ایک فصل پر مشتمل ہے۔ جس میں مغول قدیم کے عادات و رسوم۔ چنگیز خان کے وضع کردہ قوانین۔ چنگیز خاں کی تاریخ اس کے بیٹے اوکتای قاآن کی تاریخ پھر اوکتای کے بیٹے کیوک خاں کی تاریخ اور آخر میں جوچی اور چغتائی پسرانِ چنگیز خان کی تاریخ پر ختم ہوجاتی ہے۔

جلد دوم: اس میں خوارزمشاہیوں کی تاریخ بالخصوص ان کے آخری حکمرانوں کا تفصیلی ذکر ہے۔

جلد سوم:۔ اس میں منگو قاآن بن تولی بن چنگیز خاں۔ ہولاکو کی ایران میں آمد اور اسماعیلیہ کے قلع قمع کا تفصیلی ذکر ہے۔

جلد سوم کے آخر میں ہلاکو کے ہاتھوں فتح بغداد کا ذکر ہے۔ جو خواجہ نصیر الدین طوسی نے ذیل کے طور پر اس کتاب کے آخر میں ملحق کر دیا ہے۔ اکثر نسخوں میں یہ مفقود ہے۔

افسوس کا مقام ہے کہ مصنّف قریباً ۲۰ برس تک اسماعیلیہ کے خاتمہ کے بعد یعنی ۶۸۱ھ تک زندہ رہا۔ وہ فتح بغداد میں خود شامل تھا۔ اس کے علاوہ ہلاکو۔ اباقا اور تکودار کے عہدِ حکومت کے بڑے بڑے حادثات میں شریک تھا۔ اسے کتابت و تالیف کے فن میں پوری دسترس بھی حاصل تھی جس کا ثبوت اس کی یہ کتاب ہے۔ لیکن ان دونوں باتوں کے باوجود وہ ان ۲۷ سالوں کے طویل عرصہ کے حالات بیان نہیں کرتا۔ اس خاموشی کی وجہ غالباً یہ ہو سکتی ہے کہ حکومت بغداد کے جو فرائض اس کے ذمّہ لگائے گئے تھے۔ وہ اس قدر اہم اور توجہ طلب تھے کہ اسے کسی دوسری طرف دھیان دینے کا موقع نہ مل سکا۔

جیسا کہ قرائن سے ظاہر ہے مصنّف نے یہ کتاب ایک خاص یا زیادہ معیّن سالوں میں تالیف نہیں کی۔ بلکہ اپنے فرائض منصبی سے اسے جب کبھی فرصت ملتی تھی۔ وہ اس میں واقعات کا اضافہ کرتا رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ہمیں کتاب کے مختلف مواقع پر بعض باتیں صاف طور پر مختلف تاریخوں میں لکھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کتاب کے مختلف موقعوں کو ایک دوسرے کے ساتھ موازنہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ مصنّف نے اس کا آغاز ۶۵۰ھ یا ۶۵۱ھ میں کیا۔ جب وہ قراقورم میں منگو قاآن کی خدمت میں حاضر تھا۔ اور وہ ۶۵۸ھ تک پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی۔

(محمد خاں قزوینی)

---

(۲۴) تاریخ وصّاف

تاریخ وصاف عہدِ مغل کی ایک مشہور تاریخ ہے۔ تاریخ کا اصل نام "تجزیۃ الامصار و تزجیۃ الاعصار" ہے۔ اس کا مؤلف شرف الدین عبداللہ بن فضل اللہ شیرازی ہے۔ جو وصاف یا وصافِ حضرت کے نام سے مشہور ہوا۔

وصاف کی پیدائش ۶۶۳ ہجری میں شیراز میں ہوئی۔ تعلیم بھی شیراز ہی میں پائی۔ آخر رشید الدین فضل اللہ نے جو غازان اور الجائتو کے عہد کا وزیر تھا۔ اس کی سرپرستی کی اور اسے ایک مدّاح کی حیثیت سے دربار میں جگہ دلائی۔ یہاں اس نے اپنی مشہور و معروف کتاب تاریخِ وصاف تالیف کی۔

تاریخ وصاف پانچ جلدوں میں ہے۔ یہ ہلاکو اور اس کے جانشینوں کی تاریخ ہے۔ اس میں ۶۵۶ سے ۷۲۸ھ یعنی فتح بغداد سے ابوسعید کے عہد تک حالات درج ہیں۔ تاریخ وصاف کا آغاز ۶۹۹ھ میں ہوا۔ ۷۰۲ ہجری میں مؤلف نے پہلی جلد مکمل کر کے غازان کی خدمت میں پیش کی۔ دوسری جلدیں ۷۱۲ ہجری میں مکمل کر کے اس نے الجائتو خدابندہ کی نذر کیں۔

تاریخ وصاف، تاریخِ جہانگشائے جوینی کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ مؤلف کو عربی زبان اور شعرائے عرب کے دیوانوں پر عبور تھا۔ اس نے یہ کوشش کی ہے کہ اپنی تاریخ میں عربی تراکیب اور اصطلاحات کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرے۔ اس لحاظ سے وصاف عطا ملک جوینی سے بھی بازی لے گیا ہے۔ عربی اصطلاحات و تراکیب نے تاریخ کی نثر کو بہت بوجھل بنا دیا ہے۔ یہاں تک کہ فنی نثر کے شیدائی بھی اس کے مطالعے سے گھبراتے ہیں۔

تاریخ وصاف کا اندازِ بیان بہت مشکل اور دقیق ہے۔ مؤلف خود

لکھتا ہے۔ کہ یہ کتاب فصاحت و بلاغت کا ایک نمونہ ہے۔ یہ محض اتفاقی بات ہے۔ کہ مؤلف کو فصاحت و بلاغت کے اظہار کے لیے تاریخی مواد کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اس کتاب میں عربی الفاظ کی بھرمار کے علاوہ کہ یہ تشبیہہ، استعارہ اور صنعتِ سجع کثرت سے استعمال کی گئی ہے۔ مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے۔ کہ چھٹی صدی ہجری میں عربی زبان کے اثر سے جو فارسی زبان میں فنی نثر لکھی گئی وصاف کی بدولت وہ انتہائے کمال کو پہنچی۔ (بدخشانی)

یہ تاریخ ادیب شہاب الدین عبد اللہ شیرازی ملقب بوصافِ حضرۃ کی تصنیف ہے۔ یہ رشید الدین فضل اللہ کا ہم عصر تھا۔ رشید الدین نے اس کی سرپرستی کی تھی اور اسے اولجائیتو کے دربار میں پیش کیا تھا۔ تاریخ وصاف اصل میں تاریخ جہاں گشا کا تتمہ ہے اور ہلاکو کے ہاتھوں بغداد کی فتح سے لے کر ۷۲۸ھ تک کے حوادث اس میں درج ہیں۔ یعنی مغلوں کے آخری بادشاہ ابوسعید کے زمانے تک کے حالات پر یہ کتاب محتوی ہے۔ کتاب وصاف بے ضرورت طول کلام۔ تعقید عبارت۔ تصنع اور اطناب کی وجہ سے دورِ مغول کی ثقیل فارسی کے سبک کا نمونہ سمجھی جاتی ہے۔ لیکن مصنف کے زمانے کی نہایت اہم اور مفید باتیں اور تاریخی تفصیلات اس کتاب میں درج ہیں۔

(شفیق)

جیسا کہ تاریخ وصاف کا مصنف ہمیں بتاتا ہے۔ اس نے اپنی یہ کتاب تاریخ جہانگشائے کی تعقیب کے خیال سے لکھی تھی۔ اس تاریخ کا اصل عنوان "تجزیۃ الامصار و تزجیۃ الاعصار" ہے۔ اور اس کے مصنف کا اصل نام عبداللہ بن فضل اللہ شیرازی ہے گو عموماً وہ صرف وصاف (مدح گر) یا وصافِ حضرت (دربار کا مدح گر) کے ناموں سے معروف ہے۔ تاتاری حکومت میں وہ مالیہ کی تحصیل پر ملازم تھا۔ اور مقتدر وزیر رشید الدین کا متوسل تھا۔ جیسا کہ وہ خود بیان

کرتا ہے ۔ رشید الدین نے سلطانیہ میں اسے اس کی کتاب کے ساتھ اولجائیتو کے حضور میں پیش کیا۔ ڈاکٹر ریو نے خوب کہا ہے "اس کی تاریخ میں ایک اہم دور کی مستند معاصر روئیداد ملتی ہے ۔ لیکن اس کے لاریب افادے میں ترتیب کی بے اصولی سے تا حدے فرق آگیا ہے ۔ اور اس کے اسلوب کی انتہائی تصنع آمیز نوعیت اور ناگوار حشویت نے اسے اور بھی گھٹا دیا ہے ۔ بدقسمتی سے اوروں نے اس کتاب کو تاریخ کا ایک صحیح نمونہ سمجھا۔ چنانچہ ایران کی متاخر تاریخی تصنیفات پر اس نے مضر اثر ڈالا ہے ۔" جن لوگوں کو اس کتاب کے استعمال کا اتفاق ہوا۔ ان میں کوئی اس تنقید کی معقولیت سے انکار نہیں کرے گا۔ اور پھر مصنف خود صاف اظہار کرتا ہے کہ اس کا اولین مقصد شاندار اسلوب کی تحریر ہے اور تاریخی واقعات جنہیں وہ قلمبند کرتا ہے محض وہ پارچے ہیں جن پر اس نے اپنی مرصع لفاظی کی لطیف گلکاری کی ہے ہمیں بتایا گیا ہے کہ جب مصنف نے دربار میں اس کی عبارتیں پڑھ کر سنائیں تو اولجائیتو ان کے سمجھنے سے قاصر رہا۔ جس دور سے یہ کتاب بحث کرتی ہے اگر اس کی تاریخ کے ایک مستند بنیادی ماخذ ہونے کی حیثیت سے اس کو اتنی وقعت حاصل نہ ہوتی جتنی کہ ہے تو ہم اس کے مصنف کو زیادہ آسانی سے معاف کرسکتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب جتنی ملال انگیز ہے اتنی ہی اہم بھی ہے۔ اس کی پانچ جلدیں ہیں جن کے مندرجات ریو نے مجملاً بیان کئے جاتے ہیں۔ (براؤن)

تاریخ وصاف کا اصلی نام "تجزیۃ الامصار و تزجیۃ الاعصار" ہے ۔ اس کا مصنف عبداللہ بن فضل اللہ شیرازی ایلخانیوں کے زمانہ میں بعہدہ مستوفی مامور تھا۔ اور چونکہ سلطان اولجائیتو نے اسے وصاف حضرت کا خطاب دیا تھا۔ اس لئے اس کی کتاب کا نام تاریخ وصاف پڑ گیا۔

تاریخ وصاف ایلخانیوں کے زمانے کی تاریخ ہے۔ اور وہ پانچ جلدوں میں ہے۔ جن میں ۶۵۶ھ سے ۷۱۲ھ تک کے حالات درج ہیں یعنی تاراجِ بغداد سے لے کر سلطان اولجایتو کے عہد تک۔ مصنف نے اول چار جلدیں مکمل کر کے ۷۱۲ھ میں علامہ رشید الدین وزیر (صاحب جامع التواریخ) کی وساطت سے اپنی کتاب کو سلطان اولجایتو کے حضور میں پیش کیا۔ جس پر اس کو خلعت اور وصافِ حضرت کا خطاب ملا۔ پانچویں جلد ۷۲۸ھ کے قریب لکھ کر بڑھائی گئی۔ جس میں سلطان ابوسعید ایلخانی کے عہد کے حالات شامل کئے گئے۔

یورپ کے بعض فضلاء اس امر کے بڑے شاکی ہیں۔ کہ تاریخ وصاف کا انداز بیان نہایت پیچیدہ اور مغلق ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اگر مصنف اس کو زیادہ سلیس عبارت میں لکھتا تو پڑھنے والے کو آسانی ہوتی اور کتاب کی ضخامت میں بھی تخفیف ہو جاتی۔ لیکن فی الجملہ کتاب کو دیکھنے اور پڑھنے سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اس کا طرزِ تحریر اُس درجہ تھکا دینے والا نہیں ہے۔ جتنا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے۔ اور جب ہم اس کا موازنہ بعد کی تصانیف کے ساتھ کرتے ہیں۔ (مثلاً "وقائع نعمت خانِ عالی) تو ہمیں وہ از بس آسان معلوم ہوتا ہے۔ اور خصوصاً اشعار وقطعات کے جابجا آنے سے وہ اور بھی دلچسپ ہو گیا ہے۔

تاریخِ وصاف دو دفعہ چھپی ہے۔ ۱۲۶۹ھ میں بمبئی میں کامل پانچوں جلدیں طبع ہوئیں۔ اور اس کے بعد ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۶ء) میں صرف پہلی جلد یورپ میں بمقام ویانہ (آسٹریا) مع جرمنی ترجمے کے شائع ہوئی۔ اس پہلی جلد میں سلطان ارغون کی تخت نشینی تک کے حالات ہیں۔

(ڈاکٹر محمد اقبالؒ)

(۲۴) جامع التواریخ

جامع التواریخ واقعاتِ عالم کی اہم ترین تاریخ ہے۔ اسے ایلخانی عہد کا ایک عظیم تاریخی کارنامہ سمجھنا چاہیے۔ اس کا مؤلف رشید الدین فضل اللہ ہمدانی ہے۔

رشید الدین ۶۴۵ھ میں ہمدان میں پیدا ہوا اور یہیں حدیث۔ فقہ، فلسفہ اور علم طب کی تعلیم حاصل کی۔ آخر علم طب کی وساطت سے اس نے غازان کے دربار میں رسائی پائی اور اپنے علم و تدبر کی بدولت ترقی کرکے غازان کا وزیر بنا۔ ایلخانی حکمرانوں کو علم و ادب سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ لیکن وہ چاہتے تھے۔ کہ ان کے آباؤ اجداد کے کارنامے کتابی صورت میں محفوظ رہیں خصوصاً غازان تاریخ کی طرف زیادہ راغب تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایلخانی اپنی شان و شوکت کے باوجود ایرانیوں میں جذب ہوکر رہ جائیں گے۔ اس لئے اس نے چاہا کہ اس کے اور اس کے بزرگوں کے کارنامے یادگار رہنے چاہئیں چنانچہ اس نے اپنے وزیر رشید الدین فضل اللہ کو یہ تاریخ لکھنے پر آمادہ کیا۔

ایلخانیوں کی تاریخ لکھنا آسان کام نہ تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ ان کی زبان "ایغوری" سیکھی جائے۔ اور ان کے عادات و اطوار کا مطالعہ کیا جائے۔ اس وقت اتفاق سے ایران اور چین و تاتار کے لوگوں کے میل جول سے ادھر چین و تاتار میں فارسی نے رواج پایا۔ اُدھر ایغوری زبان ایران میں رائج ہوئی یہ حکمرانوں کی زبان تھی۔ اس لئے لوگ بڑے شوق سے اسے سیکھتے تھے چنانچہ رشید الدین نے بھی یہ زبان سیکھی۔ اس کے علاوہ چینی علماء اکثر ایلخانی دربار میں آتے جاتے تھے۔ ایک چینی دانشمند پولاد چنگ سانگ حکومت چین کی طرف سے سفیر کی حیثیت میں ایلخانی دربار میں تھا۔ اس سے بھی رشید الدین نے کافی استفادہ کیا۔ بالآخر اس نے
قوم تاتار کی ابتدا سے چنگیز خان اور اس کے جانشین ... تک اور ہلاکو سے لیکر

غازان خاں کے زمانے تک کی تاریخ مرتب کی جو تاریخ غازانی کے نام سے موسوم ہوئی۔ ابھی یہ تاریخ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچی تھی۔ کہ غازان راہیٔ ملک بقا ہوا۔ اس کے بعد الجائیتو خدابندہ تخت نشین ہوا۔ اس نے یہ فرمائش بھی کی کہ تاریخ مذکور کے علاوہ تمام ہمعصر قوموں کی تاریخ اور مغلوں اور مغلوں کے دوست ممالک کا جغرافیہ بھی لکھا جائے۔ رشیدالدین نے وزارت کے مشاغل کے ساتھ ساتھ تاریخ اور جغرافیہ کی تالیف جاری رکھی اور ایرانی چینی۔ تبتی اور یہودی علماء کی مدد سے جو دربار ایلخانی سے متعلق تھے۔ ایک فصیح اور بسیط کتاب تیار کر لی۔ یہ کتاب ۷۱۰ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اور جامع التواریخ کے نام سے موسوم ہوئی۔

رشیدالدین فضل اللہ کا انجام بھی ویسا ہی ہوا۔ جیسا کہ زمانۂ گذشتہ میں ایران کے نامور وزراء کا ہوتا رہا تھا۔ ایک شخص علی شاہ نے سازش کر کے یہ الزام لگایا کہ اس نے سرکاری خزانے کی گراں قدر رقوم خرد برد کی ہیں۔ الجائیتو کے عہد میں تو علی شاہ کی سازش کامیاب نہ ہو سکی۔ لیکن الجائیتو کی وفات پر جب ابوسعید تخت نشین ہوا۔ تو علی شاہ اپنے فاسد منصوبوں میں کامیاب ہو گیا۔ نہ صرف یہ کہ رشیدالدین کو وزارت سے برطرف کر دیا گیا۔ بلکہ ستر برس کی عمر میں اس کو اس کے بیٹے ابراہیم سمیت اس جرم میں مروا دیا گیا کہ اس نے غازان خاں کو زہر دیا تھا۔ اس کی تمام جائیداد ضبط کر لی گئی۔ اور اس کے اعزہ اور اقارب کو چن چن کر سزائیں دی گئیں۔

جامع التواریخ کے پہلے حصے
جامع التواریخ کی ترتیب :- میں شاہانِ قدیم انبیائے

کرام سے لے کر خلافت اسلامیہ کے اختتام تک کے حالات درج ہیں۔
ملک الشعراء بہار لکھتے ہیں۔ کہ جامع التواریخ کا کچھ حصّہ تیموری عہد میں ضائع ہو گیا تھا۔ جسے بعد میں لطف اللہ بن عبداللہ ہروی نے جو حافظ ابرو کے نام سے مشہور ہوا۔ بایسنغر مرزا کے حکم سے پھر مرتب کیا۔ اس کے علاوہ جامع التواریخ کا ضمیمہ بھی ترتیب دیا۔ یہ دونوں حصے زبدۃ التواریخ کے نام سے موسوم ہیں۔

دوسرے حصّے میں سامانیہ۔ دیالمہ۔ غزنویہ اور سلاجقہ کی تاریخ ہے بہار لکھتے ہیں کہ اس حصّے کو راحت الصدور کا اقتباس سمجھنا چاہیئے۔ اس کے بعد خوارزم شاہوں کی تاریخ ہے۔ ایک باب میں بنی اسرائیل، فرنگ اور روم اور ہند کے تاریخی حالات و واقعات درج ہیں۔ جامع التواریخ کے یہ حصے تاریخ غازانی کے نام سے موسوم ہیں۔

اس کے بعد الجائیتو کی فرمائش پر رشید الدین نے باقی حصّہ بھی مکمل کیا۔ جو جغرافیائی حالات پر مشتمل ہے۔ تاریخ غازانی اور یہ بقیہ حصّہ مل کر جامع التواریخ کے نام سے موسوم ہے۔ مختصراً جامع التواریخ کی ترتیب حسب ذیل ہے

۱۔ تاریخ مغول۔ الجائیتو کے زمانے تک

۲۔ ا۔ الجائیتو سے مؤلف کے زمانے تک

۲۔ ب۔ انبیاء اور خلفا اور شاہانِ قدیم سے مولف کے زمانے تک

۳۔ چین و تاتار اور ہمسایہ ممالک کا جغرافیہ

جامع التواریخ کی نثر سادہ اور رواں ہے جہاں کہیں مولف نے دوسرے مورخین کے اقتباسات نقل کئے ہیں۔ وہاں بھی حتی الامکان

اس نے مشکل الفاظ حذف کر دیئے ہیں (بدخشانی)

جامع التواریخ کا شمار اہم ترین تاریخوں میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب وقائع عالم اور خاص کر مغلوں کی سلطنت اور غازان کی بادشاہت کے تفصیلی حالات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے مصنف رشید الدین فضل اللہ ہمدانی کو اباقا غازان اور اولجائتو جیسے مغل بادشاہوں کے پاس بڑا تقرب حاصل تھا۔ غازان کے دربار میں وہ منصب وزارت پر فائز تھا۔ اور کافی اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ رشید الدین فضل اللہ نے اپنی یہ کتاب ۷۱۰ھ میں ختم کی۔ اس کتاب کی تیسری جلد بھی تھی جو اب ناپید ہو گئی ہے یہ جغرافیہ پر لکھی گئی تھی۔

اس کتاب کو مغلوں کی اہم ترین تاریخ کہا جا سکتا ہے۔ خواجہ رشید الدین نہ صرف ایک زبردست وزیر اور اہم سیاسی مرتبہ کا حامل مشہور محقق تھا بلکہ وہ اور دوسرے علوم و فنون میں بھی کافی بصیرت رکھتا تھا۔ اس نے دینی اور ادبی مسائل پر کئی مفید اور اہم کتابیں لکھی ہیں۔ ۷۱۸ھ میں دشمنوں اور حاسدوں نے اس دانشمند وزیر کے خلاف سازش کی اور سلطان ابوسعید کے حکم پر تبریز میں قتل کر دیا گیا۔

(شفق)

جامع التواریخ کی تجویز اور اسکی تکمیل

جامع التواریخ کے تصور کا سہرا غازان خان کے سر ہے جس نے مآل اندیشی سے کام لیتے ہوئے یہ سوچا کہ ہر چند تاتاری فی الوقت ایران میں برسر اقتدار ہیں لیکن مرور ایام کے ساتھ

یہ بات ہو کر رہے گی کہ وہ ایرانیوں میں جذب ہو جائیں گے۔ پس اس نے چاہا کہ آئندہ نسلوں کے سادان کے مآثر کی ایک یادگار چھوڑی جائے۔ جس کی صورت یہ ہو کہ فارسی میں ان کی تاریخ اور فتوحات کا ایک صحیح دفتر مرتب کیا جائے۔ اس معرکتہ الآرا کام کی انجام دہی کے لئے اس نے رشید الدین کو چنا اور بے شک اس سے بہتر انتخاب ناممکن تھا۔ چنانچہ تمام سرکاری دفاتر سندات اس کے لئے مہیا کئے گئے۔ اور ان تمام اشخاص کی خدمات لے بہم پہنچائی گئی۔ جو تاتاری تاریخ اور آثار سلف کے متبحر عالم تھے ہرچند وزیر اس وسیع سلطنت کے ملکی معاملات میں منہمک رہتا تھا۔ لیکن وہ اپنی تحقیقات جاری رکھنے اور انہیں ضبط تحریر میں لانے کا وقت نکالنے میں کامیاب ہوا۔ گو بقول دولت شاہ کل وقت جو اسے اس کام کے لئے میسر تھا وہ نماز فجر اور طلوع آفتاب کے درمیان کا وقت تھا۔

جامع التواریخ کے موضوعات کا تجزیہ ابھی رشید الدین کی مغولی تاریخ مکمل نہ ہوئی تھی کہ غازان چل بسا لیکن اس کے جانشین اولجائتو نے اسے حکم دیا کہ تاریخ پوری کی جائے اور جیسا کہ شروع میں ارادہ تھا غازان ہی کے نام معنون ہو۔ چنانچہ تصنیف کے اس جزو کو جو عموماً پہلی جلد کہلاتا ہے بعض مرتبہ "تاریخ غازانی" کا عنوان دیا جاتا ہے۔ اولجائتو نے مصنف کو اسی کے ساتھ کی ایک اور جلد لکھنے کا حکم دیا۔ جس میں دُنیا کی ایک عمومی تاریخ اور خصوصاً اسلامی ممالک کی تاریخ ہو۔ اور ایک تیسری جلد لکھنے کو کہا جو جغرافیے سے

بحث کرے۔ یہ آخری جلد یا تو ضائع ہو چکی ہے۔ یا سرے سے لکھی ہی نہیں گئی۔ اور محض تجویز ہی رہی۔ چنانچہ آج یہ تصنیف جس صورت میں ہمارے علم میں ہے۔ صرف دو جلدوں پر شامل ہے۔ پہلی تاتاریوں کی تاریخ پر ہے۔ جو غازان کے لئے لکھی گئی۔ دوسری عمومی تاریخ ہے۔ پوری تصنیف ۷۱۰ھ میں مکمل ہوئی۔ گو دو برس آگے چل کر بھی مصنف اولجائیتو کے عہدِ حکومت کی تاریخ لکھنے میں مصروف تھا۔ اس زبردست تاریخ کے موضوعات مجملاً حسب ذیل ہیں :۔

جلد اوّل :۔ (پہلا باب) مختلف ترک اور مغول قبائل کی تاریخ ان کی تقسیم۔ انساب۔ شجرے۔ اساطیر وغیرہ یہ سب کچھ ایک دیباچے اور چار فصلوں میں ہے۔

(دوسرا باب) چنگیز خاں اس کے اسلاف اور اخلاف کی تاریخ غازان خان تک۔

جلد دوم (دیباچہ) حضرت آدم۔ بطارقۂ بنی اسرائیل اور انبیائے یہود کے بیان میں۔

(پہلا حصّہ) شاہانِ قدیم ایران قبل اسلام کی تاریخ چار فصلوں میں۔

(دوسرا حصّہ) محمد رسول اللہ کی تاریخ اور خلافت کی تاریخ۔ تاتاریوں کے ہاتھوں اس کے انقراض تک۔

اسلامی عہد کے ایرانی شاہی خاندان کی تاریخ جن کی تفصیل یہ ہے۔ سلاطینِ غزنہ۔ سلاجقہ۔ خوارزمشاہی خاندان۔ فارس کے سلغری اتابک اور مغرب و مشرق کے اسماعیلی۔ اور غُز اور اس کی اولاد یعنی ترکوں کی تاریخ۔ چینیوں کی تاریخ۔ فرنگیوں ان کے شہنشاہوں اور پاپاؤں

کی تاریخ ۔ ہندوستانیوں کی تاریخ جس کے ساتھ ساکی منی (مہاتما بدھ) اور اس کے بنا کردہ مذہب کا ایک طویل اور مفصّل تذکرہ ہے ۔

جامع التواریخ نہ صرف اپنے وسیع میدان اور اس احتیاط کے سبب قابلِ ذکر ہے جس کے ساتھ یہ تمام دستیاب کتابی اور زبانی مآخذ سے تالیف کی گئی ہے ۔ بلکہ اس لئے کہ اس میں معلومات کی جدّت ہے فارسی نثریہ تصانیف اور کم سے کم شعبۂ تاریخ میں شاہد ہی کوئی کتاب اپنی منفعت کے لحاظ سے اس کے مقابلے پر آسکے ۔ اس بات کو دیکھتے ہوتے یہ امر اور بھی قابلِ افسوس ہے ۔ کہ یہ اب تک غیر مطبوع ہے ۔ اور تقریباً ناقابلِ رسائی ہے ۔ تالیف رشید الدین کی انتہائی اہمیت کے مزید ثبوت بہم پہنچانا اب غیر ضروری ہے ۔ اس اعلیٰ تالیف نے جس کا بیڑا نہایت نامساعد حالات میں اٹھایا گیا ۔ اور جس کی انجام دہی کے لئے ایسے ایسے وسائل مہیا تھے ۔ کہ کسی واحد مصنف کو اس سے قبل حاصل نہ ہوئے تھے ۔ پہلی مرتبہ اہلِ ایشیا کو کل عالم کی تاریخ اور جغرافیہ کا ایک مکمل نصاب بہم پہنچایا ۔ (براؤن)

رشیدالدین فضل اللہ کی جامع التواریخ اپنی ہم پایہ کتب کے درمیان عبارت کی روانی ۔ فصاحت ۔ جامعیت کے لحاظ سے ممتاز درجہ رکھتی ہے ۔ یہ تاریخ کا ایک عظیم ترین شاہکار ہے ۔ جو ایران میں عصر مغول کے دوران تالیف کیا گیا ۔ یہ کتاب ادبیات ایران کی بزرگ ترین یادگاروں اور دنیا کی اہم ترین تاریخوں میں شمار ہوتی ہے ۔ یہ غازان خان اور اولجائیتو کے عہد حکومت کی ایک بہت ضخیم عمومی تاریخ ہے ۔ جو خواجہ رشید الدین فضل اللہ ہمدانی

جیسے دانشمند وزیر کے اہتمام سے جمع کی گئی ہے۔ خواجہ موصوف اباقا خان کے دربار میں بطور طبیب داخل ہوا۔ اور آخر کار ترقی کرتے کرتے غازان۔ اولجائیتو اور ابوسعید کے ہاں وزارت کے عہدہ پر فائز ہوا۔

غازان خان ایلخانی علم تاریخ کا بہت شوق رکھتا تھا۔ اور اپنی اقوام کی تاریخ کے متعلق ہر شخص کی نسبت اسے بہترین معلومات حاصل تھیں۔ اس نے خواجہ رشید الدین کو حکم دیا کہ وہ مغلوں کی ایک تاریخ ترتیب دے اور اسے تاتاریوں کے اُن امراء اکابر۔ فوجی افسروں اور عام لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ جو اپنے اصل وطن سے دُوری کے باعث آہستہ آہستہ اپنے آباؤ اجداد کی تاریخ کو فراموش کر چکے تھے۔ رشید الدین نے اس اہم کام کا بیڑا اُٹھا لیا۔ اور مغلوں کے اسناد کے مطالعہ اور تاتاریوں کے حالات سے آگاہ لوگوں سے مذاکرات کرنے کے علاوہ اس نے پولاد چنگ سانگ ایلخانی دربار میں خاقان چین کے سفیر اور خود غازان سے بہت سی زبانی اطلاعات حاصل کیں۔ اس طرح اپنی معتبر کتاب کو ترتیب دے کر غازان خاں کے نام پر معنون کر دیا۔ جس کی وجہ سے وہ تاریخ غازانی کے نام سے مشہور ہوئی۔ لیکن کتاب کی تکمیل سے پیشتر ہی غازان فوت ہو گیا۔ اولجائیتو نے جو اس کا جانشین اور بھائی تھا۔ خواجہ رشید الدین کو اس کی تکمیل میں لگائے رکھا۔ اور یہ بھی فرمائش کی کہ اقوام مغول کی تاریخ کے علاوہ اُن تمام اقوام کی بھی ایک عام تاریخ جمع کی جائے۔ جن کے ساتھ مغلوں کی جان پہچان ہے۔ اور جن کے نمائندے ایلخانی دربار میں مقیم ہیں۔ اور اس کتاب کو ایک دوسری جغرافیہ کی کتاب کے ساتھ ملا کر تاریخ غازانی کی ذیل قرار دے۔ رشید الدین نے اپنے منصب وزارت اور ملکی دیوانی امور کی تدبیر

میں ہر وقت انتہائی درجہ مصروف رہنے اور بڑھاپے اور مزاج کے ضعف وناتوانی کے باوجود اس گرانبار ذمہ داری کو اٹھا لیا۔ اور چینی ۔تبتی ۔فرنگی اور یہودی وغیرہ علما کے علاوہ ہر ملک و ملت کے جو فضلا و اکابر سلطانیہ اور تبریز میں مقیم تھے۔ اسے معلومات بہم پہنچانے کے بعد وہ جامع التواریخ کے لکھنے میں منہمک ہوگیا۔ آخر سنہ ۷۱۰ھ میں اس نے اپنا کام مکمل کر لیا۔ رشیدالدین کے نقشہ کے مطابق جامع التواریخ کو حسب ذیل تین جلدوں پر مشتمل ہونا چاہیئے تھا۔

(۱) مجلد اوّل :۔ مغلوں کی تاریخ قدیم ترین زمانے سے اولجائیتو کے عہد تک۔ یہ وہی کتاب ہے جو آج کل ملتی ہے۔ اور تاریخ غازانی کے نام سے مشہور ہے۔

(۲) مجلد دوم :۔ سلطان اولجائیتو سے تالیف تک کی تاریخ کے علاوہ انبیاء و خلفاء ، پادشاہوں وغیرہ کی تاریخ عہد آدم سے تالیف کتاب تک۔ پھر اقوام عالم میں سے ہر قوم کی مفصل تاریخ۔

(۳) مجلد سوم :۔ دُنیا کے مختلف اقالیم کا جغرافیہ اور مختلف ممالک کے راستے (مسالک الممالک)

جامع التواریخ کا بنیادی اور نفیس ترین حصہ اس کی پہلی جلد ہی ہے یعنی تاریخِ غازانی جو قدیم تاتاریوں کے مختلف قبیلوں اور چنگیز خاں کے اسلافِ واجداد کی تاریخ ہے۔ حتیٰ کہ جہانکشائے بھی اس دور کے حالات سے بالکل عاری ہے۔ البتہ چنگیز خاں اور اس کی اولاد کی فتوحات کے بارے میں جامع التواریخ جہانکشائے کا خلاصہ ہے۔ لیکن غازان خاں کے حالات بالخصوص اس کی اصلاحات وقوانین اور بعض دیگر مواقع پر جامع التواریخ ایک بیش قیمت خزانہ ہے۔ اور علاوہ ازیں اس کی انشا سادگی اور روانی کے

لحاظ سے فارسی نثر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔

خواجہ رشید الدین ایک جامع کمال عالم اور فارسی۔ عربی۔ ترکی اور مغول زبانوں کا ماہر تھا۔ فرائض منصبی کی تکمیل کے بعد اسے جو وقت میسر آتا تھا۔ وہ اُسے مطالعہ یا کتابت میں صرف کرتا۔ چنانچہ جامع التواریخ کے علاوہ وہ اور بھی بہت سی اہم اور ضخیم کتابوں کا مصنف ہے۔

معتبر تواریخ میں کامل ابن اثیر اور طبقات ناصری (جو تاریخ عمومی سے تعلق رکھتی ہیں) کو چھوڑ کر چار کتابیں تاریخ مغول کے ارکانِ اربعہ شمار کی جاتی ہیں۔ جو یہ ہیں :۔

(۱) تاریخ غازانی مؤلفہ رشید الدین فضل اللہ

(۲) سیرتِ جلال الدین از نسوی۔

(۳) جہانگشائے از جوینی

(۴) تاریخ وصاف۔

ان چاروں مؤلفین کے بعد جس کسی نے بھی تاریخ مغول کے موضوع سے متعلق کسی چیز پر قلم اُٹھایا ہے۔ اس نے مندرجہ بالا چاروں کتابوں سے ہی معلومات اخذ کر کے انہیں تالیف کی بنیاد قرار دیا ہے۔ (محمد دبیر سیاقی)

جامع التواریخ کا اصل نسخہ جو اس وقت موجود ہے۔ دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد تاریخ مغول پر حاوی ہے۔ اور دوسری عام عالمی تاریخ ہے۔ رشید الدین کا ارادہ تھا۔ کہ وہ ایک تیسری جلد بھی لکھے گا۔ جو مسالک و ممالک اور مختلف بلاد کے حالات پر مشتمل ہو گی۔ لیکن وہ اپنے اس ارادہ کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ کیونکہ کسی شخص نے بھی اس کا کسی جگہ اور کسی وقت ذکر نہیں کیا۔ کتاب کی پہلی جلد جس میں مغلوں کی تاریخ ہے، کی طباعت اوقاف گب کی طرف سے موسیو بلوشہ کے ذمہ لگائی گئی ہے۔ جو کتاب خانۂ ملی پیرس کے محافظوں میں سے ہیں۔ یہ کتاب تین اجزا

منقسم ہوگی۔ یہ تقسیم اصل مصنّف کی اختیار کردہ نہیں۔ بلکہ موسیو بلوشہ نے تین مساوی الحجم اجزا میں سہولت کی خاطر اپنی طرف سے تجویز کی ہے۔ پہلا جزو اقوام ترک و مغول کی تاریخ۔ اجداد چنگیز خاں چنگیز خاں کی اپنی تاریخ اور اس کی فتوحات اور لڑائیوں پر مشتمل ہوگا۔ دوسرا جزو چنگیز خاں کے چار بیٹوں یعنی اوکتائی قاآن۔ جوچی۔ چغتائی اور تولی کی تاریخ کے علاوہ کیوک خان پسر اوکتائی قاآن۔ منگو قاآن اور قوبیلائی قاآن پسران تولی وغیرہ پر مشتمل ہوگا۔ اور تیسرا جزو پادشاہان مغول ایران یعنی ہلاکو اور اس کے بیٹوں ابقا اور تکودار کے علاوہ ہلاکو کے پوتوں ارغون و گیخاتو پسران ابقا کے واقعات پر حاوی ہوگا۔ کتاب کی دوسری جلد جو عام عالمی تاریخ ہے۔ ابھی تک علمی صورت میں باقی ہے۔ اور معلوم نہیں کہ کسی کو اس کے طبع کرنے کا خیال آیا ہے یا نہیں۔ (محمد خان قزوینی)

---

(۲۵) تاریخ گزیدہ

تاریخ جہاں گشا اور جامع التواریخ کی تصنیف کے بعد تاریخ گزیدہ تصنیف ہوئی ہے۔ اور اسی سبک میں لکھی گئی ہے۔ اور اصل میں جامع التواریخ سے عمدہ مطالب اس میں نقل کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب سنہ ۷۳۰ھ میں ختم ہوئی اور یوں اس کے آخر میں تازہ مطالب آ گئے ہیں۔ اس کے مصنّف حمد اللہ مستوفی قزوینی نے ایک اور مفصّل تاریخ شاہنامے کی طرز میں لکھی ہے۔ اس کتاب میں (۷۰۵) شعر ہیں۔ حمد اللہ مستوفی نے سنہ ۷۵۰ھ میں بمقام قزوین وفات پائی۔ (شفق)

تاریخ گزیدہ کا مؤلف حمد اللہ مستوفی ہے۔ یہ تاریخ اس نے سنہ ۷۳۰ھ میں لکھی اور رشید الدین فضل اللہ کے بیٹے غیاث الدین محمد کے نام منسوب کی۔ تاریخ

گزیدہ ایک تمہید چھ ابواب اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں کئی فصلیں ہیں۔ تمہید میں حمد اللہ مستوفی نے آفرینشِ عالم کا مختصر حال لکھا ہے۔ پہلا باب پیغمبرانِ قدیم سے متعلق ہے۔ دوسرے باب میں زمانۂ قبل از تاریخ کے بادشاہوں تیسرے باب میں آنحضرت رسول اکرم صلعم اور خلفائے راشدین کی تاریخ ہے۔ چوتھے میں عہد صفاریہ۔ سامانیہ، غزنویہ، غوریہ، دیالمہ، سلاجقہ وغیرہم اسلامی حکومتوں کا مختصر حال لکھا گیا ہے۔ پانچواں باب اماموں۔ مجتہدوں۔ محدثوں صوفیوں اور شاعروں کے حالات پر مشتمل ہے۔ چھٹے باب میں قزوین کے تاریخی اور جغرافیائی حالات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ خاتمہ مختلف نسب ناموں پر مشتمل ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے۔ تاریخ گزیدہ میں آفرینش عالم سے لے کر مصنف کے زمانے تک کے حالات درج ہیں۔ جو تاریخ اس قدر طویل زمانے کا احاطہ کئے ہوئے ہو۔ اس سے ہم کسی تفصیل کی اُمید نہیں رکھ سکتے۔ لیکن اختصار کے باوجود اس کا شمار ان کتابوں میں ہوتا ہے۔ جو تاریخ ایران کا بہترین ماخذ سمجھی جاتی ہیں۔ تاریخ کا وہ حصہ بہت مستند اور معلومات افزا ہے۔ جو مؤلف کے اپنے زمانے سے متعلق ہے۔ پروفیسر براؤن نے اس مفید تاریخ کو گِب میموریل کے سلسلۂ کتب میں ۱۹۱۰ء میں شائع کرایا۔ (بدخشانی)

گو رشید الدین اپنی تمام تصنیفات کی بقا میں ناکام رہا۔ لیکن اس نے دوسرے مورخوں کے لئے ایک مفید مثال قائم کی۔ اب ہم اس کے سب سے بڑے مقلد حمد اللہ مستوفی کی تالیف و تصنیف کو لیتے ہیں۔ جو ناظر مالیات کے عہدہ پر فائز تھا وہ چھوٹی ہی عمر سے بڑے اشتیاق سے علماء کی صحبت میں شریک رہا۔ اور عالمانہ مباحثوں میں اکثر حصہ لیتا رہا۔ بالخصوص ان میں جو تاریخ پر ہوتے تھے۔ خود رشید الدین کی صحبت سے اس نے کافی استفادہ کیا۔ چنانچہ ہر چند تاریخ نویسی

ئی باقاعدہ تربیت اس کو حاصل نہ تھی۔ لیکن اس نے عزم کیا کہ فرصت کے اوقات
عالم کی ایک مختصر مگر جامع تاریخ تالیف کرنے میں صرف کرے۔ اس کی تصانیف
میں سے تین یعنی تاریخ گزیدہ۔ ظفر نامہ اور نزہت القلوب ہم تک پہنچی ہیں ان
تینوں میں پہلی دو تاریخی ہیں اور تیسری جغرافی۔

تاریخ گزیدہ ۷۳۰ھ میں لکھی گئی اور رشید الدین کے بیٹے غیاث الدین
کے نام معنون کی گئی ہے جو آٹھ سال تک وزیر اعظم کے عہدہ پر فائز رہنے کے بعد
قتل کر دیا گیا۔ مصنف نے کتاب کے شروع میں اپنے کوئی دو درجن ماخذ شمار
کئے ہیں۔ تاریخ گزیدہ ایک فاتحہ۔ چھ ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ ہر باب
بھی کئی فصلوں میں تقسیم ہے:-

فاتحہ:- آفرینش کائنات و آدم کے بیان میں۔

باب اوّل:- انبیاء۔ پیغمبرانِ مرسل اور ان حکما کے بیان میں ہے۔ جو
ہر چند پیغمبر نہ تھے۔ لیکن انہوں نے دین کی بہتری کے لئے سعی کی۔

باب دوم: بادشاہانِ قبل از اسلام کے بیان میں۔

باب سوم:- محمد مصطفٰے صلعم۔ ان کے خلفا۔ صحابہ اور اولاد کے بیان میں۔

باب چہارم:- ایران میں دورِ اسلامی کے بادشاہ یعنی صفاریان۔
سامانیان۔ غزنویان۔ غوریان۔ دیالمہ یا آلِ بویہ۔ سلاجقہ۔ خوارزمشاہیان۔
اتابکان۔ اسماعیلیان وغیرہ۔

باب پنجم: ان لوگوں کے بیان میں جو اپنے تقدس یا فضیلت کے باعث
قابلِ ذکر ہیں (ائمہ و مجتہدین۔ قراء، محدثین۔ مشائخ و صوفیہ۔ علمائے الہیات و فقہ
و طب اور شعراء وغیرہ)

باب ششم:- احوالِ شہرِ قزوین کہ مؤلف کا مولد و منشا ہے

خاتمہ:- ایک شجرۂ انساب جو رشید الدین کے اختراع کردہ شجرے
پر مبنی ہے۔ لیکن یہاں اس پر اصلاح کی گئی ہے۔

تاریخ گزیدہ کے میدانِ بحث کی وسعت اور اس کی نسبتہً قلیل ضخامت (ایک لاکھ ستر ہزار الفاظ تقریباً) کو مدِنظر رکھتے ہوئے ظاہر ہے۔ کہ اس کی نوعیت ملخّص کی سی ہے۔ اور اس سے بہت تفصیل کی اُمید نہیں رکھی جا سکتی۔ تاہم یہ ایک مفید کتاب ہے۔ اور اس میں بہت سی دلچسپ معلومات ہیں۔ جو اور کہیں نہیں ملتیں اور معاصر تاریخ پر تو یہ قطعی سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

(براؤن)

سب سے بڑا فتنہ جو اسلام، اسلامی تہذیب و تمدن اور علم و ادب پر اثر انداز ہوا۔ وہ تیرھویں صدی عیسوی میں منگول کا حملہ تھا۔ اس سے بڑے بڑے پُر رونق شہر کھنڈرات میں تبدیل ہو گئے۔ مساجد، کتب خانے اور مکاتب سب تباہ و برباد ہو کر رہ گئے۔ ملک کے مختلف اضلاع ویران ہو گئے۔ اور تمام آبادیاں اُجڑ گئیں۔ عربی یا فارسی ادب کا ہر طالب علم اس بات کو تسلیم کرے گا۔ کہ زوالِ بغداد اور عباسی خلافت کی تباہی سے پہلے اور بعد کی لکھی گئی کتابوں میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ اس کے باوجود فارسی ادب کے ایک شعبہ یعنی علمِ تاریخ کو یقیناً اس سے مستثنیٰ قرار دینا پڑے گا۔ کیونکہ کسی ایسے دور کا پتہ لگانا بہت مشکل ہے۔ جس میں مندرجہ ذیل تصانیف کی طرح بیش قیمت اور محققانہ تاریخی کتب فارسی زبان میں تحریر کی گئی ہوں۔ مثلاً

(۱) تاریخ جہانگشائے مؤلفہ علاء الدین عطا ملک جوینی (تالیف ۶۵۸ھ مطابق ۱۲۶۰ء)

(۲) جامع التواریخ مؤلفہ رشید الدین فضل اللہ (تالیف ۷۱۰ھ مطابق ۱۳۱۰ - ۱۱ء)

(۳) تجزیۃ الامصار و تزجیۃ الاعصار موسوم بہ تاریخِ وصاف مؤلفہ عبداللہ بن فضل اللہ شیرازی (تالیف ۷۲۸ھ مطابق ۱۳۲۸ء)

ان تینوں کتابوں میں سے موخرالذکر یقیناً پہلی کا تتمہ ہے۔ کیونکہ یہ دونوں کتابیں بنیادی طور پر تاریخ منگول سے تعلق رکھتی ہیں۔ باقی معاصر خاندانوں کی تاریخ ان کا ضمنی عنوان ہے۔ باقی رہی درمیانی کتاب یعنی جامع التواریخ سو وہ منگولوں کی خاص تاریخ کے علاوہ عام تاریخ عالم (جہاں تک مصنّف کو علم تھا) اور بالخصوص خلافت اور اس کے ساتھ مختلف اسلامی حکمران خاندانوں کے واقعات پر مشتمل ہے۔ ان میں سے تاریخ وصاف غالباً مکمل طور پر ہم تک پہنچی ہے۔ جو بمبئی میں ۱۲۶۹ھ (مطابق ۵۳-۱۸۵۲ء) میں شائع ہو چکی ہے۔ اوقاف گب نے باقی دو کتابوں کی طباعت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ یہ یقیناً فن تاریخ کی ایک بہت بڑی خدمت شمار ہو گی۔

موجودہ کتاب یعنی تاریخ گزیدہ اگرچہ تاریخ وصاف کے دو ہی سال بعد (یعنی ۷۳۰ھ مطابق ۱۳۳۰ء) مکمل ہو گئی تھی۔ لیکن یہ مندرجہ بالا تینوں تاریخی کتابوں سے کم تر درجہ کی مالک ہے۔ یہ روضۃ اولی الالباب فی تواریخ الاکابر والانساب یعنی تاریخ بناکتی (تالیف ۷۱۷ھ مطابق ۱۳۱۷ء) کی طرح مجموعی طور پر رشید الدین فضل اللہ کی جامع التواریخ کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ تاہم یہ ایرانی اور اسلامی تاریخ میں ایک مفید اضافہ ہے۔ اس میں کافی دلچسپ مواد پایا جاتا ہے۔ مصنّف نے اسے تقریباً دو درجن عربی و فارسی قدیم ماخذوں سے اکٹھا کیا۔ جن کا ذکر اس نے اپنے مقدمہ میں کر دیا ہے۔

تاریخ گزیدہ کے مطالب جامع التواریخ کی دوسری جلد (جو عمومی تاریخ پر مشتمل ہے) سے بہت حد تک مطابقت رکھتی ہے۔ البتہ اتنا اختلاف ضرور ہے کہ تاریخ گزیدہ کے دو ابواب یعنی پانچواں اور چھٹا مصنّف کے وطن قزوین کی قدیم یادگاروں - وہاں کی تاریخ اور مشاہیر کی زندگی کے حالات پر مشتمل ہیں۔

تاریخ گزیدہ کے قلمی نسخے عام ہیں اور تقریباً علوم شرقیہ کے ہر کتب خانے میں موجود ہیں۔ صرف یورپ کے بعض کتب خانوں میں جو نسخے پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے قریباً چودہ کا سراغ راقم الحروف نے لگایا ہے۔ (براؤن)

حمداللہ نے تاریخ گزیدہ کے دیباچہ میں اپنی نسبت لکھا ہے۔ کہ اہل علم کی ملازمت اور خدمت میں مصروف رہنے کے بعد میں نے "مخدوم سعید شہید" (وزیر رشید الدین) کی ملازمت کا شرف پایا اور وزیر موصوف کی مجالس میں عموماً مباحث علوم اور خصوصاً مباحث علم تاریخ سے مستفید ہوتا رہا۔ اس سے مجھ کو مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ تاریخ کی کتابیں پڑھیں اور گو میرے اسلاف اور اقرباء "صناعت تحریر و سیاقت" سے موسوم تھے۔ اور تاریخ میرا فن نہ تھا۔ تاہم مجھ کو خیال آیا کہ علم تاریخ کے مضامین کو جو زمانہ کے گزرنے سے بہت مفصل ہو گئے ہیں۔ اختصار سے بیان کرنا چاہیئے۔ اور چونکہ میں گاہے گاہے شکستہ بستہ شعر کہتا ہوں میرے دل میں ہوس پیدا ہوئی۔ کہ تاریخ کو نظم میں لکھوں۔ جس سے اسلام کے ابتدا سے اس وقت تک کے حالات معلوم ہو سکیں۔ یہ نظم میں لکھنے لگا۔ اور اس وقت تک پچاس ہزار سے اوپر بیت کہہ چکا ہوں۔ اگر توفیق رفیق ہوئی تو ان کی تعداد ۷۵ ہزار بیت تک پہنچ جائے گی۔ ارادہ ہے کہ اس کو وزیر غیاث الدین بن رشید الدین کے نام پر موشح کروں گا۔ لیکن چونکہ اس منظوم کا مسودہ ابھی صاف نہیں ہو سکا۔ عجالتہً میں نے نثر میں ایک مختصر تیار کیا ہے۔ جو فن تاریخ کا مجمل ہے۔ اور اس کو وزیر موصوف (غیاث الدین) کے نام پر معنون کیا ہے۔ اس خدمت سے اس بندہ نے اپنی غلامی کے اس عہد کی تجدید کی جو زمانِ صبی میں اس خاندان بزرگ کے ساتھ میں نے کیا اور اب تک قائم ہے۔

اس مختصر (گزیدہ) کی تالیف ۷۳۰ھ (۶۹۸ یزدجردی) میں ہوئی۔ تاریخ گزیدہ کی تالیف کے وقت تاریخ منظوم نامکمل تھی۔ بعد میں مولف نے اس کو مکمل کیا۔ اور چونکہ یہ سات صدیوں اور چند سال کی تاریخ ہے۔ اس لئے ہر ایک صدی کے وقائع کو دس ہزار شعر میں ختم کیا گیا ہے۔ اس منظوم کا نام اس نے ظفرنامہ رکھا (اس میں وہ اپنا تخلص مستوفی لاتا ہے) ظفرنامہ تین کتابوں یا

قسموں میں منقسم ہے۔
(۱) قسم اسلامی (آغاز تا ورق ۲۵۴ ب)
(۲) ذکر العجم (ورق ۲۵۵ الف تا ۴۴۶ ب)
(۳) ذکر المغول (ورق ۴۴۷ ب تا ۷۳۶) (تا وقائع حدود سنہ ۷۳۴ھ) عہد ایلخان ابوسعید م-۷۳۶) (محمد شفیع)

(۲۶) تاریخ بناکتی[1]

یہ ابوسلیمان داؤد بناکتی کی تالیف ہے۔ اور مؤلف کے نام کی نسبت سے تاریخ بناکتی کے نام سے موسوم ہے۔ سن تالیف سنہ ۷۱۷ھ ہے۔

اس عہد کا ایک اور غیر مطبوعہ تاریخی رسالہ معروف بہ تاریخ بناکتی ہے جس کا پورا نام "روضۃ اولی الالباب فی تواریخ الاکابر والانساب" ہے جسے سنہ ۷۱۷ھ میں ابوسلیمان داؤد بناکتی نے تالیف کیا۔ یہ امر بدیہی اور باقرارِ مصنف ثابت ہے۔ کہ یہ رشید الدین کی بلند پایہ تصنیف کے نمونہ پہ لکھی گئی۔ اس کی نو قسمیں یعنی فصلیں ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے:۔

(۱) انبیاء و بطارقہ (۲) شاہانِ قدیم ایران (۳) محمد مصطفےٰ اور خلفاء (۴) خلفائے عباسیہ کے ہمعصر ایران کے شاہی خاندان۔ (۵) اہلِ یہود (۶) عیسائی اور فرنگی اقوام (۷) اہلِ ہند (۸) اہل چین (۹) قوم مغول۔

ایک لحاظ سے اس کتاب میں رشید الدین کے وسیع تر تصورِ تاریخ کا اثر صاف طور پر نظر آتا ہے۔ وہ یہ کہ نصف سے زیادہ کتاب غیر مسلم اقوام کے حالات کے لئے وقف کی گئی ہے۔ جن کے نام آخری پانچ قسم کی سرخیوں میں مذکور ہیں۔

---

[1] بناکت یا فناکت ماوراءالنہر کا ایک مقام ہے۔

یعنی اہل یہود۔ اقوام یورپ (جن میں پاپایان و شہنشاہان روم بھی شامل ہیں) اہل ہند، اہلِ چین اور قوم مغول۔ ان قوموں کے حالات کا بیان اگرچہ بیشتر مختصر اور تشنہ ہے۔ تاہم اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنے والے کو چیدہ واقعات کا حقیقی علم حاصل تھا۔ علاوہ بریں غیر اسلامی مذاہب کے بیانات بے لاگ ہیں اور درشتی اور تعصب سے پاک ہیں۔

اکثر ایرانی مورخین جو رشید الدین کی رہنمائی سے براہ راست بہرہ مند نہیں ہیں۔ باقی تمام تاریخ کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اور صرف اس تاریخ کو لیتے ہیں۔ جو اسلام اور اہل اسلام، شاہانِ قدیم ایران، انبیائے یہود اور بطارقہ سے وابستہ ہے۔ تاریخ بناکتی کا مصنف ماوراء النہری تھا۔ اور غازان خان (سنہ ۷۰۱ھ) کے ہاں ملک الشعرا ہونے کے سبب مغولی دربار سے اور بہت سے اجنبیوں سے جو بکثرت وہاں آتے تھے بلاشبہ واقف تھا۔ یہودیوں، عیسائیوں، ہندوستانیوں، چینیوں۔ اور مغولوں کے بارے میں اس کی اطلاعات گو بڑی حد تک ورا اکثر انہی لفظوں میں تاریخ رشید الدین سے لی گئی ہیں۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ مصنف نے ان کی تکمیل ان معلومات سے کی۔ جو اس نے زیر بحث اقوام کے نمائندوں سے زبانی حاصل کیں۔ ایسے مقامات، اشخاص اور تاریخی واقعات کی طرف جو اکثر مسلمان مصنفوں کی سرحدِ نظر سے باہر رہے ہیں۔ اس کتاب میں جتنے اشارے پائے جاتے ہیں، مغولی دور سے پہلے کسی تاریخ میں نہیں پائے جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد بھی کم ہی تاریخوں میں ملتے ہیں۔

(براؤن)

---

(۲۷) طبقاتِ ناصری

یہ تاریخ ابوعمر منہاج الدین عثمان بن سراج الدین جوزجانی کی تالیف ہے۔ منہاج الدین ۵۸۹ھ میں پیدا ہوا۔ تحصیل علم کے بعد غوری بادشاہوں کے دربار سے وابستہ ہوا۔ تاتاریوں کے طوفانی حملوں میں یہ بھی غور اور غزنی میں مارا مارا پھرا۔ پھر دریائے سندھ عبور کر کے سندھ اور ملتان کا رُخ کیا۔ اور غوری حکمران کے گورنر ناصر الدین قباچہ کی خدمت میں آپہنچا۔ لیکن جب قباچہ کو شمس الدین التمش نے شکست دی تو منہاج السراج نے عوفی اور دوسرے علماء کے ساتھ التمش کے دربار کا رُخ کیا۔ یہاں ان علما کی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ منہاج السراج نے اسی دربار میں ۶۵۸ھ میں طبقاتِ ناصری تالیف کی اور التمش کے بیٹے ناصر الدین محمود کے نام منسوب کی۔ یہ تاریخ تئیس ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب کو مولف نے طبقہ کا نام دیا ہے۔ اسی نسبت سے یہ تاریخ طبقاتِ ناصری کے نام سے مشہور ہوئی۔

"طبقاتِ ناصری" سلاطینِ ہند کی تاریخ ہے۔ لیکن ضمناً دورِ غزنویہ اور دورِ مغول کے اہم واقعات بھی لکھے گئے ہیں۔ اس کا شمار ان کتابوں میں ہوتا ہے جو غوری۔ غزنوی۔ خوارزم شاہی اور تاتاری حکمرانوں کی تاریخ کا بہترین مآخذ خیال کی جاتی ہیں۔

منہاج السراج نے اپنے ہمعصر ادیبوں کا تتبع نہیں کیا۔ بلکہ ان کے برعکس اس نے یہ تاریخ نہایت سادہ اور سلیس زبان میں لکھی ہے۔ اس کی نثر میں سو سال پہلے کی نثر کی جھلک نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ منہاج نے خود سادہ نثر لکھ کر آئندہ کی نثر کے لئے نئی شاہراہ کھول دی۔ (بدخشانی)

طبقاتِ ناصری ایک عمومی تاریخ ہے۔ اور ابتدا سے ۶۵۸ھ تک کے حالات اس میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کے بہترین مضامین وہ ہیں جو ہندوستان کے حکمران خاندانوں کے حالات پر لکھے گئے ہیں۔ اور اس کے ضمن میں تاریخ ایران کے بعض اہم واقعات جیسے غزنوی دور کے حوادث مغلوں کی سلطنت کی ابتدا، اور خاص کر اسماعیلیوں کے قلع قمع کے واقعات جن کا خود مصنّف عینی شاہد رہا ہے۔ نہایت متین اور رواں طرز میں بیان کئے ہیں۔ اس کتاب کا مصنّف ابوعمر عثمان منہاج الدین جوزجان کا رہنے والا تھا۔ اس نے ہندوستان میں زندگی بسر کی۔ تین بار ہندوستان کے سلاطین کا سفیر بن کر ایران کا سفر کیا۔ اور اس زمانے کے بہت سے اہم واقعات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا۔ (شفق)

---

(۲۸) گلستان

یہ اعجوبۂ روزگار زندہ جاوید کتاب سعدی علیہ الرحمۃ کی شاہکار ہے جو ۶۵۶ھ میں لکھی گئی تھی۔ سعدی ایک قادرالکلام شاعر اور معجز بیان نثر نگار تھے۔ تاریخ ادبیات میں سعدی کا مقام بہت بلند ہے۔ لیکن یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ کہ یہ بلندی مقام آپ کو شاعری کی بدولت حاصل ہوئی یا نثر کی بدولت۔ ملک الشعراء بہار لکھتے ہیں کہ سعدی علیہ الرحمۃ کی شخصیت اور استادانہ عظمت کو گلستان میں دیکھنا چاہیئے۔ اگر اس چھوٹی سی مگر گراں پایہ نثر کی کتاب کا وجود باقی نہ رہتا تو سعدی کی دو تہائی عظمت جاتی رہتی۔ اور فارسی ادب اس گراں بہا اور عظیم ذخیرے سے محروم رہ جاتا۔ کیونکہ ایسی کتاب نہ زمانۂ گذشتہ میں لکھی گئی۔ نہ زمانۂ آئندہ میں لکھی جائے گی۔

گلستان کو شیخ سعدی کے کلام کا خلاصہ اور لب لباب سمجھنا چاہیئے۔ فارسی نثر میں کوئی کتاب اس قدر مقبول نہیں ہوئی جتنی گلستان مقبول ہوئی ہے۔ ایران۔ افغانستان۔ ہند اور خود ہمارے ملک میں گلستان کسی نہ کسی صورت میں نصابِ تعلیم میں شامل رہی ہے۔ اسے فارسی زبان کا ذوق رکھنے والا ہر شخص پڑھتا اور حظ اٹھاتا ہے۔

گلستان کی بنیاد یوں تو اخلاقیات پر ہے جو روکھا پھیکا اور بے نمک سا موضوع ہے۔ لیکن گلستان اخلاقی کتاب ہونے کے باوجود ہر زمانے میں مقبولِ عوام رہی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں روزمرّہ زندگی کے حالات و واقعات نہایت فصاحت و بلاغت سے بیان کئے ہیں۔ حسنِ بیان اور لطفِ ادا نے اسے اور بھی زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔ گلستان ایک تمہید اور آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ ان کی ترتیب حسبِ ذیل ہے:۔

باب اول ۔ سیرت بادشاہان	باب دوم ۔ اخلاقِ درویشان
باب سوم ۔ فضیلتِ قناعت	باب چہارم ۔ فضیلتِ خاموشی
باب پنجم ۔ عشق و جوانی	باب ششم ضعف و پیری
باب ہفتم ۔ تاثیر تربیت	باب ہشتم آدابِ صحبت

گلستان کے اسلوبِ تحریر پر ایک مستقل باب لکھا جانا چاہیئے۔ لیکن یہاں لقدرِ گنجائش اس کی صرف چند خصوصیات درج کی جاتی ہیں:۔

(۱) سعدی عموماً چھوٹے چھوٹے فقرے لکھتے ہیں۔ لیکن بقول مولانا حالی یہ ریشم کے لچھے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کی نثر میں نظم کی سی روانی ہے۔

(۲) گلستان کی تشبیہات بہت تازہ اور شگفتہ ہیں۔

(۳) سعدی وسیع مضامین کو مختصر الفاظ میں اس طرح لاتے ہیں۔ کہ معنی کی ایک دنیا ان میں سما جاتی ہے۔ اس فن میں سعدی کے پائے کا کوئی ادیب نہیں پہنچ سکا۔ مثلاً "دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم" یا "از لبستر نہ مش

برخاکسترگرمش نشاند"

(۴) موزوں، متناسب اور ہم آہنگ الفاظ لانے میں سعدی کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ فقرے سُننے سے وہی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جو خوش آہنگ سروں کو سننے سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً " بکوشید تا جامۂ زنان نپوشید" یا " وقتی بہ سلامے برنجند، گاہی بہ دشنامے خلعت دہند۔"

(۵) آپ کے فقرات میں اتنا بے ساختہ پن اور حقیقت طرازی ہے کہ ان میں سے بعض کو ضرب المثل کا درجہ حاصل ہو گیا ہے مثلاً " تونگری دل است نہ بمالی بزرگی بعقل است نہ بسال" یا " ہر کہ بقامت کہتر بقیمت بہتر" یا " دروغ مصلحت آمیز بہ از راستئ فتنہ انگیز"۔ یا " دہ درویش در گلیمے بخسپند و دو بادشاہ در اقلیمے نگنجند"

(۶) سعدی نے نظم کی طرح نثر کے فقرات میں بھی اکثر ناپ تول کا خیال رکھا ہے۔ اور قافیہ بندی بھی کی ہے۔ اس سے فقروں میں شعروں کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ مثلاً " چشمش نگران است کہ ملکش با دگران است"

(۷) نثر میں اس خوبصورتی اور موزونیت سے نظم کا پیوند لگاتے ہیں کہ وہ نثر ہی کا ایک حصہ معلوم ہوتی ہے۔ اس سے مضمون زیادہ مؤثر اور دلچسپ ہو جاتا ہے۔

(۸) عبارت کو آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی سے بھی زینت دی ہے۔ جس سے مضمون میں اور بلندی آگئی ہے۔

سعدی نے گلستان میں متعدد اخلاقی مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ گلستان کا شاید ہی کوئی ایسا صفحہ ہو گا جس میں اخلاقی تربیت کا مؤثر سبق نہ ملتا ہو۔ اس لحاظ سے آپ کا مقام بہت بلند ہے۔ سعدی معلمِ اخلاق تو تھے لیکن ان کے بعض اخلاقی نظریے عام اخلاقی نظریوں سے مختلف نظر آتے ہیں مثلاً:۔

اگر شہ روز را گوید شب است ایں   بباید گفت اینک ماہ و پروین

نکوئی با بداں کردن چناں است　　　که بد کردن بجائے نیک مرداں

یا

دروغ مصلحت آمیز بہ زراستیٔ فتنہ انگیز

یا

زمینِ شور سنبل بر نیارد　　　درو تخمِ عمل ضائع مگرداں

(بدخشانی)

سعدی کے سبک کی تقلید کیا نظم اور کیا نثر میں ایران کے بہت سے شاعروں اور ادیبوں نے کی ہے۔

نظم اور نثر میں کئی رسالے اور کئی کتابیں ان کے سبک کی پیروی میں لکھی گئی ہیں۔ گلستان کی طرز میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں :-

(۱) مجدِ خوافی کی روضۂ خلد (۲) جامی کی بہارستان (۳) معین الدین جوینی کی نگارستان (۴) قاآنی کی پریشان کتابِ گلستان۔ سلاطین ہند اور سلاطینِ عثمانی کے درس میں رہی ہے اور ان ملکوں کے بادشاہ اور شاہزادے اس کے اشعار از بر رکھتے تھے۔ ہمارے زمانے کے اہل علم وادب نے اس کی جو قدر کی ہے اس کا کیا کہنا۔ سعدی کی تصانیف کا ترجمہ دنیا کی تقریباً تمام اہم زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اور ان کا نام ساری دنیا میں جانا پہچانا ہے۔ سعدی نے ۶۵۵ھ میں بوستان نظم کی اور اس کے ایک سال بعد یعنی ۶۵۶ھ میں گلستان تصنیف کی۔ چنانچہ اس کے مقدمہ میں لکھتے ہیں سہ

دراں مدت کہ مارا وقت خوش بود　　　ز ہجرت ششصد و پنجاہ و شش بود

سعدی کا ایک بہت بڑا امتیاز جس میں وہ پیشوا اور بے شبہ بے ہمتا ہیں۔ وہ ان کی شیریں اور رواں نثر ہے۔ جو ہر طرح ان کی نظم کی ہم پہ ہے ان سے پہلے کسی نے ایسی نثر نہ لکھی۔ سعدی کی نثر مسجع ہے اور اس کا سب سے اچھا نمونہ کتاب گلستان ہے۔ جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ایرانی ادبیات کا گلِ سرسبد ہے۔ اس شاہکار تصنیف میں سعدی نے صنعت سجع کی خوب داد دی ہے۔ انہوں نے الفاظ کے حسن انتخاب حسن وزن اور تناسب کو فارسی عبارت میں خوب بٹھایا ہے اور اس طرح اپنے پیشرو مسجع کہنے والوں جیسے شیخ عطار وغیرہ کے دفتر پر گویا خط بطلان کھینچ دیا ہے ان سے پہلے کے لکھنے والے ان کے آگے ماند پڑ گئے ہیں۔ صاحب کلیلہ ودمنہ ابوالمعالی نصر اللہ جیسے نثر مرسل کے استادوں کا اعجاز ان کے آگے باطل ہو کر رہ گیا ہے۔ حالانکہ ان کا سبک خود سعدی نے اپنے پیش نظر رکھا تھا۔ سجع کا لازمہ تصنع ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے ایک بھی مصنوعی اور پُر تصنع جملہ نہ لکھا۔ آب رواں کی طرح رواں، آہنگ جاناں کی طرح جاذب، شیریں گوش نواز اور دلفریب نکلی ہیں۔

سعدی کی وہ نثر جو گلستان میں اپنی بہار دکھا رہی ہے۔ اس کی ایک خوبی عبارت کے ضمن میں موزوں اشعار اور شواہد کا لانا ہے جس سے ان کی بات میں ایک خاص اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ خصوصاً وہاں جہاں قرآنِ کریم سے استشہاد کیا ہے۔ اور آیات بینات کے معنی کو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔

سعدی سے پہلے نثر مسجع کا رواج بہت کم تھا۔ اور اس میں یہ خوبی اور یہ دلکشی تو گویا تھی ہی نہیں۔

گلستان درحقیقت پند و نصیحت اور تہذیب و اخلاق پر لکھی ہوئی کتاب ہے۔ اور اس کی تمام حکایتوں اور مثالوں کا مقصد ادب، تربیت اور تہذیب نفس ہے۔ استاد کا کمال یہ ہے کہ ان حقائق کو طول طویل استدلال اور طولِ

کلام کے بغیر از راہ تمثیل بڑی پیاری اور بڑی میٹھی عبارت میں بیان کر دیا ہے اور حقیقت میں شعر و شاعری کے معنی یہی ہیں۔

گلستان کے لطیف ترین حصے تو وہ ہیں جہاں شائد اپنی روح عرفانی کے ساتھ کبھی فطرت کی درختوں میں سرسرانے والی نسیم کی اور مرغان نوا سنج کی صدا گوش جان سے سنتا ہے اور وہ سب کے سب نہایت ذوق و شوق کے ساتھ وحدت کا نغمہ اور آہنگ تخلیق کا مترنم ترانہ الاپ رہے ہیں۔ ایسے میں خود شاعر پر بھی جذب و مستی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ پرندوں کا چہچہانا اسے صدائے عالم سے عالم آگاہ بنا دیتا ہے۔

پوری کتاب گلستان حسب ذیل آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ (۱) در سیرت بادشاہان (۲) در اخلاق درویشان (۳) در فضیلت قناعت (۴) در فوائد خاموشی (۵) در عشق و جوانی (۶) در ضعف و پیری (۷) در تاثیر صحبت (۸) در آداب صحبت۔ پوری کتاب۔ اجتماعی۔ اخلاقی اور تربیت کے بہترین نکات سے مملو ہے۔ اور یہ بھی ایک بہت بڑی فضیلت ہے کہ اس کتاب کو عالمی ادب میں بلند ترین مقام حاصل ہے۔ کیونکہ اس کی ہر بات میں ایسے عمیق اور سودمند مطالب درج ہیں۔ جن سے ہر شخص اپنی زندگی میں دوچار ہوتا ہے۔ (شفق)

فارسی نظم کی سب سے گراں قدر کتاب شاہنامہ فردوسی ہے۔ اور فارسی نثر کی زیبا ترین کتاب گلستان سعدی ہے۔ یہ دونوں کتابیں خاص و عام کی پسندیدہ ہیں۔ گلستان کے اس قدر زیادہ نسخے شروع زمانے سے نقل کئے گئے بلکہ یوں کہنا چاہیئے۔ کہ شیخ سعدی کے زمانے سے ہی اس کثرت سے رائج ہو گئے تھے کہ ان میں تحریف و تصرف کو راہ مل گئی تھی۔

سعدی کا فارسی زبان کے ان بزرگ ترین شعرا میں شمار ہوتا ہے۔

جو حسنِ بیان، شیرینیٔ عبارت کی وجہ سے ادبی دنیا میں، اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ اس کے اشعار فصاحت اور حسنِ تاثیر کے نقطۂ نظر سے اس درجہ بلند ہیں کہ کسی قادر الکلام شاعر کی وہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ مختصر طور پر یوں کہا جا سکتا ہے۔ کہ کسی کو اس کے کہے ہوئے اشعار پر اضافہ کرنے کی گنجائش نہیں کیونکہ اس نے شاعری کی حد کو صحیح معنی میں آخیر تک پہنچا دیا ہے۔ سعدی بلاشبہ ادبی دنیا کی ایک بہت بڑی قابلِ فخر ہستی ہے۔ اس کا نام نہ صرف ایران میں مشہور ہے۔ بلکہ تمام دنیا میں عظمت و بزرگی سے یاد کیا جاتا ہے۔ سعدی کی شہرت صرف اس کے بعد کے زمانہ تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ وہ اکثر بڑے بڑے شعرا کے برعکس (جو اپنی وفات کے بعد ہی لوگوں کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں) اپنی زندگی میں ہی سب لوگوں سے گوئے سبقت لے گیا تھا۔ اس کے اکثر بزرگ معاصرین نے اس کا نام عظمت سے لیا ہے۔ مغول کا دانشمند وزیر جوینی اپنے رسائل میں سعدی کے اشعار کو بطور مثال پیش کیا کرتا تھا۔ اسی طرح مشہور شاعر مجد ہمگر اور ہمام تبریزی نے اس کے کمال قدرت کا اعتراف کیا ہے۔ اسی طرح وصاف حضرۃ نے اپنی تاریخ مؤلفہ ۶۹۹ھ میں سعدی کا ذکر نہایت بزرگی و احترام سے کیا ہے۔ اور اس کے بعض اشعار کا اس نے عربی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

سعدی کا طرز انشاء جسے سہل ممتنع کہنا چاہیے۔ اس قدر دلکش ہے کہ وہ اپنے زمانے سے ہی دوسرے لوگوں کے لئے تقلید و پیروی کا نمونہ بن چکا تھا۔ چنانچہ ہم جمال الدین کاشی، امیر خسرو دہلوی اور خواجوی کرمانی کو مکتب سعدی کا شاگرد قرار دے سکتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنے اسلوب بیان میں اس استاد کی روش کی پیروی کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے

سعدی نہ صرف نظم میں ایک استاد مسلم ہے بلکہ نثر کے میدان میں بھی وہ ایک ماہر ادیب اور تمام متبحر ہے۔ اس کی نثر اس قدر سحر آفرین ہے کہ جو

نثر ہوتے ہوئے بھی اعلیٰ سے اعلیٰ شعر سے زیادہ دلچسپ اور دلکش ہے۔
اس کی کتاب گلستان ایک ایسے اسلوب پر لکھی گئی ہے۔ کہ متقدمین کی تمام
یادگاروں میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ سعدی کے بعد بھی وہ ہر دور میں
دوسرے ادبا اور مصنفین کے لئے استفادہ کا ماخذ اور تقلید کا نمونہ بنی رہی
ہے۔ مجد خوافی نے ۷۳۳ھ میں اور معین الدین جوینی نے ۷۳۵ھ میں یعنی سعدی
کی وفات کے قریباً چالیس برس بعد گلستان کی تقلید میں اسی روش پر تصنیف
کی کوشش کی ہے۔ اس بنا پر سعدی تالیف گلستان کے موقع یعنی ۶۵۶ھ میں
واقعی یہ کہنے میں حق بجانب تھا کہ " اس کا ذکر جمیل تمام زبانوں پر جاری و ساری
ہے۔ اور اس کی منگوئی کا شہرہ روئے زمین پر پھیل گیا ہے۔ لوگ اس
کے نیشکر کلام کو بڑے مزے سے چوستے ہیں اور اس کی انشاء کے کاغذات
کو ہنڈی یا چیک کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے ہیں۔"

اس میں کچھ شک نہیں کہ سعدی اگر اپنے شاندار اشعار میں سے کوئی چیز بطور
یادگار کے باقی نہ چھوڑتا تو بھی اس کی کتاب گلستان اس کی ضمانت کے
لئے کافی تھی کہ تمام دنیا میں اس کا نام مشہور ہو جائے اور تمام اہلِ دنیا کو اس
کے ادبی مقام کی عظمت کا قائل کرادے۔

سعدی نے گلستان کو ۶۵۶ھ میں سعد بن ابی بکر بن سعد بن زنگی کے لئے
لکھا تھا۔ یہ کتاب اسی زمانے سے ہی ادبائے جہاں کی توجہ کا مرکز بنی رہی
ہے۔ اور ایران کے تمام مدارس میں نصاب کا ایک حصہ چلی آتی رہی ہے
یہاں تک کہ اس کے ہزاروں قلمی نسخے اطراف واکنافِ ملک میں رائج ہو گئے
بالخصوص آج سے دو سو سال پیشتر کہ جب ایران میں طباعت کا رواج شروع
ہوا۔ اس کتاب کی اشاعت پہلے سے ہزار ہا گنا زیادہ ہو گئی۔ اور گلستان
سعدی کے سینکڑوں ایڈیشن مختلف تقطیعوں پر تیار کئے گئے اور اس طرح
یہ کتاب ہر کہ وکہ کے ہاتھوں تک جا پہنچی اس بناء پر یہ دعوےٰ سے کہا جاسکتا

ہے کہ ایران میں شائد ہی کوئی ایسا شخص ہوگا۔ جو اس بزرگوار کے نام سے نا آشنا ہو اور جس نے اس کی کتاب گلستان کو نہ دیکھا ہو۔ (مؤلف)

سعدی ملک سخن کا ایک تسلیم شدہ حکمران ہے۔ اسے تمام دوسرے ادبا کی نسبت قوت بیان پر پورا تسلط حاصل ہے۔ کلام اس کے ہاتھوں میں موم کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ہر معنیٰ کو ایسی عبارت میں ادا کرتا ہے کہ اس سے بہتر، خوبصورت اور مختصر عبارت میں اسے ادا کرنا ناممکن ہوتا ہے اس کا کلام حشو و زوائد سے بالکل پاک ہوتا ہے اور دوسرے سخن گو اشخاص کے لئے سرمشق کا کام دیتا ہے۔ ایرانی شعراء چونکہ ذوق شعر سے سرشار تھے اس لئے انہوں نے طرز شعر گوئی کو انتہائی آراستگی کے درجہ تک پہنچا دیا تھا۔ شیخ سعدی نے اس طرز کو نہ صرف نظم بلکہ نثر میں بھی استعمال کیا۔ چنانچہ اس کی نثر شعر کا مزہ اور اس کی نظم نثر کی روانی رکھتی ہے۔ یہ سعدی ہی کے وجود کی برکت ہے۔ کہ فارسی میں نظم و نثر دونوں کی زبان الگ الگ نہیں رہی۔ بلکہ ایک ہی ہو گئی ہے۔

بعض اہلِ ذوق تعجب کرتے ہیں کہ سعدی نے آج سے سات سو برس پیشتر ہماری امروزہ زبان استعمال کی ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ سعدی نے سات سو سال قبل ہماری مروجہ زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ ہم نے سات سو سال بعد آج اس زبان کو اپنایا ہے۔ جو ہم نے سعدی سے اخذ کی ہے۔ بالفاظِ دیگر سعدی نے نثر فارسی کے اسلوب کو اس قدر دلکش صورت میں پیش کیا ہے۔ کہ اس کی مستعمل زبان آج ہماری مروجہ زبان بن گئی ہے۔ کاش ایرانی اس نعمت کی قدر جانیں اور اسلوب بیان کے سلسلے میں شیخ سعدی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ کیونکہ اس کے اپنے قول کے مطابق اعلیٰ درجہ کی سخن گوئی کی آخری حد یہی ہے۔ ہمیں ایران کے بعض بڑے بڑے

اچھے انشا پردازوں مثلاً میرزا ابوالقاسم قائم مقام وغیرہ کا علم ہے ۔ جنہوں نے اعتراف کیا ہے ۔ کہ انشا پردازی کے سلسلے ہیں ان کا تمام تر سرمایہ سعدی سے حاصل کیا گیا ہے ۔

گلستان نثر فارسی کی زیبا ترین کتاب ہے ۔ اور غالباً یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ تمام ادبیاتِ عالم میں بے نظیر ہے ۔ اس میں ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں ۔ جو کسی دوسری کتاب کے اندر دیکھنے میں نہیں آتیں ۔ یہ نثر کا ایک ایسا مجموعہ ہے ۔ جس میں شعر کی آمیزش موجود ہے ۔ مصنف نے ہر جملہ یا مطلب کی وضاحت و تائید کے لئے ایک یا زیادہ فارسی اور بعض اوقات عربی اشعار کو بطور استشہاد پیش کیا ہے ۔ جو اصل معنیٰ کو زیادہ دلنشین اور مکمل بنا دیتے ہیں ۔ اور ان کی مدد سے مطلب کے سمجھنے میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے ۔ یہ اشعار جیسا کہ اس نے کتاب کے آخر میں اشارہ کر دیا ہے ۔ سب کے سب اس کے اپنے ہیں ۔ اور کسی سے عاریت نہیں لئے گئے ۔ کتاب کی نثر اور اس کے اشعار دونوں چیزیں اس درجہ کو پہنچی ہوئی ہیں ۔ کہ اس سے زیادہ بہتر صورت میں ان کا اظہار متصور نہیں ہو سکتا ۔ اس کی نثر فصاحت و بلاغت ، سلاست ۔ ایجاز ، متانت ۔ استحکام ، ظرافت کے علاوہ شاعری کے تمام لوازمِ آرائش کو بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے ۔ کیونکہ اگرچہ یہ نثر زیادہ تر مقفیٰ و مسجع ہے ۔ لیکن انتہائی درجہ سلیس اور طبعی ہے ۔ تکلف اور تصنع کا شائبہ تک موجود نہیں ۔ کسی ایک جگہ بھی لفظ کی خاطر معنیٰ کا خون نہیں کیا گیا اور نہ ہی کسی جگہ معنیٰ سے زائد الفاظ کی بھرتی کی گئی ہے ۔ مصنف کے دل میں جو خیال گزرتا ہے وہ اسے بغیر کسی کمی بیشی کے مکمل طور پہ بہترین طریقے سے عبارت میں ادا کر دیتا ہے ۔ وہ اپنے مطلب کو اس طرح ادا کرتا ہے ۔ کہ دل پوری طرح مطمئن ہو جاتا ہے ۔ اس کے تمام دعاوی دلائل و براہین کی تاثیر رکھتے ہیں ۔ اور ساتھ ہی طبیعت کے لئے بہجت و

مسرت کا باعث بنتے ہیں۔ اس کا کلام سجع۔ قافیہ۔ تشبیہہ۔ کنایہ۔ استعارہ تجنیس۔ مراعات النظیر وغیرہ صنائع سے مزین ہے۔ لیکن کسی طرح بھی ان صنائع کے استعمال میں اِفراط و اسراف سے کام نہیں لیا گیا۔ حالانکہ لبعض نثر نویس عموماً جا و بے جا بغیر کسی مناسبت کے خواہ مخواہ اپنی عبارات کو صنائع و بدائع سے آراستہ کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ الفاظ کی کثرت اور معنیٰ کی قلت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ان کا کلام کم مغز۔ سُست بندش۔ ملال انگیز۔ مغلق اور پُر از تعقید ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہمیں بعض ایسے مصنّفین کا علم ہے۔ جن کی دس سطر عبارت میں اصل معنیٰ صرف ایک سطر بھی نہیں ہوتے۔ لیکن سعدی نے لطائفِ سخن کو اس طرح استعمال کیا ہے۔ کہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس خاص مفہوم کے ادا کرنے کے لیے منتخب شدہ لفظ کے سوا کوئی دوسرا لفظ ہے ہی نہیں۔ اس کی اکثر عبارات چھوٹے چھوٹے کلمات پر مشتمل ہیں اور اس کے اشعار مشہور ضرب المثل ہیں۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ سعدی نے مختصر ترین اور دلکش ترین عبارات میں پُر مغز ترین معانی کو ادا کیا ہے۔ ایجاز کے مقامات پر بعض اوقات اس کی انشا پردازی اعجاز کی حد تک جا پہنچی ہے۔ اس نے اختصارِ لفظی کو اس قدر زیادہ پیشِ نظر رکھا ہے۔ کہ اگر اس کی بعض عبارات میں غور و فکر سے کام لیا جائے۔ تو وہ حسبِ قواعد ناقص نظر آتی ہیں۔ مگر مصنّف نے انہیں اس قدر محکم اور دلپذیر پیرائے میں ادا کیا ہے کہ ذہن ان کے اس نقص کی طرف منتقل ہی نہیں ہوتا۔

ہمارا دعویٰ ہے۔ کہ سعدی کے کلام کی تعریف کماحقہٗ الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتی۔ اس کی خوبی کو سمجھنا ذوق اور وجدان کا کام ہے۔ سعدی کا حسنِ عبارت ہمیں حسن تعجب میں ڈالتا ہے۔ اس کے معنیٰ کی لطافت اگر اس

سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں اور ہم پورے وثوق سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ان چند لکھنے والوں میں سے ہے۔ جو کسی صورت میں بھی لفاظی اور اظہارِ فضیلت کو اپنا مطمحِ نظر نہیں بناتے۔ اس نے جو کچھ بھی لکھا ہے اپنے دلی جذبات اور افکار کی ترجمانی کی ہے۔ گلستان و بوستان دونوں حکمتِ عملی کا ایک مکمل نصاب پیش کرتی ہیں۔ سعدی نے علمِ سیاست و اخلاق اور تدبیرِ منزل کا عطر نکال کر دلکش ترین عبارات کے ذریعہ ان دونوں کتابوں میں بھر دیا ہے۔ باوجودیکہ اس کی عبارات انتہائی درجہ متین اور شُستہ ہیں۔ لیکن مزاح و ظرافت سے خالی نہیں ہیں۔ چنانچہ وہ خود کہتا ہے کہ مَیں نے نصیحت کی کڑوی دوائی شہدِ ظرافت کے ساتھ عطا دی ہے۔ تاکہ طبیعت ملال زدہ ہو کر اس نصیحت کے قبول کرنے سے محروم نہ رہ جائے۔ انصاف تو یہ ہے کہ اگر گلستان اور بوستان کو باذوق شخص بار بار بھی پڑھے۔ تو بھی اس کی طبیعت میں ملال پیدا نہیں ہوتا۔ سعدی کی طرح کسی شخص نے بھی بادشاہوں۔ امیروں۔ وزیروں اور دوسرے صاحبِ اقتدار اشخاص کو حسنِ سیاست۔ دادگری اور رعیت پروری کی دعوت نہیں دی۔ اس کے علاوہ وہ ہر طبقہ کے افراد مثلاً امیروں۔ وزیروں۔ فوجیوں۔ حاکموں۔ محکوموں۔ طاقتوروں۔ کمزوروں۔ درویشوں۔ توانگروں۔ زاہدوں دینداروں۔ عارفوں۔ تاجروں۔ مزدوروں۔ عاشقوں۔ رندوں۔ مستوں۔ آخرت پرستوں اور دُنیا داروں کو ان کے فرائض منصبی سے آگاہ کرتا ہے۔ اور اس سلسلے میں اُنہیں تمام مصالح و مفاسد سے مطلع کرتا ہے۔

سعدی کی ایک تعجب خیز خصوصیّت اس کی حق گوئی اور دلیری ہے منگول حکمران اور ان کے مقرر کردہ جابر حکام طاقت و حکومت کے نشہ کے باعث خود غرضی اور ہوس رانی کے سوا کسی دوسری چیز سے آشنا نہ تھے۔ کوئی چیز انہیں نفسانی خواہشات کی تکمیل سے باز نہ

رکھ سکتی تھی۔ لیکن شیخ سعدی جیسا ایک فقیر گوشہ نشین تمام حقائق کو اس طرح نظم و نثر میں واضح طور پر واشگاف الفاظ میں ادا کرتا ہے۔ کہ کسی دور میں کسی شخص نے بھی اس قدر صراحت سے کام نہیں لیا۔ اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ اس نے صرف دنیا ہی کے صاحبِ اقتدار لوگوں کو اپنا موضوعِ سخن نہیں بنایا بلکہ وہ ریاکار زاہدوں اور عابدوں اور ظالم قاضیوں اور دنیا دار صوفیوں کے حالات بیان کرنے کے علاوہ اس عبادت و ریاضت کو لغو کہنے سے بھی نہیں۔ چوکتا جو صدق وصفا سے خالی ہو۔ اور جس میں مخلوق کی بھلائی نہ پائی جاتی ہو۔ وہ ہر طبقہ کے لوگوں کی طبیعت ان کے افکار و احوال اور ان کے باطنی جذبات کے سمجھنے میں کامل بصیرت کا مالک ہے۔ وہ زمانہ کے نشیب و فراز اور دنیاوی معاملات کے بارے میں بمقدر نکتہ سنج اور دقیقہ رس ہے اور اس کی رائے اس قدر مبنی بر صداقت ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دفعہ زندگی گزارنے کے بعد دوبارہ دنیا میں آگیا ہے۔ اور اپنی پہلی زندگی میں جو تجربات اس نے حاصل کئے تھے۔ انہیں اس دوسری زندگی میں کام میں لا رہا ہے۔ اور ان سے استفادہ کر دیا ہے۔

شیخ سعدی نے بھی اپنے زمانہ کے امرا کی مدح کی ہے۔ لیکن اس کی مدح گذشتہ مداحین سے بالکل مختلف ہے۔ وہ نہ خوشامد کرتا ہے۔ اور نہ مبالغہ سے کام لیتا ہے۔ بلکہ اس کا تمام کلام وعظ و نصیحت پر مشتمل ہوتا ہے۔ وہ خوشامد کرنے والوں اور بیہودہ اور جھوٹی تعریف کرنے والوں کو ڈانٹتا ہے۔ اور اپنے ممدوحین کو فقرا۔ ضعفا کے ساتھ داد و دہش۔ مہربانی اور دلجوئی کے ساتھ پیش آنے اور خوفِ خدا رکھنے۔ توشۂ آخرت تیار کرنے اور نامِ نیک باقی چھوڑنے کی ترغیب و تحریص دلاتا ہے۔

سعدی انتہائی دیندار۔ پابندِ مذہب بلکہ سخت متعصب انسان ہے لیکن

بایں ہمہ اس نے کسی جگہ بھی اپنے تعصب و تدین کو مخالفانِ دین و مذہب کی دل آزاری کے لئے آلۂ کار نہیں بنایا۔ وہ اُنہیں برا بھلا نہیں کہتا بلکہ ان کے لئے سراپا مہر و محبت کا پیکر ہے۔ وہ خویش و بیگانہ اور دوست و دشمن سب کے ساتھ شفقت۔ انصاف اور مروّت کا سلوک روا رکھتا ہے۔ وہ فی الحقیقت انسان دوست اور انسانیت پرست انسان ہے۔ اسے اپنے بنی نوع سے انتہا درجہ ہمدردی ہے۔ مردم آزار اور ظالم اشخاص کے سوا وہ سب پر مہربان ہے۔ یہاں تک کہ وہ بدی کی سزا بھی نیکی سے دینے کا قائل ہے۔ اس کی رقت اور دلسوزی کا دائرہ انسانوں کے علاوہ حیوانوں اور جانوروں تک وسیع ہے۔ دین کے اصول و فروع پر انتہائی درجہ پابند ہونے کے باوجود وہ زہد خشک اور آراستگیٔ صورت کو چنداں اہمیت نہیں دیتا۔ بلکہ کہتا ہے کہ ظاہر صورت چاہے کوئی ہو اصل چیز معنی اور حقیقت ہیں۔

سعدی کے مندرجہ بالا فضائل اگر ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیئے جائیں اور دوسرے پلڑے میں اس کی حمایتِ عشق کا جذبہ رکھا جائے۔ تو دونوں پلڑے ہمیں برابر نظر آئیں گے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ کہ سعدی کے وجود کو عشق و محبت میں گوندھ کر تیار کیا گیا تھا۔ وہ تمام مطالب کو بہترین طریقے سے ادا کرتا ہے۔ لیکن جب عشق و محبت کے بیان پر آتا ہے۔ تو وہ ایک شور برپا کر دیتا ہے۔ عالمِ عشق کے رموز و اسرار سے جس طرح وہ آگاہ ہے۔ اور جس طرح اس نے انہیں ادا کیا ہے۔ کسی دوسرے سے بن نہیں پڑا۔ سعدی کا عشق ہوا و ہوس اور کھیل کود نہیں بلکہ نہایت سنجیدہ معاملہ ہے۔ اس کا عشق انتہائی پاکیزہ اور کامل ہے۔ وہ اپنے معشوق کی خاطر قربان ہونے کے لئے تیار ہے۔ اس کے عشق کا آغاز مخلوق سے ہوتا ہے۔ لیکن آخر کار خالق سے جا ملتا ہے۔ اسی لئے وہ کہتا ہے۔ کہ عشق کا آغاز تو ہے لیکن انجام نہیں۔ اگرچہ گلستان اور بوستان میں بھی اس نے اس موضوع پر

پر بہت کچھ لکھا ہے مگر غزلیات میں تو اس نے اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ لیکن یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ چونکہ وہ حد درجہ عشق سے سرشار تھا اس لئے اس کے احساسات نہایت لطیف ہیں۔ حسن و خوبی خواہ ظاہری ہو یا باطنی وہ اسے شدت سے محسوس کرتا اور دوست رکھتا ہے۔ اس کی رقت قلب اور مہربانی کی اصل وجہ یہی ہے۔

مختصر یہ کہ فردوسی، مولوی اور حافظ کی طرح سعدی بھی متمدن انسان کا ایک کامل نمونہ ہے۔ جس کی رفتار و گفتار ہر شخص کے لئے راہنمائی کا کام دے سکتی ہے۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ گلستان کے اشعار سعدی نے کسی سے عاریت نہیں لئے اسی طرح اس میں بیان شدہ حکایات بھی اس کی اپنی وضع کردہ ہیں جن کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا۔ یہی بات بوستان کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔

ایک قابل غور بات یہ ہے کہ ہمارے اسلاف چونکہ گلستان کو بہت دلکش کتاب سمجھتے تھے اس لئے وہ اپنے بچوں کے ہاتھ میں اسے پڑھنے کے لئے دے دیتے تھے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا۔ کہ ہر ایرانی بچہ سب سے پہلے یہی کتاب پڑھا کرتا تھا۔ یہ طریق کار اگرچہ بچے کے ذہن کو پسندیدہ الفاظ و معانی کے ساتھ مانوس کرنے کے لئے بہت سودمند ثابت ہو سکتا ہے لیکن اس کا ایک بڑا نقصان بھی ہوا اور وہ یہ کہ گلستان صرف بچوں کی کتاب بن کر رہ گئی اور چونکہ ہر شخص اسے آغاز عمر میں پڑھ لیتا اس لئے آئندہ زندگی میں اس کے مطالعہ سے اپنے آپ کو بے نیاز تصور کرتا تھا۔ حالانکہ از روئے انصاف یہ کتاب بچوں کے لئے نہیں اور نہ ہی شیخ نے اسے ان کی تصنیف کیا تھا۔ کیونکہ جو فائدہ اس سے اخذ کیا جا سکتا ہے وہ بچوں کو میسر نہیں آسکتا اس لئے ہماری نصیحت یہ ہے کہ گلستان کو بچوں کے ہاتھ میں نہ دینا چاہیے ہاں البتہ اس کے بعض قطعات ایسے ہیں جو دوسرے مصنفین کے قطعات

کی طرح سکول کے بچوں کے لئے جزو نصاب قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ اور درس و تدریس اعلےٰ درجہ کے مدارس اور منتہی درجہ کے طالب علموں کے لئے مخصوص ہونا چاہیے تاکہ وہ نوجوان اس کی لفظی خوبیوں کو سمجھ سکیں اور اس کے معنیٰ سے استفادہ کر کے سبق حاصل کر سکیں۔

ایک اور آخری نصیحت جو شیخ شیراز کے کلام کے سلسلے میں اپنے اہلِ وطن کو کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ سعدی کے کلام کو انشا پردازی کا ایک نمونہ سمجھنا چاہیئے۔ مگر اس کی تقلید نہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ وہ ناقابلِ تقلید ہے اور جس شخص نے اس کی تقلید کی کوشش کی ہے اس نے شکست کھائی ہے ہر انشا پرداز کو چاہیے کہ وہ اپنی ہی روش پر چلے البتہ سعدی سے انشاء پردازی کا سیقہ سیکھے ورنہ کوّے اور ہنس کی مثال پیش آئے گی۔

مقدمہ گلستان (مطبوعہ وزارت فرہنگ ایران)

---

(۲۹) اخلاقِ ناصری

اخلاق ناصری اصولِ اخلاق یا حکمت عملی پر لکھی گئی ہے۔ اس کا مصنف مشہور حکیم نصیر الدین طوسی ہے۔ طوسی نے یہ کتاب قہستان میں اسماعیلیوں کے حاکم ناصر الدین عبد الرحیم ابن ابی منصور کی فرمائش پر لکھی ہے۔ اصل میں یہ کتاب ابن مسکویہ کی اخلاقی کتاب "طہارۃ الاعراق فی تہذیب الاخلاق" کا ترجمہ اور خلاصہ ہے اور طوسی نے اپنی طرف سے بھی اس میں بعض مطالب کا اضافہ کیا ہے۔ یہ کتاب ۶۳۳ھ کے لگ بھگ تصنیف ہوئی ہے۔ بشفق،

ابو جعفر نصیر الدین نام اور وطن طوس تھا۔ خواجہ نصیر الدین کا شمار ایران کے ان بزرگوں میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے حملہ مغول کے بعد ۔۔۔ ہے ایرانی

تمدن کو بچانے کے لئے قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں۔ آپ علوم دین حکمت اور ریاضی و نجوم کے متبحر عالم تھے۔ حملہ مغول سے کچھ عرصہ پہلے اسماعیلیوں کی قید میں رہے۔ ہلاکو نے جب قلعہ الموت فتح کیا تو آخر انہیں رہائی ملی۔ ہلاکو نے ان کے علم و فضل کا حال سنا تو انہیں اپنے مقربین میں شامل کر لیا۔ آپ نے ہلاکو کے حکم سے دارالسلطنت مراغہ میں ایک عظیم الشان رصد خانہ بنوایا اور ایلخان (لقب ہلاکو) کے نام کی مناسبت سے "زیج ایلخانی" تیار کی۔ کہا جاتا ہے۔ نصیر الدین طوسی ساٹھ کتابوں کے مصنف ہیں ان میں سے بیشتر عربی زبان میں ہیں۔

اخلاقیات کے موضوع پر یہ نصیر الدین طوسی کی مشہور و معروف تالیف ہے جو ناصر الدین عبدالرحیم بن ابی منصور حاکم قہستان کی فرمائش پر عربی سے فارسی میں ترجمہ کی گئی تھی۔ اصل کتاب کا نام طہارۃ الاعراق فی تہذیب الاخلاق ہے جو ابن مسکویہ کی تصنیف ہے نصیر الدین طوسی نے محض ترجمہ کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بعض مسائل خود لکھ کر بھی اس میں اضافہ کئے ہیں اخلاق ناصری حکمت عملی اور اخلاق سے متعلق ہے۔ اس کا سال تالیف ۶۳۳ھ ہے۔ (بدخشانی)

علمائے اسلام نے فارسی یا عربی میں جو کتبِ اخلاق تالیف کی ہیں۔ ان کی دو قسمیں ہیں۔ اول اخلاق عملی ایسی کتابوں میں مؤلفین نیک بد صفات اور پسندیدہ و مکروہ اخلاق کی علیحدہ علیحدہ طبقہ بندی کرتے ہیں اور ہر موضوع کے تحت وعظ و نصیحت اور سود مند نصائح درج کرتے ہیں جن کا ماخذ مذہبی کتابیں۔ بزرگوں کے کلمات۔ حکایات اور تاریخی روایات یا فرضی داستانیں ہوتی ہیں۔ فارسی زبان میں اس قسم کی کتابوں کا بہترین نمونہ کیمیائے سعادت اور عربی میں احیاء العلوم ہیں۔ یہ دونوں کتابیں امام محمد غزالی (۴۵۰ھ تا ۵۰۵ھ)

کی تصنیف ہیں۔ اس قسم کی کتابوں میں اخلاقی مذہبی اور عرفانی مطالب کا خلط ملط کر دیا گیا ہے دوسری قسم کی اخلاقی کتابیں فلسفہ و حکمت عملی کے نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں اس قسم کی کتابوں میں مؤلفین انسانی عادات و آداب اور فضائل و رذائل اخلاق پر فلسفہ اور علت و معلول کی روشنی میں بحث کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان میں ہر خلق کے وجود میں آنے کی علت اور ہر صفت کے ازالہ کا طریقہ بیان کیا جاتا ہے۔ فارسی زبان میں اس قسم کی بہترین اور اعلیٰ ترین کتابوں میں اخلاق ناصری کا شمار ہوتا ہے جو خواجہ نصیر الدین کی تالیف ہے اور عربی میں ابو علی مسکویہ کی کتاب کتاب الطہارۃ۔ اس قسم کی کتابوں میں انسانی صفات و اخلاق و عادات کو بالکل مباحث طبی کی طرح زیر بحث لایا جاتا ہے۔ جس طرح طب جسمانی میں حفظ صحت کے طریقوں۔ مرض کی تشخیص اور علامات اور طرز معالجہ پر بحث کی جاتی ہے۔ اسی طرح حکمت عملی اور اخلاق فلسفی میں مطالب اخلاقی تحقیق کا موضوع قرار پاتے ہیں اسی بنا پر فن اخلاق کو طب روحانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

خواجہ نصیر الدین نے اخلاق ناصری کو ۶۳۳ھ کے لگ بھگ تالیف کیا۔ ان دنوں . . میں وہ قہستان میں مقیم تھا۔ اس نے یہ کتاب وہاں کے حاکم ناصر الدین ابو الفتح عبدالرحیم بن ابی منصور کے نام معنون کی۔ اس کی تالیف کے سلسلے میں اس کا عمدہ مآخذ "الطہارۃ وتہذیب الاخلاق" ہے جو عام طور پر کتاب "الطہارۃ وتہذیب الاخلاق" کہلاتی ہے ابو علی مسکویہ کی بہترین یادگاروں میں شمار ہوتی ہے۔ خواجہ نصیر الدین نے تمام کتاب الطہارۃ کو عربی سے فارسی میں نقل کر دیا ہے۔ البتہ اس نے مطالب کی تقدیم و تاخیر اور حذف و اضافے سے بھی اپنی کتاب میں کام لیا ہے۔ حکمت عملی کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے (۱) تہذیب اخلاق (آرائش خوی) (۲) تدبیر منزل (خانہ داری) (۳) سیاست مدن (کشورداری)۔ ابو علی کی کتاب ان تینوں میں

سے ہے صرف تہذیب الاخلاق پر منحصر ہے۔ چونکہ خواجہ نصیر الدین حکمت عملی کی ان تینوں اقسام کو اپنی کتاب اخلاق ناصری میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اسے بعض دیگر حکما کی کتابوں سے بھی استفادہ کرنا پڑا۔ چنانچہ تدبیر منزل کے حصہ کے لئے اس کا بہترین ماخذ شیخ بوعلی سینا کا رسالہ "تدبیر منزل" ہے اور کتاب کے حصہ سیاست۔ مدن کے لئے معلم ثانی ابونصر فارابی کی السیاستہ المدنیتہ اور بعض دیگر رسائل ہیں۔

یہ جو کچھ مذکور ہوا سب خواجہ نصیر الدین نے خود ہی کتاب کے مقدمہ اور باقی حصہ متن میں وضاحت سے بیان کر دیا ہے۔ اس نے اپنے بعض دیگر ماخذوں مثلاً آداب ابن المقفع اور افلاطون، ارسطو، یعقوب کندی کے رسائل وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

ہم نے اخلاق ناصری کا سن تالیف ۶۳۳ھ قرار دیا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ مؤلف نے مقالہ دوم کی اس فصل میں جو والدین کے حقوق سے متعلق ہے خود لکھا ہے کہ "۶۶۳ھ میں جبکہ اس کتاب کو لکھے ہوئے تیس سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ ایک بہت بزرگ اور عالم شخص اس علاقے میں آیا اور اس نے اس کتاب کو شرف مطالعہ بخش کر فرمایا کہ اس کتاب کے بیان کردہ فضائل میں ایک بہت بڑی فضیلت (یعنی حقوق والدین کی رعایت) کا ذکر موجود نہیں۔ میں نے اگرچہ اشارتاً اور کنایتہ اس فضیلت کا ذکر کتاب میں کئی جگہ کر دیا تھا۔ لیکن چونکہ معترض کی تنقید اپنی جگہ درست تھی اس لئے اس بارے میں چند سطریں مقالہ دوم کی چوتھی فصل میں اضافہ کر دیں جو اولاد کی سیاست و تدبیر سے تعلق رکھتی ہے۔"

مؤلف کتاب کے سبب تالیف کے بارے میں خود ہی مقدمہ کتاب

رقمطراز ہے "جن دنوں میں قہستان کے حاکم ناصر الدین ابوالفتح عبدالرحیم بن ابی منصور کے پاس تھا تو ایک دفعہ اس کی مجلس میں حکیم ابوعلی مسکویہ کی کتاب الطہارۃ کا ذکر چھڑ گیا۔ جو اس نے تہذیب اخلاق کے متعلق لکھی ہے اس کا طرز تحریر نہایت

بلیغ اور عبارت بہت فصیح ہے۔ حاکم موصوف نے مجھے حکم دیا کہ اس نفس کتاب کو عربی سے فارسی زبان میں نقل کر کے اس کے مطالب کی تجدید کرنی چاہیے۔ میں نے حکم کی تعمیل کی لیکن جب یہ دیکھا کہ کتاب حکمت عملی کی دو اقسام یعنی حکمت مدنی اور حکمت منزل سے خالی ہے تو خیال کیا کہ کتاب کا صرف فارسی ترجمہ ہی کر دینا کافی نہ ہوگا بلکہ حکمت کی تمام اقسام کی شرح بھی حسب استطاعت کرنی چاہیے میں نے اس خیال کا تذکرہ حاکم موصوف کے سامنے کیا۔ اس نے اسے پسند کیا۔ چنانچہ کتاب کو اسی نہج پر لکھا گیا ہے۔ کتاب کا وہ مضمون جو حکمت خلق پر مشتمل ہے اسے ابو علی مسکویہ کی کتاب کا خلاصہ سمجھنا چاہیے اور دوسری دو قسموں کا مواد دیگر حکما کے اقوال و آرا سے جمع کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں مؤلف نے نقد و تحقیق کا اپنا مخصوص طریق ترک کر دیا ہے اور صرف اپنے سے پہلے حکما کے مطالب کو نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے اس لئے اگر کسی موضوع کے اصل مطالب پر اعتراض وارد ہوتا ہے تو اس میں خواجہ کا کوئی ذمہ نہیں کیونکہ اس نے وضاحت سے لکھ دیا ہے کہ حکمت عملی کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا جائے گا۔ وہ سب حکمائے متقدمین و متاخرین کی روایت اور ان کی نقل و حکایت کے مطابق ہوگا۔ اور اس میں حق کی تحقیق اور باطل کا ابطال نہیں کیا جائے گا۔

اخلاق ناصری فارسی کی نہایت گرانما یہ کتاب ہے جو علم اخلاق اور حکمت عملی کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ خواجہ نصیر الدین نے اس میں وہ تمام بڑے بڑے مسائل اور مباحث جمع کر دیئے ہیں جو اس علم کی تینوں قسموں یعنی تہذیب اخلاق تدبیر منزل سیاست مدن کے متعلق بڑے بڑے حکما نے اپنی تالیفات میں بیان کئے ہیں۔ کتاب کے شروع حصے میں تمام مسائل کو نہایت اچھے اور بہتر طریقے پر بیان کر دیا گیا ہے۔ جن کی ضرورت فلسفہ مشرق کے مطالب کے سمجھنے میں پیش آتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ کتاب بے کم و کاست فارسی طلبا کی درسی نصاب میں شامل ہونے کے لائق ہے۔

اخلاق ناصری ایک مقدمہ۔ ایک خاتمہ اور تین مقالوں پر حاوی ہے۔ پہلا مقالہ تہذیب اخلاق۔ دوسرا تدبیر منزل اور سیاست مدن کے بارے میں ہے پھر ہر مقالہ آگے چند فصلوں پر مشتمل ہے۔ چنانچہ پہلا مقالہ جس کے دو حصے ہیں بالترتیب سات اور دس یعنی کل سترہ فصلوں پر مشتمل ہے اسی طرح ۔ دوسرا مقالہ چھ فصلوں اور تیسرا آٹھ فصلوں پر۔

فارسی نثر کے نادیہ نگاہ سے عموماً نثر فارسی کی کتابوں کو کل چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے کیونکہ نثر یا مرسل ہوتی ہے یا مسجع اور پھر ان دونوں قسموں میں سے ہر ایک یا آسان ہوتی ہے یا دشوار۔ اخلاق ناصری ان چاروں میں سے نثر فارسی مرسل دشوار سے تعلق رکھتی ہے۔ دشوار اس لئے کہ ایک تو اس میں عربی لغات اور اصطلاحات کے استعمال کے علاوہ لمبے لمبے جملے پائے جاتے ہیں۔ دوسرے اس لئے کہ اس کے بعض اصل مطالب جو فلسفہ شرق سے تعلق رکھتے ہیں اس قدر پیچیدہ ہیں کہ جو لوگ اس علم سے بے بہرہ ہیں انہیں ان کے سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ بہر حال یہ کتاب فارسی زبان کی اہم ترین کتب میں سے ہے اور جو شخص بھی فارسی قدیم کی یادگاروں سے تعلق رکھتا ہے وہ اسے نظر انداز نہیں کر سکتا بلکہ اس کی نگاہداری اس کے ذمہ واجب اور لازم ہے۔

(جلال ہمائی)

---

(۳۰) مطلع السعدین

یہ تاریخ عبدالرزاق سمرقندی کی تانیف ہے اس میں ابو سعید ایلخانی سے لے کر ابو سعید تیموری تک (یعنی ؁ سے ؁) کے حالات درج ہیں۔ مطلع السعدین سادہ اور رواں نثر میں لکھی گئی ہے۔ اس کا پہلا حصہ مولوی محمد شفیع نے ایڈٹ کر کے طبع کرایا ہے۔ (بدخشانی)

عبدالرزاق سمرقندی کی تاریخ مطلع السعدین قابل ذکر ہے اس میں سلطان ابوسعید ابوسعید تیموری کی ولادت یعنی ۸۳۰ھ سے لے کر ۸۷۵ھ تک درمیانی سالوں کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

(شفق)

کمال الدین عبدالرزاق کی تاریخ "مطلع السعدین" بھی اس عہد (یعنی تیمور کی وفات سے سلاطین صفویہ کے طلوع تک) کی تاریخی اطلاعات کا ایک گراں قدر خزانہ ہے۔ یہ کتاب مخصوصاً "دو مبارک ستاروں" کے زمانۂ حکومت پر وقف ہے ان سے مراد دونوں ابوسعید ہیں۔ ایک تو مغول ایلخانی جس کا عہد سلطنت (۷۱۶ھ تا ۷۳۶ھ) ہے دوسرا تیموری ابوسعید۔ مطلع السعدین کی تکمیل ۸۷۵ھ میں یعنی ابوسعید کی وفات کے صرف دو سال بعد ہوئی۔

(براؤن)

عبدالرزاق ۸۱۶ھ میں گو ہرات میں پیدا ہوا لیکن سمرقندی کہلاتا ہے کیونکہ سمرقند اس کے والد مولانا جلال الدین اسحاق کا پیدائشی مقام تھا عبدالرزاق نے ۸۸۷ھ میں ہرات میں انتقال کیا۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے عبدالرزاق نے پائے کی چیز صرف ایک لکھی یعنی وہ تاریخ جس کا عنوان مطلع السعدین ہے یہ دو جلدوں میں ہے اور اس میں ۱۷۰ سال کی تاریخ ہے یعنی ایران کے آخری مغول سلطان ابوسعید کی ولادت ۷۰۴ھ سے اس کے ہمنام تیمور کے پڑپوتے کی وفات تک کی (ابوسعید تیموری کو اوزون حسن نے ۸۷۳ھ میں گرفتار کر کے قتل کرا دیا تھا) یہ تاریخ اسی واقعہ کے ایک دو سال بعد یعنی ۸۷۵ھ تک چلتی ہے، قیاساً سعدین سے مراد یہی دو ابوسعید ہیں۔

مطلع السعدین کے قلمی نسخے گو بہت عام نہیں ہیں لیکن اکثر بڑے بڑے کتب خانوں میں مل جاتے ہیں۔ اور جہاں تک ہم نے دیکھا ہے عموماً صحت اور عمدگی کے اعتبار سے اوسط درجے کے نسخوں سے برتر ہیں۔ یہ تصنیف کو قابل

لحاظ حد تک حافظ ابرو کی زبدۃ التواریخ پر مبنی ہے لیکن بڑی اہمیت کی چیز ہے۔ اور اس کی ایک محققانہ طبع کی بہت ضرورت ہے کیونکہ یہ ایرانی تاریخ کے ایک بڑے اہم دور سے مفصل طور پر بحث کرتی ہے۔ اور ایک ایسے شخص کے قلم سے ہے جس نے چشمدید حالات لکھے اور جن واقعات کی شرح کی ان میں سے اکثر میں خود نمایاں عملی حصہ لیا۔

مطلع السعدین و مجمع بحرین ایران اور متصلہ ممالک کی تاریخ ہے جو ۷۰۴ھ سے ۸۷۵ھ کے واقعات پر شامل ہے۔ اس کا مصنف کمال الدین عبدالرزاق ابن اسحاق سمرقندی ہے جو ۸۱۶ھ میں ہرات میں پیدا ہوا۔ موصوف اسحاق اردوئے شاہرخ میں قاضی اور امام کے عہدہ پر فائز تھے جب ۸۴۱ھ میں ان کا انتقال ہوا تو ان کے بیٹے عبدالرزاق نے پچیس برس کی عمر میں شاہرخ کے ہاں شاہی ملازمت اختیار کر لی۔ ۸۴۵ھ وہ بیجانگر اور پھر ۸۵۰ھ میں گیلان کی طرف سفیر بنا کر بھیجا گیا شاہرخ کے انتقال کے بعد اس کے کئی ایک جانشینوں کے پاس یکے بعد دیگرے ملازم رہا۔ بالآخر ۸۵۶ھ میں ہرات میں شاہرخ کی خانقاہ کا شیخ مقرر ہوا اور ۸۸۷ھ میں ہرات ہی میں فوت ہوا۔ مصنف نے تولیت خانقاہ ہی کے زمانہ ۸۷۲ھ — ۸۷۵ھ میں مطلع السعدین تالیف کی۔

مطلع السعدین دو جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد کا آغاز ابو سعید بہادر خان کی ولادت (یعنی ۷۰۴ھ) سے ہوتا ہے اور جلد کا خاتمہ تیمور کی وفات اور خلیل سلطان کے جلوس پر ہوتا ہے۔ شاہ مذکور سمرقند میں تخت نشین ہوا۔ یہ دونوں واقعات ۸۰۷ھ کے ہیں۔ گویا یہ جلد ایک صدی کے واقعات پر مشتمل ہے۔

دوسری جلد کا آغاز شاہرخ کے جلوس سے ہوتا ہے۔ جو ۸۰۷ھ میں ہرات میں واقع ہوا۔ اس جلد کا خاتمہ ابوالغازی سلطان حسین کے جلوس ثانی (۸۷۵ھ) پر ہوتا ہے۔ پس یہ قریباً ۱۷۰ سال کی تاریخ ہے۔

مؤلف کے اہم ترین مآخذ میں شہاب الدین عبداللہ بن لطف اللہ المعروف بحافظ ابرو (متوفی ۸۳۳ھ) کی کتاب زبدۃ التاریخ ہے۔ کتاب کے اس حصہ میں جس کا مضمون زبدہ کے ساتھ مشترک ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف زبدۃ التواریخ کی تلخیص کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اشعار و امثال و اقوال تک بھی اسی کتاب سے دے دیتا ہے گو اس کے سامنے اس حصہ کے لئے بھی کچھ اور مواد ضرور تھا۔ (مولوی محمد شفیع)

---

(۳۱) روضۃ الصفا

روضۃ الصفا تیموری عہد کی ایک اہم تصنیف ہے۔ اس کا مؤلف محمد بن خاوند شاہ بن محمود موسوم بہ میرخواند ہے۔ یہ ضخیم تاریخ سات جلدوں میں لکھی گئی ہے۔ پہلی جلد قبل از اسلام کے پیغمبروں اور بادشاہوں سے متعلق ہے۔ دوسری جلد میں رسولِ اکرم صلعم اور خلفائے راشدین کے حالات ہیں۔ تیسری جلد میں دوازدہ امام، بنو امیہ اور بنی عباس کا ذکر ہے۔ چوتھی جلد میں ایران کے مسلمان حکمرانوں پانچویں میں مغول حکمرانوں کا بیان ہے۔ چھٹی جلد تیمور اور اس کے جانشینوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ روضۃ الصفا کی ساتویں جلد میرخواند کی وفات کے بعد لکھی گئی تھی۔ یہ آخری حصہ میرخواند کے بھانجے غیاث الدین خواند میر نے میر علی شیر نوائی کی فرمائش پر لکھا تھا۔ اس میں ابو الغازی سلطان حسین بایقرا کے حالات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔

میرخواند ۸۳۶ھ میں پیدا ہوا اور ۹۰۳ھ میں فوت ہوا۔ روضۃ الصفا کا انداز تحریر ساتویں صدی کی تاریخوں کی طرح مشکل اور پیچیدہ ہے۔ اس میں مترادفات کا استعمال کثرت سے کیا گیا ہے۔ صنائع و بدائع کی افراط ہے۔ میرخواند کے بھانجے

خواندمیر نے ۹۰۵ھ میں روضۃ الصفا کا اختصار بھی کیا جو خلاصۃ الاخبار کے نام سے موسوم ہے۔ (بدخشانی)

یہ سب سے اہم تاریخ ہے جو تیموریوں کے دور میں تصنیف ہوئی ہے یہ کتاب سات جلدوں پر مشتمل ہے اور اس میں اسلام اور ایران کی تاریخ اور خاص کر تیموری دور کے حالات ابوالغازی سلطان حسین بایقرا (متوفی ۹۱۲ھ) کی سلطنت کے آخر تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کا مصنف محمد بن خاوندشاہ بن محمود معروف بہ میرخواند بلخ کے نجیب زادوں میں تھا۔ اور امیر علی شیر نوائی کے دربار کا متوسل تھا۔ اس نے ۹۰۳ھ میں بمقام ہرات وفات پائی۔ اس کتاب کا باقی حصہ یعنی ساتویں جلد کے مطالب کو جو مصنف کی وفات کے بعد چند سالوں کے واقعات پر مشتمل ہیں، مصنف کے پوتے خواندمیر نے مکمل کیا ہے۔ اس کے سوا خواندمیر نے ۹۰۵ھ میں روضۃ الصفا کا ایک خلاصہ "خلاصۃ الاخبار" کے نام سے تیار کیا ہے۔ (شفق)

محمد بن خاوندشاہ (میرخواند) کی ضخیم عمومی تاریخ شاید ایران میں اس قسم کی مشہور ترین تصنیف ہے۔ اور ذرا ناواجب حد تک مورد توجہ رہی ہے۔ یہ ۱۲۷۱ھ میں بمبئی سے اور ۱۲۷۰ھ میں طہران سے شائع ہو چکی ہے۔ ان سات جلدوں میں سے جن میں روضۃ الصفا کا تاریخی حصہ منقسم ہے۔ پہلی جلد میں بزرگانِ اسرائیل، انبیاء اور ایران کے قبل الاسلامی بادشاہوں کی تاریخ ہے۔ دوسری میں خاتم انبیاء محمد صلعم اور خلفائے راشدین کی تاریخ۔ تیسری میں بارہ اماموں اور خلفائے بنی امیہ اور بنی عباس کی تاریخ چوتھی میں بعد الاسلامی ایرانی خاندانوں کی تاریخ تیموری یورش تک۔ پانچویں میں مغولوں اور تاتاریوں کی تاریخ تیمور تک۔ چھٹی میں تیمور اور اس کے جانشینوں کی تاریخ ۸۷۳ھ تک اور ساتویں میں جو کسی دوسرے

(غالباً مصنف کے پوتے خواندمیر) کے قلم سے ہے۔ تمام تر میرخواند کے مربی ابوالغازی سلطان حسین کی زندگی اور عہدِ حکومت کی تاریخ ہے۔ جو ۹۱۲ھ میں مرا۔ یہ جلد میرخواند کی وفات سے کئی سال بعد تک چلتی ہے۔ آخری دو جلدیں جو مصنف کے اپنے زمانے سے متعلق ہیں۔ ظاہر ہے کہ پہلے حصوں سے زیادہ باوقعت اور مستند ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اسی تاریخ کے مطالعہ کرنے والوں کی توجہ ان پر زیادہ مرتکز نہیں رہی۔ سابق مورخین کے اسلوب کی نسبت میرخواند کا اندازِ تحریر بہت زیادہ آراستہ اور طنطنہ آمیز ہے۔ اور اس لحاظ سے اپنے زمانہ کی متداول تحریروں کا صحیح نمونہ ہے۔ (براؤن)

کسی مشرقی مصنف کی تاریخ جو اسلامی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہو۔ بہت قیمتی سرمایہ تصور کی جانی چاہئے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ مشرقی اسلامی دُنیا کے متعلق بہترین معلومات اخذ کی جا سکتی ہیں۔ اس قسم کی کتابوں میں کوئی کتاب بھی روضۃ الصفا سے زیادہ مقبول اور قابلِ قدر شمار نہیں کی جاتی۔

اس کتاب کا اصل نام روضۃ الصفا فی سیرۃ الانبیاء والملک والخلفاء ہے اس کے مصنف کا نام محمد بن خاوند شاہ بن محمود ہے۔ جو عام طور پر میرخوند کے لقب سے مشہور ہے۔ اس کی وفات ۹۰۳ھ (۱۴۹۸ء) میں ہوئی۔ مصنف کے مربی کا نام علی شیر تھا۔ جو ہرات کا امیر تھا۔ اسی کے حکم کے مطابق اس نے اس کتاب کی تالیف کا بیڑا اٹھایا۔

روضۃ الصفا اس قدر ضخیم کتاب ہے کہ ابھی تک اس کے صرف بعض حصے ہی ترجمہ کئے جا سکے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے ۱۶۶۲ء میں اس کے بعض تاریخی واقعات کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوا۔ پھر اطالوی زبان میں اور آخر میں ۱۷۱۵ء میں انگریزی زبان میں۔ (مولف)

---

(۳۲) اخلاقِ محسنی

اخلاقِ محسنی اصولِ اخلاق اور صفات پر لکھی ہوئی کتاب ہے۔ اس میں چالیس باب ہیں۔ اس کا مصنف حسین واعظ کاشفی ہے اور اس نے یہ کتاب ۹۰۰ھ میں ابو الغازی سلطان حسین کے نام لکھی ہے۔ (شفیق)

اخلاقِ محسنی کے مصنف حسین الواعظ کاشفی ہیں۔ آپ سبزوار میں پیدا ہوئے۔ فارغ التحصیل ہو کر درس و تدریس اور وعظ و خطابت کا سلسلہ شروع کیا۔ اور ایک فصیح البیان مقرر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ آخری تیموری بادشاہ سلطان حسین مرزا آپ کی بڑی قدر کرتا تھا۔ سلطان حسین کا وزیر میر علی شیر نوائی جو ایک علم پرور شخص تھا۔ آپ کو بڑی عزت سے دیکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے آپ کو ہرات کا واعظ مقرر کیا۔ آپ کی وفات ۹۱۰ھ میں ہوئی۔

حسین واعظ کاشفی کی ایک علمی یادگار اخلاقِ جلالی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ان کی زبان مشکل اور انشا عالمانہ ہے۔ لیکن مولانا حسین واعظ نے وہی اخلاقی مسائل نہایت سادہ اور عام فہم زبان میں لکھے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب عوام الناس اور طلبہ کے استفادہ کے لئے بہت مفید ہے۔

اخلاقِ محسنی ایک دیباچہ اور چالیس الواب پر مشتمل ہے۔ اس کی عبارت شگفتہ اور رواں ہے۔ مضمون کی وضاحت کے لئے دلچسپ حکایات بھی لکھی گئی ہیں۔ موزوں اشعار اور احادیث بھی زینتِ کتاب ہیں۔ اخلاقِ محسنی کے اعداد جمع کئے جائیں

تو مجموعہ ۹۰۰ بنتا ہے ۔ اور یہی اس کا سنِ تالیف ہے ۔ (بدخشانی)

---

(۳۴۳) اخلاق جلالی

اس کتاب کا نام لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق ہے اور تہذیبِ اخلاق تدبیرِ منزل اور سیاست مدن پر لکھی گئی ہے ۔ مصنّف کے بیان کے مطابق اس کتاب میں اخلاقِ ناصری سے بھی نقل و اقتباس کیا گیا ہے ۔ اس کتاب کا مصنّف جلال الدین دوانی (متوفی ۹۰۸ھ) صوبہ فارس میں گازرون کے قریب قریۂ دوان کا رہنے والا حکیم و عارف تھا ۔ اس نے یہ کتاب آق قو یونلو سلطان بن حسن کی فرمائش پر نویں صدی کے نصف آخر میں تصنیف کی ۔ (شفق)

یہ مولانا جلال الدین دوانی کی ایک مشہور کتاب ہے ۔ اصل نام تو اس کا لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق ہے ۔ لیکن شہرت اسے اخلاق جلالی کے نام سے ہوئی ۔ اسے مولانا نے امیر حسن بہادر خاں ترکمان آق قو یونلو (اوزون حسن) کے نام سے منسوب کیا ہے ۔ مولانا نے انسانی زندگی کی تہذیب کے لئے علمِ اخلاق کو تین حصّوں میں منقسم کیا ہے ۔ جن کے نام تہذیب الاخلاق ۔ تدبیرِ منزل اور سیاست مدن ہیں ۔ ہر حصّے میں متعدد مسائلِ اخلاق کی وضاحت کی گئی ہے ۔

مولانا جلال الدین نے اخلاقِ جلالی نصیر الدین طوسی کی کتاب اخلاقِ ناصری سے متاثر ہو کر لکھی ہے جس کا انہوں نے دیباچۂ کتاب میں اعتراف کیا ہے ۔ اس کے اکثر مسائل بعینہٖ وہی ہیں ۔ جو اخلاقِ ناصری کے ہیں ۔ ان کے علاوہ آپ نے بعض نئے مسائل بھی پیش کئے ہیں ۔ عبارت کو پُر زور بنانے کے لئے آیاتِ قرآنی اور احادیث کے اقتباسات بھی شاملِ کتاب کئے گئے ہیں ۔

اخلاق جلالی کی نثر میں انتہا درجے کا تصنع پایا جاتا ہے۔ بہت کم فقرے ایسے ہیں۔ جن میں الجھنیں نہ ہوں۔ سیدھی سادی باتیں ہیں۔ لیکن ان میں اتنی لسانی مشکلات پیدا کی گئی ہیں کہ ان کا سمجھنا مشکل ہے۔

اخلاق جلالی کا مؤلف جلال الدین صوبۂ فارس کے قصبہ دوّان میں ۸۳۰ھ میں پیدا ہوا۔ اور اسی نسبت سے دوّانی مشہور ہوا۔ اس کا باپ یہاں قاضی کے منصب پر فائز تھا۔ جلال الدین کو بھی فارغ التحصیل ہونے کے بعد یہی منصب ملا۔ جلال الدین اپنے فرائض کے علاوہ شیراز کے دارالایتام میں درس بھی دیتا تھا۔ جلال الدین دوّانی شعر بھی کہتا تھا۔ اس کا تخلّص فانی تھا۔ فن شعر میں اس کی یادگار چند رباعیاں ہیں۔ اس کی وفات ۹۰۸ھ میں ہوئی۔

(بدخشانی)

اخلاق جلالی کا پورا نام "لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق" ہے۔ جسے جلال الدین دوّانی فلسفی نے تصنیف کیا۔ اور آق قویونلو خاندان کے سلطان اوزون حسن کے نام معنون کیا۔ اخلاق جلالی کا اسلوب تحریر پرتکلّف اور مرصّع ہے۔ اس کتاب کا موضوع حکمتِ عملی ہے۔ جس کی شاخیں تہذیب اخلاق۔ تدبیر المنزل اور سیاست المدن ہیں۔ یہ کتاب انگریزی میں ترجمہ ہو کر چھپ چکی ہے۔ یہ ترجمہ ڈبلیو۔ ایف۔ ٹامسن نے اہلِ اسلام کی حکمتِ عملی PRCTJCAL PHILOSOPHY OF THE MOHAMMADAN PEOPLE کے نام سے کیا ہے۔

(براؤن)

---

(۳۴) انوارِ سہیلی

اس کتاب کے مصنّف حسین واعظ ہیں۔ اس میں اخلاق و سیاسیات کے اصول جانوروں کی زبان سے حکایات کی صورت میں پیش کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کو ابوالمعالی نصراللہ کی کتاب کلیلہ دمنہ کا نقشِ ثانی سمجھنا چاہیئے حسین واعظ نے چاہا تھا کہ کلیلہ دمنہ کی زبان کو زیادہ سادہ اور رواں کریں۔ اور عربی امثال و حِکَم کو خارج کر دیں۔ لیکن یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکا۔ چنانچہ اس میں بھی تکلّف اور تصنّع پایا جاتا ہے۔ عربی کے الفاظ بھی بکثرت ہیں۔ اس میں وہ لطافت بھی نہیں جو کلیلہ دمنہ کا خاصہ ہے۔

حسین واعظ کو اگرچہ ایک واعظ کو اگرچہ ایک واعظ کی حیثیت میں بڑی اہمیت حاصل ہوئی۔ لیکن ان کی شہرت کا اصل سرمایہ اخلاقِ محسنی اور انوارِ سہیلی ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ انہوں نے بعض اور کتابیں بھی تصنیف کیں۔

(بدخشانی)

اس مشہور کتاب میں جانوروں کی زبانی حکایتوں کے ذریعہ اصولِ اخلاق بیان کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کی اصل کلیلہ و دمنہ ہے۔ اس کا مصنّف ملا حسین واعظ کاشفی ہے۔ واعظ کاشفی کا ارادہ تھا۔ کہ ابوالمعالی نصراللہ کی کتاب کلیلہ و دمنہ کو بہتر انداز اور سادہ تر انداز میں بیان کرے۔ اور عربی اشعار و امثلہ کو ترک کر دے۔ لیکن اس کا یہ مقصد پورا نہ ہو سکا اور اس کتاب کا سبک اس زمانے کے مروجہ پر تکلف سبک کا تابع ہو گیا۔ لطافت اور متانت میں انوارِ سہیلی ہرگز کلیلہ دمنہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کے باوجود انوار سہیلی فارسی کی مشہور ترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اور خاص کر ہندوستان میں مشہور ہے۔

حسین واعظ کا شمار سلطان حسین کے عہد کے مشہور عالموں میں ہوتا تھا۔
اس نے اور بھی کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن انوار سہیلی میں اس نے فارسی زبان پر اپنی
قدرت اور مہارت کا خوب ثبوت دیا ہے۔ (شفق)

انوارِ سہیلی کے نام سے حکایات کا جو مجموعہ ہندوستان میں مشہور ہے۔ اس کے
متعلق عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ کہ اس کی اصل سنسکرت زبان ہے جس میں
تقریباً ایک ہی قسم کی حکایات قدیم ترین زمانے سے روایت کی جاتی رہی ہیں جیسا
کہ عام قاعدہ ہے۔ اس قسم کی کتابوں کی تاریخ کسی یقین کے ساتھ معین نہیں کی
جا سکتی۔ بلکہ اس کتاب کے بعد کے زمانہ کی کتابوں کے بارے میں بھی یہ ابہام
قائم رہتا ہے۔ مثلاً بیدپا یا پیل پا جو مشہور حکایات نویس تھا۔ اور جس کے متعلق
خیال کیا جاتا ہے۔ کہ وہ تین سو قبل مسیح کے زمانے کا آدمی ہے۔ بلکہ یہ بھی ایک
مشتبہ امر ہے کہ آیا اس نام کا کوئی آدمی موجود تھا بھی یا نہیں۔

بیدپا کی حکایات ایران میں نوشیرواں کے عہدِ حکومت میں روشناس
ہوئیں۔ (یعنی چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں) نوشیرواں نے حکیم برزویہ
سے درخواست کی کہ وہ انہیں اس وقت کی ملکی زبان یعنی پہلوی میں ترجمہ
کیا۔ یہ فارسی ترجمہ کلیلہ ودمنہ کے نام سے مشہور ہے۔ ملا حسین بن علی الواعظ
الکاشفی نے پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں اس ترجمہ کو اپنی کتاب
کے لئے اصل قرار دیا۔ ملا حسین واعظ شاہ ابوالغازی سلطان حسین حاکم
خراسان کے دربار میں مقیم تھا۔ اس نے اپنی کتاب کو اپنے مربی امیر سہیلی
کے نام پر موسوم کر کے اس کا نام انوارِ سہیلی رکھا۔ امیر سہیلی شاہ ابوالغازی
کا ایک فوجی افسر تھا۔

مشرقی ادب میں بہت ہی کم کتابیں ایسی ہیں جو انوار سہیلی کی طرح
غیر معمولی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں اور جن میں مشہور

فاضل مشرق سر ولیم جونز (SIR WILLIAM JONES) کے قول کے مطابق مشرقی اقوام کی حکمت و دانش کوٹ کوٹ کر بھری گئی ہے۔ یہ کتاب ایک دلچسپ مجموعہ حکایات ہونے کے علاوہ ادب آموز مشرقی انشا کا نمونہ بھی ہے۔ مشرقی لوگوں کے لیے یہ ایک نہایت دلچسپ خزینہ ہے اور اہل مغرب جو عام طور پر سنجیدہ طرز تحریر کے عادی ہیں۔ اس کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس کے باوجود اسکی ہر دلعزیزی کا ثبوت یہ ہے کہ کم از کم دنیا کی بیس مختلف زبانوں میں اسکا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اپنی ذاتی خوبیوں کے علاوہ یہ کتاب ہندوستان اور یورپ کے بعض ممالک میں فارسی امتحانات کے لیے بطور نصاب مقرر ہے۔ اگرچہ مجموعی طور پر یہ چنداں مشکل نہیں لیکن اس میں بعض مقامات مبتدیوں کے فہم سے بالاتر ہیں۔

ملا واعظ کاشفی نے اپنے کتاب انوار سہیلی کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ "ان چند کتابوں میں سے جن کی بنیاد مسائل حکمت و نصیحت پر رکھی گئی ہے۔ ایک کتاب کلیلہ و دمنہ ہے جسے حکمائے ہند اور وہاں کے دانشمند برہمنوں نے نہایت جامعیت کے ساتھ ایک خاص طریق پر تالیف کیا ہے۔ انہوں نے اس میں حکمت و متانت کے ساتھ لہو و ہزل کا امتزاج کر دیا ہے۔ اور اپنے قیمتی نصائح کا انداز کچھ ایسا رکھا ہے کہ اکثر طبائع اس کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مختلف قسم کی حکایات و روایات وحوش و بہائم و طیور کی زبان سے ادا کی ہیں اور ان کے ضمن میں حکمت و موعظت کی باتیں بیان کی ہیں۔ تاکہ دانا آدمی ان کے مطالعہ سے فائدہ اٹھا سکے۔ اور نادان انہیں بطور افسانہ پڑھ سکے۔ علاوہ ازیں معلم کے لئے ان کا پڑھانا آسان اور متعلم کے لئے انہیں یاد رکھنا سہل ہو۔ درحقیقت یہ حکمت آموز کتاب ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں ہر شخص کی مرضی کے مطابق مواد موجود ہے۔ اور کئی ایسی باتیں ہیں جو اس سے پیشتر کہیں دیکھنے یا سننے میں نہیں آئیں۔ اس کتاب کو حکیم بیدپای برہمن نے ہندوستان کے ایک راجہ رائے دابشلیم کے لئے ہندوستان کی زبان میں تصنیف کیا تھا حکیم موصوف نے اپنی کتاب

کی بنیاد اُن مواعظ پر رکھی تھی جو بادشاہوں کے لئے سیاست رعیت، سلطنت کے خیر خواہوں کی تربیت و تقویت اور حکومت کے بد خواہوں کی دفع مضرت کے سلسلے میں کار آمد ثابت ہو سکتی تھیں۔ رائے دابشلیم نے اس کتاب کو مفید مطلب پا کر ہمیشہ اپنے مطالعہ میں رکھا۔ اور وہ اپنی مشکلات اور تکالیف کے موقع پر اس سے استمداد کیا کرتا۔ اسی کے دورِ حکومت میں یہ بیش قیمت موتی عوام الناس کی نظروں سے اوجھل تھے۔ وہ کسی کو اس کتاب کا دکھانا بھی گوارا نہ کرتا تھا۔ اس کے بعد اس کی اولاد اور جانشینوں نے بھی اسی طریقہ پر عمل کیا۔ یہاں تک کہ کسریٰ نوشیرواں کے زمانے میں یہ خبر عام مشہور ہوئی کہ ہندوستان کے بادشاہوں کے خزانے میں ایک کتاب ہے جسے وحوش، بہائم اور طیور و حشرات کی زبان میں جمع کیا گیا ہے۔ اور اس میں وہ تمام قواعد و آئین درج ہیں جو ملکی سیاست اور جہانداری کے سلسلے میں بادشاہوں کو درکار ہوتے ہیں۔ یہ معلوم کر کے نوشیرواں کے دل میں اس کتاب کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ اس نے فارسی کے سب سے بڑے طبیب برزویہ سے فرمائش کی کہ وہ ہندوستان سے اس کتاب کو حاصل کرے۔ برزویہ نے ہندوستان پہنچ کر کافی مدت وہاں قیام کیا اور کسی حیلہ و تدبیر سے کتاب حاصل کر کے ایران لے آیا۔ اس نے ہندوستانی زبان سے اس کا پہلوی زبان میں ترجمہ کیا۔ جو اس زمانے میں سلاطینِ ایران کی زبان تھی پھر اسے نوشیرواں کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ بادشاہ نے اسے پسند کیا۔ اور برزویہ کو انتہائی درجہ کا شاہی تقرب حاصل ہو گیا۔ نوشیرواں کے عدل و انصاف تسخیر بلاد اور رحم و کرم کی بنیاد اسی کتاب کے مطالعہ پر تھی۔ نوشیرواں کے بعد دوسرے ملوکِ عجم بھی اس کتاب کی تعظیم اور اخفا میں مبالغہ سے کام لیا کرتے تھے۔ جب بنی عباس کے دوسرے خلیفہ ابو جعفر منصور نے اس کتاب کے متعلق سُنا تو وہ اسے حاصل کرنے کا سخت خواہشمند ہوا۔ چنانچہ اس نے وہ پہلوی نسخہ لطائف الحیل سے حاصل کر لیا۔ اور امام ابوالحسن عبداللہ بن المقفع

کو پہلوی سے عربی زبان میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا جو اس زمانہ کا سب سے بڑا فاضل تھا۔ خلیفہ منصور ہمیشہ اس کتاب کو زیر مطالعہ رکھتا تھا۔ اور خلافت کے احکام اور عدل و انصاف کے معاملات میں اس کے نصائح سے استفادہ کیا کرتا تھا۔ بعد ازاں ابوالحسن نصر بن احمد سامانی نے اپنے زمانے کے کسی فاضل شخص کو حکم دیا جس نے اسے عربی سے فارسی زبان میں ترجمہ کر دیا۔ رودکی شاعر نے سلطان کے حکم سے اسے نظم کا جامہ پہنایا۔ اس کے بعد سلطان محمود غزنوی کی اولاد میں سے ابوالمظفر بہرام شاہ بن سلطان مسعود کے حکم سے ایک فصیح و بلیغ شخص ابوالمعالی نصراللہ بن محمد نے ابن المقفع کے عربی ترجمہ سے اسے دوبارہ فارسی میں ترجمہ کیا اور اب جو کتاب کلیلہ و دمنہ کے نام سے مشہور ہے وہ یہی ترجمہ ہے۔ اگرچہ یہ ترجمہ لطیف عبارت۔ دلفریب الفاظ اور شیریں طرز بیان کا حامل ہے۔ اور بلیغ تراکیب اور جزیل کلمات پر مشتمل ہے۔ لیکن غریب لغات۔ مبالغہ آمیز تشبیہات و استعارات۔ کثیر التعداد عربی الفاظ اور مغلق عبارات کے باعث کتاب کا مفہوم سمجھنے میں دقت پیش آتی تھی۔ اور پڑھنے اور سننے والا دونوں حکایت کی ابتدا سے آخر تک راستے میں لفظی گورکھ دھندوں میں پھنس کر رہ جاتے تھے۔ جس سے طبیعت میں ملال پیدا ہوتا تھا۔ بالخصوص اس زمانے میں جبکہ لوگوں کی نازک طبیعتیں اس وقت تک بات کو سمجھنے سے قاصر رہتی ہیں۔ جب تک اسے صریح الفاظ میں بیان نہ کیا جائے۔ اس کا نتیجہ ہو سکتا تھا۔ کہ کتاب باوجود نفیس ہونے کے بالکل متروک ہو جاتی اور لوگ اس سے استفادہ کرنے سے محروم رہ جاتے ان حالات کی بنا پر شاہ ابوالغازی معز الملک سلطان حسین کے ایک امیر احمد السہیلی نے مجھے حکم دیا۔ کہ میں خاص و عام کے فائدے کے لئے اس کتاب کو مروجہ زبان میں نئے سرے سے منتقل کروں اور جو روایات مغلق الفاظ اور مشکل کلمات میں بیان کی گئی ہیں انہیں واضح اور روشن عبارت میں پیش کروں تاکہ پڑھنے والا زیادہ غور و فکر کئے بغیر ان کا مطلب سمجھ کر ان سے متمتع ہو سکے۔

''آخر میں نے استخارہ کے بعد اس کام کو شروع کیا اور جو کچھ مجھ سے بن پڑا لکھ کر پیش کر دیا۔
کتاب کلیلہ و دمنہ کی بنیاد حکمتِ عملی پر ہے۔ حکمتِ عملی سے مراد یہ ہے کہ انسان کی حرکاتِ ارادی اور افعالِ طبیعی کی مصلحتوں کو اس طرح سمجھا جائے جس سے اس کے معاد و معاش کے احوال منتظم ہو کر اسے کمال تک پہنچنے میں مدد دیں۔ یہ حکمت عملی دو حصوں پر منقسم ہے۔ ایک حصہ تو ہر انسان کی ذات سے متعلق ہے۔ اسے تہذیبِ اخلاق کہتے ہیں۔ دوسرا حصہ اجتماعی زندگی سے تعلق رکھتا ہے جس کی پھر دو قسمیں ہیں۔ اوّل ایک ہی گھر میں رہنے والے افراد پر حاوی ہے۔ اسے تدبیرِ منزل کہا جاتا ہے۔ دوم وہ جو تمام شہر بلکہ ملک کے سارے لوگوں سے متعلق ہے۔ اس کو سیاستِ مدن بولتے ہیں۔ مذکورہ بالا کتاب ان ہی آخری دو قسموں کے بعض فوائد پر مشتمل ہے۔ تہذیبِ اخلاق کے متعلق علیحدہ ذکر اس میں موجود نہیں البتہ کہیں کہیں ضمناً اس کا ذکر آ گیا ہے۔ اس لئے اگرچہ مکارمِ اخلاق کے متعلق بعض چیزوں کا اس میں اضافہ کیا جا سکتا تھا۔ مگر ہم نے اپنی کتاب کی اصل وضع میں، کوئی بنیادی تبدیل کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ لہٰذا ہم نے اس کو اسی رنگ ڈھنگ پر ترتیب دیا ہے جس طرح ہندوستان کے حکیم بید پای نے اسے لکھا تھا۔ چونکہ کتاب کے پہلے دو باب چنداں سودمند نہ تھے۔ اور اصل کتاب کے موضوع سے ان کا خاص تعلق نہ تھا۔ اس لئے انہیں حذف کرنے کے بعد باقی چودہ ابواب کو ہم نے نہایت واضح اور آسان عبارت میں لکھ دیا ہے۔ اور جیسا کہ اصل کتاب میں حکایات رائے دابشلیم اور حکیم بید پای کے درمیان سوال و جواب کی صورت میں ہیں۔ ہم نے اس طرز مکالمہ کو اسی طرح رہنے دیا ہے۔ حکایات کے دوران میں جو عربی کلمات مثلاً آیات، احادیث، امثال وغیرہ پائے جاتے تھے۔ ہم نے انہیں بہت ہی کم استعمال کیا ہے۔ اور عربی اشعار کی بجائے فارسی اشعار درج کئے ہیں۔ مختلف ابواب کے تحت جہاں کہیں کوئی مناسب حکایت یا مثال نظر آئی۔ وہاں ہم نے متفرق

کر کے اسے پیش کرنے سے گریز نہیں کیا۔"

(کرنل یوسف اوزلی)

---

(۳۵) بہارستان

جامی کی نثریہ تصنیف بہارستان ہے۔ اگرچہ سب سے آخر میں ہے مگر کسی سے کمتر نہیں۔ یہ کتاب اپنی نوعیت اور ترتیب میں سعدی کی مشہور تر تصنیف گلستان سے ملتی جلتی ہے۔ ۸۹۲ھ میں لکھی گئی۔ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ (ہر ایک کا نام روضہ ہے) پہلے میں اولیا اور صوفیاء کی حکایتیں ہیں دوسرے میں فلسفیوں اور حکماء کے اقوال ہیں۔ تیسرا عدالت ہائے سلاطین پر ہے۔ چوتھا جود وکرم پر۔ پانچواں عشق پر۔ چھٹا مطائبات ولطائف پر۔ ساتواں شعراء پر اور آٹھواں جانوروں پر۔ کتاب ملی جلی نظم ونثر میں لکھی گئی۔ اور نظم کا حصہ خاصا ہے۔ اس کا متن جرمن ترجمے کے ساتھ ۱۸۴۶ء میں وی انا سے شائع ہوا۔ متن کی بہت سی قسطنطنیوی اشاعتیں بھی ہیں۔ پورا انگریزی ترجمہ ۱۸۸۷ء میں اور چھٹے روضہ کا "ایران کی بذلہ گوئی اور ظرافت" کے عنوان سے نشر ہوا۔ (براؤن)

مولانا جامی نے اپنے صاحبزادے یوسف ضیاء الدین کو گلستان پڑھانے کے دوران میں اس کتاب کی تصنیف کا ارادہ کیا۔ اور گلستان کی طرز میں ۸۹۲ھ میں اس کو تمام کیا۔ گلستان کی طرح یہ کتاب بھی لطیف حکایات اور ظریف نکات سے مملو ہے۔ اس میں نہایت اچھے شعر آئے ہیں اور بعض علماء اور شعراء کا ذکر بھی آگیا ہے۔ (شفق)

بہارستان سعدی کی تصنیف گلستان کی تقلید میں لکھی گئی ہے۔ اس کا سالِ تالیف ۸۹۲ھ ہے۔ یہ بھی گلستان کی طرح آٹھ ابواب پر مشتمل ہے ہر باب میں چند حکایات ہیں۔ جن کی ترتیب حسبِ ذیل ہے :۔

پہلا باب :۔ درویشوں اور صوفیوں کی حکایات۔ دوسرا باب :۔ دانشمندوں کی حکایات
تیسرا باب :۔ بادشاہوں کے عدل و انصاف کی حکایات۔
چوتھا باب :۔ سخاوت کی حکایات۔ پانچواں باب :۔ عشق و محبت کی حکایات
چھٹا باب :۔ مزاحیہ حکایات۔ ساتواں باب :۔ شعراء کی حکایات و لطائف
آٹھواں باب :۔ جانوروں کی حکایات۔

بہارستان کی حکایات کو مناسب مقامات پر اشعار سے بھی مزین کیا گیا ہے۔ بہارستان کو ایک مشہور جرمن محقق نے مع ترجمہ ۱۸۴۶ء میں شائع کرایا۔ ۱۸۸۷ء میں ایک سوسائٹی کے زیرِ اہتمام بہارستان کا انگریزی ترجمہ ہوا صرف چھٹے باب کا "ایرانی مزاح" کے نام سے بھی ترجمہ شائع کیا گیا۔ (بدخشانی)

مولانا جامی کی انشائیہ تصانیف میں سے ایک اور بہارستان ہے جس کے عنوان کی ساخت گلستانِ سعدی کی سجھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے پہلے باب میں جماولیاء کے اقوالِ سے متعلق ہے۔ اور ساتویں باب میں جو شاعری اور شعراء کے بیان میں ہے کچھ سیرتی مواد ملتا ہے۔ لیکن اس کتاب کا مقصد زیادہ تر ناظرین کے لئے تفریحِ طبع اور ہدایت کا فراہم کرنا ہے۔ نہ کہ صحیح و مفصل سیرتی معلومات کا بہم پہنچانا اس کا پیرایۂ عبارت نفحات الانس کے انداز سے نمایاں طور پر زیادہ مرصّع ہے۔ اس کا ایک انگریزی ترجمہ نام نہاد کام شاستر سوسائٹی نے شائع کیا تھا۔ پیرس ست اس کا فرانسیسی ترجمہ ۱۹۲۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔ (براؤن)

(۳۶) تذکرۃ الشعراء

لباب الالباب کے بعد فارسی کا اہم ترین تذکرہ دولت شاہ سمرقندی کا تذکرۃ الشعراء ہے۔ یہ تذکرہ ۸۹۲ھ لکھے لگ بھگ یعنی تیموریوں کی سلطنت کے آخر میں تصنیف ہوا ہے۔ اس میں ابتدا سے کر نویں صدی کے آخر تک (۱۵۰) فارسی شاعروں کے حالات درج ہیں۔ اس کا تذکرہ کا مصنف دولت شاہ بن علاء الدولہ سمرقندی امیرزادوں اور ذی مرتبہ لوگوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس کا باپ امیر علاء الدولہ۔ شاہرخ کے ندیموں میں شامل تھا۔ خود دولت شاہ بھی ہرات میں ابوالغازی سلطان حسین اور امیر علی شیر نوائی کا مقرب تھا اور ملا عبدالرحمٰن جامی کا ہم عصر تھا۔ ان تینوں کے نام اس نے اپنی کتاب کے آخر میں لئے ہیں۔ ان کی مدح کی ہے۔ اور ان کے فضائل گنائے ہیں مصنف نے فارسی شاعروں کا یہ تذکرہ امیر علی شیر نوائی کے نام معنون کیا ہے۔ کیونکہ اسی عالم وزیر کی تشویق اور سرپرستی کی وجہ سے یہ تذکرہ لکھا گیا تھا۔ تذکرہ دولت شاہ ایک مقدمہ، سات طبقات اور ایک خاتمہ پر حاوی ہے۔

مقدمہ میں دس عربی کے مشہور شعراء کے حالات ہیں۔ پہلے طبقہ میں بیس تیسرے میں سولہ۔ چوتھے میں بیس۔ پانچویں میں اٹھارہ۔ چھٹے میں اکیس۔ ساتویں میں شعراء کے حالات ہیں۔ اور خاتمہ میں مولف کے چھ معاصر فارسی شعرا کا حال ملتا ہے۔ (شفق)

تذکرۃ الشعراء دولت شاہ سمرقندی (۸۹۲) ہجری کی تالیف ہے۔ یہ تذکرہ ایک تمہید، سات طبقات اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔ تمہید میں فنِ شعر گوئی

پر ایک مختصر سا مقالہ ہے۔ طبقات میں تقریباً ١٥٠ شعرا کا حال لکھا ہے۔ اور ان کا نمونہ کلام بھی دیا ہے۔ خاتمے میں مؤلف نے اپنے محسن و ممدوح سلطان ابوالغازی سلطان حسین اور اس کے نامور وزیر امیر علی شیر نوائی کی سیرت و کردار پر روشنی ڈالی ہے اور اپنے ہم عصر شاعر جامی کا حال لکھا ہے۔ پروفیسر براؤن نے تذکرۃ الشعراء کو ایڈٹ کر کے شائع کرایا ہے۔ پروفیسر براؤن کا خیال ہے کہ یہ ایک دلچسپ کتاب ہے لیکن اس میں بعض تاریخی اغلاط بھی ہیں۔ اس کی وجہ سے ریو جیسا محتاط اور ثقہ نقاد بھی کہیں کہیں گمراہ ہو گیا ہے۔ دولت شاہ کی وفات سنہ ٩٠٠ھ میں ہوئی۔ دولت شاہ بن علاء الدولہ کا شمار سمرقند کے رؤسا میں ہوتا تھا۔ اس کا والد شاہ رخ مرزا کا ندیم خاص تھا۔ وہ خود ابوالغازی سلطان حسین اور اس کے نامور وزیر امیر علی شیر نوائی کے مقربین میں سے تھا۔ یہ تذکرہ اس نے امیر علی شیر کی فرمائش پر لکھا اور اسی کے نام منسوب کیا۔

تذکرۃ الشعرا کی نثر میں چھٹی صدی ہجری کی سی سادگی اور روانی ہے۔ مترادف الفاظ و فقرات بہت کم ہیں۔ صنائع و بدائع کہیں خال خال ہیں۔ تشبیہات بقدر ضرورت استعمال کی گئی ہیں۔

(بدخشانی)

امیر دولت شاہ بن علاء الدولہ بختیشاہ غازی سمرقندی فارسی کے مشہور ترین 'تذکرۃ الشعراء' کا مصنف ہے۔ اس کا تذکرہ سات طبقات میں تقسیم ہے۔ ہر ایک میں کوئی بیس ایک کم و بیش ہم عصر شعراء اور ان سلاطین کا حال ہے جن کی سرپرستی میں وہ پنپ رہے تھے۔ اس میں فن شاعری پر ایک مقدمہ بھی ہے۔ اور ایک خاتمہ ہے۔ جو مصنف کے سات ہمعصر شاعروں کے حالات اور اسکے محسن بادشاہ ابوالغازی سلطان حسین کے مکارم و کمالات کے بیان میں ہے۔ یہ کتاب ایک دلچسپ لیکن ناقص تصنیف ہے۔ یہ ایک طرف تو اس میں اشعار کا ایک عمدہ انتخاب ہے۔ اور دوسری طرف تاریخی اغلاط کی بھرمار ہے جس نے بعض جگہوں پر ریو جیسے قابل اور محتاط عالم کو بھی گمراہ کر دیا ہے ١٨٨٧ء میں اسکی ایک سنگی طبع بمبئی سے نکلی ١٩٢٢ء میں

اس کا ایک ایڈیشن لاہور سے بھی نکل چکا ہے۔ (براؤن)

امیر دولت شاہ اسفرائن کے ایک شریف خاندان سے تھا۔ اس کا باپ علاؤ الدولہ بختی شاہ الغازی امیر تیمور کے سب سے چھوٹے بیٹے شاہرخ سلطان (۱۴۰۴ء—۱۴۴۷ء) کے مشہور درباریوں میں سے تھا۔ دولت شاہ ایک قابل۔ منکسر المزاج اور ہونہار نوجوان تھا۔ اس نے اپنے آباؤ اجداد کی شان و شوکت اور حکومت کے طریق کو خیرباد کہا۔ معمولی زمینداری کی آمدنی پر قناعت کر کے گوشۂ عافیت اختیار کیا۔ اور کسب علوم و فنون میں پوری کوشش کی۔ تقریباً پچاس سال کی عمر میں تذکرۃ الشعراء لکھنا شروع کیا۔ اور اپنے مربی سلطان حسین غازی کے نام پر معنون کیا۔ کتاب تذکرۃ الشعراء ۸۹۲ھ (مطابق ۱۴۸۷ء) میں ختم ہوئی۔ دولت شاہ کا سن وفات ۹۰۲ھ بیان کیا جاتا ہے۔

دولت شاہ کے زمانہ کے عام حالات

دولت شاہ ناقدریٔ زمانہ کا بہت شاکی ہے اپنے زمانہ کی بابت لکھتا ہے کہ اس زمانہ میں علم کی کوئی قدر نہیں۔ شعراء کو بہت قلیل صلے ملتے ہیں۔ رذیل اور چھوٹے درجہ کے لوگ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہو جاتے ہیں۔ خود اسے باوجود علمی قابلیت۔ خاندانی شرافت اور وسیع تعلقات کے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ ایک مقام پر وہ اس زمانہ کے علمائے دین پر الزام دیتا ہے۔ کہ وہ ابن الوقت اور طامع ہیں۔ شر کو روکنے کے لئے اخلاقی جرأت سے کام نہیں لیتے۔ دوسرے موقع پر اپنے بارِ قرض کا ذکر کرتا ہے۔ اور محصّل کی سختی سے نالاں ہے۔ اپنی ناداری کی بابت جو کچھ وہ لکھتا ہے۔ اس کی ذمہ دار ممکن ہے۔ اس کی گوشہ نشینی اور منکسر المزاجی ہو۔ جس کی طرف نوائی نے مجالس النفائس کی چھٹی مجلس میں اشارہ کیا ہے اور اغلب ہے کہ اسی وجہ سے باقی زمانہ کی شکایت کر دی ہو ورنہ مشکل ہے کہ سلطان حسین کی بادشاہت اور امیر علی شیر نوائی کی وزارت ہو

اور علماء کی بے قدری۔

تذکرۃ الشعراء میں مصنف نے قریباً سینتیس کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ جن میں سے مندرجہ ذیل اہم ہیں:۔

احیاء العلوم غزالی۔ اخبار الطوال دینوری۔ تاریخ بناکتی ابوسلیمان داؤد۔ تاریخ بیہقی۔ جامع التواریخ رشید الدین فضل اللہ۔ تاریخ طبری۔ مطلع السعدین عبدالرزاق سمرقندی۔ تاریخ گزیدہ مستوفی۔ جہانگشائے جوینی۔ چہار مقالہ عروضی سمرقندی۔ سیاست نامہ نظام الملک۔ طبقاتِ ناصری جوزجانی۔ قابوس نامہ کیکاؤس۔ مناقب الشعراء ابوطاہر خاتونی۔ نظام التواریخ بیضاوی۔ نفحات الانس جامی وغیرہ۔

دولت شاہ اپنے خیال میں پہلا آدمی تھا جس نے کہ شعرا کے حالات لکھے ہیں۔ حالانکہ وہ مندرجہ بالا کتابوں کے حوالے دیتا ہے جس میں مناقب الشعرا بھی شامل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے لباب الالباب عوفی کو نہیں دیکھا کیونکہ وہ اس کا کہیں ذکر نہیں کرتا۔

تذکرۃ الشعراء فارسی تاریخ ادب پر فارسی زبان میں بہترین کتب سے ہے یہ ایک مقدمہ سات طبقات اور ایک تتمہ پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں فارسی شعر کی مختصر سی تاریخ لکھی ہے۔ ہر ایک طبقہ میں تقریباً بیس شعرا اور ان کے مربی بادشاہوں کے حالات درج ہیں۔ تتمہ میں مؤلف نے سلطان حسین غازی اور چھ ہمعصروں کے حالات دیئے ہیں۔ شاعر کے حالات کے بعد اس کے کلام کا انتخاب درج ہے۔ جو مؤلف کے مذاق کی داد دیتا ہے۔ تذکرۃ الشعراء کو چیدہ اشعار کے مجموعہ کی وجہ سے ایک نفیس بیاض کہا جا سکتا ہے۔ جس میں تقریباً ۱۵۰ شعرائے متقدمین کے کلام کا انتخاب درج ہے۔ جو مؤلف کی قابلیت اور ذہانت پر دال ہے۔ اس کے مندرجہ اشعار میں سے بعض نایاب ہیں اور بعض علیحدہ کبھی نہیں چھپے۔ اشعار کے علاوہ عام تاریخی حالات بھی موجود ہیں۔ جو اس

زمانہ کے حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ بہت سی پُرلطف حکایتیں دی ہیں۔ کتاب بحیثیتِ مجموعی فارسی زبان کے طالب علم کے لئے دلچسپ اور مفید ہے۔ اس کی زبان شیریں اور لطیف ہے انوارِ سہیلی (جو اسی زمانہ کی تصنیف ہے) کی طرح ثقیل بلاغت وغیرہ سے پاک ہے۔

تذکرۃ الشعرا کا ساتواں طبقہ اور تتمہ تاریخی نقطۂ نگاہ سے دلچسپ ہے۔ دولت شاہ کی معلومات اس طبقہ کی بابت بڑی حد تک مستند قرار دی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ ان دونوں حصّوں میں ان لوگوں کے حالات درج ہیں۔ جو مؤلف کے ہمعصر تھے۔ باقی کتاب کی نسبت یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعات کے جمع کرنے میں مؤلف نے احتیاط سے کام نہیں لیا۔ ضعیف یا معتبر روایت جیسی ملی لکھ دی۔ خود اسے پرکھا نہیں اسی وجہ سے کتاب میں بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ جن کی وجہ سے بڑے بڑے فاضل مثلاً ریو اور شبلی بھی ٹھوکر کھا گئے ہیں۔ جس قدر واقعات کی تاریخیں بہم پہنچ سکیں۔ مؤلف نے جمع کر دی ہیں۔ چند ایک نظم میں ہیں اور باقی عربی لفظوں میں۔ تاریخ لکھنے کا یہ بہت محفوظ ذریعہ ہے۔ کیونکہ ہندسوں کے بدل جانے کا اندیشہ دُور ہو جاتا ہے۔ اور ایسا اندیشہ مشرقی پرانی کتابوں کی نسبت عام ہو سکتا ہے۔ دولت شاہ کے اس فاضلانہ تاریخیں لکھنے کے طریق کی نسبت کم ازکم یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ مؤلف نے جو لکھی ہوں گی وہ تقریباً ویسی ہی ہم تک پہنچ سکی ہیں۔ تذکرۃ الشعرا میں تاریخی لغزشیں بہت ہیں۔ مثلاً فردوسی کا نام غلط لکھا ہے۔ اسی طرح اس کے سالِ وفات کے بارے میں لغزش کھائی ہے پھر نظام الملک کا سنِ وفات بھی غلط معین کیا ہے۔ پھر اسدی کو فردوسی کا استاد قرار دیا ہے۔ جو قرینِ صحت نہیں وغیرہ وغیرہ (اقبال صافی)

دولت شاہ نے اپنا تذکرہ گو ۸۹۲ھ (۱۴۸۷ء) سے پہلے نہیں لکھا۔ تاہم عوفی (جو تیرھویں صدی عیسوی کے نصفِ اوّل میں ہو گزرا ہے) کو چھوڑ کر فارسی

شعرا کے سوانح حیات پر یہ سب سے پہلی مستقل کتاب ہے جو ہم تک پہنچی ہے. عوفی کا تذکرہ لباب الالباب محض اشعار کا ایک مجموعہ ہے اور شعرا کی زندگی کے حالات یا ان کی تاریخوں کے متعلق مشکل سے ہی کوئی چیز اس سے دستیاب ہوتی ہے۔ اس سے قبل فارسی شعرا کے حالاتِ زندگی پر ایک بہت قدیم کتاب مناقب الشعرا کا پتہ چلتا ہے۔ جو ابوطاہر الخاقانی کی تصنیف تھی اور گیارھویں صدی عیسوی کے آخر میں لکھی گئی تھی۔ نہ صرف دولت شاہ کو ہی اس کا علم تھا بلکہ حاجی خلیفہ نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن انتہائی کوشش کے باوجود بھی اس کتاب کا کہیں سراغ نہیں مل سکا۔ اگر یہ کتاب مل جاتی تو غالباً بہت قابلِ قدر ثابت ہوتی۔ لیکن ڈر ہے کہ شائد یہ اب بالکل ناپید ہو چکی ہے۔

دولت شاہ کا ایک اور ماخذ چہار مقالہ ہے۔ جو نظامی عروضی سمرقندی کی تصنیف ہے۔ بے شک یہ ایک دلچسپ کتاب ہے۔ اور اس زمانے کے ادبی اور فنی پہلو پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔ لیکن شعرا کے حالاتِ زندگی کے بارے میں یہ کوئی باقاعدہ تالیف نہیں۔ اگرچہ بعض شعرا کی زندگی کے متعلق ہماری معلومات میں کافی اضافہ کرتی ہے۔ دولت شاہ کا ایک اور ماخذ تاریخ گزیدہ مؤلفہ حمداللہ مستوفی کا وہ حصہ ہے جو فارسی شعرا کے حالات پر حاوی ہے۔ یہ گو قیمتی کتاب ہے مگر اس میں سوانح حیات کی کمی ہے۔ اندریں حالات کہا جا سکتا ہے۔ کہ مجموعی طور پر تذکرۂ دولت شاہ فارسی زبان میں تاریخ ادبیاتِ فارسی پر ایک بہترین کتاب ہے۔ اس کتاب میں کہیں کہیں عمومی تاریخ کی کافی باتیں مل جاتی ہیں۔ میرے خیال میں فارسی ادب میں چند ایک ہی ایسی کُتب فارسی کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ جنہیں فارسی ادب کے طالب علم اس کتاب کی طرح شوق اور مسرت سے پڑھتے ہوں گے یا اُن سے اس کتاب کی طرح استفادہ کر سکتے ہوں گے۔ شعرا کے مجموعۂ اشعار کی حیثیت سے بھی اسی کتاب کی قدر و قیمت بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ اس میں قریباً ڈیڑھ سو شعرا کا نمونۂ کلام نہایت اچھے مذاق

اور پختگی رائے کی بنا پر منتخب کر کے درج کیا گیا ہے۔ یہ تمام شعراء، فارسی کے کلاسیکی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ دور جامی پر ختم ہو جاتا ہے۔ جامی دولت شاہ کے معاصرین میں سے تھا۔ اس کے حالات بھی مصنف نے پانچ دوسرے معاصرین کے ساتھ بیان کر کے اپنی کتاب ختم کر دی ہے۔

تذکرۃ الشعرا میں مندرجہ نظموں میں سے بہت سی آج تک شائع نہیں ہوئیں۔ اور اس لئے مشکل ہی دستیاب ہوتی ہیں۔ گو تذکرۃ الشعرا، کو ایک زیادہ تنقیدی قسم کی کتاب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن یہ دلکش ہونے کے علاوہ بعض نہایت عمدہ اشعار اور دلچسپ واقعات پر بھی حاوی ہے۔ اس کا طرزِ انشا گو بہت ممتاز نہیں۔ لیکن یہ مشکل اور موٹے موٹے الفاظ سے باقی ان تمام کتابوں کی نسبت زیادہ پاک ہے۔ جو اسی دور یا ماحول میں لکھی گئیں۔ مثلاً انوار سہیلی جو دولت شاہ کے معاصر حسین واعظ کاشفی کی نہایت قابلِ قدر تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ (براؤن)

---

(۱۳۷) حبیب السیر

حبیب السیر ایک عام تاریخ ہے۔ یہ غیاث الدین بن ہمام الدین خواند میر کی تصنیف ہے۔ اس میں ابتدائے بشر سے لے کر شاہ اسماعیل صفوی کی وفات یعنی سنہ ۹۳۰ھ تک کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب روضۃ الصفا سے چھوٹی ہے اور تین جلدوں میں تمام ہوئی ہے۔ صفوی دور کی ابتدا اور شاہ اسماعیل کی سلطنت کی جو تفصیل اس میں بیان کی گئی ہے۔ وہ بڑی اہم ہے۔ کیونکہ خود مصنف اس بادشاہ کا ہمعصر تھا۔

یہ کتاب ختم کرنے کے بعد خواند میر نے ہندوستان کا سفر کیا۔ اور یہاں اس

نے اس کتاب کی نظر ثانی کی۔ خواندمیر نے سنہ ۹۴۱ھ میں ہندوستان میں وفات پائی۔ اور دہلی میں مدفون ہؤا۔ اس مصنّف نے حبیب السیر اور روضتہ الصفا کے تکملہ کے سوا اور دوسری کتابیں بھی تالیف کی ہیں۔ ان میں سے ایک دستور الوزرار بھی ہے۔ اس میں ابتدائے اسلام سے لے کر تیموریوں کی سلطنت کے اختتام تک کے وزرائے اسلام کا حال بیان کیا ہے۔ (شفیق)

شاہ اسماعیل صفوی کے عہد میں ایک اہم تاریخ کی کتاب لکھی گئی جو حبیب السیر کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں انسانی تاریخ کی ابتداء سے لے کر شاہ اسمٰعیل صفوی کی وفات تک کے حالات وواقعات درج ہیں۔ مؤلّف غیاث الدین بن ہمام الدین خواندمیر ہے۔ جو روضتہ الصفا کے مؤلّف محمد بن خاوندشاہ میر خواند کا پوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو تاریخ اتنے طویل زمانے کا احاطہ کئے ہوئے ہو۔ اس سے تفصیلات کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ لیکن اختصار کے باوجود ایران کی تاریخ کا یہ ایک اہم ماخذ سمجھی جاتی ہے۔ حبیب السیر کا انداز بیان سادہ اور رواں ہے۔

(بدخشانی)

---

(۳۸) مجمع الفصحا

یہ شعراء کا ایک مشہور تذکرہ ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس تذکرے میں ۷۰۰ شعرا کے حالات اور کلام کے نمونے درج ہیں۔ اس لحاظ سے مجمع الفصحا تاریخ ادبیاتِ ایران کا نہایت مفید ماخذ ہے۔ اس کی زبان سادہ اور رواں ہے۔

(بدخشانی)

یہ کتاب آخری دور میں تصنیف شدہ تمام تذکروں میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے مصنّف محمد ہادی خاں کے بیٹے رضا قلی خاں طبرستانی تخلص

بہ ہدایت ۱۲۱۸ھ (یعنی فتح علی شاہ کے عہد) میں بمقام طہران پیدا ہوئے۔ رشد و نمو اور تحصیل کمالات کے بعد محمد شاہ اور ناصر الدین شاہ کے درباروں میں اونچے منصبوں پر فائز ہوئے اور خاص کر ناصر الدین شاہ کی جوانی میں شاہ کی تربیت و ہدایت ان کے سپرد کی گئی۔ مجمع الفصحیٰ کی دو جلدیں ہیں۔ اس میں ایران کے بادشاہ، شہزادہ اور امیر شعرا کے سوا وسطی اور آخری دور کے ۷۰۰ سے زیادہ شاعروں کے حالات اور ان کے کلام کا انتخاب درج ہے۔ خود مرحوم رضا قلی خاں بھی اچھا شاعرانہ ذوق رکھتے تھے۔ ان کا تخلص ہدایت تھا۔ اور خود اپنی تصریح کے مطابق انہوں نے تیس ہزار سے زیادہ شعر لکھے ہیں۔ انہوں نے اپنے قصیدوں اور غزلوں کا نمونہ مجمع الفصحیٰ میں دیا ہے۔ اور اسی کتاب میں اپنا مختصر سا حال بھی لکھا ہے۔ انہوں نے ریاض العارفین۔ روضۃ الصفا اور نعت انجمن آراء وغیرہ کے نام سے کئی اور کتابیں بھی لکھیں اور ۱۲۸۸ھ میں وفات پائی۔ (شفق)

---

(۳۹) منشآت قائم مقام

ابوالقاسم نام اور تخلص ثنائی ہے ۱۱۹۳ھ میں فراہان میں پیدا ہوئے۔ میرزا عیسیٰ قائمقام وزیر سلطنت مشہور بہ میرزائے بزرگ آپ کے والد تھے۔ والد کی سرپرستی میں تعلیم پائی۔ فارغ التحصیل ہوئے تو دربار شاہی میں ملازمت مل گئی۔ کچھ عرصہ بعد انہیں آذربائیجان بھیج دیا گیا۔ جہاں ان کے والد عہدۂ وزارت پر فائز رہ چکے تھے۔ یہاں انہیں شاہزادہ ولی عہد کا دبیرِ خاص مقرر کیا گیا۔ ابوالقاسم کے والد فوت ہوئے تو فتح علی شاہ نے انہیں وزارت کا منصب سونپ دیا۔ یہاں حسنِ کارکردگی کے صلے میں انہیں سید الوزراء کا خطاب

ملا۔ خوش حالی کا یہ دَور زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکا۔ کیونکہ حاسدوں نے آپ کے خلاف بادشاہ کے کان بھرنے شروع کئے۔ اور روس دوستی کا الزام بھی لگایا جس کی پاداش میں وزارت سے آپ کو الگ کر دیا گیا۔ تین سال بیکار رہنے کے بعد آپ کے سوئے ہوئے بخت نے ایک کروٹ لی۔ اور سنہ ۱۲۴۱ھ میں دوبارہ منصب وزارت پر سے الگ کر دیئے گئے۔ سنہ ۱۲۵۰ھ میں فتح علی شاہ فوت ہوا۔ تو محمد شاہ تخت پر بیٹھا۔ اس کے عہد میں بھی وزارت کی باگ ڈور قائم مقام ہی کے ہاتھوں میں رہی۔ لیکن مخالف اور حاسد ان کے خلاف ریشہ دوانیاں کرنے لگے۔ چنانچہ محمد شاہ نے نہ صرف انہیں وزارت ہی سے معزول کر دیا۔ بلکہ انہیں قتل بھی کرا دیا۔

قائم مقام شاعر ہونے کے علاوہ اچھے نثر نگار بھی تھے۔ ان کے خطوط اس زمانے کی نثر کا عمدہ نمونہ سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثر تاریخی اور سیاسی اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ (بدخشانی)

ایران کے نئے ادبی سبک کے بانی میرزا ابوالقاسم قائمقام بھی ہیں۔ انہیں علوم حکمت و ادب میں بڑی دستگاہ حاصل تھی۔ فارسی اور عربی نظم و نثر پر انہیں استادانہ عبور حاصل تھا۔ ان کے اشعار اور ان کے منشآت فصاحت اور بلاغت کا نمونہ ہیں۔ مغلوں کے بعد کا وہ سبک جس میں پُر تکلف عبارتیں پیچیدہ مضامین مبہم معانی اور دُور از تشبیہیں رائج ہو گئی تھیں اُن سے ہٹ کر اس بے مثل ادیب کی تحریریں آنکھوں کو خاص طراوت بخشتی ہیں۔ قائم مقام کی طرزِ گفتار متقدمین اور خاص کر سعدی کی طرز کی بے اختیار یاد دلاتی ہے۔
محمد شاہ کے حکم پر قائم مقام کو سنہ ۱۲۵۱ھ میں بمقام طہران قتل کر دیا گیا۔ (شفق)

" منشآت قائم مقام جو بلاشبہ فارسی نثر کا ایک شاہکار ہے، ادبیات فارسی میں

زیادہ تر دو نقطہ ہائے نظر سے اہم ہے۔ اول تو ادبی قدر و قیمت کے اعتبار سے اور دوسرے نکات تاریخی کے لحاظ سے۔

اس کی ادبی قدر و قیمت رواں و شیریں نثر۔ سلیس و محکم جمل اور صحیح و سادہ ترکیبات کے باعث ہے۔ قائم مقام نے باوجود ایک ادیب کامل اور انشا پردازی پر پوری قدرت رکھنے کے اس مغلق اور پیچیدہ قسم کی نثر کی بساط الٹ دی جو مغلیہ کے بعد افشاریہ اور زندیہ دورِ حکومت میں انتہائی درجہ بے قدر ہو چکی تھی۔ اور اس کی بجائے اس نے فارسی نثر کو روانی اور سادگی کی راہ پر ڈال دیا۔ ہماری آج کل کی سادہ و رواں نثر اسی نمونہ کے نقش قدم پر جاری ہے۔

قائم مقام کی تحریرات کی تاریخی اہمیت اس لحاظ سے ہے کہ ان کے ذریعہ ہمیں قاجاریہ دور کے اوائل میں ایران کے سیاسی۔ اجتماعی اور تاریخی حالات و واقعات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے (خط نمبر ۴۰، ۵۵)

کیونکہ ان خطوط میں فتح علی شاہ کے دربار کے اندرونی حالات۔ مختلف تحریکات اور اسکے درباریوں کی گروہ بندیوں کی تشریح بوجہ احسن ملتی ہے (خط نمبر ۵۴) ان حالات کے مطالعہ سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس وقت کے حکمران کا عزم و ارادہ کس طرح اپنے طرفداروں کے مقاصد و نظریات کی خاطر ایک کھلونا بن کر رہ گیا تھا۔ اور کس طرح کسی کے کہنے سننے پر وہ پہلے نہایت مصمم ارادہ کر لیتا تھا۔ لیکن پھر کسی دوسرے کے کہنے سننے پر اپنے اس ارادے کو فسخ کر دیتا تھا۔ (خط نمبر ۵۱ - ۵۵) سلطنت کی وسیع قطع اور اسکی بڑی بڑی ضروریات مختلف اشخاص کی ذاتی اغراض اور بدنیتیوں کا شکار ہو رہی تھیں، ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کسطرح خیانتکار اور بے ایمان خدام اپنے آپکو مخلص خدمتگار ظاہر کرتے تھے۔ ان ہی خطوط سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حکمران وقت کس حد تک نفع پرست اور خود غرض انسانوں سے مسحور ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ اسکا ولی عہد بھی اتنی جرأت نہیں رکھتا تھا۔ کہ احوال واقعی اسکے سامنے بیان کر سکے اور سلطنت کے مفاد کی خاطر حقیقی بہتری کا مشورہ دے سکے۔

اسکے علاوہ اور بھی بہت سے مطالب ان تحریرات سے مستنبط ہوتے ہیں جن کی نسبت عہد قاچاریہ کے مؤرخین و مصنفین بالکل خاموش ہیں جن کی وجہ یا تو حالات کا تقاضا تھا اور یا بعض ذاتی مصلحتیں پیش نظر تھیں اور یا ممکن ہے انہیں ان واقعات سے آگاہی نہ ہو سکی ہو (خط نمبر ۴۰) اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ منشآت قائم مقام کا مجموعہ درحقیقت ایک ایسا آئینہ ہے جس میں فتح علی شاہ کے زمانہ کے اصل واقعات صحیح طور پر منعکس ہوتے ہیں۔ اور یہ ایک ایسا کامل مجموعہ ہے کہ اسکے ہر صفحہ پر تیرھویں صدی ہجری کے اوائل میں ایران کے تمام حالات بے کم و کاست بیان کئے گئے ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ قائم مقام کے اکثر و بیشتر خطوط شاہی فرامین اور احکام کا مجموعہ ہیں جو بادشاہ اور اسکے ولی عہد کی طرف سے وقتاً فوقتاً صادر ہوتے رہے اور چونکہ یہ خطوط دربار کے روزمرہ کے واقعات اور سلطنت کی بابت پیش آنے والے امور سے تعلق رکھتے ہیں اسلئے یقیناً وہ دروغ و ریا سے پاک اور پردہ پوشی اور حمایت سے مبرا ہیں۔ افسوس ہے کہ ان تمام احکام و فرامین اور خطوط کی تعداد چند ہزار تک پہنچتی تھی جو قائم مقام نے تیس سالہ درباری خدمت کے دوران میں مختلف حالات و اوقات کے تحت لکھے تھے مگر اب ان میں سے بہت تھوڑے ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ اور ان کا بیشتر حصہ مفقود یا ناپید ہو چکا ہے۔ آج ان میں سے جو مدون ہو کر ہمارے ہاتھوں تک پہنچے ہیں۔ ان کی تعداد حسب ذیل ہے۔

(۱) فارسی و عربی خطوط ۱۲۵ عدد

(۲) چار رسالے جن میں سے دو رسالے ناقص ہیں۔

(۳) دیباچے ۵ عدد

فارسی ادب اس مجموعہ شاہکار کی تدوین و فراہمی کے لئے شاہزادہ فرہاد مرزا معتمد الدولہ کی کوشش اور ہمت کا مرہون و ممنون ہے جو شاہزادہ عباس میرزا نائب السلطنت کا بیٹا اور قائم مقام کا تربیت یافتہ تھا اور دور

قاچاریہ کا ایک فاضل شخص تھا۔ منشآت قائم مقام کا مجموعہ پہلی بار شعبان سنہ ۱۲۸۰ ہجری میں طہران میں فرہاد مرزا ہی کے مساعی واہتمام سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ ۷۵۴ صفحات پر مشتمل تھا۔ اور اسکی تفصیل حسب ذیل تھی۔

۱۔ اشعار قائم مقام ۱۲۵ صفحات ۲۔ فارسی خطوط ۱۲۴ عدد

۳۔ عربی خطوط ۳ عدد ۴۔ رسالے ۴ "

۵۔ دیباچے ۵ عدد

اس نسخہ کے حاشیہ پر مرحوم فرہاد مرزا معتمد الدولہ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی بعض مفید توضیحات بھی موجود ہیں۔ چونکہ یہ منشآت عوام الناس اور قائم مقام کی تحریروں کے دلدادہ لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئے تھے۔ اسلئے یہ مجموعہ اس کے بعد پھر چار دفعہ طبع ہوا۔ دو بار تو مستقل طور پر علیحدہ اور دو بار بعض دوسرے اصحاب قلم کے منشآت کیساتھ ان خطوط کی تاریخ انشا کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ سوائے چند ایک خطوط کے اس زمانے کے دستور کے مطابق ان خطوط کے ساتھ ان کی تاریخ تحریر موجود نہیں۔ لیکن ہر ایک خط کی تاریخ تحریر اسکی عبارت اور متن کے مضمون سے بذریعہ قرائن حاصل کی جاسکتی ہے۔ (مقدمہ منشآت قائم مقام)

---

(۴۰) تمثیلات فتح علی اخوند زادہ

(مترجمہ جعفر قراجہ داغی)

میرزا فتح علی اخوند زادہ تاتاری نسل تھا۔ اس کا وطن مالوف قراجہ داغ تھا۔ چونکہ اس کا باپ دربند میں درس دیا کرتا تھا۔ اس لئے اسے اخوند زادہ کہتے ہیں۔ اس نے زندگی کا آغاز فوجی ملازمت سے کیا۔ اور بڑھتے بڑھتے قابودان (کپتان) کے عہدہ تک پہنچ گیا۔ پھر تلوار کو چھوڑ کر قلم اٹھایا اور دہ

کام کر گیا۔ جو حشر تک مٹنے کا نہیں۔ طفلس میں مستقل سکونت اختیار کی۔ اور ڈرامہ لکھنے لگا۔ اعلیٰ تعلیم میں بہرہٗ کافی رکھتا تھا۔ اور مغربی تہذیب و تمدن پر مٹا ہوا تھا۔ قوم کے درد سے اس کا دل نا آشنا نہ تھا۔ چنانچہ اس کی جھلک اس کی تصنیفات سے جا بجا پائی جاتی ہے۔ اس نے آذری ترکی میں کہ فارسی اور ترکی آمیزش سے تیار ہوئی ہے طفلس کے روسی تھیٹر کے لئے حسب ذیل ڈرامے لکھے جن میں سے بیشتر کومیڈیاں ہیں :۔

(۱) ملا ابراہیم خلیل کیمیاگر ۱۸۵۰ء

(۲) موسیو ژوردان ۱۸۵۰ء

(۳) خرس قولدور باسان ۱۸۵۱ء

(۴) وزیر خانِ لنکران ۱۸۵۱ء

(۵) مردِ خسیس ۱۸۵۲ء

(۶) وکلائے مرافعہ ۱۸۵۵ء

(۷) یوسف شاہ سراج ۱۸۵۵ء

ان میں سے اکثر کی بنیاد فرانسیسی ڈراما نگار مولیر کی کومیڈیوں پر ہے۔ ایران میں حقیقی ڈراما کا طرح انداز یہی ادیب ہے۔ ۱۸۵۹ء میں اس نے ان تمام ڈراموں کو ایک مجموعہ کی صورت میں "تمثیلاتِ قابودان میرزا فتح علی اخوندزادہ" کے نام سے شائع کیا۔ اور اپنے افسر جنرل بریاکنی کے نام پر معنون کیا۔ اس مجموعہ کی جان دیباچہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا کے نزدیک ڈرامہ کیا چیز ہے۔ اور اس کا مقصد کیا ہے۔ ہم اس کے ملخص کا ترجمہ درجِ ذیل کرتے ہیں :۔

انسان کی طبیعت میں دو خاصیتیں رکھی گئی ہیں۔ ایک غم اور دوسری خوشی۔ رونا علامتِ غم اور ہنسی خوشی کی دلیل ہے۔ کبھی مصیبت پڑنے یا فرحت بخش بات کے ہونے سے اور کبھی تحریر یا تقریر کے ذریعہ ان کے اظہار سے یہ دو حالتیں انسان کے مزاج میں ظاہر ہوتی ہیں۔ تقریر اور تحریر کی صورت میں

عمدہ اور موثر طرزِ حکایت ہے۔ اکثر اوقات اگر حکایت کو نامرغوب طریق سے بیان کیا جائے تو تاثیر پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن اگر اسی مصیبت کو نقل کر کے دکھایا جائے۔ تو انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا چنانچہ روضہ خوانوں کی مجلسوں میں اس کے عیب و ثواب بارہا دیکھنے میں آتے ہیں۔ نقلِ مصیبت اور نقل بہجت (ٹریجڈی اور کومیڈی) کی نمائش کی غرض و غایت یہ ہے کہ انسان کے اخلاق اور خواص کی تصویر کھینچ کر دکھائی جائے۔ تاکہ انسان خوبیوں کو دیکھ کر ان پر عمل کرے۔ اور بدیوں کو ملاحظہ کر کے ان سے پرہیز کرے۔ اور نفسِ امارہ اس قسم کی حکایتوں کے مزے میں پڑ کر گناہوں کی طرف میل نہ کرے۔

میرزا جعفر تحقیق قراجہ داغی
۱۸۳۳ء تا ۱۸۸۶ء

قراجہ داغ میں پیدا ہوا۔ شاہزادہ جلال میرزا پسر فتح علی شاہ قاچار کے متوسلین میں سے تھا۔ بیوی مرگئی تو پھر شادی نہ کی۔ اور بیٹی کی محبت پر سب کچھ نثار کر دیا۔ مروجہ طریق تعلیم کو قوم کی ذہنی ترقی کے منافی خیال کرتا تھا۔ اور رات دن اس کی اصلاح کی فکر میں رہتا تھا۔ اتفاقاً جلال میرزا کے کتب خانہ میں میرزا فتح علی کے ڈرامے نظر پڑے۔ انہیں پڑھا پسند آئے۔ اور انہیں فارسی میں ترجمہ کرنے کا تہیہ کیا۔ سب سے اول ۱۸۷۲ء میں ملا ابراہیم خلیل کیمیاگر کا ترجمہ کر کے شاہزادے کے حضور میں پیش کیا۔ شاہزادہ کمال خوش ہوا۔ اور انعام و اکرام سے حوصلہ بڑھایا۔ اور باقی ڈراموں کے ترجمہ کی فرمائش کی۔ کچھ عرصہ کے بعد موسیو ژوردان کا ترجمہ بھی ہو گیا۔ ان دونوں کتابوں کی اشاعت کی ابھی نوبت نہ آئی تھی کہ جلال میرزا کے انتقال کے باعث میرزا جعفر پریشان روزگار ہو گیا۔ تاہم جس کام کو شروع کیا تھا۔ اس نے ختم کر کے دم لیا۔ اس طرح میرزا فتح علی کے تمام ڈرامے فارسی میں منتقل ہو گئے

یہ طہران میں چھپ کر شائع تو ہو گئے۔ مگر مترجم کی یہ خواہش کہ انہیں تمثیل کیا جائے دل کی دل ہی میں رہی۔ اپنے ان ترجموں کی ایک جلد میرزا فتح علی کو بھیجی۔ جس نے انہیں ازحد پسند کیا۔ افسوس ہے کہ ملک نے اس کی قدر نہ کی۔ اور ناقدریٔ ابنائے وقت کا شکوہ مرتے دم تک اس کے لب پر رہا۔ اس مجموعہ کے مقدمہ میں لکھتا ہے:۔

"حکمائے عصر کا اس بات پر اتفاق ہے۔ کہ قباحتوں اور عیبوں کو جس طرح تمسخر انسان کی طبیعت سے دور کر سکتا ہے۔ ویسے کسی قسم کی پند یا نصیحت نہیں کر سکتی۔ اس سے ان کی طبیعت اس بات کی طرف راغب ہوتی ہے۔ کہ بُرے کاموں کو چھوڑ دیں۔ اس کے لئے کوئی وعظ یا نصیحت ایسی موثر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے علم تیاتر کی اشاعت کہ یہ علم انسان کے بُرے اور اچھے افعال کا آئینہ ہے۔ لازم ہے۔" ان ڈراموں کی زبان کے متعلق وہ خود کہتا ہے۔ اور خوب کہتا ہے۔ کہ مصنفوں کے طریق کے برخلاف اس نے پیچیدہ عبارتوں اور مغلق لفظوں سے احتراز کیا ہے۔ عوام کے روزمرہ کی تقلید کی ہے۔ یہی ڈراما کی زبان ہے۔ ان ڈراموں کی اشاعت نے ادبائے ایران کی جولانی طبع کے لئے نیا میدان پیدا کر دیا اور بہت تھوڑے عرصہ میں اس صنعت میں اچھا خاصا لٹریچر تیار ہو گیا۔ شیکسپیئر اور مولیر کے اکثر ڈراموں کے ترجمے انگریزی اور فرانسیسی سے ہوئے۔ (انتخاب [illegible] نمایش سالگرہ)

۱۲۹۱ھ (مطابق ۱۸۷۴ء) میں طہران سے فارسی کے سات ڈراموں کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا جس کے شروع میں میرزا جعفر قراجہ داغی نے ایک مقدمہ ڈراموں کی تعلیمی اہمیت پر لکھا تھا۔ یہ ڈرامے اصل میں مرزا فتح علی دربندی نے آذربائیجان ترکی میں لکھے تھے۔ اور طفلس سے ۱۸۶۱ء میں شائع کئے تھے۔ ان میں سے حسب ذیل پانچ شرح۔ حواشی اور اکثر صورتوں میں ترجمہ کے ساتھ

یورپ میں دوبارہ چھپ چکے ہیں ؟

(۱) وزیر خاں لنکران۔ مع اصل ترجمہ۔ فرہنگ الفاظ و حواشی۔

(۲) موسیو ژوردان (۳-۴-۵) تین بزمیہ ڈرامے مترجمہ از آذر بائیجانی ترکی در فارسی نیز فرہنگ و حواشی جن کے اصل عنوانات یہ ہیں۔

(ا) خرس قلدر باسان (چور پکڑنے والا ریچھ)

(ب) وکلائے مرافعہ (ج) ملا ابراہیم خلیل کیمیا گر"

بقیہ دو ڈرامے جو اب تک یورپ میں نہیں چھپے یہ ہیں :۔

(ا) مرد خسیس (ب) یوسف شاہ سراج۔ (براؤن)

مرزا فتح علی اخوند زادہ تاتاری النسل تھا۔ اور اس کے آباؤ اجداد کا وطن قراباداغ تھا۔ اس کا والد دربند میں پیشۂ معلّی کرتا تھا۔ اس وجہ سے وہ اخوند زادہ کے لقب سے ملقّب ہے۔ روسی رعایا ہونے کی حیثیت سے وہ روسی فوج میں داخل ہو گیا۔ اور اپنی ذاتی قابلیت اور احسن کارگزاری سے قابودان (رپتان) کے عہدہ جلیلہ تک ترقی کر گیا۔ آخر میں وہ تفلس میں ہی مقیم ہو گیا تھا۔ اس نے علوم مروجہ میں بہت اعلیٰ تعلیم پائی تھی۔ اور فرنگستانی رسوم و آداب کا بہت شیدا تھا۔ اپنی قوم اور اس کی کمزوریوں کا نبض شناس تھا۔ اس نے روسی تماشا خانۂ تفلس کی کامیابی اور فوائد سے متاثر ہو کر آذری ترکی میں (جو فارسی اور ترکی کی معجون مرکب ہے) ایک تاریخی حکایت اور چھ تمثیلیں اس تماشا خانے میں نقل کئے جانے کی اُمید پہ لکھیں۔ جن کے نام بقید سنہ تالیف درج ذیل ہیں :۔

(۱) ملا ابراہیم خلیل کیمیا گر ۱۲۶۷ھ یا ۱۸۵۰ء

(۲) موسیو ژوردان ۱۲۶۷ھ یا ۱۸۵۰ء

(۳) خرس قولدر باسان ۱۲۶۸ھ یا ۱۸۵۱ء

(۴) وزیر خان لنکران ۱۲۶۸ھ یا ۱۸۵۱ء

(۵) مردِ خسیس ۱۲۶۹ھ یا ۱۸۵۲ء

(۶) وکلائے مرافعہ ۱۲۷۲ھ یا ۱۸۵۵ء

(۷) قصۂ یوسف شاہ سراج ۱۲۷۲ھ یا ۱۸۵۵ء

پھر ان سب کو ۱۲۷۶ھ (۱۸۵۹ء) میں یکجائی طور پر تفلس میں بنام "تمثیلات قاپودان مرزا فتح علی اخوندزادہ" چھپوا کر شائع کیا۔ اور اپنے افسر جنرل بریاکنی کے نام پر معنون کیا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے جلال الدین مرزا پسر فتح علی شاہ قاچار نے نامۂ خسروان ایک کتاب ایران کی تاریخ میں لکھی اور اس کی ایک جلد فتح علی کو تفلس میں بھیجی تھی۔ مرزا نے اس کے عوض میں اپنی تمثیلات کی ایک جلد شاہزادے کو ارسال کی اور سر ورق پر یہ بھی لکھ دیا کہ اگر ان کا ترجمہ فارسی میں بھی ہو جائے۔ تو خالی از دلچسپی اور فائدہ نہ ہوگا۔ مگر بعض وجوہ سے یہ کتاب بہت عرصے تک زینتِ طاقِ فراموشی رہی۔

جلال مرزا جیسا خود صاحبِ علم تھا۔ ویسا ہی قدردانِ علم و کمال تھا، بہت سے اہلِ قلم اس کے سلکِ ملازمت میں منسلک تھے۔ جن میں قراجہ داغ کا رہنے والا منشی محمد جعفر بھی تھا جس کا تخلص تحقیق ظاہر کرتا ہے کہ وہ شاعر بھی تھا۔ اس کے حالات کے متعلق ہمیں صرف یہ معلوم ہے۔ کہ اس کی پیدائش ۱۸۳۲ء میں قراجہ داغ میں ہوئی۔ قاپودان فتح علی سے اس کا دور کا رشتہ بھی تھا۔ وہ ایران کے مروجہ طریقۂ تعلیم کو بہت ناپسند کرتا تھا۔ اور نصاب جو اس ملک کے مدارس میں جاری تھے۔ اُس قابل نہ تھے۔ کہ طلبہ میں صحیح قابلیت پیدا کر سکیں۔ وہ اس فکر میں رہتا تھا۔ کہ کس طرح اس طریقۂ تعلیم کی اصلاح ہو۔ اتفاقاً ایک دن اسے اپنے مربی شاہزادہ جلال مرزا کے کتب خانہ میں مرزا فتح علی کی تمثیلات کی وہ جلد جو مصنف نے

بھیجی تھی۔ ہاتھ آگئی۔ اُس نے اس کو بڑے شوق سے پڑھا۔ اس قدر لطف آیا کہ اسی وقت ارادہ کر لیا کہ جس طرح بھی ہو مصنف کی خواہش (دوبارہ ترجمۂ فارسی) کو پورا کیا جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے ملّا ابراہیم خلیل کیمیا گر کا ترجمہ ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) میں کر کے شاہزادے کے سامنے پیش کیا۔ شاہزادے نے خوش ہو کر مترجم کا حوصلہ بڑھایا اور باقی حصوں کے ترجمہ میں جلدی کرنے کی تاکید کی۔ چنانچہ ۱۲۸۹ھ کو موسیو ژوردان کے ترجمے کی تکمیل ہوئی۔ یہ دونوں کتابیں شائع بھی نہ ہونے پائی تھیں۔ کہ جلال مرزا کا انتقال ہو گیا اور مرزا جعفر ملازمت کے ختم ہو جانے کے باعث بیکاری کی وجہ سے پریشان رہنے لگا۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری اور ترجمے کا کام برابر جاری تھا۔ چنانچہ خرس قولدورباسان (قصّہ یوسف شاہ سراج) ۱۲۹۰ھ اور سرگذشت وزیر خان لنکران۔ مرد خسیس اور وکلائے مرافعہ ۱۲۹۱ھ شائع کیے۔ پھر ۱۲۹۱ھ میں چھیوں تمثیلوں (در قصہ یوسف شاہ سراج کو یکجائی طور پر طہران سے شائع کیا۔ اور مرزا فتح علی مصنّفِ اصلی کے پاس تفلس میں بھیجا جس نے انہیں بے انتہا پسند کیا۔ اور اپنے خطوط میں مترجم کی مساعی کی بہت تعریف کی۔

لیکن افسوس ہے کہ اہلِ ملک و ملّت نے مترجم کی عملی قدردانی نہ کی اور اسے عمر بھر اس بات کا افسوس رہا۔ کہ نہ تو اس کی ترجمہ کردہ تمثیلات کی اہلِ ملک نے تماشا خانہ میں نقل کی اور نہ ہی انہیں بطور نصاب تعلیم مدارس میں داخل کیا۔ اس ناقدری کی وجہ یہ ہے کہ مکتبوں کے ملّا لوگ تعلیم کے پرانے طریقوں اور نصاب مروجہ کو آسانی سے چھوڑنے والے نہ تھے۔ علاوہ ازیں ان تمثیلوں کی اصطلاحی اور سوقی زبان ان کے خیال میں متانت کے منافی تھی۔ اس لئے تعلیمی نصاب میں ان کو داخل کرنے کی بہت مخالفت کی گئی تشبیہی حیثیت سے ان کی ناکامی کا باعث یہ ہے۔ کہ اول تو ایران میں فن تشبیہ ابھی ابتدائی حالت میں تھا۔ اور تمام نظاروں کو تماشائیوں کے سامنے پیش

کرنے میں بہت دقّت تھی۔ دوسرے چونکہ ان میں ملّاؤں۔ رمّالوں۔ فالگیروں۔ نجومیوں اور حکامِ عدالت کے خاکے مضحکہ آمیز رنگ میں اڑائے گئے تھے۔ اور ممالکِ ایشیا اور خصوصاً ایران میں عامۃ الناس پر ان کا اثر اور نفوذ بہت زیادہ ہے۔ اس لئے ان لوگوں کی علانیہ تضحیک آسان بات نہ تھی۔ تاہم اتنا معلوم ہے۔ کہ بعض اصل آذری اور فارسی ترجموں کی نقلیں مختلف اوقات میں تماشا خانوں میں دکھائی گئی ہیں۔

ہاں ممالکِ غیر کے فارسی آموزوں نے ان کتابوں کا تپاک سے خیر مقدم کیا۔ اور ایران کی اصطلاحی زبان کے سیکھنے میں ان سے معتد بہ فائدہ اٹھایا اور اٹھا رہے ہیں۔ یورپ کی اکثر زبانوں میں ان کے ترجمے اور حاشیے شائع ہو چکے ہیں۔ اور اکثر تعلیمی مجلسیں ان کو فارسی زبان کے نصاب میں داخل کر چکی ہیں۔ ایران کے آئندہ تعلقات بین الاقوامی کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ ان کی مانگ اور قدر اب بہت بڑھ جائے گی۔

ان تمثیلوں کے شائع ہوتے ہی ایرانی اہلِ قلم نے اپنے ہاں اس فن کی ترویج اور ترقی کی طرف توجہ کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس فن کے متعلق بہت سی کتابیں شائع ہوئیں۔ جن میں سے اکثر ترجمے ہیں۔

——— (از منشی فضل حق)

مرزا جعفر قراجہ داغی نے اپنی فارسی میں ترجمہ شدہ تمثیلات کے دیباچے میں لکھا ہے کہ "مقامِ افسوس ہے کہ ابھی تک ایران میں کوئی تمثیل بہجت (COMEDIES) پبلک کے سامنے پیش نہیں کی گئیں۔ حالانکہ اس قسم کی تصانیف نہ صرف سامانِ عبرت و نصائح مہیا کرتی ہیں۔ بلکہ باہر سے آنے والے اجنبیوں کے لئے بھی زبان پر عبور حاصل کرنے اور یہاں کے باشندوں کے اخلاق و عادات کا صحیح اندازہ لگانے کے سلسلے میں کافی حد تک مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ اندریں حالات میں نے اس کمی کو پورا کرنے کا ارادہ کیا۔ اور

بجائے کسی دوسرے ادبی مشغل کی طرف متوجہ ہونے کے آئندہ نسلوں کے لئے یہی چیز بطور یادگار چھوڑنا مناسب خیال کیا۔"

"حسن اتفاق سے مجھے ترکی زبان کی چند تمثیلات کا مجموعہ ہاتھ لگ گیا۔ ان تمثیلات کی زبان سادہ ، فصاحت و بلاغت سے پاک اور ثقیل و متروک الفاظ سے عاری تھی۔ میں نے ان ہی تمثیلات کو فارسی زبان میں منتقل کر دیا۔ میں نے یہ تمام کام بالخصوص مدارس کے طالب علموں کے لئے سرانجام دیا ہے۔ جنہیں اب تک ایسی خشک اور فرسودہ قسم کی کتابیں پڑھنے پر مجبور کیا جاتا رہا ہے۔ جو ان کے دماغی قوٰے سے مناسبت نہیں رکھتیں۔ علاوہ ازیں ان میں عام مذاق کی چیزیں بھی نایاب ہوتی ہیں۔ طالب علموں کے علاوہ یہ تمثیلات اجنبیوں کے لئے بھی سودمند ثابت ہو سکتی ہیں۔"

مترجم اقرار کرتا ہے۔ کہ اس نے ادنیٰ درجہ کے کرداروں کا مکالمہ پیش کرتے وقت بعض غلط الفاظ کا استعمال بھی روا رکھا ہے۔ اور ان کے تلفظ کو بھی بدل دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بول چال کے سلسلے میں ایران کی جمہور آبادی کا تلفظ اسی طرح پر ہے۔ (ڈبلیو۔ ایچ۔ ہیگرڈ)

---

(۱۴) سیاحت نامہ ابراہیم بیگ

اس بات کا تصفیہ کسی قدر دشوار ہے کہ حاجی زین العابدین مراغی کا سیاحت نامہ ابراہیم بیگ (ابراہیم بیگ فرضی نام ہے) جو بقول مرزا محمد علی خاں تربیت کے دسن ۱۹۰۵ - ۶ عیسوی) کے انقلاب ایران کا محرک ہوا۔ ناول کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اگرچہ قصہ کا ہیرو اور اس کی سرگذشت دونوں فرضی ہیں۔ لیکن اس میں مبالغہ بہت کم ہے۔ اور اُسے اصلی اور سچی سرگذشت بھی سمجھا جا سکتا

ہے۔ اس کتاب میں ایران کے طریق حکومت اور معاشرتی حالت پر بہت سخت چوٹیں کی گئی ہیں۔ اور ان کا بیان بہت پُر اثر انداز سے کیا گیا ہے۔ مصنف کا منشا یہ تھا۔ کہ عوام میں بے چینی اور بد دلی پیدا کر کے انہیں ان حالات کی اصلاح پر اُبھارا جائے۔ گو ایرانی من حیث القوم طنز اور ہجو کے معاملے میں بہت زود حس واقع ہوئے ہیں۔ لیکن پھر بھی اکثر یورپی قوموں کی نسبت وہ اسے ٹھنڈے دل سے سہتے اور برداشت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ایرانی مسلمان قوم اپنے مقصد اصلاح کو حاصل کرنے کے لئے طنز اور ہجو کا استعمال بہت زیادہ کیا کرتے ہیں۔ یہ سیاحت نامہ بہت خوبی کے ساتھ اور نہایت جوش سے لکھا گیا ہے۔ اس کا طرز تحریر سادہ اور پُر زور ہے۔ اور اگر فارسی زبان کا کوئی متعلم روزمرہ کے محاورات پر عبور اور ایران کے متعلق ایک عام لیکن کسی قدر رنگ آمیز واقفیت پیدا کرنا چاہے تو میری رائے میں اس سے بہتر کوئی اور کتاب اس کے مطالعہ کے لئے نہیں ہو سکتی۔

سیاحت نامہ ابراہیم بیگ اصل فارسی زبان میں تین جلدوں میں چھپا تھا پہلی جلد قاہرہ میں جس پر سن تصنیف درج نہیں ہے۔ دوسری کلکتہ میں جس پر ۱۳۲۳ھ (مطابق ۱۹۰۵ء) درج ہے۔ اگرچہ طباعت ۱۹۰۷ء سے پہلے ختم نہ ہوئی۔ اور تیسری قسطنطنیہ میں ۱۳۲۷ھ (مطابق ۱۹۰۹ء)۔ مصنف کا نام صرف تیسری جلد کے سرورق پر درج ہے۔ (براؤن)

کتاب سیاحت نامہ ابراہیم بیگ کے مؤلف کا نام حاجی زین العابدین آقا ہے۔ جو مراغہ میں تجارت کا کاروبار کیا کرتا تھا۔ وہ اصل و نسل کے لحاظ کرد سرداروں میں سے تھا۔ اس کے باپ دادا کا پیشہ مدت مدید سے مراغہ میں تجارت چلا آرہا تھا۔ یہ خاندان وہاں کے باشندوں کی نسبت مالدار گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔ آٹھ سال کی عمر میں حاجی زین العابدین مدرسہ میں داخل ہوا۔

اور سولہ سال کی عمر میں وہ تجارت کے کاروبار میں اپنے باپ کے ساتھ شامل ہو گیا۔ جب وہ بیس سال کا ہوا۔ تو اردبیل میں پہنچ کر تجارت میں مصروف ہو گیا۔ رفتہ رفتہ تجارت کے معاملہ میں اسے نقصان ہونے لگا اور مختلف پریشانیوں نے آگھیرا۔ باپ کی وفات کے بعد کاروبارِ تجارت کی تباہی سے مجبور ہو کر وہ اپنے بھائی کے ساتھ قفقاز کو چلا گیا۔ اور وہاں مقیم ہو کر تجارت کا سلسلہ شروع کیا۔ لیکن بدقسمتی سے اسے وہاں پھر نقصان ہوا۔ وہاں سے وہ کریمیا کو چل دیا۔ وہ کبھی کبھی اسلامبول (قسطنطنیہ) سے سامان لا کر گلی کوچوں میں پھر پھر کر فروخت کیا کرتا۔ اسی طرح اس نے کچھ سرمایہ فراہم کر لیا۔ اور پھر وہاں سے نقل مکانی کر کے یالتا کو چل دیا۔ وہاں اپنی صداقت اور ایمانداری کے باعث اس نے بہت نیکنامی حاصل کر لی۔ اور اس طرح حکام اور عوام الناس کی نظر میں مقبول ہو گیا۔ بعدازاں اس نے اسلامبول میں واپس آ کر شادی کر لی۔ اور اپنی بیوی کے ہمراہ پھر یالتا آ گیا۔ پندرہ سال تجارت میں مشغول رہ کر دوبارہ اسلامبول میں سکونت اختیار کر لی۔ وہاں سے وہ حج کرنے کے لئے گیا۔ حاجی زین العابدین نے بہتر سال کی عمر پائی۔ اور آخر اپریل ۱۹۱۰ء میں اسلامبول میں فوت ہوا۔

حاجی زین العابدین کی تعلیم اگرچہ صحیح طریقہ پر نہ ہوئی تھی۔ اور فارسی نویسی کی اسے مشق نہ تھی۔ لیکن اس کے خیالات نہایت بلند۔ پسندیدہ اور جذبۂ حب الوطنی سے معمور تھے۔ وہ ہمیشہ اہل کمال کی صحبت اور ان کے ساتھ خط و کتابت کو غنیمت خیال کرتا تھا۔ ۱۸۸۷ء میں اس نے سیاحت نامۂ ابراہیم بیگ کے فرضی نام کے ساتھ ایک مسودہ ترتیب دیا۔ اور اسے کلکتہ کے مشہور رسالہ حبل المتین کے مدیر مویدالاسلام جلال الدین حسینی کی خدمت میں ارسال کیا تاکہ وہ اس کی لفظی و معنوی اصلاحات کے بعد اسے واپس کر دیں۔ سیاحت نامہ کا یہ مسودہ ۱۸۸۸ء میں اسلامبول کے مطبع اختر میں طبع ہوا۔ چونکہ یہ کتاب

عبارت کی شیرینی اور مطالب کی صداقت کے باعث اہلِ ایران کو بہت پسند آئی۔ اس لئے حکومت کی سخت پابندیوں کے باوجود پہلے ایڈیشن کے تمام نسخے ختم ہوگئے۔ چنانچہ سنہ ۱۸۹۰ء میں دوبارہ کلکتہ کے مطبع حبل المتین سے طبع ہوئی۔ پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں سیاسی مصلحتوں کے باعث سال و محلِ طباعت کو ظاہر نہ کیا گیا تھا۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں یہ کتاب بمبئی کے مطبع مظفری سے خیالی تصاویر کے ساتھ پھر شائع ہوئی۔ اور بعد ازاں کلکتہ کے بورڈ آف اگنامیز نے اسے کرنیل۔ ڈی۔ سی فلاٹ کے زیرِ اہتمام شائع کیا۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی تالیف سے اصل غرض یہ تھی کہ حکومتِ ایران کے مختلف شعبوں کے عیوب اور حکامِ وقت کے استبداد کو لوگوں کے سامنے پیش کر کے ملتِ ایران کو ہیجان میں لایا جائے۔ تاکہ وہ اپنے حقوق کا مطالبہ کریں۔ چنانچہ یہ کتاب حسنِ عبارت، سلاستِ کلام اور پُر اثر مطالب کی بنا پر اس قدر پسند کی گئی کہ ہر کس و ناکس اس کی تلاش میں لگ گیا۔ اور خواتینِ ایران بھی اس کے مطالعے سے محظوظ ہونے لگیں۔ اس طرح مؤلف کا مقصد حل ہو گیا اور ایران کے باشندوں میں بیداری اور جوش نظر آنے لگا۔

یہ کتاب گو افسانوی طرز پر لکھی گئی ہے۔ اور اس کا نام بھی فرضی ہے۔ لیکن اس کے واقعات صحت و حقیقت پر مبنی ہیں۔ اس داستان کے ضمن میں ایران کی سیاسیات پر جو چوٹیں کی گئی ہیں۔ وہ اس زمانے کے سیاسی مقتضیات کی بنا پر بالکل درست ہیں۔

(کرنل ڈی۔ سی۔ فلاٹ)

(۲۴) حاجی بابا اصفہانی

موریر (MORIER) کے حاجی بابا کا فارسی ترجمہ ایک لائق لیکن بدنصیب شخص حاجی شیخ احمد روحی کرمانی کا کیا ہوا ہے۔ اور جسے کرنل ڈی۔ سی۔ فلاٹ نے ۱۹۰۵ء میں کلکتہ سے شائع کیا ہے۔ سیاحت نامہ ابراہیم بیگ کی طرح اس کتاب میں بھی ایرانیوں پر بہت چبھتی ہوئی چوٹیں کی گئی ہیں۔ اور چونکہ اس کا مصنف ایک غیر ملکی شخص ہے (یعنی موریر) اس لئے اس کی حیثیت اور زیادہ عجیب و غریب اور پُرمعنی ہو گئی ہے۔ مگر اصل میں یہ کتاب بجائے فارسی کے انگریزی تصانیف کے ضمن میں آتی ہے (براؤن)

حاجی بابا (فارسی) کے مترجم حاجی شیخ احمد کرمانی بن احمد بن ملّا جعفر پیش نماز ہیں جنہوں نے جیمس موریر کے انگریزی حاجی بابا سے یہ ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ میں مترجم صرف اصل قصہ انگریزی سے لیتے ہیں۔ ورنہ امثال و اشعار و اقوال و رنگینیٔ عبارت و برجستگیٔ محاورات وغیرہ کا بہت کچھ اس ترجمہ میں اضافہ کر دیا ہے۔

مترجم کے حالات بہت سادہ اور غم انگیز ہیں۔ وہ ۱۸۵۵ء میں بمقام کرمان پیدا ہوئے۔ عربی پڑھنے کے بعد اصفہان میں آ گئے۔ یہاں مرزا آغا خاں کرمانی سے ملاقات ہوئی پھر یہ دونوں مل کر قسطنطنیہ گئے۔ تاکہ غیر ملکوں کی زبانیں سیکھ سکیں۔ چنانچہ قسطنطنیہ پہنچ کر مشرقی زبانوں کی تعلیم دے کر اپنی معاش پیدا کرتے تھے۔ اور خود فرانسیسی۔ انگریزی اور ترکی زبانیں سیکھتے تھے ان دونوں نے مرزا یحییٰ شیرازی بابی صبح ازل کی بہن اور بیٹی سے شادی کر لی ابھی یہ قسطنطنیہ ہی میں تھے۔ کہ حکومتِ ایران نے انہیں سازش کے جرم میں

گرفتار کرا دیا۔ لیکن جب سلطان ترکی کے سامنے ان کا مقدمہ پیش ہوا۔ تو اس نے انہیں نہ صرف بری کر دیا بلکہ برداشتِ صعوبت کے عوض پانسو تومان انعام دیئے۔

شیخ احمد کرمانی نے قسطنطنیہ میں ہی مرزا حبیب شاعر اصفہانی کی مدد سے چند تصانیف انگریزی۔ فرانسیسی کے تراجم فارسی زبان میں کئے۔ جن میں سے حاجی بابا (انگریزی) اور گل بلاس (فرانسیسی) کو شہرت اور قبولیت عامہ کا درجہ ملا۔

شیخ احمد کرمانی اور ان کے ساتھی مرزا آغا خاں دونوں بابی فرقہ کے باقاعدہ رکن بن گئے۔ انہوں نے ایران کے مجتہدین کو بہت سے خطوط لکھے جس میں انہیں مشورہ دیا کہ سنی اور شیعہ اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر ترکی سے اتحاد پیدا کر کے اپنے ملک کو اغیار کے مظالم دائمہ سے بچایا جائے۔ یہ تحریریں ایرانی عہدہ داروں نے پکڑ لیں۔ اور آخر سلطنت ایران کی طرف سے انہیں گرفتار کر کے ایران بھیج دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ اسی اثنا میں ناصرالدین شاہِ ایران کی پنجاہ سالہ جوبلی کی رسوم ادا ہونے سے کچھ دن پہلے اسے کسی بابی نے مزارِ شاہ عبدالعظیم میں گولی کے فائر سے ہلاک کر دیا۔ بادشاہ کی موت ان کے حق میں مضر ثابت ہوئی۔ یہ دونوں خفیہ طور پر گورنر تبریز کے سامنے ذبح کر دیئے گئے۔ یہ قتل ایک مطبخ میں ۴ صفر ۱۳۱۴ھ (۱۵ جولائی ۱۸۹۶ء) کو واقع ہوا۔ اور لاشیں کسی کنوئیں میں ڈال دی گئیں۔

جیمس جسٹنیان موریر نے ۱۸۲۴ء میں سرگذشتِ حاجی کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔ جب یہ انگریزی حاجی بابا ایشیا میں پہنچا اور اس کی شہرت ہوئی۔ تو اس کا ترجمہ زبانِ حال فارسی میں حاجی شیخ احمد کرمانی رومی نے کیا۔ جس کو پہلے ہندوستان میں ایڈیٹر اخبار حبل المتین کلکتہ نے چھاپا۔ اس کے بعد بورڈ آف اگزامینرس کلکتہ نے فلاٹ صاحب کے نوٹس کے ساتھ

اس فارسی ترجمہ کو شائع کیا۔

حاجی بابا کا ایک اور فارسی ترجمہ اسداللہ شیرازی نے بحالتِ قیامِ ہندستان بمبئی میں ۱۳۲۲ھ میں کیا۔ اور یہ ۱۳۲۹ھ میں وہیں سے شائع ہوا۔ یہ ترجمہ بھی زبانِ حال میں ہے۔ اور بہت اچھا ہے۔ مگر فلاٹ ایڈیشن کی عبارت زیادہ شوخ اور دلچسپ ہے۔ حاجی بابا کی کتاب اسّی گفتاروں پر مشتمل ہے حاجی بابا کے دونوں ترجمے اور مرزا جعفر قراجہ داغی کے ساتوں ڈرامے۔ زبانِ حال فارسی سیکھنے کے لئے بہت کارآمد ہیں۔

حاجی بابا کا انگریزی سے فرانسیسی زبان میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ خاص حاجی بابا کی لکھی ہوئی سرگذشت کا کچھ پتہ نہیں۔ ممکن ہے کہ لندن کے کسی کتب خانہ میں موجود ہو۔ لیکن گمانِ غالب یہی ہے کہ یہ سب موریہ کا گھڑا ہوا قصہ ہے۔ حقیقت نہیں۔

اس کتاب کے دیکھنے سے ایرانیوں کے عادات و اطوار و رسوم و طرزِ معاشرت کا بھی حال معلوم ہوتا ہے۔ گو تصویر کا ایک رُخ دکھایا گیا ہے۔ کیونکہ کوئی قوم ایسی نہیں جس میں خصائلِ ذمیمہ ہوں۔ اور فضائل نہ ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ شاہانِ خود مختارِ ایشیا علی الخصوص شاہان باجبروت مسلمانان اپنے تقاضائے نفس سے کچھ افعال ایسے کر بیٹھتے ہیں جو انصاف و انسانیت سے بعید ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی کچھ خوبیاں بھی رکھتے ہیں۔ جو کمتر دوسری اقوام میں پائی جاتی ہیں۔ مگر اس کتاب میں ایک بھلائی کا ذکر نہیں۔ اس بنا پر اگر یہ کہا جائے۔ کہ جیمس موریہ ایک مستشرق یورپین تھے۔ اور ان کو مشرق کے لوگوں کے عادات و رسوم سے واقفیت ایشیا میں رہنے سے ہو گئی تھی۔ لہذا یہ کتاب بطور قصہ (نہ واقعہ) تصنیف کی جس میں ایرانیوں کے اطوارِ ناپسندیدہ کی واقعی یا غیر واقعی ناول کے پیرایہ میں دل کھول کے توضیح کی گئی ہے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ تاہم اگر ایرانی اس کتاب کو دیکھ کر اسے اپنا ناصح قرار دیں۔ اور اسے ترکِ ذمائم کا وسیلہ سمجھیں تو اچھا

ہی نہیں ہوگا۔ بھلائی تو بہرطور بھلائی ہے۔ سچا دوست وہی ہے جو برائی سے آگاہ اور متنبہ کرے چاہے آگاہ کرنے والے کی نیت تضحیک و تہجین ہو مگر اس سے سبق حاصل کرنا عقل کا کام ہے۔

بہرصورت یہ کتاب موریہ کی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ نہ ترجمہ مصنف حاجی بابا کیونکہ ترجمہ کرنے کی طرف کوئی لفظ اس کا مُشعر نہیں ہے۔ (شادان بلگرامی)

جب شیخ احمد کرمانی کے اس فارسی ترجمہ کا ایک قلمی نسخہ اس کے وطن میں پہنچا تو پہلے اسے ایک مستقل تصنیف خیال کیا گیا۔ چنانچہ بڑے شوق سے اس کی نقلیں لی گئیں۔ اور نہایت جوش و خروش کے ساتھ اس کا مطالعہ کئے جانے لگا۔ کرمان کے علاوہ شیراز اور اصفہان میں بھی اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا کیونکہ ایرانیوں نے یہ خیال کیا کہ یہ سب سے پہلا ناول ہے جو فارسی زبان میں لکھا گیا ہے۔ اہلِ ایران جو اتنے ہی زیرک واقع ہوئے ہیں جتنے کہ خوددار اور غیرت مند اس بات کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ کہ ان کے ایک اپنے ہی ہموطن نے اس ناول میں ان کی ہجو لکھی ہے۔ بلکہ وہ اس بات پر نازاں تھے کہ ان کے ایک اپنے ہی بھائی نے ملک کی بعض عظیم المرتبہ ہستیوں اور عام طور پر رائج شدہ بعض تمدنی و سیاسی امور پر نہایت دانشمندی اور ہوشیاری کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ وہ اس کتاب میں صرف و نحو اور طرزِ انشا کی بعض خامیوں کو بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اور کہتے تھے۔ کہ اس کی زبان ہماری تحریر و تقریر کے عین مطابق ہے۔ مسٹر فلاٹ کا بیان ہے۔ کہ ایک ایرانی دوست نے اس کتاب کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہوئے مجھ سے یہ الفاظ کہے تھے کہ "یہ ایک عام ایرانی آدمی کی زندگی کا نقشہ ہے۔" کاش موریہ اپنی کتاب پر اس تنقید کو سن سکتا۔

بہرصورت اس کتاب کا غیر فانی ہیرو یعنی حاجی بابا ایرانیوں کے ہاں ہر دلعزیز ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ایک دن بدقسمتی سے اصل انگریزی کتاب کے چند

نسخے ہندوستان سے ایران پہنچے اور اس دن سے حاجی بابا کی ہردلعزیزی ختم ہوگئی۔ اور ایرانی کہنے لگے "فرنگی توئے کوک مارفتہ" انہوں نے اصل انگریزی مصنف یعنی جیمس موریر کے خلاف سخت غم و غصہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس نے حد سے بڑھ کر قدم اٹھایا ہے اور شاہ سے لے کر گدا تک ہر شخص کا مذاق اڑایا ہے مختصر یہ کہ آخر کار یہ راز طشت از بام ہوگیا۔ کہ حاجی بابا کسی ایرانی شخص کی تصنیف نہیں بلکہ یہ کتاب موریر نے خود انگریزی میں لکھ کر ایسا ظاہر کیا ہے۔ گویا یہ حاجی بابا کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔

حاجی بابا (مصنفہ موریر) کے متعلق لارڈ کرزن کی رائے

اہل ایران اگر بحیثیت قوم صفحۂ ہستی سے مٹ بھی جائیں۔ اور طہران مشہد اور شیراز وغیرہ مختلف ایرانی شہروں کا بھی حشر اگر وہی ہو جو بعض قدیم شہروں کا ہوا یعنی وہ کھنڈرات بن کر رہ گئے، تب بھی حاجی بابا ایسی ایک کتاب باقی رہ جائیگی جو مزاحیہ انداز میں اُس قوم کا ایک بے نظیر اور صحیح مرقع ہے۔ جو گو اس وقت معرض زوال میں ہے لیکن وہ اس سے قبل بلکہ اب بھی ایشیائی ممالک کے دائرہ سیاسیات میں ایک اہم کردار ادا کرتی رہی ہے۔ اگر اہل ایران کا تمام ٹھوس اور سنجیدہ قسم کا علم ادب کسی بین الاقوامی معاہدہ کی رُو سے جلا بھی دیا جائے لیکن حاجی بابا اور سر جان میلکم کے پیش کردہ بعض کردار باقی رہنے دیئے جائیں پھر بھی مجھے یقین ہے کہ مستقبل کے سیاستدان یا سیاح جو ایران کی زیارت کے لئے آئیں گے: یا علما جو دور دراز بیٹھے ایران کے متعلق تحقیقات کریں گے۔ حاجی بابا اور جان میلکم کی تحریرات سے ایرانیوں کے اخلاق و عادات و آداب اور رسوم و رواج کے متعلق زیادہ صحیح اور یقینی معلومات و اطلاعات حاصل کرسکیں گے۔ بہ نسبت ان معلومات و اطلاعات کے جو وہ اپنے طویل ذاتی مطالعہ اور عرصہ دراز تک مقامی رہائش اختیار کرنے کے بعد حاصل کریں گے

یہ دونوں تحریریں جدید اور رُو بہ زوال ایران کا صحیح خاکہ ہیں۔"

حاجی بابا کو ایک سنجیدہ تاریخ کی نگاہ سے دیکھنا چاہئے۔ اسے صرف طنز و مزاح ہی کا ایک مرقع خیال نہ کرنا چاہیئے۔ اس کی فارسی ترجمہ کی عبارت کا انداز زیادہ تر بول چال کی زبان پر مبنی ہے۔

(کرنل۔ ڈی۔ سی۔ فلاٹ)

دورِ سامانیہ کی نثر[1]

سامانیوں کے عہد میں نظم کی طرح فارسی کو بھی ترقی حاصل ہوئی۔ اس دور میں مصنفوں نے کتابیں لکھیں۔ ان میں سے کچھ انقلابِ زمانہ سے ناپید ہو گئیں۔ اور کچھ محفوظ رہ گئی ہیں۔ ان میں سے ایک شاہنامہ کا مقدمہ ہے۔ شاہنامہ کا یہ مقدمہ طوس کے حاکم ابو منصور بن عبدالرزاق کے حکم سے سنہ ۳۴۶ھ میں لکھا گیا ہے۔ دوسری اہم کتاب تاریخِ طبری کا ترجمہ ہے۔ اس کا مترجم عبدالملک بن نوح (سنہ ۳۴۳ھ۔ سنہ ۳۵۰ھ) اور منصور بن نوح (سنہ ۳۵۰ھ۔ سنہ ۳۶۶ھ) کا وزیر ابوعلی محمد بلعمی ہے۔ اس نے یہ عربی تاریخ امیر منصور کے حکم سے فارسی میں منتقل کی۔ یہ کتاب نہایت سادہ اور رواں فارسی نثر میں لکھی گئی ہے۔ اور اس عہد کی طرزِ تحریر کی ایک اچھی مثال ہے۔

سامانی عہد کی نثر کی ایک اور کتاب تفسیرِ طبری کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ بھی منصور بن نوح کے حکم سے ماوراءالنہر کے کسی عالم نے کیا ہے۔ ان کتابوں کے سوا قرآن کے ترجمہ اور تفسیر کا ایک قلمی نسخہ بھی ہے جس کے بارے میں بعض مستشرقین کا خیال ہے۔ کہ یہ بھی سامانی دور سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کتابوں کے سوا اور

---

[1] آئندہ صفحات میں مختلف "سبک ہائے نثر" کا مطالعہ کیا جائے گا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا۔ کہ یہ صفحات ہر دور کی نثری کتب کے ذکر سے پہلے آتے۔ لیکن افسوس ہے کہ بوجوہ ایسا نہ ہو سکا۔ اب یہ صفحات کتاب کے تتمہ کے طور پر کتاب کے آخر میں لگائے جا رہے ہیں۔ (مؤلف)

بھی تالیفیں ہیں - جو یا تو ابھی دریافت نہیں ہوئی ہیں - یا ان کی نشرو اشاعت کی نوبت نہیں آئی ہے - . . . . . چوتھی صدی ہجری میں فارسی نثر . . . . . سادہ اور رواں تھی - اس میں پیچیدہ عبارتیں بہت کم تھیں - اور جملے چھوٹے چھوٹے لکھے جاتے تھے - اور رسم خط اور الفاظ کا تلفظ بھی آج کل کے رسم خط اور تلفظ سے مختلف تھا - (شفق)

دربارِ سامانیہ میں متعدد انشا پرداز اور ادیب تھے - لیکن ان میں صرف ابو منصور المعمری، ابو علی محمدؐ بن محمد بلعمی، ابو المؤید بلخی اور موفق ہروی ہی ایسے ادیب ہیں - جن کے ادبی کارنامے دستیاب ہوتے ہیں - (بدخشانی)

جس طرح اس دور میں فارسی شعر کی بنیاد پڑی - اسی طرح نثر فارسی کی طرح بھی ڈالی گئی - اور مختلف خصوصاً علمی و ادبی موضوعات کہ دیگر مواضیع سے مشکل ترہیں پر کتب تالیف کی گئیں - اور یہی وہ دور ہے جس میں منطق، طب، الہیات، نجوم ریاضیات ایسے علمی مسائل پر بے شمار کتابیں تصنیف ہوئیں - اور زمانہ آئندہ کے لوگوں کے لئے علمی تحقیق کی راہیں ہموار کیں -

اس عہد کی نثر سادہ و رواں ہے - اور تکلف و تصنع سے پاک - ابتدائی نثر کی تمام خوبیاں، کہ مدعا و مفہوم کو سادگی سے ادا کر دیا جائے اس دور کی نثر میں موجود ہیں -

دورِ سامانی کے بعد فارسی تحریروں میں عربی زبان کے الفاظ کی آمیزش ہونے لگی تھی - لیکن اس دور کی نثر میں عربی الفاظ بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں - حتیٰ کہ علمی موضوعات پر بحث کرتے وقت بھی یہ کوشش کی گئی ہے - کہ ممکن ہو - تو عربی کلمات و تراکیب کے استعمال سے پرہیز کیا جائے - اور طبی - فلسفی - ریاضی یا دیگر علوم مختلفہ کے لئے فارسی کی علمی اصطلاحات ہی لائی جائیں - اور بصورتِ

عدم وجود نئی اصطلاحات وضع کر لی جائیں۔ البتہ بعض عربی کتب کا فارسی زبان میں ترجمہ کرنے سے کچھ عربی الفاظ و تراکیب اس میں در آئے۔ . . . . . .
غیر ترجمہ شدہ کتب میں عربی زبان کے جو الفاظ و تراکیب پائے جاتے ہیں، وہ ہیں، جو روزمرہ میں مستعمل اور زبان زدِ خلائق تھے۔ اس کے برعکس یہ بات ہماری خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔ کہ اس دَور کے اشعار میں عربی الفاظ کی بہتات ہے۔ کیونکہ یہاں شاعر کا سروکار وزن اور قافیہ سے بنے۔ اور بعض دفعہ اُنہیں مختلف و مترادف الفاظ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ بعض عربی الفاظ تو ایسے ہیں۔ جو محض حفظ وزن اور صحت قافیہ کی وجہ سے اشعار میں آ گئے ہیں۔ اور اس کے بعد تو ان کا استعمال عام ہو گیا۔

قرن چہارم اور اوائل قرن پنجم کی نثر میں افعال و ترکیبات کی تکرار اور بے ترتیب جملے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اور یہ اس دَور کی ایرانی نثر کی خصوصیت تھی۔ کہ تکرار کو عیب نہیں سمجھتے تھے۔ اور اگر اسے بعد میں عیب گنا جانے لگا۔ تو یہ عربی زبان و ادب کے اثر کا نتیجہ تھا۔

چونکہ اس دَور کی نثر تصنّع اور تکلّف سے عاری تھی۔ اس لئے متنِ عبارت میں علمی اصطلاحات اور عربی اشعار و امثال کو جان بُوجھ کر بے جا نہیں لاتے تھے۔ (صفا)

دَورِ غزنویہ کی نثر

غزنوی دَور میں شعرا کے سوا علماء فضلا اور ادبا کی کمی نہ تھی۔ ان میں سے ہر ایک علم و ادب میں استاد کا درجہ رکھتا تھا۔

غزنوی دربار کے سوا بخارا۔ گرگانج اور ایران کے دوسرے علاقے سلجوقیوں

خوارزم شاہیوں اور دوسرے حکمرانوں کی سرپرستی میں علوم وادبیات کے معدن اور شعرا علما اور عقلا و فضلا کا مرکز بن گئے تھے ۔ ان مقامات پر ابوریحان بیرونی شیخ ابوعلی سینا، ابوالخیر خمار، ابوسہل مسیحی اور ابونصر عراقی جیسے علماء و حکما اور اطبا پیدا ہوئے دونوں حکمران خاندان علم دوست اور ادب پرور تھے ۔ انھوں نے شعراء، ادباء، اور حکما کی سرپرستی کی ۔ سب سے پہلے سامانیوں نے فارسی زبان میں تصنیف و تالیف، ترجمہ اور شاہنامہ کے نظم کرنے کا حکم دیا ۔ نوح بن منصور کے پاس بہت بڑا کتب خانہ تھا ۔ اور اس سے ابوعلی سینا نے استفادہ کیا تھا ۔

• خوارزمشاہیوں میں خاص طور پر ماموں بن ماموں بڑا علم دوست اور ہنر پرور تھا ۔ ان دونوں خاندانوں کے وزرا بھی بڑے لائق اور فرض شناس تھے ۔ سامانیوں کا وزیر بلعمی اور ماموں کا وزیر احمد بن محمد سہیلی اسی ذیل میں آتے ہیں ۔ اسی طرح طبرستان ، گرگان اور اس کے آس پاس کے علاقے یعنی آل زیار اور علویوں کی ریاستیں بھی شاعروں ، ادیبوں اور عالموں کے مرکز بن گئے تھے ۔ خود شمس المعالی قابوس وشمگیر اور اس کے پوتے کیکاؤس کا شمار علماء اور حکماء میں ہوتا ہے ۔ دیلمیوں اور آل بویہ کے بادشاہ اور وزراء بھی ہنر مند اور ہنر پرور گزرے ہیں ۔ ان میں شمس الدولہ ۔ علاؤالدولہ ۔ عنصر الدولہ ۔ عزالدولہ بہاء الدولہ اور صاحب عباد جیسے لوگ پیدا ہوئے ہیں ۔ اس دور کے مصنفوں اور خاص کر ان لوگوں نے جو صاحب بن عباد ۔ وزیر کے دربار سے تعلق رکھتے تھے عربی میں تصنیف و تالیف کی ہے ۔ لیکن انھوں نے عربی کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی تصنیف و تالیف کی ۔ اور دانش نامۂ علائی اور کتاب التفہیم سے یہ بات بخوبی واضح ہے ۔ (شفق)

سلطان محمود غزنوی کا دربار علم و فضل کا بہت بڑا مرکز تھا ۔ یہاں شعراء کے علاوہ مشہور آفاق علما بھی جمع تھے ۔ جن کی گراں قدر تالیفات آج بھی علمی

تحقیق کا مفید ترین ماخذ سمجھی جاتی ہیں۔ ان میں ابوریحان البیرونی۔ اور ابوالفضل بیہقی۔ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ شیخ الرئیس بوعلی سینا اور بدیع الزمان ہمدانی کو اگرچہ غزنوی دربار سے تعلق نہ تھا۔ لیکن یہ اس زمانے کے عالم تھے . . . . .

سامانی دور میں ایرانی علماء نے اگرچہ فارسی نثر میں ضخیم کتابیں تالیف کیں۔ لیکن ان میں بیشتر عربی سے فارسی میں ترجمہ کی گئی تھیں۔ غزنوی دور میں علما نے فارسی نثر پر اور بھی زیادہ توجہ دی۔ چنانچہ اُن کی کوشش اور تحقیق سے بعض بیش قدر علمی کتابیں تصنیف و تالیف ہوئیں۔ ان میں دانش نامہ علائی۔ التفہیم تاریخ بیہقی اور ترجمان البلاغت خاص طور سے مشہور ہیں۔ (بدخشانی)

دورِ سلجوقیہ کی نثر

اس خاندان کی اور اس کے ہم عصر خاندانوں کی اہمیت ایران کی ادبی تاریخ کے لحاظ سے پچھلے حکمران خاندانوں سے کہیں زیادہ ہے۔ ان کے عہد میں ایرانی ادبیات کا احیا ہوا۔ اور ان کا عام رواج ہوا۔ ان کے دور میں بڑے بڑے شاعر اور بڑے بڑے عالم جیسے ناصر خسرو۔ خیام انوری، معزی، قطران، سنائی، شیخ عطار مورخوں میں راوندی، فقہا۔ علماء اور مشائخین میں غزالی، قشیری، نجم الدین کبری جیسے لوگ پیدا ہوئے۔ اسی دور میں پچھلے دور سے کہیں زیادہ ادبی۔ تاریخی، مذہبی منظوم اور منثور آثار منصۂ شہود پر آئے۔ ملک شاہ اور سنجر جیسے سلجوقی بادشاہوں نے ادیبوں کی سرپرستی کی۔ بلکہ ان میں سے بعض خود سخن شناس اور عالم و فاضل تھے۔ ان کے وزراء بھی بڑے دانش مند اور علم دوست تھے۔ مثلاً عمید الملک کندری خود بڑا عالم اور فاضل تھا۔ نظام الملک طوسی بہت بڑا ادیب نہایت بلند پایہ مصنف تھا۔ اور علما کا بڑا احترام کرتا تھا۔

عمید الملک نے خاص طور پر فارسی نویس شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی کی نظام الملک کو عربی سے زیادہ وابستگی تھی - اسی نے بلخ، نیشاپور، ہرات، اصفہان بغداد اور دوسرے مقامات پر نظامیہ کے نام سے بڑے بڑے مدرسے قائم کیے اور ان مدرسوں میں اس عہد کے بڑے بڑے عالموں کو درس و تدریس کے لئے مقرر کیا۔ سلجوقیوں کی حکومت کے مراکز جیسے نیشاپور وغیرہ شاعروں اور ادیبوں کے مرکز بن گئے تھے - باخرزی نے جو خود بھی اس عہد کا ایک بڑا ادیب گزرا ہے اپنے تذکرہ "دمیۃ القصر" میں سینکڑوں عربی گو شاعروں کے نام گنائے ہیں - ان شاعروں میں سے اکثر اس کے ہم عصر تھے - اس سے ظاہر ہے کہ فارسی گو شاعروں کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہوگی - آنے والے صفحوں میں ہم ان فارسی گو شاعروں میں سے بعض مشاہیر شعراء کا تذکرہ کریں گے -

سلجوقی دور کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اسی دور میں صوفیانہ عقائد کو ترقی ہوئی اور اس سلسلہ کے بہت سے مشائخ اور شاعر پیدا ہوئے -

لیکن یہ یاد رہے کہ ان علمی اور ادبی ترقیوں میں صرف سلجوقی بادشاہوں کی سرپرستی اور حمایت کو دخل نہیں ہے - بلکہ سلجوقی دور سے پانچویں اور چھٹی صدی مراد ہے - ان صدیوں میں غوریوں - خوارزمشاہیوں - بویہیوں - غزنویوں اور آتابکوں کی حکومتیں بھی رہی ہیں - اور یہ خاندان کم و بیش سلجوقیوں کے ہم عصر رہے ہیں - ان میں سے ہر خاندان نے اپنے دور حکومت میں عالموں اور شاعروں کی سرپرستی کی ہے چنانچہ ان میں سے بعض کے حالات سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے - اس دور کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ عربی تسلط کے بعد ایران کی حصول آزادی اور فارسی زبان کے رواج کی وجہ سے سامانی اور غزنوی دور میں ایرانی ذکاوت، فطانت اور طباعی کو اپنے جوہر دکھانے کے مواقع ہاتھ آئے - (شفق)

فارسی نظم کی طرح فارسی نثر کو بھی سلجوقیوں کے دور یعنی پانچویں اور چھٹی صدی میں ترقی حاصل ہوئی۔ اور اس دور میں بہت سے ادیب پیدا ہوئے۔ ان ادیبوں نے مختلف علوم و فنون میں اپنی تصانیف پیش کیں۔ اور حق یہ ہے۔ کہ فارسی نثر کے بعض شاہکار جیسے تاریخ بیہقی چہار مقالہ۔ کلیلہ و دمنہ۔ تذکرۃ الاولیا، وغیرہ اسی دور کی یادگار ہیں۔ ان میں سے بعض کتابیں جو اگرچہ سلجوقی دور میں تالیف ہوئی ہیں۔ لیکن سلجوقیوں کے ہم عصر بعض دوسرے حکمران خاندانوں اور امیروں کی سرپرستی میں لکھی گئی ہیں۔ جیسے غزنوی اور خوارزم شاہی اور دوسرے خاندان۔ اس دور کی نثر بھی پچھلے دوروں کی نظم کی طرح عام طور پر سادہ اور رواں ہے۔ یعنی تکلفات اور عبارت پردازی سے عاری ہے۔ اور حشو و زوائد اور لفظی صنائع جو دور مغول کے بعد سے عام ہو گئیں، اس نثر میں شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔ یہ نثر حقیقت میں نہایت پختہ آزمودہ نہایت بدیع اور فصیح ہے۔ اس کے باوجود اس عہد کی بعض تالیفوں میں ہم عربی کے ثقیل الفاظ اور جملے اصول ترسل، تحریر میں شواہد اور عربی اشعار کا استعمال دیکھتے ہیں۔ ظاہری تمطراق اور نثر مرسل و مزین کی ابتدا ہو چکی تھی۔ اصل میں بعد مغول کی طرز انشا، کی بنیاد اسی دور میں رکھی جا چکی تھی۔ یہاں مثال کے طور پر کتاب راحۃ الصدور راوندی اور کتاب التوسل الی الترسل (بہاؤالدین بغدادی) کا نام لینا کافی ہے۔ (شفق)

نثر میں مرکب اور مسلسل عبارتیں اور بڑے بڑے جملے لکھے جانے لگے۔ بے جا مترادفات استعمال ہونے لگے۔ عربی جملے، سجعے اور صنعتیں شروع ہو گئیں۔ سعد وراوینی کا مرزبان نامہ۔ راوندی کی راحۃ الصدور، مقامات حمیدی۔ تاریخ یمینی کا ترجمہ اور اس طرح کی کتابیں اس کی مثالیں ہیں۔ اقسام شعر میں قصیدہ، غزل، قطعہ، مثنوی، رباعی اور ترجیع بند لکھے جاتے تھے۔ مدح، وصف

بیان حال ، اظہار عشق ، مرثیہ ، پند و نصیحت ، دینی مطالب ، علمی اور صوفیانہ مسائل ، زبان کی قواعد اور عروض کے محاسن ان کے موضوع تھے ۔ (شفق)

دورہ سلجوقیہ کو علم و ادب کی ترقی کے لحاظ سے بڑی اہمیت حاصل ہے سلجوقی بادشاہ علم و ادب کے بڑے محسن تھے ۔ ان کے وزرا بھی علم و ادب کے شیدائی تھے ۔ طغرل بیگ کا وزیر عمید الملک الکندری ایک عالم شخص تھا اور فارسی شعرا اور ادبا کی بہت حوصلہ افزائی کرتا تھا ۔ الپ ارسلان اور ملک شاہ کا وزیر نظام الملک طوسی تھا جو بہت بڑا مدبر سیاست دان اور متبحر عالم تھا عربی زبان اور عربی ادب کی طرف بہت زیادہ متوجہ تھا ۔ نظام الملک نے تعلیم و تدریس کے لئے بڑی بڑی آسائشیں مہیا کیں ۔ مدرسہ نظامیہ کے علاوہ ۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بلخ نیشاپور ۔ ہرات اور اصفہان میں بھی بڑی بڑی درس گاہیں کھولی گئیں ۔ جن میں شہرہ آفاق عالم درس دیتے تھے ۔ سلجوقی حکومت کا پایہ تخت نیشاپور علم و ادب کا بہت بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا ۔ یہاں شعرا اور ادبا کا جمگھٹا لگا رہتا تھا ۔

سلجوقی دور کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ تصوف نے بہت ترقی کی اور اس سلسلے کے شعراء اور مشائخ نے اپنی تصنیفات سے فارسی علم و ادب کے سرمائے کو اور بڑھایا ۔ ناصر خسرو ۔ خیام ، انوری ۔ سنجری ۔ قطران ۔ حکیم سنائی ۔ خواجہ عطار ۔ ایسے نامور شاعر راوندی ایسے مورخ اور غزالی ۔ منتیشری اور نجم الدین ایسے عارف باللہ اسی عہد میں ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ علم و ادب کی ترقی کی وجہ سے محض سلجوقی حکمرانوں کی حوصلہ افزائی نہ تھی ۔ بلکہ سلجوقی دور میں یعنی پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں غوریوں یا خوارزم شاہیوں ، آل بویہ یا غزنویوں اور اتابکوں کی معاصر حکومتیں بھی علمی خدمات میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں ۔ غزنوی حکمران نعد کے شکست کھانے کے بعد غزنوی دور ایران میں تو

ختم ہو گیا۔ لیکن غزنی اور ہند میں ان کی حکومت ابھی قائم تھی۔ (بدخشانی)

اس دور کی فارسی نثر نے قدیم نثر سے ہٹ کر نئی راہ اختیار کی۔ وہ سادہ و دلکش نثر جو ہمیں سامانی دور میں نظر آتی ہے۔ اس دور میں بتدریج تکلف و تصنع میں تبدیل ہو گئی۔ اور اس میں عربی الفاظ کی آمیزش بڑھ گئی۔ اس تبدیلی کی بڑی وجہ یہ ہے۔ کہ اس دور میں تعلیم یافتہ طبقے میں عربی ادبیات کا رواج بڑھ گیا مزید برآں اسلامی تعلیمات کا اثر بروز افزوں ترقی کرتا جاتا تھا۔ اور ملک میں دینی مدارس کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ اس طرح طالب علم عربی زبان و ادب سے واقف ہوتے چلے گئے۔ اور انہوں نے عربی زبان کو ایران میں فروغِ معنوی بخشا۔

یوں فارسی نثر اور زبان میں تبدیلی آئی۔ ایجاز و اختصارِ عبارت ختم ہوا اور نثر نویسوں نے اطناب، توصیف، منظر نگاری اور تمثیلات کی طرف توجہ دینا شروع کر دی۔ یہ تبدیلی غزنوی دور کے بعد سے ہی دیکھی جا سکتی ہے۔ دوسری طرف اس علاقے سے باہر جہاں زبانِ دری بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ نئی سلطنتیں وجود پذیر ہونے لگیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ بہت سے نئے الفاظ اور نئی اصطلاحات و تراکیب وجود میں آئیں۔ اور جدید صرف و نحو نے نثر فارسی میں راہ پالی۔

اس زمانے سے نثر میں اشعار کا استعمال شروع ہوا۔ اور اس طرح عبارت میں اطناب اور حسنِ بیان میں تاثیر کی جھلک نمایاں ہوئی۔ جو مدتوں نثر فارسی کا سرمایہ رہی۔

اسی سبک سے نثر کے دائرۂ مطالب میں وسعت پیدا ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دورۂ اول کے آخر میں بہت سے علماء و فضلاء نے اپنے مطالب علمی کو فارسی زبان میں ادا کرنا شروع کر دیا تھا جس سے ایسے موضوعات جن کا اس وقت تک تصور بھی ناممکن تھا۔ نثر فارسی کی زینت ہے۔ اور ادائے مطلب کے لئے جدید اصطلاحات و ترکیبات و تعبیرات استعمال کی گئیں۔

مذکورہ بالا امور کے پیشِ نظر یہ کہا جاسکتا ہے ۔ کہ نثرِ معمولِ فارسی یعنی قیودِ لفظی سے عاری نثرِ مرسل جو پانچویں صدی اور چھٹی صدی ہجری کے اوائل کے دوران متداول تھی ۔ اور جس میں چوتھی صدی اور اوائلِ قرنِ پنجم کے سبک کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا تھا۔ اس دَور سے بہت مختلف ہے ۔ اور اگرچہ یہ فرق اتنا زیادہ بھی نہیں کہ پہلی نظر میں ہی نمایاں ہو جائے ۔ تاہم اس میں اختلاف کی کافی کڑیاں نمایاں ہیں ۔ یعنی اس میں دورۂ سامانی اور اوائل دورۂ غزنوی کی نسبت عربی کے الفاظ اور تمثیل با شعارِ عربی و فارسی کی کثرت ہے ۔ اس دَور کے لکھنے والے ، دلکش منظر نگاری اور دلپذیر اشعار سے عبارت کو مزین کرنے کے شوقین ہیں ۔ اور ایجاز و اختصار کے بجائے اطناب سے کام لیتے ہیں ۔

اس تمام بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے ۔ کہ پانچویں صدی ہجری کے نصفِ آخر اور چھٹی صدی ہجری کی نثر میں سادگیٔ الفاظ کے جلو میں آرائشِ معنوی کے لحاظ سے معانی و مضامین میں تکلف پیدا ہونے لگا تھا ۔ اور اس آرائشِ معنوی نے آرائشِ لفظی کو جگہ دی ۔ ... اس دَور میں جلد ہی لکھنے والوں کا ایک ایسا طبقہ وجود میں آگیا ۔ جو اپنی تحریر کو رعایت لفظی و معنوی سے مزین کرتا تھا ۔

نثرِ مرسل کی ان تحریروں میں ، جن کا ہم نے ذکر کیا ہے ۔ تاریخِ بیہقی ، سیاست نامہ اور تصنیفات ناصر خسرو کا نام لیا جاسکتا ہے ۔

جب ہم مذکورہ بالا کتب کا مطالعہ کر کے آگے بڑھتے ہیں تو ہمیں ایک اَور اندازِ تحریر کا سراغ ملتا ہے ۔ جسے نثرِ مرسل اَور نثرِ مصنوع کے درمیان حدِ فاصل شمار کرنا چاہیئے ۔ اس میں گو ترکیبِ کلمات میں نثرِ مصنوع کی سی پیچیدگی نہیں البتہ اطناب ، مترادفات اَور صنعتِ سجع کو اس کی خصوصیات قرار دی جاسکتی ہیں ۔ نثر کا یہ انداز ہمیں صوفیوں ... واعظوں اور خطیبوں کی مجالس میں نظر آتا ہے ۔ اور کتب کے لحاظ سے شیخ ابو سعید ابو الخیر کی تصنیف اسرار التوحید کا نام پیش پیش ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اس روش کا، جسے ہم نے نثر مرسل اور نثر مصنوع کے درمیان حدِ فاصل قرار دیا ہے اس عہد کے آخر تک، ایک ہی انداز رہا۔ اور زیر بحث دور کے آغاز سے انجام تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں ملتی۔ اور وہ نثر مصنوع جو معمولی سی تبدیلی کے بعد اس سبک کے بعد رائج ہوئی۔ اور ساتویں صدی کے آغاز تک اہم مدارج طے کر کے درجۂ کمال کو پہنچی۔ اس میں اسجاع کا استعمال کم اور فقرات مختصر ہو گئے لیکن عربی و فارسی کی آمیزش اسی طرح برقرار رہی۔

اگرچہ نثر مصنوع چھٹی صدی ہجری کے آغاز میں فارسی نثر میں شروع ہوئی۔ لیکن اس کا عروج چھٹی صدی کے آخر اور خصوصاً ساتویں صدی میں ہوا . . . . (صفا)

دورِ ایلخانیہ کی نثر

مغلوں اور تیموریوں کے عہد میں مملکت ایران کے مختلف حصوں میں فتنہ و فساد اور انحطاط علم و ادب کے باوجود فارسی نثر میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ ظاہر ہے اگر اس دور کے ناگوار واقعات پیش نہ آئے ہوتے تو ایران کے ادب میں اور بھی ترقی ہوئی ہوتی۔ مغلوں کے استیلا کے وقت ایرانی ادبیات اور ایرانی مدن دونوں اپنے کمال پر پہنچ چکے تھے۔ بڑے بڑے اُستادوں اور بڑے بڑے صاحبان علم نے تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا گیا تھا۔ علم و معرفت کے ان خزانوں میں سے جو کچھ ہم تک پہنچا ہے اسے ان کا ایک حصہ سمجھنا چاہیئے۔ اور یہ بھی چھوٹے چھوٹے خاندانوں کے آفات سے محفوظ رہنے اور علم و دانش کی سرپرستی کرنے کی وجہ سے بچ رہا۔ اتابکانِ فارس، آل جلایر۔ آل مظفر اور آلِ کرت کی دانش پروری یا متاخر سلاطین و مغول و آلِ تیمور کی حمایت اور تشویق کی وجہ سے ادب کے جو خزانے جمع ہوئے تھے۔ اُن میں سے ملک میں امن و امان باشندوں کی فراغت اور فتنۂ مغول سے مامون ہونے کے باوجود صرف ایک حصہ ہم تک

پہنچلے ہے- اس دَور کی بعض اہم نثری تصانیف کا بیان ذکر کیا جاتا ہے ۔ (شفق)

تاتاریوں نے ایران میں بڑی تباہی مچائی ۔ اس زمانے میں یہ توقع رکھنا کہ ان خرابیوں میں علم و ادب کے تازہ پھول کھلیں گے ۔ محال بات تھی ۔ تاتاریوں کی توجہ علم و ادب کی طرف تو کیا ہوتی ۔ ہاں ! انھیں یہ خیال ضرور آیا کہ ان کے عہد حکومت کے واقعات تاریخ میں محفوظ رہ جائیں ۔ اس لئے مورخوں کی بڑی حوصلہ افزائی کی گئی ۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس عہد میں فن تاریخ نویسی کو بہت ترقی ہوئی ایران کی مشہور ترین تاریخیں اس عہد میں لکھی گئیں ۔ اگر تیموری دَور کو اس میں شامل کر لیا جائے ۔ تو کہا جا سکتا ہے کہ ایران میں ، بلکہ سارے عالم اسلام میں اس زمانے کی تاریخوں سے بہتر تاریخیں نہیں لکھی گئیں (دیدخشانی)

مغلوں اور تیموریوں کے دَور میں فارسی سبک بگڑنا شروع ہوا ۔ اور خاص کر یہ بگاڑ نثر میں بہت زیادہ رونما ہوا ۔ تصنع اور تکلف زیادہ ہونے لگا تو طویل جملے ، مغلق ترکیبیں ، ٹھنڈے استعارے پُر تکلف اور بے جا سجع عربی کی تقلید میں کثرت سے استعمال کئے جانے لگے ۔ عربی جملے داخل کئے جانے لگے ۔ ... جملہ معترضہ کی بھرمار ہونے لگی ۔ استعارے تشبیہیں ایہام ، مبتدا اور خبر میں زیادہ فصل ، چھوٹی چھوٹی باتوں میں مبالغہ ، خواص کی مدح میں اغراق ، یہ سب اس دور کے سبک کی خصوصیات ہیں ۔ اس سبک کی مثالیں تاریخ وصاف اور تاریخ معجم سے لے کر تاریخ نادری درہ نادرہ تک برابر ملتی ... چلی آتی ہیں ۔ لیکن اس کے ساتھ گنتی کے کچھ ایسے اُستاد بھی ملتے ہیں ۔ جنہوں نے نظم و نثر دونوں میں پچھلے سادہ سبک ہی کو اختیار کیا ۔ اور سعدی اور حافظ کی نظم و نثر میں یا تاریخ جہاں گشا اور طبقات ناصری کی انشا میں نہایت پاکیزہ اشعار اور تحریریں لکھی ہیں ۔ انھوں نے اپنے

زمانہ کے پُر تصنع اور مبہم اسلوب کے خلاف گویا قلمی جہاد کیا ہے (شفق)

زیر مطالعہ تقریباً ستر برس کا زمانہ خاص طور پر ادبی نقطۂ نظر سے بہت قابل توجہ ہے۔ کیونکہ اس نے بہت سے ممتاز فارسی مورخ پیدا کئے۔ ان میں کم سے کم آٹھ تو کسی قدر مفصل تذکروں کے مستحق ہیں۔ ان کے علاوہ ایک قدرے بڑی تعداد قابلِ اعتنا شاعروں کی ہے۔ جن میں اگر متوسط درجے کے شاعر بھی ملا لئے جائیں۔ تو ان کا شمار بآسانی بڑھ سکتا ہے۔ ان فارسی مصنفوں پر غور کرنے سے پہلے بہرحال ضروری ہے۔ کہ چند الفاظ اس عہد کے عربی ادب پر کہے جائیں۔ اُن طلباء کے لئے بھی جو مقدم طور پر فارسی علم و ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں مناسب ہے کہ اس عربی ادب کا ایک عام تصور اپنے ذہن میں رکھتے ہوں۔

عربی ادب جس سے ہمارا یہاں واسطہ ہے۔ تین قسموں میں تقسیم ہوتا ہے۔ اول دو زبانی ایرانیوں کی عربی تصانیف جن کی فارسی تالیفات انہیں اپنے ملک کی ادبی تاریخ میں مذکور ہونے کا حقدار بناتی ہیں۔ اس قسم اول کی مثال کے طور پر قاضی ناصر الدین بیضاوی کو لیا جا سکتا ہے۔ البیضا جس سے اس کی نسبت ماخوذ ہے۔ صوبۂ فارس کی ایک بستی کا عربی نام ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ ایک سفید مقبرہ (تربت سفید) ہے جس کے سبب یہ مقام مشہور ہے۔ البیضاوی کی سب سے زیادہ شہرت قرآن کی مشہور تفسیر موسوم بہ اسرار التنزیل کے مصنف کی حیثیت سے ہے۔ یہ تفسیر عربی میں لکھی گئی ہے۔ لیکن اس نے فارسی میں نظام التواریخ کے عنوان سے ایران کی ایک تاریخ بھی قلمبند کی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بڑی بے انصافی ہوگی اگر ہم اسے محض ایک اوسط درجے کا مورخ کہہ کر چھوڑ دیں۔ اور مفسر کی حیثیت سے اس کے کہیں زیادہ اہم کام کو نظر انداز کریں۔

دوسری قسم غیر ایرانیوں کی عربی مصنفات کی ہے۔ جنہوں نے ایرانی فکر پر عمیق اثر ڈالا مثلاً شیخ صدر الدین قونوی کی مصنفات۔ یہ وہ سرچشمے تھے۔ جن سے فخر الدین عراقی جیسے شعرا نے معنوی فیضان حاصل کیا۔ تیسری اور سب سے اہم قسم عربی کی تاریخی، جغرافی

اور سیرتی تالیفات کی ہے۔ یہ اشخاص، مقامات، حالات اور خیالات پر روشنی ڈالتی ہیں۔

ایرانی تاریخ اور ادب کا متعلم جو ان کتابوں کو نظر انداز کرتا ہے۔ قابلِ اعتبار اطلاعات کے بعض نہایت گراں مایہ منبعوں سے محروم رہتا ہے۔ بایں ہمہ ایسے ایسے ماہرین نے بھی ان سے بے اعتنائی برتی ہے، جن کی تصانیف فارسی شاعری اور دیگر متعلقہ موضوعات پر سند سمجھی جاتی ہیں۔ قزوینی کی ۔ ۔ ۔ آثار البلاد کو ہی لیجئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کتاب میں فارسی کے ۔ ۔ ۔ ۔ اہم شاعروں کے ذکر موجود ہیں۔ جو تیرھویں صدی کے دوران میں یا اس سے قبل زندہ تھے۔ ان مذکورات میں لطیفے خاصے مکمل ہیں۔ اور ان میں ایسی معلومات ملتی ہیں۔ جو اور کہیں میسر نہیں۔ بہت حالتوں میں یہ مذکورات محفوظ مذکورات میں سب سے پرانے ہیں۔ کیونکہ اس سے زیادہ قدیم فارسی تصانیف جو شاعروں کے حالاتِ زندگی سے کم و بیش منظم طور پر بحث کرتی ہیں۔ صرف لباب الالباب عوفی اور چہار مقالہ، نظامی عروضی سمرقندی ہیں۔ اس پر لطف کتاب کے ان متعدد مباحث کے منجملہ جو فارسی کے متعلم کے لئے دلچسپ ہیں۔ شاعروں کے حالات کا یہ موضوع بھی ہے۔

آئیے اب ہم مورخین کو لیتے ہیں۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ یہ طبقہ اس عہد کے مصنفوں میں اہم ترین طبقہ ہے۔ کیونکہ جہاں اس سے متقدم اور متاخر دونوں زمانوں نے بڑے بڑے شاعر پیدا کئے۔ جو تعداد میں ویسے ہی فائق تھے، جیسے شہرت میں۔ وہاں ان میں کسی نے ایسے مورخ پیش نہیں کئے۔ جو زمانۂ زیرِ غور کے مورخوں سے ٹکر کھا سکیں۔ (براؤن)

دورۂ تیموریہ کی نثر

بمقابلہ شاعروں کے قابلِ ذکر نثر نگاروں کے اعتبار سے زیرِ نظر زمانہ کہیں کم فرومایہ ہے۔ اور ہمیں چار پانچ سے زیادہ پر غور کرنے کی ضرورت نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پچھلے دور کی طرح اس دور میں بھی تاریخ اور سیرت نگاری کی نمائندگی اچھی ہے۔ اور

ان مضمونوں کے کم سے کم نو یا دس مصنف بہرحال ایک مختصر سے تذکرے کے مستحق ہیں عموماً یہ اپنے معمول نقد کے پیش روؤں سے نمایاں طور پر گھٹیا ہیں۔ کیونکہ درحالیکہ ان کا انداز تحریر ویسا ہی آراستہ اور پُرتکلف گو نسبتاً کم جدت طرازانہ ہے۔ جیسا "دُعاتِ حضرت" کا لیکن تفصیلات کی فراوانی، مباحث کی وسعت گیری۔ اور تاریخی وقعت کی سندیں پیش کرنے میں یہ اس دور سے پیچھے رہ جاتے ہیں، پھر جب ان کا مقابلہ علاؤ الدین عطا ملک جوینی اور رشید الدین فضل اللہ کے سے جید مورخوں سے کیا جاتا ہے۔ تو یہ اور بھی فرومایہ نظر آتے ہیں۔ (براؤن)

دَورِ صفویہ کی نثر

دورِ زیرِ بحث پر جو عام ایرانی تاریخیں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً خواندمیر کی حبیب السیر (۹۲۹ھ مطابق ۱۵۲۳ء) سے شروع کر کے رضا قلی خاں کے ضمیمہ روضتہ الصفا اور لسان الملک کی ناسخ التواریخ تک اور خلد بریں جو ان دونوں کے درمیانی زمانہ میں تصنیف ہوئی یعنی (۱۰۷۱ھ مطابق ۱۶۶۰ء ۔ ۱۶۶۱ء) میں اور بہت کم یاب ہے۔ ان سب کے متعلق کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگرچہ ان واقعات کے اعتبار سے جو خود ان مصنفین کے زمانے میں گزرے ہیں۔ ان کی اہمیت مذکورہ بالا تواریخ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ لیکن سابقہ دوروں کے متعلق انہوں نے اتنا بھی نہیں کیا بلکہ جن ماخذ سے انہوں نے کام لیا ہے۔ کم از کم ان کا انتخاب اور استعمال خوش سلیقگی سے کرتے اور ان کے اقتباسات اچھی طرح اور احتیاط سے نقل کرتے۔ علاوہ بریں مذکورہ بالا جملہ تواریخ جمہور ایران کی تاریخیں نہیں ہیں۔ بلکہ ان بادشاہوں، شاہزادوں اور امرا کی تاریخیں ہیں جو رعایا پر ظلم توڑتے اور مالِ غنیمت کے لئے آپس میں دست و گریباں رہا کرتے تھے۔ ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ خوں ریزی، تشدد اور غارت گری کی بے مزہ داستانوں کی سی ہے۔ جن سے اس زمانے کے اخلاق اور معاشرتی معیار اخلاق کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا اور وہ مذہبی، سیاسی اور معاشرتی مسائل جن پر ابن خلدون کا جیسا کوئی مورخ نہایت کمال کے ساتھ قلم اٹھاتا افسوس ہے۔ کہ ان کتابوں سے بہت کچھ محنت اور صبر آزما تلاش کے بعد

بھی حاصل نہیں ہوتے۔

تاہم زمانہ حال میں اس فن میں ترقی کے کچھ اُمید افزا آثار نظر آتے ہیں۔ مرزا جانی کاشی اگرچہ بے چارہ تاجر پیشہ تھا۔ اور کچھ زیادہ ادبی قابلیت بھی نہیں رکھتا تھا۔ لیکن اس نے بابی فرقے کی تاریخ پر نقطۃ الکاف لکھی ہے۔ اور ۱۸۵۲ء میں اسی فرقے پر اس نے اپنی جان نثار کر دی۔ اگرچہ اس کی کتاب میں ضرورت سے زیادہ جوش و خروش نظر آتا ہے۔ تاہم وہ بہت کچھ عالمانہ اور سادہ اور سلیس زبان میں ہے۔ اور اس میں وہ رنگین نگاری مطلق نہیں ہے۔ جو ہم لوگوں کے ذوق پر اتنی گراں گزرتی ہے۔ اسی طرح سے ناظم الاسلام کرمانی کی غیر مکمل تاریخ بیداری ایرانیاں جس میں کثرت سے مستند حوالے موجود ہیں۔ اور سیاسی حالات پر شخصی خصوصیات کے اثرات دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میری رائے میں گذشتہ چھ یا سات صدیوں کی ہر ایرانی تاریخ سے بمراتب افضل و اعلیٰ ہے۔ (براؤن)

صفویوں کے زمانۂ سلطنت میں عام لکھنے پڑھنے کی نثر اور کتابی زبان سادہ اور رواں تھی۔ لیکن فنی نثر کا بھی رواج تھا۔ انشا پرداز منشی ظفر نامہ اور تاریخ وصاف کی تقلید میں پُر تکلف، پیچیدہ اور شاعرانہ نثر لکھتے تھے۔ مشکل اور مغلق عربی الفاظ۔ فنی اصطلاحات اور مترادفات کی تکرار سے نثر مبہم ہو کر رہ جاتی تھی۔ بادشاہوں کے تمام جو خطوط لکھے جاتے تھے۔ یا بادشاہوں کی طرف سے جو فرامین جاری ہوتے تھے۔ وہ بے جا مدح و تشبیب سے پُر ہوتے تھے۔ بے کار عبارت آرائی سے مضمون خواہ مخواہ طویل ہوتا تھا۔ معترضہ جملوں کی اکثریت سے فہم مطلب میں دشواری ہوتی تھی۔ (ڈاکٹر ظہور الدین احمد)

دورِ قاچاریہ کی نثر

ادبیاتِ ایران کی پوری تاریخ میں صرف عربی زبان ہی دینی اور علمی زبان رہی ہے۔ ایران میں اسلام کی ابتدا سے لے کر آج تک ابو علی سینا۔ ابو ریحان بیرونی۔ فخر رازی۔ خواجہ نصیر الدین طوسی سے لے کر ملا صدرا۔ حاجی ملا ہادی جیسے ایرانی علماء و فضلا نے علوم حکمت جیسے نجوم۔ طب۔ ریاضی۔ طبیعیات وغیرہ پر اپنی اہم ترین تصنیفیں عربی میں لکھیں اور فارسی کی طرف کم توجہ کی ہے۔ ان کی نظر صرف معانی کی طرف معطوف اور علمی حقائق کی شرح و بسط کی طرف متوجہ تھی۔ اس توجہ نے لازمی طور پر نظم و نثر حتی کہ

عام خط و کتابت اور خواص کی بات چیت پر بھی اثر ڈالا۔ بہت سی ایسی اصطلاحیں اور ترکیبیں جن میں عربی سے احتراز کیا جاسکتا تھا۔ عام طور پر رائج ہو گئیں۔ اس سے فارسی زبان کی موزونی متاثر ہونے لگی۔ اس کے سوا فنی اصطلاحیں جو عربی سے لی گئی تھیں، مصر اور ترکی کے رستے ہماری زبان میں داخل ہونے لگیں۔ جیسے بلدیہ، عدلیہ، نظمیہ، ارکان حرب اور ایسی ہی بہت سی ترکیبیں جیسے عرض اندام اور نقطۂ نظر وغیرہ جن میں سے بعض غلط بھی ہیں۔ فارسی میں نمودار ہونے لگیں۔ ان دونوں نے مل کر فارسی زبان کے مخصوص آہنگ میں بگاڑ پیدا کر دیا۔ دوسری طرف نئے نئے علوم و فنون کے رواج کی وجہ سے نئی اصطلاحیں گھڑنے کی ضرورت پیش آئی۔ اور مترجم اور معلم ان اصطلاحوں کے وضع کرنے کی فکر میں لگ گئے۔ ان اسباب کی بنا پر آج سے کوئی پچاس سال پہلے لکھنے والوں میں ایک نئی ادبی تحریک شروع ہوئی۔ ان لوگوں نے فارسی زبان سے بے ضرورت آرائشی الفاظ، آرائشی اور بے کار جملے اور بھرتی کی فضول ترکیبوں کو نکالنا شروع کیا۔ اور ان کی جگہ صحیح اور فصیح فارسی الفاظ استعمال ہونے لگے۔ اس ادبی تحریک نے آخر کار فرہنگستان ایران کی تاسیس کی صورت اختیار کی۔ (شفق)

قاچاریوں کے عہد میں یعنی تیرھویں صدی کے آغاز اور چودھویں صدی ہجری کی ابتدا تک زبان ادبیات میں ایک نمایاں تبدیلی واقع ہوئی۔ اور ایک پسندیدہ اور نفیس نثر وجود میں آئی محمد شاہ و فتح علی شاہ قاچار کی فتوحات سے ملک میں امن ہوا تعلیم و تربیت کی طرف شوق بڑھا علما نے عوام کو تعلیم یافتہ و ترقی یافتہ بنانے کے لئے توجہ دی۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی جنگیں بھی اثر انداز ہوئیں۔ ایران اور مغربی ممالک میں تعلقات بہتر ہو گئے۔ ایرانی اروپائی کتابوں اور رسائل و جرائد سے آشنا ہوئے۔ ایران و روس کی جنگ کے بعد خیر خواہان سلطنت نے مشورہ دیا کہ نظام تعلیم کا از سر نو انتظام ہونا چاہیئے۔ اور نئے علوم و فنون سیکھنے کے لئے طالب علموں کو یورپ بھیجنا چاہیئے۔ چنانچہ مرزا صالح و مرزا حاج بابا تعلیم کے لئے لندن گئے۔ فتح علی شاہ قاچار کے زمانے میں پریس جاری ہوا۔ اور پتھر پہ چھپائی کا رواج ہوا۔ اس زمانے میں نئی اور پرانی کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ ناصر الدین کے عہد سلطنت (۱۸۴۸ء - ۱۸۹۶ء) میں اخبار بھی جاری ہوا اور نثر کا رنگ ڈھنگ بھی تبدیل ہوا۔ قائم مقام (۱۱۹۳ھ تا ۱۲۵۱ھ ۱۸۳۵ء) نے اپنے
[illegible]

کو کم کیا۔ خط و کتابت میں نامذ القاب اور بے جا تعریفوں کو حذف کیا۔ . . . . اس مصنف کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ "کہ" تعلیل کو حذف کرتا ہے" "را" علامت مفعول کو زیادہ استعمال نہیں کرتا۔ "ہا" غیر جانداروں کی علامت جمع کو جانداروں کے لئے بھی استعمال کرتا ہے مثلاً نوکر ہا و آدم ہا وغیرہ۔ کبھی جانداروں کے لئے جمع کی خبر لاتا ہے۔ اس عہد کے دوسرے مصنف قائمقام کی تقلید میں سادہ نویسی کی طرف مائل ہیں۔ شیخ احمد روحی نے موریر کی کتاب حاجی بابا کا ترجمہ انگریزی زبان سے فارسی میں کیا۔ یہ کتاب ایک طرف تو سلاست و لطافت اور پختگی زبان کی وجہ سے گلستان سعدی کا مقابلہ کرتی ہے۔ اور دوسری طرف اپنے لئے اسلوب کی وجہ سے یورپ کے بہترین ناولوں کے مقابلوں میں پیش کی جا سکتی ہے۔ مرزا جعفر علی قراجہ دای نے آذربائیجانی ترکی سے حکیم نباتات، وزیر خان لنکران اور وکلائے مرافعہ وغیرہ ڈراموں کا ترجمہ آسان روزمرہ فارسی میں کیا۔ ناصرالدین شاہ خود تین مرتبہ یورپ گئے۔ اور انہوں نے سلیس فارسی میں سفرنامے لکھے۔ یورپ میں علوم و فنون سیکھنے کے لئے انہوں نے انگریزی اور فرانسیسی زبانیں پڑھنے کے لئے ایران میں مدرسے قائم کئے۔ انگریزی اور فرانسیسی کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ مثلاً روبن سن کروسو، ژل بلاس اور مونٹی کرسٹو وغیرہ۔ پُرتصنع فارسی میں یورپین افکار و خیالات کا اظہار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے لازمی طور پر سیدھی سادہ اور واضح نثر رائج ہوئی۔ بہت سے نئے نام اور نئی اصطلاحات زبان میں داخل ہوئیں۔ مصر میں ثریا و پرورش، اسلامبول میں اختر، کلکتہ میں حبل المتین اور لندن میں قانون جیسے بلند پایہ اخبارات و رسائل میں سیاسی و اجتماعی مضامین پر مقالات لکھے گئے۔ اس لئے الیکٹرک، ماہیت کابینہ، کنفرانس اور مجلس مبعوثان جیسے الفاظ استعمال ہونے لگے۔ اعلان مشروطیت کے بعد بہت سے اخبارات و رسائل شائع ہونے لگے۔ اور ایک زبردست ادبی انقلاب رونما ہوا۔ اور تکلف سے عاری سادہ نثر کا رواج ہوا۔ فارسی قدیم کے اسلوب کو تبدیل کرنے میں وطن پرستی اور قوم پرستی کے جذبات کا بھی کافی اثر ہوا۔ کچھ لوگ ایسے بھی نکل آئے جو عربی الفاظ کو نکال باہر کرنے میں کوشاں تھے۔ شاہنامہ اور گرشاسب نامہ کو نمونہ سمجھ کر خالص فارسی میں نثر لکھتے تھے۔ نامۂ خسرواں اور داستان ترکتازانِ ہند اس تحریک کی بنا پر خالص فارسی میں لکھی گئیں۔ (ڈاکٹر ظہورالدین احمد)